جمع و ترتیب: احمد حقانی ندوی

محمد الحسنی ٹرسٹ

طبع چہارم

ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ ——— جنوری ۲۰۰۸ء

نام کتاب ——— قرآنی افادات
نام مؤلف ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
نام مرتب ——— ر۔ احمد حقانی ندوی
کمپوزنگ ——— ناشر کمپیوٹر لکھنؤ
صفحات ——— ۵۶۸
طباعت ——— کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ
تعداد ——— ۱۱۰۰
طابع وناشر ——— محمد الحسنی ٹرسٹ، تکیہ کلاں، رائے بریلی
اسٹاکسٹ ——— ندوی بکڈپو لکھنؤ

ہدیہ -/140 روپے

﴿ملنے کے پتے﴾

(۱) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس 119 لکھنؤ
(۲) مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس 93 لکھنؤ

عرض ناشر

کچھ ہی دن پہلے ایم حسنی ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ اس کے پیش نظر جہاں اور مقاصد ہیں ان میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے نام پر یہ ٹرسٹ بنایا گیا) کی کتابیں اور رسالے خاص طور پر شائع کیے جائیں جس کی ابتداء انہی کے ایک رسالہ "آج بھی دنیا اسی در کی محتاج ہے" کی اشاعت سے کی گئی جو بیک وقت اردو ہندی اور انگریزی میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل اور توفیق سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے قرآنی افادات شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جو مولوی ر۔احمد حقانی ندوی نے بڑی عرق ریزی محنت اور شوق سے جمع کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ افادات سے استفادہ کو عام فرمائے اور ٹرسٹ کو قبول فرمائے اور اس کے تمام کاموں کو باعث اجر و ثواب بنائے۔ آمین

عبداللہ حسنی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم محرم ۱۴۲۰ھ

عرض ناشر

(طبع دوم)

الحمد للہ قرآنی افادات کا پہلا اڈیشن ختم ہوا۔ جس کی تعداد اشاعت دو ہزار تھی، ضرورت کے تحت ضمنی اڈیشن (تعداد ایک ہزار) بھی طبع ہوا۔ کتاب میں پروف ریڈینگ کی کچھ غلطیاں تھیں ان کی درستگی کا کام کرا کے دوسرا اڈیشن پیش خدمت ہے۔

پہلے اڈیشن کو ہر اعتبار سے پسند کیا گیا۔ نفس کتاب کی افادیت کا خاص و عام نے اعتراف کیا۔ ٹرسٹ اس حوصلہ افزائی پر احسان مند ہے اور شکر گزار ہے۔ خاص طور پر ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دعاؤں سے نوازا تھا۔ اب حضرت مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو آپ کے حق میں رفع درجات کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ان کے کاموں کو آگے بڑھائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خلق خدا کو نفع پہنچے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس اڈیشن کو بھی قبول عام عطاء فرمائے۔ آمین۔

محمد الحسنی ٹرسٹ

تکیہ کلاں میدان پور، رائے بریلی

یوپی، انڈیا۔

رجب ۱۴۲۱ھ

اکتوبر ۲۰۰۰ء

فہرست ابواب ومضامین

نمبر شمار | صفحہ نمبر

باب (۱) تعارف وہدایات ۲۵-۵۸

باب (۲) دعوت و عزیمت ۵۹-۹۶

باب (۳) ایمان و استقامت ۹۷-۱۴۶

باب (۴) دین و عبادت ۱۴۷-۱۹۲

باب (۵) تہذیب ومعاشرت ۱۹۱-۲۴۰

باب (٦) تعلیم وتربیت ۲۴۱-۲۷٦

باب (۷) احکام ومطالبات ۲۷۷-۳۳۴

باب (۸) فرائض اور ذمہ داریاں ۳۳۵-۳۹۸

باب (۹) نبی رحمت اور مقدس مقامات ۳۹۹-۴۳۰

باب (۱۰) مادی افکار و نظریات ۴۳۱-۴۶۰

باب (۱۱) قانون مکافات ۴۶۱-۵۰۰

باب (۱۲) عبرت و موعظت ۵۰۱–۵۴۷

باب (۱۳) قصص و واقعات ۵۴۹–۵۶۸

کلمۂ دعا

الحمد لله والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ ﷺ و آلہ وصحبہ وسلم ۔اما بعد:

خاکسار راقم نے عزیز گرامی قدر مولوی ر۔ احمد حقانی ندوی اطال اللہ عمرہ وزادہ توفیقا کی مرتب کردہ کتاب "قرآنی افادات" پر نظر ڈالی جو تمام تر اس راقم کی تحریروں، دعوتی تقریروں، اور تصانیف ورسائل کے اقتباسات پر مشتمل ہے، تو اپنی ہی مستور و مخفی اور منتشر و منقسم توفیقات وبیانات کی دستیابی کی اطلاع اور ان کو مجموعی شکل میں یکجا دیکھ کر وہ خوشی ہوئی جو کسی کو اپنی عزیز ترین متاع کی گمشدگی یا پردہ پوشی کے بعد دوبارہ مل جانے پر خوشی ہوتی ہے۔

عزیز موصوف کی یہ محنت، ذوق سلیم، قدر شناسی، اور حسن انتخاب خود اس راقم کی طرف سے (جس کی تحریروں اور تقریروں کے یہ اقتباسات ہیں) موجب حیرت بھی ہے اور باعث مسرت بھی اور الحکمۃ ضالۃ المؤمن" کا مصداق بھی۔

یہ خود راقم کے حق میں ایک گمشدہ یا منتشر و مستور حقائق قرآنی اور تعلیمات ایمانی کا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے اور بہت سے فراموش کردہ اور فراموش شدہ حقائق وعبرتوں اور مواعظ وحکمتوں کو ذہنوں میں تازہ اور دل ودماغ میں جاگزیں بنائے۔

وماذلک علی اللہ بعزیز۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۲۵/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

تاثرات

از : جناب مولانا شمس الحق صاحب ندوی
اڈیٹر تعمیر حیات واستاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زمانۂ طالب علمی کے ابتدائی درجات ہی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی کے ہفتہ واری تفسیری درس میں -جو مرکز دعوت و تبلیغ کچہری روڈ پر ہوا کرتا تھا- حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، یہ زمانہ اگرچہ ہماری کم عمری اور کم علمی کا زمانہ تھا- لیکن حضرت مولانا مدظلہ کی ذات سے عقیدت و محبت روز اول ہی سے دل میں رچ بس گئی تھی، جس کی تاویل محض فضل خداوندی کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہیں آئی-!

دل کی سادہ تختی پر اس بندہ خود آگاہ کی محبت ثبت ہو گئی جو اپنے معاصر کے سارے اولیاء اللہ اور علماء ربانیین کا منظور نظر اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک رہا۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی

فصادف قلبا خالیاً فتمکنا

حضرت مولانا مدظلہ کا طرز کلام اور اسلوب بیان چونکہ علم کلام اور منطق و فلسفہ کے بکھیڑوں سے پاک، سادہ و دلکش ہوتا۔ اس لئے ایک کم سن کی عقل بھی اس کو قبول کرتی جاتی گو اس کو بیان نہ کر سکے۔

جیسے جیسے عقل و شعور ترقی کرتے گئے مولانا مد ظلہ کی تحریروں سے تعلق و مناسبت نے عشق و وارفتگی کا درجہ حاصل کر لیا۔ ضخیم اور مفصل کتابوں کے پڑھنے کے لئے تو وقت و استعداد دونوں کی ضرورت تھی۔ لیکن رسالوں اور مضامین کا پڑھنا۔ خواہ عربی کے ہوں یا اردو کے۔ معمول بنا رہا۔!

مولانا مد ظلہ کے مضامین و رسالوں میں وقت اور موضوع کی مناسبت سے کسی نہ کسی آیت کی تشریح سب میں نہیں تو بیشتر میں ضرور ہوتی جو اپنے اندر ایک اچھوتا اور مطابق حال انداز رکھتی۔ اور ادھر دس پندرہ سالوں میں تو شاید ہی کوئی تقریر ہوتی ہے جس کا مرکزی مضمون موضوع کی مناسبت سے کوئی آیت کریمہ نہ ہوتی ہو۔!

پڑھ پڑھ کر دل میں خیال آتا تھا کہ ان تفسیری آیتوں کو جمع کر کے کتابی شکل میں لانے کی سعادت حاصل کروں۔ لیکن یہ خیال...... خیال ہی بن کر رہ گیا۔! کئی بار حضرت مولانا مد ظلہ سے عرض کیا کہ حضرت قرآن کا مطالعہ کس طرح کروں؟ ہر بار یہی جواب ملا کہ۔ "قرآن کی تلاوت اپنے کو مخاطب سمجھ کر کرو۔ معانی کھلتے جائیں گے۔" کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ "ہمارے مضامین قرآن کا مجموعہ"، "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی"۔ دیکھ لو"!

ہم حضرت مولانا مد ظلہ کے مضامین قرآن کی ترتیب و جمع کا خیال ہی باندھتے رہے۔ کہ معلوم ہوا عزیز خوش نصیب مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ بڑی مسرت ہوئی۔ وقفہ وقفہ سے ان سے پوچھتا بھی رہا کہ کام کہاں تک پہونچا۔

اور اب خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کام کو تکمیل تک پہونچا چکے ہیں اور وہ کتابی شکل میں شائع ہونے جا رہا ہے...... ان مضامین کے جمع و ترتیب میں (مولانا محمد الحسنیؒ جو حضرت مولانا مد ظلہ کی اکثر تحریروں کے مترجم بھی رہے اور عربی رسالہ "البعث الاسلامی" اور اردو میں پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کے مؤسس و بانی بھی، کے فرزند ارجمند) عزیز مکرم مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی کے مشورے اور رہنمائی دونوں برابر شریک رہے۔ جس سے یہ کتاب "حسین گلدستہ قرآن" کے قالب میں ڈھل گئی!

اس کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ ہر خاص و عام کی اصلاح و تربیت کے لئے مفید ہے بلکہ علماء و طلباء کے

لئے قرآن فہمی سے مناسبت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ وسیلہ ہے جزاہ اللہ خیراً۔!

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ عزیز موصوف کا یہ شوق علم برابر بڑھتا رہے اور ان کو مفید خدمات کی توفیق مزید ملے! (آمین)

خاکسار

شمس الحق ندوی

۱۰/ ۳/ ۱۴۱۸ھ

تعارف

از: مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی
استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدالمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین.

اما بعد!

قرآن مجید ایک زندہ جاوید اور عالم گیر کتاب ہے۔ اس میں ہر عہد، ہر نسل، اور ہر حالات کے لئے رہنمائی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو معجزہ کے طور پر عطا فرمایا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزے عطا کئے جن میں زمانہ کے حالات اور تقاضے، لوگوں کے جذبات و رجحانات اور زمان و مکان کے حدود و قیود کا خیال رکھا گیا۔ اسی لئے اس وقت ان معجزات کا وجود نہیں، جو آسمانی کتابیں تھیں وہ تحریف کا شکار ہو چکی ہیں۔ جس کا اعتراف خود یہودی اور عیسائی محققین و مصنفین نے کیا ہے، لیکن جو معجزہ حضرت رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا وہ ایک ایسا لازوال، دائمی، تازہ اور تابندہ ہے جو آج تک اسی طرح جدید اور زندگی سے لبریز، اور قیادت ورہنمائی کی صلاحیت سے بھرپور ہے۔ انسانی عالمی مشکلات اور پیچیدگیوں کا بہترین حل پیش کرتا ہے، زندگی کا آئینہ اور مرقع ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

قرآن مجید مجموعی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔ یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے

کہ قرآن مجید کی ہر آیت مستقل ایک معجزہ ہے اور اس کا اعجاز مختلف زبانوں میں اور مختلف زمانوں میں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ نہیں ہزاروں مرتبہ پڑھا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آج ہی نازل ہوا ہے"

قرآن مجید ایک خزانۂ عامرہ ہے، ایک بحر عمیق ہے، جس میں آبدار اور بیش بہا موتیوں کی کمی نہیں، آدم کے سارے کنبہ کو عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو اس میں سے تقسیم کیا جائے تو بھی کمی واقع ہونے والی نہیں۔

حضرت مولانا مدظلہ العالی دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "بڑے بڑے فرمانرواؤں، سرمایہ داروں اور دولت مندوں کو دینے کے لئے اگر کوئی چیز ہے اور جو اضافہ کر سکتی ہے، دنیا بدل سکتی ہے، قسمت چمکا سکتی ہے وہ قرآن مجید کی بھیک ہے"۔

قرآن مجید تحت الثریٰ سے اٹھا کر افلاک و ثریا پر پہونچا سکتا ہے اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کو منھ کے بل گرا دیتا ہے، یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے خانہ بدوشوں، صحرا نشینوں جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا تھا، نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ جو ساربان تھے ان کو جہاں بان بنا دیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے بدوؤں کو، خانہ بدوشوں کو جن پر دنیا کی توجہ بھی نہ ہوتی تھی۔ ع

"جہاں بان و جہاں دار او جہاں آرا"

بنا دیا، انھوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج کو پاؤں سے روندا اور ان کے تخت سلطنت پر ایسے بے تکلف بیٹھے جیسے بوریے پر بیٹھے ہیں۔

در شبستان حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

غار حراء میں ایک کمبل پوش نے چند راتیں گذاریں، ایک قوم پیدا کر دی، ایک آئین دیا، ایک حکومت بنادی، اس کی آنکھیں چند راتیں نیند سے محروم رہیں لیکن اس کی قوم تخت خسروی پر سونے کے لائق ہو گئی۔ اس نبیؐ امی کے غلام قیصر و کسریٰ کے تخت پر قابض ہو گئے۔

قرآن مجید مٹی کو اکسیر بناتا ہے اور جو اسکی ناقدری کرتا ہے وہ اکسیر ہوتا ہے تو اس کو مٹی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا بے لاگ قانون ہے، یہ دو دھاری تلوار ہے اگر اس کا استعمال صحیح نہیں ہوا، ناقدری کی گئی تو قوموں کا کام تمام کر سکتی ہے۔ اللہ کا قانون بے لاگ ہوتا ہے اور ہر غیور قانون کسی حد تک بے لاگ ہوتا ہے، ہر باعزت شخص کی بات کی لاج ہوتی ہے، احترام ہوتا ہے حکومتوں کا قانون جب جب نافذ ہو جاتا ہے تو اس کا احترام لازمی ہو جاتا ہے"۔

ان اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مد ظلہ نے قرآن مجید کا مطالعہ ایک زندہ جاوید کتاب، ایک ہدایت نامہ بلکہ ایک ذاتی کتاب کی طرح کیا ہے جو براہ راست ان سے مخاطب ہے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے قران مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع اور آئینہ ہے، جس میں افراد بھی اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات و عروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں"۔

اسی لئے دوسرے تلاوت کرنے والوں اور پڑھنے والوں کو مشورہ دیتے ہیں:

"قرآن مجید کو اپنی ذاتی کتاب سمجھا جائے، یہ کتاب ابدی ہے، آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بھی بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے، قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہو گا کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں، یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد

میں ہوگی پہلے اپنی اصلاح ہو جائے“۔

اس طرح قرآن مجید کے مطالعہ نے حضرت مولانا مد ظلہ کو قرآن مجید کے خزانہ عامرہ کی دولت سے مالا مال کر دیا، مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہ اللہ کے اسباق میں حاضری اور استفادہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سالہا سال قرآنی اسباق کے درس اور افادہ نے قرآن کا ذوق پیدا کیا، مزید عربی زبان و ادب میں مہارت اور دستگاہ کامل نے اس کا ذائقہ بھی پیدا کر دیا، جس کے بغیر عربی زبان کی لطافت و وسعت، اس کی گہرائی اور گیرائی کا سمجھنا بہت مشکل اور دشوار ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں، اور واقعہ یہ ہے کہ میری تمام فکر، تحریر و تقریر اور اظہار خیال کا مظہر اور مرکز بلکہ اس کا سرچشمہ قرآن مجید کا محدود مطالعہ ہے، چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ:

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا، وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے“۔

جو حضرات اس خزانہ عامرہ کی دولت پا رہے تھے، اور اس بحر کی غواصی میں لگ چکے تھے وہ حضرت مولانا کی اس صفت اور ذوق سے واقف اور آگاہ تھے، جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ بانی جماعت تبلیغ نے خاص موقع پر خاص انداز سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”جایئے دولت قرآن مبارک ہو“۔

جہاں تک خوردوں کا تعلق ہے وہ ایک عرصہ سے قرآن کے ذوق آشنا اور اس کے معانی اور مفاہیم سے گہری واقفیت و آگہی رکھنے والے کی حیثیت سے مولانا سے تفسیر لکھنے کی درخواست کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن ابھی تک درخواست قبول نہ ہو سکی، وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو جتنا عظمت و جلال کلام الٰہی سے واقف ہوتا ہے اتنا ہی اس کے لئے اس کا بیان اور تفسیر دشوار ہوتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ رمضان المبارک میں درس قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا جو الحمد للہ جاری ہے، اور

کئی پارے ٹیپ ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مدظلہ کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور درس پایۂ تکمیل کو پہونچے، اس سے افادۂ قرآنی کی ایک اچھی شکل سامنے آسکتی ہے۔

ایک عرصہ سے یہ خیال تھا کہ مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں سے ان مختصر آیات قرآنی کو یکجا کردیا جائے، جن میں مولانا نے اپنے البیلے اور اچھوتے انداز سے کلام کیا ہے، اور نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں، ان میں ایسی آیات ہیں جو بار بار دہرائی گئی ہیں، لیکن ہر تقریر اپنے اندر نئے نئے نکتے، ہر تحریر اپنے جلو میں نئے نئے اشارے رکھتی ہے، اگر ان کو سلیقے سے جمع کردیا جائے، تو ایک حسین گلدستہ تیار ہو سکتا ہے، کیوں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بڑے اہم نکات، بڑی اہم اور ضروری ہدایات اور تعلیمات پرچوں اور ماہناموں کی فائلوں میں، پمفلٹس اور کتابچوں کے انبار میں اور بڑی کتابوں کے اوراق میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

محبّ عزیز مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی (ناظم ادارہ شباب اسلامی۔ دہرہ دون) سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے سپرد یہ کام کیا گیا، انھوں نے بڑی محنت و کاوش اور تلاش و جستجو سے حضرت مولانا مدظلہ کے اکثر و بیشتر کتابچے، مختلف پرچوں میں شائع شدہ تقریریں دیکھیں، اور کچھ چیزیں ٹیپ سے بھی نقل کیں، اور نہایت سلیقہ مندی سے یہ مجموعہ تیار کردیا، جن میں ایسے مضامین آگئے ہیں جو جدید نسل کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں تہذیب جدید کے چیلنجوں کا جواب بھی ہے، جاہلیت کی تصویر کشی بھی ہے، دور جدید کی جاہلیت اور جاہلیت اولیٰ کا موازنہ بھی ہے، اس میں عقائد وایمانیات کی اہمیت بھی بتائی گئی اور اصلاح حال کا سبق بھی دیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں۔ ایک ایسا منارہ نور ہے جو گم گشتہ راہوں اور فکری بے راہ روی کے شکار لوگوں کے لئے ایک نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور اس سے استفادہ کو عام فرمائے۔

عبداللہ حسنی

دائرہ شاہ علم اللہ

۲۰/۱/ ۱۴۱۸ھ

(استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

تقدیم

از : مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے تفسیری افادات

جمع و ترتیب

از- مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی

قرآن مجید وہ آخری آسمانی صحیفہ ہے جو اللہ تعالٰی نے ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا اور اس کیلئے طے فرمایا کہ یہ بغیر کسی تبدیلی و تغیر کے قیامت تک باقی رہے گا، اس کو گذشتہ آسمانی صحیفوں کی طرح بگاڑا یا بدلا نہ جاسکے گا، بد باطن اور بد خواہ لوگ اس میں وہ ردو بدل نہ کرسکیں گے جو انھوں نے تورات و انجیل جیسے عظیم آسمانی صحیفوں کے ساتھ کیا اور صحیفوں کو ضائع بھی کر دیا۔

چونکہ تورات و انجیل کے بعد قرآن آنے والا تھا اس لئے گذشتہ صحیفوں میں کئے گئے ردو بدل کا نقصان قائم و جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے ردو بدل سے جو خرابی صحیح دین و شریعت میں آرہی تھی وہ نئے رسول محمد ﷺ اور نئی کتاب قرآن مجید سے دور کر دی جانے والی تھی اور چونکہ محمد ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا رسول نہیں آنا ہے اور نہ قرآن مجید کے بعد کوئی نئی آسمانی کتاب آنی ہے اس لئے حضرت محمد ﷺ قیامت تک کے لئے رسول بنائے گئے اور قرآن مجید قیامت تک کے لئے معتبر آسمانی کتاب قرار دی گئی اس طرح ان دونوں سے حاصل ہونے والی شریعت قیامت تک قائم و دائم

رہنے والی شریعت ہوئی اور ان دونوں سے حاصل ہونے والا دین قیامت تک رہنے والا دین ہوا اور جب یہ دونوں آخری اور قیامت تک قائم رہنے والے قرار پائے تو ان میں تغیر و تبدل اور فناء کی گنجائش باقی نہیں رہی، ان کے ذریعہ تا قیامت انسانوں کے لئے صحیح شریعت اور صحیح دین جاننے کا موقع باقی رہے گا اور کسی کو کہنے کا موقع نہ ہوگا کہ ہمارے سامنے صحیح دین و شریعت موجود نہ تھی، لہٰذا اب یہ دین صرف یہی نہیں کہ محفوظ ہے اور تا قیامت کام دینے والا ہے بلکہ یہ اپنے ایک ایک جزء کے لحاظ سے بعینہ وہی دین ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل تھا، نماز وہی ہے جو صحابہ کرام پڑھتے تھے اور حضور ﷺ نے پڑھنے کو بتایا تھا اور پڑھ کر دکھایا تھا۔ روزہ وہی ہے جو آپ نے رکھا اور بتایا تھا اسی طرح دوسری عبادات سب اول عہد کی انہی شکلوں میں ہیں جن کو حضور ﷺ نے بتایا تھا اور خود بھی عمل کیا اور آپ کے صحابہ نے کیا تھا، ان کے بعد ان کے دیکھنے والوں نے، پھر ان کو دیکھنے والوں نے کیا تھا، ایمان و اخلاق اور مومنانہ اور منافقانہ و کافرانہ صفات کا جو تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے وہ اسی طرح آج بھی اس میں پایا جاتا ہے اور اسی طرح پڑھا اور سمجھا جاتا ہے جس طرح عہد اول میں پڑھا اور سمجھا جاتا تھا، اس محفوظیت اور بقاء کامل کی صورت میں دین کے مختلف معاملات اور اعمال کے انجام دینے میں آج زمانہ کے طویل ہو جانے پر اگر کوئی فرق ملے گا تو وہ صرف اخلاص نیت اور جذبہ ایمانی کا ملے گا، یہ وہ بات ہے جو ایمان کے فرق کے لحاظ سے ایک شخص میں دوسرے شخص کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے، اس کی بنا پر جس میں جذبہ اور ایمانی کیفیت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی اس کی عبادت درجہ قبول تک پہونچے گی اور یہ کیفیت جتنی کم ہوگی اتنی ہی وہ عبادت نا قابل قبول ہوگی۔

قرآن و حدیث کی ہدایات کے مطابق عبادات و اعمال کی شکلیں اور طریقہ سب عہد اول سے متعین ہو چکے ہیں اور ان پر عمل کرنے والوں کے عمل میں نظر آتے ہیں اور اگلوں کو دیکھ کر پچھلوں میں منتقل ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کے ارشادات سے ان کے صحیح شکل میں رہنے کی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔

قرآن و حدیث کے باقی رہنے کا یہ اثر ہے کہ دین اسلام پورا پورا اپنی تفصیلات کے ساتھ باقی ہے اور یہ بات صرف دین اسلام کے ساتھ مخصوص ہے ورنہ دنیا میں اس وقت کوئی دین اپنی اصلی شکل میں

باقی نہیں ہے، کیونکہ کسی دین کی صحت کی نگرانی کے لئے اس کی شریعت کو تفصیل سے بتانے والی کوئی اولین کتاب اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہے۔

قرآن مجید کی اس اہمیت کے ساتھ کہ وہ دین اسلام کے بقاء و حفاظت کا تا قیامت ذریعہ ہے اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے، قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہے، ایک تو ہر آسمانی صحیفہ میں رد و بدل ہوتا رہا ہے، پھر اس کو ایک زبان سے دوسری زبان میں دوسری سے تیسری میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور ترجمہ میں اصل اپنی صحیح حالت میں منتقل نہیں ہو پاتی اس طریقہ سے صاحب کلام کے تقدس کی کیفیت بھی ترجمہ شدہ کلام میں باقی نہیں رہتی ہے۔

لیکن قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جو خود اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے استفادہ کے لئے انسانی الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے تاکہ انسان اس کو سمجھ سکے اور اپنی زبان سے اس کو ادا کر سکے، اللہ رب العالمین کا کلام ہونے کی وجہ سے اس کو عظمت و تقدس کا اس کے لائق مقام حاصل ہے اس کے اس اعلیٰ مقام کو کہیں تو اس طرح بتایا گیا ہے کہ "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، یہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے ہدایت ہے، اور کہیں فرمایا "لَايَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" (اس کو نہیں چھوئے مگر پاکیزگی والے لوگ) اور کہیں فرمایا کہ "إِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ الخ۔ (اس کو ہم نے قدر کی رات میں اُتارا اور جانتے ہو کہ قدر کی رات کیا ہے، قدر کی رات ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس میں فرشتے اور رُوح القدس اُترتے ہیں اور یہ سلسلہ ساری رات فجر کے طلوع ہونے تک رہتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس کو بندوں کی ہدایت کے خاطر اتارا ہے اور اس کو انسانی الفاظ میں اتارا ہے، کیونکہ انسانوں کو بات سمجھانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ الفاظ ان آوازوں کو کہتے ہیں جو معین معانی و مطالب کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ان کی زبانوں کے الفاظ کہے جاتے ہیں عربوں کی زبان کے الفاظ ان کے اپنے طریقہ کے ہیں جو عربی زبان سے موسوم ہیں قرآن مجید انہی کے الفاظ میں اتارا گیا۔

زندگی کے مختلف مطالب کو سمجھانے کے لئے ان الفاظ کا جاننا ضروری ہوتا ہے جن سے وہ

مطالب ادا ہوتے ہیں، انسان اپنی تمام ضرورت کی باتوں، بلکہ حال و کیفیت کو بتانے اور انہی الفاظ میں باتوں کو پہونچانے، کسی امر کی طرف توجہ دلانے اور اپنا تاثر ظاہر کرنے کے لئے اپنی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتانے اور سمجھانے کے لئے انہی کے الفاظ میں اپنا کلام اتارا ہے، مخاطبین اولین چونکہ عرب تھے اس لئے عربی میں اپنا کلام اتارا، یہ کلام جن الفاظ میں اتارا گیا ان الفاظ کے مطالب سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کو بہت خوبی کے ساتھ نہیں سمجھا جاسکتا، قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے والے اس کو اتنا ہی سمجھتے اور سمجھا سکتے ہیں جتنا اچھا وہ اس کے الفاظ کے مطالب کو سمجھتے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مد ظلہ کو عربی زبان کے الفاظ و تعبیر کو سمجھنے کا اعلیٰ ادبی ذوق حاصل ہے۔ وہ قران مجید کی آیات کی تشریح کرتے ہوئے ان کے بعض الفاظ کی ایسی دلنواز و دل گداز تشریح و وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کیفت سے آشنائی ہوتی ہے جو لفظ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیت سے بڑی مطابقت رکھتی ہے، مولانا مد ظلہ کی یہ خصوصیت بڑی امتیازی خصوصیت ہے جو کم اہل علم میں پائی جاتی ہے۔

مولانا کی اس خصوصیت کا اظہار ان کی بہت سی تقریروں اور مضامین میں مختلف آیات کی تشریح میں ہوتا ہے جو بڑا معنی خیز اور ذہن کشا اور دلنواز ہوتا ہے۔

مولوی رسال الدین ندوی نے مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی رہنمائی میں ایسے مضامین و خطابات کا ایک انتخاب کیا ہے جن میں مختلف آیات کی تشریح مولانا مد ظلہ نے اپنے نہایت عالمانہ انداز اور زبان و ادب کی نبض شناسی کے ساتھ کی ہے، مولوی رسال الدین صاحب ندوی نے اس طرح ایک بہت اہم کام انجام دیا ہے جو دین کی روح اور قرآن مجید کی معجز بیانی کا ایک موثر عکس پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور برکت دے۔ آمین۔

محمد رابع حسنی ندوی

۲۵/۱۲/۱۴۲۰ھ

باب ۱

تعارف و ہدایات

❖

قرآن کے مطالعہ اور تفہیم کو زمانہ کے محدود پیمانوں کا پابند نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ زمانے آتے جاتے رہتے ہیں، غور و فکر کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں، اشیاء کی قدر و قیمت کو بھی کبھی قرار نہیں۔ یہ چڑھتی اُترتی رہتی ہے، ایک زمانہ میں جو نظریہ پیدا ہو یا جو اصطلاح وضع کی جائے، جائز نہیں کہ اسی نظریہ یا اصطلاح کو اگلے زمانہ یا اگلے پر بھی جوں کا توں منطبق کر دیا جائے۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہے، مستقل ہے، اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے، علوم انسانی کا پورا خزانہ اور اس کے سارے نظریات ریت کے پھسلتے ہوئے ٹیلے کی مانند ہیں، جو بکھرتا بھی ہے اور پھیلتا بھی، سمٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی، اس پر کسی چیز کی بنیاد رکھنا درست نہیں، پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ:

قرآن اپنے بلند آسمانی مقام اور اپنے مستقل مضبوط اور ابدی بنیادوں سے گر کر ریت کے اس بے ثبات ٹیلے پر آ رہے؟

(منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین)

میرے مطالعۂ قرآن کی سرگزشت

الحمدلله نحمده ونستعینه ونتوکل علیه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهده الله فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهد ان لااله الاالله وحده لا شریك له ونشهد ان محمدا عبده ورسوله صلی الله تعالیٰ علیه وعلے اله واصحابه وسلم تسلیما کثیراً کثیراً.

اعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم.

اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَاءُ وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ.

قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے

قرآن مجید کے معجزات میں سے جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں کسی تقریر کے موقع پر یہ طے نہ کر سکا کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں گا اور مجھے آج کیا کہنا ہے اور قاری نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کے سننے سے پہلے وہ آیتیں مجھے سنائی جا رہی ہیں اور ان آیتوں کا

انتخاب میرے لئے کیا گیا ہے، مجھے اپنے غیر ملکی دوروں میں بھی اس کا تجربہ ہوا کہ دن بھر کی مصروفیتوں اور نقل و حرکت میں اس پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، کہیں تو موضوع کا تعین ہو جاتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا تو میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ وقت پر رہنمائی فرمائے گا، چونکہ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو عارفین "وارد" کہتے ہیں، یعنی ایک عزیز مہمان جس کا ورود ہوا ہے، اس میں اپنے ارادہ اور انتخاب کو کوئی دخل نہیں۔

مطالعۂ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز

میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں قرآن شریف کا ایک حقیر اور ادنیٰ طالب علم ہوں، میری علمی زندگی قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاد عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوقِ قرآنی ملا تھا(۱)۔ وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقش جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا، جو درد میں ڈوبی ہوئی تھی، یہ میری خوش نصیبی تھی، اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے۔

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا گیا کہ نماز پڑھاؤ اور حضور ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" مستقل مضمون۔

عرض کیا کہ ابو بکرؓ کو اس سے معاف رکھا جائے کہ وہ "رجل بکاء" ہیں جب وہ قرآن شریف پڑھنے لگتے ہیں تو پڑھ نہیں سکتے، ان پر گریہ غالب ہو جاتا ہے اور لوگ سن نہیں سکتے ہیں اور یہی شکایت کی تھی مشرکین قریش نے جب حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کی اجازت دی گئی اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی، جب تک کہ وہ سرّی نماز پڑھتے رہے تو لوگ وہاں جمع نہیں ہوتے، لیکن جب وہ قرأت کرنے لگے اور مرد و عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پھر وہ رقت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے لگے تو پتھر بھی موم ہونے لگے تھے اور دلوں پر ایسا اثر ہونے لگا کہ قریش کو یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں مکہ معظّمہ کی زندگی میں تہلکہ نہ مچ جائے اور زمام کاران کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے، اصل میں قرآن کا مزاج ہی یہی ہے کہ درد کے ساتھ، ایمانی حلاوت کے ساتھ پڑھا جائے۔ حدیث میں آتا ہے "اَلْإِيْمَانُ يَمَانٌ وَالْفِقْهُ يَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ" یہ میری خوش نصیبی ہے کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا وہ رقیق القلب تھا، دل دردمند رکھتا تھا اور ہم لوگوں کو حسرت رہتی تھی کہ وہ دیر تک قرآن شریف پڑھیں اور ہم سنیں، وہ ہمارے محلّہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔ شاذ و نادر کبھی ایسی نوبت آتی تھی کہ وہ پوری سورہ پڑھ سکیں، پڑھنا شروع کیا کہ گریہ طاری ہوا، آواز بھرّا گئی، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا، انھوں نے مجھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں پڑھائیں، توحید کی صورتیں خاص طور پر انھوں نے مجھے پڑھانی شروع کیں، سورہ زمر سے شروع کیا، پھر وہ وقت آیا کہ زبان و ادب کی تعلیم غالب آگئی اور اسی میں مشغول ہو گیا، لیکن قرآن مجید کا جو ذوق تھا وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتا تھا اور اثر کرتا تھا۔

اس کے بعد جب میری تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں، پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علیؒ سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرانی زندگی تھی جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنّت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو "برکت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا۔ میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ مولانا مدنیؒ اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے اور علوم و فنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں، مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے اور وہ تحریک کا زمانہ تھا لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ اور علوم قرآن

اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت

سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں
ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی برِ اعظم میں بھی کوئی ایسا شخص
نہیں ملا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ
عربی زبان و ادب اور بلاغت اور اعجازِ قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع و عمیق تھا، پھر
مولانا حمید الدین فراہیؒ (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہ کر ان کی گفتگو،
ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعۂ قرآن سے پورا استفادہ کیا، مجھے یاد ہے کہ ایک بار
ہم لوگ دار المصنفین گئے ہوئے تھے تو انھوں نے سورۂ جمعہ پر تقریر کی، میں نے
ایسی عالمانہ، ایسی محققانہ اور ایسی نکات سے بھری ہوئی تقریر ابھی تک نہیں سنی تھی،
کاش کہ وہ محفوظ ہو جاتی۔ تو مجھے سید صاحب سے مختصر استفادہ کا موقع ملا، پھر جب
دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد میرا انتخاب ہوا تو خاص طور سے قرآن مجید کا
درس میرے سپرد ہوا، وہاں قرآن کے درس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو متن
قرآن پڑھایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ غالباً دار العلوم ندوۃ العلماء ہی سے شروع ہوا، پھر
اور مدارس میں اس کی تقلید کی جانے لگی اور یہی صحیح طریقہ ہے کہ ابتدا میں متن کو
سامنے رکھ کر پڑھایا جائے بغیر کسی تفسیر کی مداخلت کے، استاد تیار ہو کر آئے اور وہ
اپنا مطالعۂ قرآن پیش کرے، تو مجھے کئی سال تک قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا،
تفسیر بھی پڑھائی لیکن زیادہ متن قرآن پڑھایا، جو مضامین میرے سپرد ہوئے تھے ان
میں سب سے زیادہ اہم تفسیر والا مضمون تھا، میں نے اپنا تعارف اس لئے کرا دیا کہ
آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ
نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے ؎

"آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم"

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے، میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے، اور میں تاریخ کو قرآن مجید ہی کی تفسیر سمجھتا ہوں۔(۱)

(۱) تلخیص از "حدیث پاکستان" صفحہ ۱۴۶ تا صفحہ ۱۵۲۔

قرآن مجید کا اعجاز

ہم اگر غنی ہیں تو اسی قرآن مجید کے خزانۂ عامرہ سے، قرآن مجید کے مطالعہ سے کچھ موتی ہاتھ لگ جائیں تو ہم آپ کو پیش کریں، یہ انسانیت اور آدمؑ کے پورے کنبے کو دینے کے لئے کافی ہے۔

بڑے بڑے فرمانرواؤں، سرمایہ داروں اور دولت مندوں کو دینے کے لئے اگر کوئی چیز ہے اور جو اضافہ کر سکتی ہے، دنیا بدل سکتی ہے، قسمت چمکا سکتی ہے، وہ قران مجید کی بھیک ہے۔

قرآن مجید تحت الثریٰ سے اُٹھا کر افلاک و ثریا پر پہنچا سکتا ہے، اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، ان کو منھ کے بل گرا دیتا ہے۔ یہی قرآن مجید جس نے عرب کے خانہ بدوشوں، صحرا نشینوں کو جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا تھا نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ کہاں سے کہاں پہنچادیا، جو ساربان تھے ان کو جہانبان بنادیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے بدوؤں کو، خانہ بدوشوں کو جن پر دنیا کو

توجہ بھی نہ ہوتی تھی۔

"جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا"

بنا دیا انھوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج کو پاؤں سے روندا اور ان کے تختِ سلطنت پر ایسے بے تکلف بیٹھے جیسے بوریئے پر بیٹھتے ہیں ؎

در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت و آفرید

ماند شبہا چشم او محرومِ نوم　　تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

غارِ حرا میں ایک کملی پوش نے چند راتیں گذاریں، ایک قوم پیدا کر دی، ایک آئین دیا، ایک حکومت بنا دی، اس کی آنکھیں چند راتیں نیند سے محروم رہیں لیکن اس کی قوم تختِ خسروی پر سونے کے قابل ہو گئی، اس نبی اُمیؐ کے غلام قیصر و کسریٰ کے تخت پر قابض ہو گئے۔

قرآن مجید مٹی کو اکسیر بناتا ہے، اور جو اس کی ناقدری کرتا ہے، وہ اکسیر ہوتا ہے تو اس کو مٹی میں تبدیل کر دیتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بے لاگ قانون ہے، یہ دو دھاری تلوار ہے، اگر اس کا استعمال صحیح نہیں ہوا، ناقدری کی گئی تو قوموں کا کام تمام کر سکتی ہے، اللہ کا قانون بے لاگ ہوتا ہے اور ہر غیور قانون کسی حد تک بے لاگ ہوتا ہے، ہر باعزت شخص کی بات کی لاج ہوتی ہے، احترام ہوتا ہے، حکومتوں کا قانون جب نافذ ہو جاتا ہے تو اس کا احترام لازمی ہو جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) تحفۂ انسانیت ص ۱۴۳ تا ص ۱۴۵

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَیَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ.

"اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ ان کو ہدایت دیتا ہے
جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔(سورہ شوریٰ۔ ۱۳)

اجتباء خاص، ہدایت عام

اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقامِ اجتباء اور دوسرے ھدایت، اجتباء کے لئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے "اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَاءُ" سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت و اجتباء کا درجہ عطا کرے، لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے۔ "یَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ" وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اور جن میں انابت کی، تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستہ پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں انابت کی صفت پائی جائے "یَھْدِیْ

اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ" میں اسی ٹکڑے پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے، یعنی وہ عقائد جن پر ہر شخص کو ایمان لانا چاہئے اور سمجھنا چاہئے اور قرآن سے اخذ کرنا چاہئے، اس کے متعلق تو قرآن مجید کا اعلان ہے کہ "بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْن" (روشن اور واضح عربی میں ہے) اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرْ"، ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہو سکتا

کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت کے لئے کیا شرائط ہیں اور توحید و رسالت اور معاد کا قرآنی تصور کیا ہے؟ قرآنی عقیدہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات مل سکے؟ اس کے لئے قرآن مجید آسان ہے اور کسی کو یہ کہنے کا یہ عذر نہیں کہ ہم قرآن مجید سے ان باتوں کو سمجھ نہیں سکے، اور قرآن ہمارے لئے حجت نہیں، توحید کے بارے میں واضح سے واضح، صریح سے صریح، طاقتور سے طاقتور دوٹوک بات جو کہی جا سکتی ہے قرآن مجید میں موجود ہے، قرآن مجید پڑھ کر آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مشرک نہیں ہو سکتا۔ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، بے عمل ہو سکتا ہے، وہ فسق کی راہ اختیار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک توحید و شرک کا تعلق ہے تو قرآن مجید بالکل سورج کی طرح روشن اور سورج کیا چیز ہے اس میں کسی قسم کے

اشتباہ کی گنجائش نہیں، اور جہاں تک رسالت کے عقیدہ کا تعلق ہے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ انبیاء کیا ہیں؟ ان کے ذمہ کون سی چیز سپرد کی گئی؟ ان کو کیا حکم ہوتا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی سیرت کیسی ہوتی ہے؟ ان کی زندگی کیسی پاکبازانہ اور بلند ہوتی ہے؟ یہ قرآن مجید میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے، وہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں، وہ شبہوں کو بھی دور کرتے ہیں، آپ سورۂ اعراف پڑھئے، سورۂ ہود پڑھئے، سورۂ شعراء پڑھئے، اس میں ایک ایک نبی کا نام لے کر تعارف کرایا گیا اور ثبوت دیا گیا ہے۔

ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے

ہدایت کے لئے قرآن مجید آسان ہے، اس میں کہیں کوئی شبہ نہیں، لیکن جہاں تک اس کے علوم کا تعلق ہے، اس کے رفیع و دقیق مضامین کا تعلق ہے، اس میں کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سب غلط ہے، قرآن کے بارے میں سب سے الگ، منفرد و شاذ رائے قائم کرنا بڑی خطرہ کی بات ہے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قول ہے "**ای سماء تظلنی وای ارض تعلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم**" اے اللہ! "کس آسمان کے نیچے پناہ لوں گا اور کس زمین پر چلوں گا اگر میں کتاب اللہ کی آیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہدوں جس کی کوئی بنیاد، کوئی تحقیق نہیں"۔ اور قرآن کے بارے میں صحابۂ کرام کا یہ عام رویہ تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی لفظ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے کیا معنی؟ اور پھر خود ہی کہہ دیتے کہ "**ثکلتك امك یا عمر**" عمر تیری ماں

تجھ پر روئے، اگر تجھے اس ایک لفظ کے معنی نہیں معلوم تو کیا غضب ہوا"، صحابۂ کرامؓ کا اندازِ فکر بتاتا ہے کہ پورے قرآن پر حاوی ہونے کو وہ نہ تو ممکن سمجھتے تھے اور نہ ضروری۔ میری یہ جرأت معاف کی جائے اور وہ یہ کہ قرآن کی جو اصل روح، اصل مدعا اور اصل مقصد ہے وہ حاصل ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے ادب و خشوع کا، ہمیں بہت سی چیزوں کی حقیقتیں معلوم نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا پورا فائدہ پہنچا ہے، اگر کسی شخص کو قرآن مجید کے حقائق و مطالب معلوم نہیں یہاں تک کہ پورے الفاظ کے معنی بھی معلوم نہیں، لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، خشیت ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے جو اللہ نے فرمائی "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ"

اس کا حال یہ ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ لرز جاتا ہے اور اس کا رواں لرز جاتا ہے، کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہدایت کے آخری مدارج تک پہنچ جائے اور اس کو قرب بالقرآن حاصل ہو، حدیث میں آتا ہے کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ قرآن مجید پڑھیں گے اور بہت تکلف سے پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نہیں اترے گا، تو جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بڑے سے بڑا آدمی اس کی وسعت کے سامنے لرزہ بر اندام رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اللہ کی ہدایت اور توفیق کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

افادہ اللہ کی طرف سے

پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ افادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت سے اور کلامِ ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ قرآن مجید کو نوافل میں پڑھے اور یہ تصور کرے کہ جیسے قلب پر اسی وقت نزول ہو رہا ہے اور اس کا لطف لے اور اس میں گم ہو جانے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید دماغی زور آزمائی کی چیز نہیں ہے کہ اپنا پسندیدہ مطلب قرآن مجید سے زور آزمائی کر کے نکالا جائے۔

تیسری بات یہ کہ دورانِ مطالعہ جو مطلب و معانی سمجھ میں آئیں تو یہ کہے کہ میری ناقص سمجھ میں یہ بات آئی ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے اور یہ دعویٰ ہرگز نہ کرے کہ آج تک قرآن کو کسی نے سمجھا نہیں، میں نے ہی سمجھا ہے، یہ بالکل صحیح نہیں ہے، اور میں نے بارہا کہا اور لکھا بھی ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برس میں نہیں سمجھا سکا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے۔ وہ تو کہتا ہے "لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ، اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ قُرْآناً عَرَبِیّاً لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ" اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت آج تک کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمنار میں اس کی اختتامی تقریر میں، میں نے کہا تھا کہ اہلِ علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا، اس کے نتیجہ

میں ہمارا خیال یہ ہے...... میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں...... لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائجِ فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں۔ قرآن مجید کے سلسلہ میں آتا ہے کہ اس کا نیاپن، تازگی پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہا نہیں تو اگر آپ کو عمرِ نوحؑ بھی ملے اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو ہر روز نئے نئے معانی کھلنے لگیں۔ ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور اس کے بعد ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

میری ذاتی کتاب

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو اپنی کتاب سمجھا جائے، یہ کتابِ ہدایت ہے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہوگا جب کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہوگی پہلے اپنی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے پھر میں دوسروں سے کچھ کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت بنے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے، حالانکہ صحابۂ کرامؓ

قرآن پڑھتے تھے اپنی اصلاح کے لئے۔ ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی۔

یہ چند باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھیں وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ "یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ" کے میدان میں جہاں تک ہم کوشش کر سکتے ہیں کریں، اللہ جس کو چاہے مقامِ اجتباء تک پہنچائے ہم اس کے مکلّف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزلِ مقصود پر بھی پہونچائے گا، ہم میں ہدایت کی طلب، اپنی احتیاج کا احساس اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہئے۔ اسی کے مجموعہ کا نام "انابت" ہے۔ میں دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.(۱)

---

(۱) ماخوذ از حدیث پاکستان ص ۱۴۶ تا ص ۱۵۷

پیغامِ ہدایت

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً○ قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ. قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ○ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ○ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا. اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ○ قَالَ یٰاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ. فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ، وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَاكُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ○

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا:- میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں! فرشتوں نے عرض کیا:- کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خوں ریزی کرے گی؟ حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی اور قدوسی کا اقرار کرتے ہیں! (تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے) اللہ نے کہا میری نظر جس حقیقت پر ہے تمھیں اس کی خبر نہیں! (پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا ظہور میں آگیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لئے تو اللہ نے فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیئے اور فرمایا:- اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتاؤ ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا:- خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لئے ہیں ہم تو اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے! علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت ہے! (جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو) حکمِ الٰہی ہوا: اے آدم! تم (اب) فرشتوں کو ان

(حقائق) کے نام بتادو۔ جب آدم نے بتادیئے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان وزمین کے غیب مجھ پر روشن ہیں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے تھے وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں ہے! (سورہ بقرہ: ۳۰ تا ۳۳)

ہم آپ سب قرآن مجید کے اس مکالمہ کو پڑھتے ہیں، جس کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے، جو خدا اور اس کے فرشتوں کے درمیان ہوا، جب خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ نسلِ انسانی کے مورث اعلیٰ آدم کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) بنائے گا، اور اس کائناتِ ارض کا چارج دے گا۔ اس کو صحیح رخ پر لگانے، کائنات کی مختلف طاقتوں کو متحد و منظم کرنے، اس کائنات کو با مقصد اور اس زندگی کو با معنیٰ بنانے کے لئے، انسانوں کا خدا سے رشتہ جوڑنے، اور انسانوں کے درمیان اخوت و تعاون کا رشتہ استوار کرنے، اور خدا کی نعمتوں سے اس کے احکام و تعلیمات کے مطابق فائدہ اٹھانے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ اس کے لئے ایسے انسان کو پیدا کرے، جو اقبال کے الفاظ میں ؎ خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات!...... ہو۔

تو فرشتوں نے عرض کیا "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی اور قدوسی کا اقرار کرتے ہیں۔

کیا آپ کے خادم و غلام اس کام کے لئے موزوں نہ تھے؟ ہم تو آپ کی تسبیح و تقدیس میں ہر وقت لگے رہتے ہیں!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا، جس جگہ کے انتخاب کے لئے اس ہستی کا میں انتخاب کر رہا ہوں، وہ کتنا بر محل اور حق بجانب ہے، چنانچہ حضرت آدم اور فرشتوں کا امتحان لیا گیا، پہلے حضرت آدم کی فطرت میں ان ناموں

کے سیکھنے، اور جن کے نام ہیں ان سے آشنا ہونے، ان کی صلاحیتوں، طاقتوں سے واقف ہونے اور ان سے فائدہ اٹھا سکنے کی صلاحیت اور ان کی فطرت میں ان کی ضرورت کا احساس پیدا کیا گیا، ان کے اندر یہ طاقت ودیعت کی گئی کہ ان کا رشتہ اس مادّی کائنات کی چیزوں سے بآسانی قائم ہو سکے، اور وہ ان سے کام لے سکیں۔

پہلے حضرت آدمؑ کو تعلیم اسماء ہوئی۔ "ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلآئِكَةِ" پھر وہ چیزیں ان کو پیش کی گئیں اور انھوں نے صحیح جواب دیئے، ملائکہ کے سامنے لایا گیا، تو انھوں نے اپنی شان کے مطابق اس کا اعتراف کیا کہ ان کا علم خدا کی تعلیم کے اندر محدود ہے۔ اور ان کو صرف اپنے فرائض منصبی کا علم ہے، "قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ" تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے نائب بن کر اس کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جس ہستی کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

فکر انگیز مکالمہ

قرآن مجید نے یہ ایک بڑا معنی خیز و فکر انگیز مکالمہ نقل کیا ہے، جو تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان ہوا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔

پھر فرمایا گیا:-

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا.

اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس دنیا کا جو کچھ ضروری علم دیا گیا ہے، اور اس مادی دنیا سے اس کا جو تعلق ہے، اور حیات و کائنات سے نفع اٹھانے کی اسے جتنی طاقت و صلاحیت دی گئی ہے، وہ اسے خلافتِ الٰہی کے نتیجے میں ملی ہے۔ اور یہ سب اس کی ماتحتی نہ کہ خود مختاری کی حیثیت سے ملی ہے۔ اور اس منصبِ خلافت کے طفیل ہے۔ جو ملائکہ کے بجائے اسے دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اشارۃً کہا گیا:۔

وَأَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ. اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں تمھیں اس نے خلیفہ بنایا ہے۔ (سورۃ الحدید-۷)

قرآن مجید خلافتِ الٰہی کو بڑی ذمہ داری کی چیز سمجھتا ہے جو عدل و رحمت اور سخت محاسبے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور خلافت و خود مختاری کا فرق بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، "خلیفہ" ہمیشہ اپنے مالک سے مربوط اور اس کا تابعدار، ذمہ داری میں امانت دار، اپنے ماتحتوں کا ہمدرد، اپنے مالک و آقا کا شکر گزار اور ہر فضل و کرم اس کی طرف منسوب کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور نہ قوت و حکومت اسے آپے سے باہر کرتی ہے۔

لیکن مغرب نے اس حقیقت کو بھلا دیا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف علم و تحقیق کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی سامنے آئی، اور یہ کسی ایک فرد یا چند افراد یا کسی ایک فکر و فلسفہ کی بھول نہ تھی۔ بلکہ پوری علمی دنیا اور عالمی قیادتوں کی بھول تھی۔ جس کے ہاتھ میں انسانیت کا مستقبل اور دنیا کے رجحانات تھے۔ اس طرح یہ بڑی بدبختانہ بھول اور بہت بھاری غفلت و جہالت تھی، جو تاریخ کے اسٹیج پر ظاہر ہوئی۔ اور ایسی غلطی تھی جس نے غلطیوں کے بہت سے طویل دور

پیدا کردیئے۔ کسی دانشور نے صحیح کہا ہے کہ "غلطی سے زیادہ کسی اور مخلوق کی افزائش نسل میں نے نہیں دیکھی"۔ دنیا ابھی تک اس خط مستقیم سے انحراف کے نتائج بھگت رہی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ (آدم کو عطائے خلافت اور علم کی تعلیم کا واقعہ سنا کر) عاقل انسانوں کے لئے قائم کیا تھا۔

ان آیات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہاں پر انسان خدا کا نائب ہے، انسان یہاں پر اصل نہیں، وہ Original حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ وہ خدا کا نائب ہے، خدا کا منشاء پورا کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا ہے......!

اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا نائب ہے تو اسے خدا کا منشاء معلوم کرنا چاہئے جو پیغمبروں کے ذریعہ اور پیغمبروں کے لائے ہوئے صحیفوں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اُس کو اپنے اندر اُن صفات کا پَر تو پیدا کرنا چاہئے۔ وہ خدائے رب العالمین ہے۔ (سارے جہانوں کا پروردگار ہے) رحیم و کریم (نہایت رحم والا عزت والا) ہے۔ عادل و حلیم (منصف اور بردبار) ہے۔ رحمٰن و رحیم (بے حد مہربان نہایت رحم والا) ہے۔ اس لئے خدا کے دیئے ہوئے علم کو، اس کی ربوبیتِ عامہ، رحمانیت تامہ اور عدلِ کامل کے مطابق استعمال کرے۔

اگر اس علم کا استعمال نفسانی و شیطانی اغراض کے لئے کیا گیا تو یہ "خلافتِ الٰہی" کے مقصد و منصب کے ساتھ غداری اور اپنے مورثِ اعلیٰ (آدمؑ) کے ساتھ بے وفائی و ناخلفی ہوگی۔(۱)

---

(۱) "تعمیر حیات" شمارہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۵ء جلد ۲۳ اور "انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار" ص ۵۸ تا ص ۶۱ سے مشترک اخذ و تلخیص۔

ہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء و مرسلین ہیں

وَقَالُوْا الْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا، وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰہُ،
لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ. (سورہ اعراف: ۴۳)

قرآن مجید فرماتا ہے کہ جنت تک پہونچنے والے خوش نصیبوں نے کتنی سچی بات کہی کہ "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا" سب شکر خدا کا ہے جس نے ہم کو یہاں (جنت) تک پہونچایا۔ اس میں انہوں نے ایک بڑی حقیقت بیان کی۔ وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰہُ، ہم (اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت، کسی علمی مہارت اور ذاتی تلاش و جستجو سے) اس مقام تک نہیں پہونچ سکتے تھے اگر خدا کی رحمت اور رہبری ہماری یاوری نہ کرتی۔

ہم جو یہاں تک پہونچے، عقل و دانش کی راہ سے نہیں پہونچے، تجربہ کی راہ سے نہیں پہونچے، اشراقیتِ نفس کشی اور ریاضت و مجاہدہ کی راہ سے نہیں پہونچے، فلسفہ و حکمت کی راہ سے بھی نہیں پہونچے۔ پہلے تو انھوں نے اجمالاً کہا ہے وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰہُ، (ہماری رسائی یہاں تک نہ تھی اگر خدا ہمیں یہاں تک نہ پہونچا دیتا)

پھر انھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ خدا ایک ایک کی ہدایت کے لئے زمین پر نہیں اترتا، اور وہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر راستہ پر نہیں لگاتا، لیکن خدا کے پہونچانے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے، تو اس کا ذریعہ کیا ہوا؟ "لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالحَقِّ" "ہمارے رب کے قاصد لے کر آئے۔"

یعنی اس کا ذریعہ پیغمبروں کی بعثت اور ان کی ہدایت و رہبری ہے، وہی دنیا میں اللہ کا پیغام، ہدایت و نجات کا سامان، اور منزلِ مقصود کا نشان لے کر آتے ہیں، اور وہی گم کردہ انسانیت اور بھٹکے ہوئے افراد بنی آدم کو راہ پر لگاتے اور منزلِ مقصود پر پہونچاتے ہیں۔

جانِ سخن یہ ہے کہ خدا کے ایلچی اور سفیر حق لے کر نہ آتے تو ہم یونہی بھٹکتے رہتے اور جنت کے بجائے ہمارا کوئی دوسرا مقام ہوتا۔

تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جس چیز نے ہم کو اس قابل بنایا، وہ چیز دانشوروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں اور تجربہ کاروں سے اخذ کی ہوئی نہیں ہے، پیغمبروں سے اخذ کی ہوئی ہے، اور اس کا کوئی ذریعہ نبوت و رسالت اور اس کے حاملین (انبیائے کرام) کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کو قبول کرلیا تو اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں سے، ان سعادتوں اور صداقتوں سے فیضیاب اور بہرہ اندوز ہوں، اور دوسروں تک بھی ان کو پہونچائیں۔

ہم داعی یا مبلغ ہوں، یا دین کے شارح یا ترجمان، ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیائے کرامؑ سے اخذ کی ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی۔

یہ رہبر کامل اور فرستادۂ خدا، انبیاء و مرسلین ہیں، جو انسانوں کی رہنمائی کے لئے دنیا میں آتے رہے۔ اور گم کردہ اور حیران و سرگرداں انسانی قافلوں کو اپنے اپنے وقت اور زمانہ میں خدا تک پہونچاتے اور جنت کا مستحق بتاتے رہے۔ تنہا انہیں کے ذریعہ صحیح معرفتِ الٰہی، مقصد تخلیق کا علم اور زندگی گزارنے کا صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کا یہی واحد راستہ ہے۔ جو جہالت و ضلالت، سوءِ فہم و غلطئ تعبیر سے محفوظ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے راستے کے سوا معرفتِ الٰہی کا کوئی اور راستہ نہیں، نہ اس سلسلہ میں عقل رہنمائی کر سکتی ہے، نہ تنہا ذہانت کام آسکتی ہے، نہ علم و فن، نہ سلامتِ فکر و حسنِ فطرت، ذہن کی تیزی، قیاس آرائی، تجربہ کاری مدد کر سکتی ہے!

اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کا اظہار اہل جنت کی زبان سے کیا ہے۔ اہل جنت جو صادق القول بھی ہیں، اور یہ ان کے ذاتی تجربہ کا معاملہ بھی ہے۔ اور یہ موقعہ بھی کسی غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کا نہیں۔ تو انھوں نے پہلے تو اس کا اعلان کیا کہ "اگر خدا ہماری ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یہاں (جنت) تک نہیں پہونچ سکتے تھے"۔ "وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللهُ" پھر اس حقیقت کا انکشاف اور اقرار کیا کہ اس ہدایت کا ذریعہ تنہا انبیاء و مرسلین ہیں؛ " لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ"! (بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق بات لے کر آئے تھے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرامؑ کی بعثت ہی کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اللہ کی صحیح معرفت حاصل کریں، اور اس کی مرضی اور اس کے

احکام معلوم کریں، اور ان پر عمل پیرا ہوں، اور اس کے نتیجے میں جنت میں داخلہ ممکن ہوا......!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی ایک عظیم الشان سورہ "الصّافّات" (جس میں مشرکین کی گمراہی، ان کی بداعتقادی، اور اللہ کی طرف ان امور کی نسبت کی تردید کی گئی ہے۔ جو ذات باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہیں) کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:-

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے، اس سے پاک ہے۔ اور پیغمبروں پر سلام، اور سب طرح کی تعریف خدائے رب العالمین کو سزاوار ہے۔

(سورہ الصافات۔ ۱۸۰۔ ۱۸۲)

یہ تینوں آیتیں ایک طلائی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جو ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ کیونکہ جب اللہ نے اپنی ذات کو مشرکین کی لغو اور بیہودہ باتوں سے منزہ فرمایا تو اس کی تکمیل انبیائے کرام علیہم السلام کے ذمہ کی، جنہوں نے خدا کی کامل و تقدیس کو اجاگر کیا، اور اللہ کے صحیح اوصاف بیان کئے۔ اللہ نے ان پر سلام بھیجا، اور ان کی تعریف کی۔ کیونکہ مخلوق سے خالق کے صحیح تعارف اور خالق کے صحیح صفات سے روشناس کرانے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اور ان کی بعثت مخلوق پر احسانِ عظیم، انسانوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ اور اللہ کی ربوبیت، رحمت اور حکمت کا تقاضائے بلیغ ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہوئے فرمایا:-

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

اور ساری تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

اب بھی ہدایت و نجات کا راستہ پیغمبروں کی پیروی، اور اب قیامت تک خاتم

المرسلین سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے اور آپ کی سنت کی اتباع اور آپ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔(۱)

(۱) کاروانِ زندگی حصہ چہارم ص۳۱ تا ص۳۳۔ (۲) تحفہ کشمیر ص۱۴ و ص۴۲۔
(۳) اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار ص۳۶ تا ص۳۹ سے مشترک ماخوذ ہے۔

قرآن کا پیغام

وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوْا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ. (الحشر)

ترجمہ: ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے خدا کو بھلایا تو

خدا نے ان کو ایسا بنادیا کہ وہ اپنے کو بھول گئے۔

انسان کو سب سے زیادہ تعلق اپنی ذات سے ہے، تمام دلچسپیوں کا محور و مرکز انسان کی اپنی ذات ہے۔ گہری نظر رکھئے تو اس کو جس سے محبت ہے اپنی ذات کے لئے ہے جو اس سے محبت کرتا ہے اس سے وہ بھی محبت کرتا ہے، جس کو اس سے نفرت ہے اس میں ہزاروں خوبیاں ہوں اس سے دل کو لگاؤ نہیں پیدا ہوتا، زندگی کی ساری حرکت، چہل پہل دوڑ دھوپ اسی محبت کے دم سے ہے، جہاں جائے گا اسی کا ظہور پائے گا۔ ہر محبت کی تہہ میں اسی محبت کی کرشمہ سازی نظر آئے گی، دنیا کی ہر چیز فراموش ہو سکتی ہے، انسان ہر ایک سے غافل اور مشغول ہو سکتا ہے، لیکن نازک وقت میں اپنی ذات سے غفلت نہیں ہوتی اور کٹھن گھڑی میں جب اولاد، متعلقین، اعزاز واحباب سب فراموش ہو جاتے ہیں اپنی فکر رہتی ہے اور انسان اپنی خیر مناتا رہتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، روزمرہ کا مشاہدہ ہے، فطرت انسانی کا خاصہ ہے، اس کے خلاف اگر دعویٰ کیا جائے تو کان کھڑے ہوتے ہیں، کیا واقعی انسان کبھی اپنے کو بھول جاتا ہے اور اس کو اپنی فکر نہیں ہوتی اور سب کی فکر ہوتی ہے؟ اس کو اپنا ہوش

نہیں رہتا اور ہر بات کا ہوش رہتا ہے، اس کو سارے جہاں کی فکر ہوتی ہے اور اپنی فکر سے غافل ہوتا ہے۔ اس کو سب کی جان عزیز ہوتی ہے، اور اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھوئے پڑا رہتا ہے؟ اور یہ کسی بلند مقصد کے ماتحت نہیں، کسی اصول اور کسی نظریے کے ماتحت نہیں، ایثار و قربانی کے جذبے سے نہیں بلکہ یہ خود فراموشی کے عالم میں اور ایک ذہنی طاعون کے طور پر!

خدافراموشی کی سزا خود فراموشی ہے

قرآن مجید یہی دعویٰ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے۔ جب انسان خدا کو بھلاتا ہے تو وہ یہ دکھادیتا ہے کہ پھر اپنے کو بھولتا چلا جاتا ہے۔ اس کو خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے، زندگی کا انہماک بڑھتا چلا جاتا ہے، ساری زندگی انسان کے گرد چکر لگاتی نظر آتی ہے، مگر انسان کسی اور چیز کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے، مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ذرائع و وسائل مقصود بن جاتے ہیں، اشیاء سے براہ راست ایسی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی ذات بھی بیچ میں سے نکل جاتی ہے، پھر ایک ایسی بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ احساسات ختم ہو جاتے ہیں، لذت و راحت جو دنیا میں ہمیشہ سے بڑے مقصود رہے ہیں، ذہن سے نکل جاتے ہیں، انسان ان سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس محرومی کا احساس اور اس پر افسوس بھی ختم ہو جاتا ہے، خیالی چیزیں حقیقی چیزوں کی جگہ لے لیتی ہیں اور انسانی زندگی عجائبات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے، اور یہ سب اس دور میں ہوتا ہے جب خدا کے بجائے انسان اپنی ذات کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اپنے سوا ہر چیز کے انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ خدافراموشی اور خدا سے یہ بغاوت جتنی ترقی کرتی ہے خود

فراموشی، خود دشمنی، خود کشی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔

تمدن کے شاید کسی دور میں اس آیت کا ظہور اس طرح نمایاں اور صاف طریقے پر نہ ہوا ہو جتنا اس دور تہذیب و ترقی میں، انسان کا اپنی ذات کے معاملات میں انہماک، اپنی ذات سے شیفتگی شاید اتنی کسی زمانے میں نہ پیدا ہوئی ہو جتنی اس زمانے میں، لذت و راحت کے وسائل شاید کبھی اتنے ایجاد نہ ہوئے ہوں جتنے اس دور میں، خود پرستی کا فلسفہ شاید کسی عہد میں ایسا مرتب نہ ہوا ہو اور اس کی اشاعت شاید کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوئی ہو جیسی اس زمانے میں، اپنے سوا ہر چیز کے انکار کا ذوق اور جوش شاید کبھی اتنا عام نہ ہوا ہو جتنا اس موجودہ سوسائٹی میں، لیکن واقعہ اور دن رات کا مشاہدہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مسائل سے سب سے زیادہ غافل ہے؟ اپنے انجام سے سب سے زیادہ بے فکر ہے؟ اپنی ذات سے سب سے زیادہ بے پرواہ ہے؟ حقیقت لذت و راحت سے سب سے زیادہ محروم ہے، زندگی کے ذخیرہ میں اس کا اپنا حصہ سب سے زیادہ کم ہے، وہ روپیہ ڈھالنے کی مشین بن کر رہ گیا جو اپنے ڈھالے ہوئے سکوں سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتی، اس کا حصہ زندگی میں صرف اتنا ہے کہ اس کو اتنا تیل دیا جاتا رہے جس سے وہ چلتی رہے، جذبات واحساسات سے عاری، لذت والم سے محروم، مسرت و کلفت سے بے خبر ایک بے جان مشین ہے۔

وہ تیلی کا بیل بن کر رہ گیا ہے جو ایک مقرر دائرہ کے اندر چکر لگاتا رہتا ہے، کام لینے والے سے چارہ پانی پاتا ہے اور بغیر شکوہ وشکایت کے چکر لگاتا ہے، آج تمدن وسوسائٹی کے اس چکر میں انسان بھی تیلی کے بیل کی طرح پھرکی کی طرح پھر رہا ہے، تمدن کے ضوابط میں جکڑا ہوا ہے، سوسائٹی کے معیاروں کا پابند ہے، دوسروں

کے لئے کماتا ہے، دوسروں کے لئے پہنتا ہے، اور زندگی قائم رکھنے کے لئے اس کو راتب یا راشن ملتا رہتا ہے، وہ ایک قلی بن کر رہ گیا جو دنیا کے اس بڑے کارخانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتا پھرتا ہے، بوجھ ڈھوتا ہے، تمدن کی گاڑی چلاتا ہے اور تھوڑی سی مزدوری پاتا ہے۔ حقیقی لطف ومسرت، اچھی غذا، اچھی ہوا، روح کی شادمانی، دل کے سکون، ضمیر کے اطمینان پیدا کرنے والی معرفت و محنت کی لذت سے محروم ہے اور زندگی کا دھارا تیزی سے بہہ رہا او رتمدن کا چکر اس زور کا چل رہا ہے کہ اس کو ان مسائل پر سوچنے کی بھی فرصت نہیں، جسم اتنا تھکا، دماغ اتنا شل، ذہن اتنا مشغول اور دل اتنا مردہ ہوچکا ہے کہ اس کو اس محرومی اور مدہوشی کا بھی ہوش نہیں، وہ اس دھارے میں تنکے کی طرح بہا چلا جارہا ہے، وہ ایک ایسا سوار ہے جو سواری کے قابو میں ہے، سواری اس کے قابو میں نہیں۔

نے ہاتھ میں عنان ہے نہ پائے رکاب میں

خدافراموشی کی سزا خود فراموشی عجب عبرت ناک ہے۔ لاکھوں، کروڑوں افراد، پوری کی پوری قومیں، بڑی بڑی سلطنتیں اس خود فراموشی، خودکشی کا شکار ہیں، ایک ذہنی طاعون ہے جو سارے عالم پر مسلط ہے، مگر آنکھ نہیں کھلتی، بجائے خداشناسی کی دعوت کے خدا فراموشی کی تلقین بڑھتی جاتی ہے، خدا سے بغاوت کے جھنڈے ہر طرف بلند ہیں، خود پرستی کی جتنی تبلیغ کی جارہی ہے خود فراموشی بڑھتی جاتی ہے، زندگی کی نعمتیں اور قلب وروح کی لذتیں چھنتی چلی جارہی ہیں، مقاصد اٹھائے جاتے ہیں اور وسائل میں الجھادیئے جاتے ہیں، دولت راحت کے لئے تھی، دولت رہ گئی، راحت لے لی گئی اور اس طرح لی گئی کہ اس کا کہیں نشان نہیں ملتا اور اب لوگوں نے

اس کی خانہ پوری بھی دولت ہی سے کرنی شروع کردی، غذائیں اور دوائیں بڑھ گئیں اور صحت سلب کرلی گئی۔ تیز رفتار سواریاں اور وسائل سفر راحت وسہولت کے لئے تھے، اب سرعت ہی مقصود بن گئی اور راحت مفقود ہوگئی، قدرتی دشواریاں دور ہوئیں تو قانونی اور مصنوعی دشواریاں خود پیدا کرلیں اور اپنے اوپر مسلط کرلیں، سفر آسان ہوا تو مقصد سفر مشکل ہوگیا، پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا مشکل تھا اب پہنچنا آسان ہے لیکن منزل ڈراؤنی اور مقصد سفر بھیانک ہے، پہلے ایک شہر کے آدمی کا دوسرے شہر کے آدمی سے بات کرنا مشکل تھا اب بات کرنا آسان ہے لیکن اس بات میں کوئی دلکشی اور دل آویزی نہیں رہی۔ محبت کافور ہوگئی، خون سفید ہوگیا، اغراض کا ہرطرف دور دورہ ہے اس لئے بات کرکے کیا دل خوش ہو، پہلے دور افتادہ اور دور دراز کے لوگ آواز کو ترستے تھے مگر اب آواز سننے سے بیزار اور ریڈیو کے جھوٹ اور پروپیگنڈہ سے عاجز ہیں، غرض یہ کہ مقاصد کی خرابی یا طریق استعمال کی خرابی نے ان وسائل وآلات کو بھی بے کار بلکہ عذاب جان اور بلائے بے درماں بنادیا ہے اور انسانی زندگی بے معنی، بے مقصد، بے روح، بے کیف بے لذت اور بے حس ہوکر رہ گئی ہے۔

قرآن کا پیغام یہ ہے کہ یہ خود فراموشی نتیجہ ہے خدا فراموشی کا، اس کا علاج صرف خدا شناسی اور خدا طلبی ہے۔ فرار کے بجائے واپسی، وحشت کے بجائے انس، انکار کے بجائے اقرار وایمان، بغاوت کے بجائے صلح، اور سرکشی کے بجائے اطاعت وانقیاد، اور خدا سے بھاگنے کے بجائے خدا کی طرف بھاگنے کی ضرورت ہے۔

"فَفِرُّوْا اِلَى اللهِ اِنِّیْ لَکُمْ مِنْهُ نَذِیْرٌ"

(ماخوذ ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ۔ اگست ستمبر ۱۹۹۸ء بحوالہ "صبح صادق" ۱۹۵۲ء)

پڑھو قرآں سمجھ کر اور عمل دل سے کرو اس پر
فنا ہو حق کی مرضی میں، بنو محبوبِ سبحانی

قرآن مجید کے فہم کا دروازہ

"ان علمی تجربات میں اب اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ ...... قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ جب کھلتا ہے جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے اس کلام کے ذریعہ صاحبِ کلام سے ہمکلام ہو، اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے، اور نوافل یا بندگانِ خدا کی صحبت جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں۔ اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہِ راست تعارف وانس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ وہ براہِ راست مخاطب ہے......!

شاعر نے کچھ غلط نہیں کہا کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف !

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی
(میرے مطالعہ قرآن کی سرگذشت۔ نئی دنیا قرآن نمبر)

باب ۲

دعوت وعزیمت

''دعوتِ دین بہت نازک کام ہے، اور اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس کے کچھ حدود مکانی ہیں اور کچھ زمانی۔ اور دونوں انتہائی وسیع اور پھیلے ہوئے، زمانے کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ کسی پیغمبر نے دعوت کا آغاز کیا یا غیر پیغمبر نے اس دعوت کی ابتداء کی اور اس کی انتہا کوئی بھی نہیں ہے، اسی طرح اس کا مقام (مکانی حدود) بھی متعین نہیں کیا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ داعی مشرق میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق منتقل ہو جائے، لہٰذا اگر صرف اہل مشرق کو سمجھانے کا طریقہ اس کو معلوم ہے تو مغرب میں وہ افہام و تفہیم کا کام انجام نہیں دے سکتا، اور اگر وہ صرف اہلِ مغرب کے طبائع اور نفسیات سے واقف ہے تو مشرق میں اس کی دعوت برمحل اور بار آور نہیں ہوگی''۔

(دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب)

دعوت وتبلیغ کے اصول وآداب

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل: ۱۲۵)

حقیقت تو یہ ہے کہ تبلیغ ودعوت کے اصول و ضوابط کی تحدید نہیں کی جاسکتی، اس کا تعلق انسانی فہم و عقل اور بشری اذواق و جذبات، ماحول و معاشرہ پر ہے۔ ہاں عربی زبان کے وہ الفاظ جن کا کسی زبان میں بدل اور نظیر نہیں، ان میں سے ایک لفظ ہے ''حکمت'' اس کے تعارف کے لئے آپ ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالیں، تمام تفاصیل و شروحات کو یہ لفظ جامع ہوگا، یعنی فہم کے مطابق، استعداد کے مطابق، معاشرہ کے مطابق، ماحول کے مطابق، علاقے کے مطابق، طبیعت کے مطابق، ذوق ووجدان کے مطابق، عصری مطالبات ومقتضیات کے مطابق، موضوع کی اہمیت کے مطابق، مخاطب کی عقلی سطح اور نفسیات کے مطابق ان کے افکار و معتقدات کے مطابق ...... گویا کہ ''حکمت'' میں ہر وہ چیز شامل ہوگی جو کسی سے اپنی بات منوانے کے لئے ضروری اور ناگزیر ہوتی ہے۔

میں ایک جگہ محاضرہ دے رہا تھا، مجھ سے سوال کیا گیا کہ دعوت کے اصول و ضوابط اس کے حدود عمل اور دائرہ کار اور عنوانات واصطلاحات کی تعریف و تعیین کر

دی جائے۔ میں نے کہا کہ اس سوال کا حال تو ویسے ہی ہے جیسے ایک شخص نے نوکر رکھا، اس نوکر سے جتنے کام لینے تھے اس نے اس کی ایک فہرست بنا کر اس نوکر کو دے دی ایک دن اس کا آقا گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا، جیسے ہی رکاب میں پاؤں رکھا پاؤں الجھ گیا۔ اور قریب تھا کہ وہ زمین پر آگرے۔ اس نے نوکر کو آواز دی تو اس نوکر نے دور ہی سے وہ پرچی دکھلائی جس میں اس کے کاموں کی فہرست درج تھی، اس نے کہا کہ اس فہرست میں کہاں درج ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہوتے وقت میرا پاؤں رکاب میں الجھے تو تم میرا تعاون کرنا۔ کچھ یہی حال دعوت کے اصول و قوانین کا بھی ہے کہ ہم لفظوں میں اس کی تحدید و تعیین نہیں کر سکتے، ہم خالقِ کائنات کے بندے اور اس کے غلام ہیں، جس چیز لی بھی ضرورت ہو۔ دین اسلام کو جس میدان میں ضرورت ہو۔ اسی کی تکمیل کا نام دعوت ہے۔

البتہ ''دعوت'' کی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد سے واقفیت ضروری ہے۔ قرآن و حدیث پاک کے حکیمانہ اسلوب کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ، تاریخ اسلام کے مجددین کے کارناموں، ان کے طریقۂ کار اور طرز عمل کو بھی نگاہ میں رکھیں، مثال کے طور پر میں قرآن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں جس سے بہت سے اصول و آداب پر روشنی پڑے گی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ. قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّيْ أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْراً. وَقَالَ الآخَرُ إِنِّي أَرَانِيْ اَحْمِلُ فَوْقَ رَأسِيْ خُبْزاً تَأكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ. نَبِّئْنَا بِتَأوِيْلِهِ، إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ○ قَالَ لَا يَأتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهِ إِلَّا نَبَّأتُكُمَا بِتَأوِيْلِهِ قَبْلَ أَنْ يَّأتِيَكُمَا. ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَهُمْ

بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ. مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْئٍ. ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۝ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَائُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ. اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ. ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (سورہ یوسف آیت ۳۵۔۴۰)

ترجمہ:- قید خانہ میں اس (یوسفؑ) کے ساتھ دو غلام بھی داخل ہوئے، ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں" دوسرے نے کہا۔ "میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے اس کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نیک آدمی ہیں" یوسف علیہ السلام نے کہا "یہاں جو کھانا تمھیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا، یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب (علیہم السلام) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے

سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نہیں نازل کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ (سورہ یوسف ۴۰)

دعوت اور حکمت وموعظت

قرآن پاک نے نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اسلوب دعوت کو بیان کیا ہے کہ انھوں نے کس احتیاط، حکمت، دانشمندی، معاملہ فہمی، موقع شناسی کے ساتھ قید خانہ میں دعوت کا کام کیا۔ اس کا خلاصہ ہم ذکر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح دعوت دی؟ تو قرآن پاک نے اپنے معجزانہ اور حکیمانہ اسلوب میں پوری منظر کشی کی ہے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے کوئی سامان خریدتا ہے تو سب سے پہلے مناسب جگہ کا انتخاب کرتا ہے، تاکہ اطمینان خاطر ہو، دھوکہ اور فریب کا خطرہ نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کام جلدی ہو۔ (مثلاً دوا خریدنا ہو) اگر دوکان بند ہو رہی ہو اور وہ شخص اس وقت دوکان پر پہونچے اور سامان طلب کرے تو جواب میں وہ دوکاندار کہے کہ کل تشریف لائیے آج تو معاف رکھئے تو وہ شخص دوبارہ اس دوکان پر کبھی نہ جائے گا۔ اس لئے کہ وہاں تو مریض کی جان جارہی ہے، دوا کی اشد ضرورت

ہے، کل دوا لے جا کر وہ کیا کرے گا، مسئلہ موت و حیات کا ہے کوئی کھیل تماشہ نہیں، لہٰذا کام وقت پر ہونا چاہئے۔

تیسرے یہ کہ وقت کا تعین بھی قابل اطمینان ہو اس کے لئے سکون پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر دوکان پر گاہک آیا تو دوکاندار کہے کہ فلاں کام کرلوں تو سامان دوں گا، چار گھنٹہ بعد آنا فلاں شخص سے ملاقات کرلوں تب سامان دوں گا۔ ایسی صورت میں وہ شخص وہاں سے بھاگ جائے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ شخص مطلوبہ چیز ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ دیگر قابل نفع چیز کا بھی اضافہ کرے اگر ممکن ہو۔

پانچویں یہ کہ طالب کی خرابیوں کو دور کرے مثلاً ڈاکٹر کے پاس بخار کی دوا لینے گئے مگر ہمیں دوسرا بھی مرض ہے مگر ہمیں معلوم نہیں تو ڈاکٹر کا فریضہ ہے کہ بخار کی دوا دینے کے ساتھ اس دوسرے مرض کا بھی ازالہ کرے اور کہے کہ جناب آپ کی پیشانی کے خطوط بتاتے ہیں کہ آپ کو بلڈ پریشر کی بیماری ہے، آپ کا چہرہ بتاتا ہے کہ آپ کا گردہ خراب ہے۔

جن نکات کی جانب میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا یہ تفسیروں اور شروحات میں نہ ملیں گی، یہ قرآن کے عمیق مطالعہ سے اور گہرے لگاؤ سے معلوم ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا وہ آیتیں جن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اگر انہیں پڑھ کر کوئی شخص ایمان لے آئے تو عین تقاضائے بلاغت کلام ربانی ہوگا۔ مثلاً غور کیجئے۔ دو آدمی اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے آئے تو اولاً انھوں نے ان کی دیانت و امانت، علم و آگہی فضل و کمال کے بارے میں ضرور اطمینان کرلیا ہوگا وہ ضرور جان

رہے ہوں گے کہ یہ کوئی اور ہی عالم کے آدمی ہیں۔ نبوت سے وہ تو واقف نہ ہوں گے مگر ایک پیغمبر کے چہرے پر جو نورانیت، تقدس، عصمت و پاکیزگی کے آثار ہو سکتے ہیں۔ اسے انھوں نے ضرور دیکھا اور محسوس کیا ہوگا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ داعی ایسا ہو کہ دل خود اس کی جانب متوجہ ہو۔ اور وہ داعی بھی اپنے طالبین کی جانب زیادہ متوجہ ہوں، چنانچہ ان دونوں قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات میں دلچسپی لی، اور انھوں نے ان کی بھی خاطر خواہ خبر گیری کی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ داعی کا اپنا ایک معیار و تشخص ہونا چاہئے۔ اس کا ایک مخصوص شعار ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہوں۔ داعی کو ہر حال میں اپنا امتیاز برقرار رکھنا چاہئے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ جیل میں داخل ہوتے ہی تمام قیدیوں نے اچھی طرح جان لیا ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مجرم نہیں، یہ ضرور بے خطا ہیں انھیں ظلماً جیل خانہ میں محبوس کیا گیا ہے کیونکہ جیلر چہرے کا رنگ دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ کون عادی مجرم ہے اور کون بے قصور ہے یہ ایک نفسیاتی بات ہے، ایک نظر پڑتے ہی لوگ آپ کے تقدس کے ضرور دل سے معترف ہوئے ہوں گے۔

ساتویں یہ کہ انھوں نے تعبیر پوچھی آپ نے تعبیر بتائی، آخر انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ صاحب علم و عمل ہیں، خواب کی تعبیر جانتے ہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ضرور انھوں نے ظاہری حالت و ہیئت کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہوگا، کیونکہ اس زمانہ میں ڈائری تو نہ تھی کہ جیل میں آنے والوں کے احوال ریکارڈ ہوتے۔

خیر و شر کی تمیز

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں جاہل سے جاہل، پست سے پست انسان میں یہ قوت ودیعت فرمائی ہے کہ وہ خیر و شر کی تمیز کرے، قیافہ شناسی ہی تھی کہ لوگوں نے بھانپ لیا کہ یہ مجرم نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے برجستہ کہا "اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ" یہ لفظ بھی عربی زبان میں نہایت وسیع و عمیق معنوں میں مستعمل ہے جن میں صاحب کمال، صاحب جاہ و جمال، شرافت و نجابت والا، اونچا آدمی وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ فلاں دوکان پر فلاں سودا ملتا ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کسی دوکان پر گئے۔ اور وہاں کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو کہ کون سا سامان ملتا ہے تو صرف شرمندگی حاصل ہوگی۔

...... دوسری بات یہ ہے کہ ہر موقع تواضع و انکساری کا نہیں ہوتا ہے، کوئی شخص کسی علمی موضوع پر گفتگو کرے آپ ہمیشہ تواضعاً ہاں میں ہاں ملائیں، اس کی کسی بات کا جواب نہ دیں تو وہ آپ کو جاہل سمجھے گا۔ حضرت یوسفؑ سے صرف انھوں نے تعبیر پوچھی تھی مگر انھوں نے اپنی علمی سطح، اور مبلغ عقل و فکر کو اجاگر کرتے ہوئے کہا : قَالَ لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ اِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّأْتِيَكُمَا۔ آپ نے گویا انہیں یہ اشارہ دے دیا کہ تمہیں جو سودا مطلوب و درکار ہے وہ میرے یہاں موجود ہے۔

اللہ کی وحدانیت و خالقیت کا درس

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اگر چاہتے تو کوئی وقت مقرر کر دیتے کہ تھوڑی دیر بعد آنا، مگر انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ موقع دوبارہ ہاتھ نہ آئے۔ لہٰذا داعی دوسروں کی دینی ضرورت کو فی الفور پوری کرنے کو غنیمت جانے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے کھانے کا ذکر کیا، کیونکہ جیل کی محدود اور سخت زندگی میں کھانا بڑی مرغوب شئے ہوتی ہے، یہ ایک نفسیاتی جملہ تھا۔ اس سے ان قیدیوں کو ضرور کچھ سکون و اطمینان ہوا ہوگا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کہا تھا۔ کہ کھانا آنے سے قبل میں بتا دوں گا کہ تمھیں کون سا کھانا ملے گا۔ اس پر مستزاد ایک دوسرے مفسر نے یہ لکھ دیا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو داروغۂ مطبخ بنا دیا گیا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے "تاویله" کی ضمیر کھانے کی طرف نہیں بلکہ خواب کی طرف راجع ہے۔ موقع کی نزاکت اس بات کی طالب تھی کہ وہ فخریہ کہتے کہ میں تو تمھاری تعبیر اپنی ذہانت و فطانت اور ذکاوت و فراست سے بتا سکتا ہوں۔ اور اس طرح کے تو میں نے بہت سے معرکے سر کئے ہیں، یہ کون سی بڑی بات ہے، مگر نہیں! انھوں نے ایسا کچھ نہ کہا۔ بلکہ انھیں اپنی ذہانت وفطانت سے مرعوب کرنے کے بجائے توحید کا سچا درس دیا خداوند قدوس کی خالقیت و رزاقیت، اس کی وحدانیت و پاکیزگی کا وعظ کہا۔ وہ بھی ایسا جامع وعظ کہ اگر اس سلسلے میں ایک مستقل ضخیم کتاب تیار کی جائے تو بجا ہے۔

مثلاً انھوں نے ان کے خداؤں کو بُرا بھلا نہ کہا، یا اور دوسرا کوئی سلبی پہلو نہ

اختیار کیا بلکہ ایجابی نقطۂ نظر پر عمل کرتے ہوئے، "ذلکما مما علمنی ربی" یہ تو میرے رب کا سکھایا ہوا ہے، نہ کسی قسم کی کوئی تعریض اور نہ کسی پر کوئی حملہ۔ دوسرے یہ کہ یہ بھی نہ کہا کہ ارے صاحب یہ تو میرے بھائی، چچا اور باپ دادا کا عطا کردہ ہے میرا گھرانہ علمی اور دینی گھرانہ ہے ان کی تربیت ہی کا اثر ہے کہ میں آپ لوگوں کو تعبیر بتانے کے قابل ہوا۔ بلکہ تمام معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور فرمایا "ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" یہ اثباتی پہلو ہے، انھوں نے ان اسماء کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ غالباً اس زمانہ کے لوگ ان ناموں سے پہلے ہی مانوس تھے، یہ اسماء ضرور پہلے سے وہاں پہونچے ہوں گے اور غالباً وہ اس کی ضرور عزت و تکریم بھی کرتے رہے ہوں گے۔ پھر اپنی ذات سے بڑائی اور ترفع کا انکار کیا، اور کہا یہ سب کچھ محض فضل الٰہی ہے اور قرآن نے اس کو ان الفاظ میں ادا کیا: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَشْكُرُوْنَ. یہ خدا کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی لیکن اکثر لوگ شکر نہیں ادا کرتے۔

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور فرمایا۔ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ میرے جیل خانہ کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا و غالب؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھانپ لیا تھا کہ اگر میرا یہ عقیدہ فاش ہو گیا اور بادشاہ کو معلوم ہو گیا کہ میں نیا دین اور نیا عقیدہ رکھتا ہوں اور پھر دوسروں کو اس کی تلقین بھی کر رہا ہوں تو اس کا انجام کچھ زیادہ اچھا نہ ہو گا۔ اس لئے اپنائیت اور رازداری کے انداز میں "صاحب" (ساتھی) کے لفظ سے مخاطب کیا۔ اور اس طرح کے اندیشے شانِ نبوت

کے خلاف نہیں۔

یہاں سلامت ایمانی اور فراست یوسفی نے اشارہ دیا کہ بس یہیں پر ٹھہر جائیں کیوں کہ خطرہ تھا کہ وہ دونوں گھبرا جائیں، اکتاہٹ محسوس کریں۔ اور کہیں کہ ہم تو صرف تعبیر پوچھنے کے لئے آئے ہیں، آپ کی لمبی چوڑی تقریر اور خطاب سماعت کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ خوفناک تعبیر سن کر ویسے ہی طبیعت پریشان ہے اور ابھی تک ہم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ لہٰذا آپ اپنے اس طویل وعظ سے معاف ہی رکھئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان نفسیاتی دواعی کا لحاظ کرتے ہوئے بات کو مختصر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے سلسلے میں ہر چیز کی ایک حد مقرر ہے کہ مضمون و مادہ کتنی مقدار میں ہو، تاریخ کا کتنا حصہ ہو۔ ادب و زبان کی چاشنی کتنی مقدار میں ہو۔ تفہیم اور سلاست کتنی مقدار میں۔ ہر ایک کا ایک کوٹا مقرر ہے ان تمام باتوں کا لحاظ ایک نبی اور ابن نبی نہیں کرتا تو کون کرتا۔ اور تمام داعیانِ اسلام کے لئے بھی اس کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے۔

اس پورے قرآنی ٹکڑے میں دعوت کا اسلوب، طریق کار، حکمت، انداز تخاطب، بالکل مجسم اور ناطق نظر آرہا ہے۔(۱)

(۱) "تعمیر حیات" لکھنؤ ۱۰ر جون ۱۹۹۸ء

دین حق و دعوتِ اسلام

ایک فلک بوس عمارت اور سدا بہار درخت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَاءِ، تُؤْتِىْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ٥

(سورہ ابراہیم۔ ۲۴-۲۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو اور خدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

کسی ملک اور کسی عہد میں بھی دین کا کام کیا جائے، دین کے تعارف کا کام کیا جائے، اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کیا جائے، اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کا کام کیا جائے اور لوگوں کو زندگی اور زندگی کے بعد کے خطرات سے نکالنے کا کام کیا جائے، تو یہ آیت اس کی پوری تصویر کھینچ دیتی ہے۔

اس آیت میں مکانی رقبہ بھی آگیا اور زمانی رقبہ بھی آگیا اور اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آگیا اور اس کے نقطۂ عروج اور جن بلندیوں تک اسلام کی دعوت پہنچ سکتی ہے اس کا ذکر بھی آگیا۔

آپ ایک درخت کی حقیقت پر غور کیجئے ﴿کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ﴾ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اچھا درخت ہو "شَجَرَة طَیِّبَة" ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرط ہے کام کی کامیابی کے لئے، کتنی ہی بڑی ذہانت اور کتنے بھی بُلند مقاصد، کتنے ہی وسیع وسائل، کتنی ہی بڑی جمعیت، کتنی ہی بڑی تنظیم، کتنی ہی اپنے عہد کی علمی و صنعتی ترقیاں سب ساتھ ہوں تو وہ اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مقصد صحیح ہو، دافع اور محرک صحیح ہو اور وہ دعوت بذاتِ خود صحیح ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَةً طَیِّبَةً. کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟

کلمۂ طیبہ ہونا چاہئے

پہلی شرط تو یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ ہو، صرف کلمہ ہونا کافی نہیں، دنیا میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوتی رہی ہے، ادبیات کی تاریخ بتاتی ہے، شاعری کی تاریخ بتاتی ہے، ذہانت و حکمت کی تاریخ بتاتی ہے، یونان کے فلسفہ و منطق کی تاریخ بتاتی ہے کہ لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھ لیا، کلمہ ہونا چاہئے اور اس کے اندر انسان کی ذہانت جھلکنی چاہئے، اس کے اندر مضمون آفرینی ہونی چاہئے، انسان کے مطالعہ کی گہرائی ہونی چاہئے، اظہارِ بیان کی طاقت ہونی چاہئے، دنیا میں زیادہ تر اسی پر زور دیا گیا ہے، آپ ساری دنیا کے ادبیات کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب میں "کلمہ" پر زور ہے "کلمۂ طیبہ" پر زور نہیں۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ ہو، اس کا مقصد صحیح ہو، بات جو کہی جائے تو

صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ فصیح و بلیغ ہے، بعض لوگوں نے اس کو کافی سمجھا ہے، اگر آپ مذہبی، دینی نفسیات کی تاریخ پڑھیں اور دعوتوں کی تاریخ پڑھیں، تو بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھا ہے کہ بات اچھی طرح (Tactfully) کہی جا رہی ہے، لیکن وہ خود بجائے خود صحیح ہے، اس کا رشتہ صحیح ہے، وہ خالقِ کائنات سے، الہام اور اس کی رہبری سے اخذ کی گئی ہے، وہ صُحفِ سماویہ سے لی گئی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ماخوذ ہے، یا صرف اس میں انسان کی فصاحت و بلاغت ہی ہے، اس کا زورِ بیان ہے، اس کی شاعری کی لطافت ہے؟

کلمۂ طیبہ کی مثال دینے کے لئے دنیا میں سیکڑوں، ہزاروں چیزیں ہو سکتی تھیں، موتی، جواہرات، سونا، چاندی، پھول، پھل سب سے تشبیہ دی جا سکتی تھی، لیکن "کلمۂ طیبہ" کے بار آور ہونے اور اس کے ثمر دار ہونے اور اخیر عہد تک اس کے کام کرتے رہنے کی مثال "درخت" سے بہتر نہیں ہو سکتی، درخت کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ "شجرۂ طیبہ" ہو، یہ نہیں کہ آپ نیم کا درخت لگالیں اور آپ اس سے آم کی امید رکھیں، آپ کانٹے بوئیں اور آپ اس سے پھول کی توقع کریں، خود وہ شجرہ بھی طیبہ ہونا چاہئے جیسے کلمہ طیبہ ہوتا ہے۔ اس کی تعریف میں کہا گیا ہے "كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ" اب اس کے بعد قرآن کا اعجاز ہے وہ کہتا ہے:-

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔

آپ ان الفاظ کی وُسعت اور ان کی لطافت پر غور کریں تو ان میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، اس میں ادیان سماویہ کی تاریخ آگئی، اس میں نبوّات اور پیغمبروں کی مساعی اور کوششوں کی تاریخ آگئی، اس میں ان روحانی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ آگئی

جس کا احاطہ اس وقت تک نہیں کیا گیا، اور احاطہ کرنا مشکل ہے، سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں مثالیں ایسی ہوں گی مخلصین کے کلام کی کہ جن کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

ایک تو یہ کہ وہ ایسا شجرۂ طیبہ ہو کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" اس کی جڑ تو زمین میں ہوگی "وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" اور اس کی شاخ آسمان سے بات کرتی ہوگی، ایک انسان کی زبان سے کلمہ نکلے گا، لیکن وہ قوموں کی تقدیر بدل دے گا، زمانہ کا رُخ بدل دے گا، سوچنے کا طریقہ بدل دے گا، قوموں کی قومیں دین حق میں داخل ہوں گی۔

ایک مثال ......

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے!

اس کے لئے میں ایک مثال جو اس وقت میرے ذہن میں آئی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں کہ ایک چھوٹا سا کلمہ کیا کام کرتا ہے؟ اس کے لئے میں عرض کردوں اپنے فاضل دوستوں کے سامنے کہ محض مطالعہ، محض ذہانت،

پیش کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ، الفاظ کا انتخاب، انشاء پردازی، اور خطابت کا زور تنہا کافی نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو، اور اسلام کو جو اس وقت آپ دنیا میں پھیلا ہوا دیکھ رہے ہیں، اسلام کی جو فتوحات ہیں، ان میں ایک بہت بڑا عامل (Factor) یہ تھا کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ ع

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

تو قلق(۱) تیمور تاتاریوں کی ایک شاخ کا شاہزادہ تھا جس کا پایۂ تخت کاشغر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے ترکستان اور ایران پر حملہ کیا اور پھر اس کے بعد وہ بغداد تک پہنچ گئے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عالمِ اسلام کی چولیں ہلا دیں، ایسا نظر آنے لگا کہ اب اسلام دنیا میں ایک طاقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا، ان کی ایک شاخ (وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئے تھے) جو ترکستان پر حکمراں تھی، جس میں ایران بھی شامل تھا، اس کا وہ ولی عہد تھا، ابھی اس کی تاج پوشی نہیں ہوئی تھی تاج پوشی کے بعد وہ اس پورے قلمرو کا حکمراں ہوتا، وہ شکار کے لئے نکلا......، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی باہر کا آدمی شکارگاہ میں داخل نہ ہونے پائے، ایک ایرانی بزرگ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، وہ نادانستہ اس شکار گاہ میں داخل ہوگئے، ان کو مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے حاضر کیا گیا، خان نے ان سے غضبناک ہو کر کہا کہ ایک ایرانی سے تو کتا ہی بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے، اگر ہم کو اللہ تعالیٰ دین حق کی نعمت و عزت نصیب نہ فرماتا تو ہم سے کتا ہی بہتر ہوتا، خان نے شیخ سے پوچھا کہ دین برحق کیا چیز ہے؟ شیخ نے اسلام کے عقائد ایسی گرم جوشی اور ایسے دینی ولولہ سے بیان کئے کہ اس کا پتھر کا دل موم کی طرح پگھل گیا، شیخ نے حالتِ کفر کا بھی ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان پر لرزہ طاری ہو گیا، خان نے شیخ سے کہا کہ جب آپ سنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو آپ مجھ سے ضرور ملیں۔(۱)

---

(۱) غالباً یہی نام بعد میں تغلق کے نام سے پکارا جانے لگا، فیروز تغلق شاہانِ دہلی ترکی النسل تغلق خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔(۱) ملاحظہ ہو "دعوت اسلام" ترجمہ از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ باب ہشتم ص ۲۳۵-۲۳۶

یہ دل سے نکلی ہوئی بات تھی اس لئے اس میں کوئی منطقی اثر ہو یا نہ ہو لیکن اس کے دل پر اس کا اثر پڑا، اور یہ من جانب اللہ بات تھی، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب تک دعوت میں وہ دل شامل نہ ہو جو نورِ باطن سے منور اور دردمند ہے، اور وہ بات دل کی گہرائی سے نہ نکلی ہو تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا کہ زندگی میں انقلاب پیدا کر دے۔

اس کے بعد وہ برابر اس کے انتظار میں رہے کہ یہ اطلاع ملے کہ تغلق تیمور کی تاجپوشی ہو گئی ہو تو میں جاؤں اور یہ واقعہ یاد دلاؤں، لیکن ان کی قسمت میں نہیں تھا، جب وہ عالمِ سکرات میں تھے، آخر وقت تھا تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ شیخ رشید الدین کو بلایا اور کہا کہ دیکھو بیٹا! میری قسمت میں تو یہ سعادت نہیں تھی، لیکن شاید تمھاری قسمت میں ہو، جب سُنناکہ تو قلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی اور وہ بادشاہ ہو گیا تو اس سے ملنا اور یہ واقعہ یاد دلانا۔

جب شیخ رشید الدین نے سنا کہ تو قلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی تو وہ گئے، اس کے شاہی محل میں تو ان کو کون اندر جانے دیتا، جب ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انھوں نے ذرا فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے مصلّٰی بچھا لیا اور وہاں نماز پڑھنی شروع کی، جب نماز کا وقت آتا اذان دیتے اور نماز پڑھتے، اور وقتوں میں تو اذان کی آواز نہیں پہنچتی، لیکن فجر میں ایک دن جو کہ سناٹے کا وقت ہوتا ہے محل میں آواز آئی، اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیسی مجنونانہ صدا ہے؟ یہ کیا صدائے بے ہنگام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت! (وہ جس طرح بھی خطاب کرتے ہوں) ایک مجذوب سا شخص ہے، وہ کچھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اور یہ آواز لگاتا ہے، اس نے کہا کہ پکڑ لاؤ

اُسے، وہ لائے گئے تو اس نے کہا تم کون ہو؟ اور یہ کیا آواز لگاتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ کو کچھ یاد ہے ایک مرتبہ آپ شکار میں گئے تھے، تو ایک ایرانی عالم آپ کو ملے تھے شیخ جمال الدین، ان سے آپ کا کچھ مکالمہ ہوا تھا، اس نے کہا کہ ہاں یاد ہے، انھوں نے کہا کہ میں یہ شہادت دینے آیا ہوں کہ ان کا ایمان پر خاتمہ ہوا، اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا، آرنلڈ نے بھی یہ لکھا ہے، اور ترکی فارسی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے، اس نے کلمہ پڑھا اور اپنے ایک رازدار اور سربرآوردہ امیر کو بلایا اور تنہائی میں کہا کہ دیکھو میں نے اپنے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اب تم اپنے متعلق سوچو، انھوں نے کہا کہ حضور میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، آپ کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتا تھا، اس کے بعد پھر اس طرح پوری کی پوری شاخ سو فیصدی مسلمان ہو گئی(۱)۔

قرآن مجید میں کوئی لفظ اتفاقی نہیں ہوتا

میں عرض کر رہا تھا "كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ" یہ محض اتفاقی لفظ نہیں ہے، قرآن مجید میں کوئی اتفاقی لفظ نہیں ہوتا، پہلی شرط یہ ہے کہ "شجرۂ طیبہ" ہو، یہ نہیں کہ آپ برگد کا درخت لگا دیں، نیم کا درخت لگا دیں، کانٹے بو دیں اور آپ ان سے اچھے پھل پھول کی امید کریں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ "شجرۂ طیبہ" ہو، پھر اس شجرۂ طیبہ کی جو صفت خدا نے

(۱) تاتاری حملہ کی ہیبت ناکی اور پھر پوری تاتاری نسل وقوم کے قبول اسلام کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو، صاحب مقالہ کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول کا باب "فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" ص ۳۰۲۔ ۳۳۴

بیان کی وہ بالکل اس کے دین کی صفت ہے کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" جڑ تمھیں نظر آئے گی زمین پر، اور شاخیں تمھیں نظر آئیں گی آسمان پر، اب آپ اسلام کی تاریخ پڑھئے کہ کس پستی کی حالت میں، کس بے سر و سامانی کی حالت میں، کس کمزوری کی حالت میں اس کی ابتدا ہوئی اور پھر اس کی شاخیں کہاں تک پہونچیں۔

"تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے، ہر زمانہ میں وہ اللہ کے حکم سے پھل دیتا رہے گا، یہ محض "شجرۂ طیبہ" نہیں "شجرۂ طیبہ خالدہ" ہے، یہ زمانہ کے تغیرات کا تابع نہیں ہے، بہت سے درخت ہیں، جو اپنی عمر پوری کر لیتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، جانور ان کو تباہ کر دیتے ہیں، اور خود ان کا لگانے والا کبھی ان کو کاٹ دیتا ہے، تو اس میں بتایا کہ اس کی مکانی وسعت تو یہ ہے کہ وہ زمین سے اٹھتا ہے اور آسمان تک جاتا ہے، یہ تو اس کی مکانی وسعت ہے، اور زمانی وسعت یہ ہے کہ "تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" وہ اپنے پھل ہر زمانہ میں اللہ کے حکم سے دیتا ہے۔

شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا

آج آپ اپنی آنکھوں سے اس آیت کا تحقق دیکھ رہے ہیں کہ وہ شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا اور جس کی جڑ زمین میں تھی، کہاں تھی؟ جزیرۃ العرب میں تھی، جو سیاسی حیثیت سے، فکری حیثیت سے، علمی حیثیت سے، اور مالی حیثیت سے، ہر حیثیت سے دنیا کا پسماندہ ترین علاقہ تھا، اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا "اَصْلُهَا ثَابِتٌ

وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" اس کی شاخیں کہاں تک گئیں؟ اس کی شاخیں آسمان تک گئیں، آپ دیکھیں کہ اس کی اشاعت و فتوحات کے نتیجہ میں کتنی سلطنتیں پیدا ہوئیں، اس کے نتیجہ میں کتنی دانش گاہیں، کتنی جامعات وجود میں آئیں، کتنے مراکزِ ہدایت و تربیت قائم ہوئے، کتنے محقق پیدا ہوئے، کتنے مفکّر پیدا ہوئے، کتنے ادیب پیدا ہوئے اور کتنا بڑا لٹریچر تیار ہوا، کسی ایک زبان میں بھی اگر آپ اس کا احاطہ کرنا چاہیں تو مشکل ہے، جو کلمہ کہا گیا تھا جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر وہ کلمہ آج ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، اور وہ اپنے پھل دے رہا ہے، شجرۂ طیبہ کی طرح پھل پھول رہا ہے۔

عناصر اربعہ کا خیال

ایک تو چیز ہے علم و معرفت، دوسری چیز ہے زبان کی تاثیر اور قوت، اور تیسری چیز ہے اخلاص و دردمندی، یعنی خود دل پر چوٹ ہو اور جو چیز نکلے بلکہ قلب سے نکلے صرف قلم سے نہ نکلے تب اس کا اثر ہوگا، اگر ہم نے ان "عناصر اربعہ" کا خیال رکھا تو مغربی ممالک میں، اور اس نئے بدلے ہوئے زمانہ میں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں تحریری و تقریری طور پر دینِ صحیح کی دعوت ضرور اثر انداز ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج عطا فرمائے گا، اس میں ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور فالِ نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" ورنہ آدمی یہ کہتا کہ زمانہ گزر گیا، اب یہ بیسویں صدی ہے، دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے، سائنس، پالیٹکس، ٹکنالوجی کی ترقی کہاں سے کہاں تک پہنچی، ذہن و فکر کا معیار بدل گیا ہے، اب وہ زمانہ نہیں رہا، اب اس وقت اسلام کی دعوت کوئی اثر نہیں کرے

گی، تو قرآن نے "تُؤْتِیْ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ بِّاِذْنِ رَبِّھَا" کہہ کر تسلّی دی ہے اور تقویت کا سامان کیا ہے کہ کسی زمانہ کے، کسی جگہ کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے اسلام کی دعوت دینے کا کیا فائدہ؟ قرآن نے "کُلَّ حِیْنٍ" کہہ کر زمانہ کی تحدید کو ختم کر دیا۔

لیکن یہ سب اللہ کے ارادہ اور قدرت سے ہوگا اس نے "باذن ربھا" کہہ کر یہ بتا دیا کہ اپنی ذہانت پر، اپنی زبان کی مہارت پر اعتماد نہ کرو، بلکہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ ہی اگر چاہے گا تو اثر ہوگا، اس کے اندر دعوت کا پورا نقشہ آگیا ہے۔(۱)

---

(۱) "دین حق ودعوت اسلام ایک فلک بوس عمارت اور سدا بہار درخت" مطبوعہ تقریر سے تلخیص کی گئی ہے۔

دعوت اور حکمتِ دعوت

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ.إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ.
(النحل۔ ۱۲۵)

آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقہ سے، بیشک آپ کا پروردگار (ہی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔

اللہ رب العزت کا یہ خطاب اپنے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آخری امت کے لئے ہے، کیونکہ اس امت کے بعد کوئی اور امت نہیں، یہ سورہ نحل کے آخری رکوع کی آیت ہے، جس میں دعوت وارشاد کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ.

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم وحکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلائیے۔

آیت دعوت کا اختصار و اعجاز اس کی وسعت اور گیرائی

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریق کار کے حدود مقرر نہیں کیے اور یہ کام داعی کی قوت تمیز اور عقل سلیم پر چھوڑ دیا ہے، اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کون سا طریق کار اختیار کیا جائے اس کی طرف خود داعی کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا، اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات و اعصاب پر حکمراں ہے وہ خود طریق کار کا انتخاب کر لے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کر دیا ہے، جس کے اندر دعوت دین کی پوری روح (اسپرٹ) سما گئی ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے، کہاں تک وہ جا سکتا ہے، اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے، جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے، وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ "ادع الی سبیل ربک" (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف) اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایمان کی طرف دعوت دو، یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی دعوت دو یا اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی ترغیب دو، انسانیت کے احترام کی تلقین کرو، یہ سب نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں "سبیل ربک" میں سمٹ آئی ہیں، اس لفظ نے فکر و عمل کے آفاق کھول دیئے ہیں، یہ آفاق بھی محدود نہیں ہیں، اس میں دوسرے ادیان سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں "ادع" (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ وسیع معانی پر حاوی ہے، اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ و تقریر کے ذریعے بلاؤ، نہ

یہ کہ تحریر کے ذریعے دعوت دو، نہ یہ کہ وعظ وتلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو، یہ لفظ "اُدْعُ" تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے، اور حسب موقع داعی، دعوت کا فرض کبھی پند و نصائح سے کبھی وعظ و تقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کر سکتا ہے، اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کر سکتا ہے، جو مشروع ہو، موثر اور نافع ہو، پھر فرمایا "سَبِيْلِ رَبِّكَ" اپنے رب کے رستے (کی طرف)- اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

حکمت و موعظت حسنہ کا مفہوم

"حکمت کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح "موعظت" بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے "حسنہ" کا لفظ بھی لا محدود معانی پر مشتمل ہے، قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز واختصار بھی ہے، اور بیان وشرح بھی۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ — اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ۔

حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقعہ پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے، اور حکمت و موعظت الگ ہے۔

اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندے موسیٰ علیہ السلام کو اُس عہد کے خدا کے مغضوب ترین بندے ظالم و جفاکار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم

ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ. (طٰہٰ۔ ۴۳) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔

اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟

فَقُوْلاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّنًا. (طٰہٰ۔ ۴۴) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلّم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو:۔

لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْيَخْشٰى. (طٰہٰ۔ ۴۴) شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔

تاکہ وہ نصیحت پکڑے، یا سلیقہ کی بات سن کر اس کے دل میں خشیت و خوف پیدا ہو جائے، اور اپنے کفر و طغیان، اور شر و ظلم سے باز آئے، اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہو تو وہ کار آمد ثابت نہیں ہوتا شاعر نے سچ کہا ہے۔ ع

کہتے ہیں وہ بھلے کی و لیکن بُری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسن سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال و جواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہئے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقعہ پر بھی اس کی ہدایت ہوئی:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ. اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

تاکہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقۂ استدلال سے متاثر ہوں، چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقۂ بحث و مجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بنا پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین و سامعین پر

حسنِ مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت آیت:-

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيْفا. وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (النحل۔۱۲۰)	بیشک ابراہیم بڑے مقتدا تھے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔

سے بھی واضح ہوتی ہے، ان کو اس طریقۂ استدلال، سلیقہ، حکمت و موعظت، اور احسنِ مجادلہ کے باوجود:-

حَنِيْفاً مُسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (آل عمران۔۶۷)	طریق مستقیم والے (یعنی) صاحبِ اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔

کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کی دعوت میں حکمت تھی، مداہنت نہ تھی، لینت تھی، سیاست نہ تھی، لہٰذا ایک مومن مسلمان کو بھی یہ طرز تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے، عقائد کی اصلاح کے لئے بھی "ادع الی سبیل ربك بالحكمة" کا طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مریض کا علاج کرنا ہے، اس میں پیار، نرمی، اور محبت ہو، سختی، درشتی، تیزی و تندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج معالجہ کی بات ہی الگ ہے۔ امت کو پیغام ملتا ہے:-

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ۔۱۲۸)	(اے لوگو) تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمھارے منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

اس پر عمل کرنا آپ کے ایک امتی پر بھی لازم ہے، وہ دوسرے انسان کو حکمت عملی اور محبت اور پیار سے دعوت دے کر، سلیقہ سے سمجھا کر عقائد کی اصلاح کے لئے مائل وراغب کرے۔(۱)

(۱) تحفہ کشمیر از ص ۶۴ تا ص ۶۷
(۲) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب از ص ۲۱ تا ۲۴ سے مشترک ماخوذ ہے۔

امت اسلامیہ کا مقام اور اس کی دعوت

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ

(اے پیروان دعوتِ ایمانی)! تم تمام امتوں میں "بہتر امت" ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)

امتِ اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے۔ اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے۔ اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے، قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. تم تمام امتوں میں سب سے بہتر امت ہو۔

"أخرجت للناس" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ امت کوئی سبزۂ خود رو نہیں، جیسے جنگل کی گھاس ہوتی ہے، یا جنگلی درخت ہوتے ہیں کہ اُگ آئے، نہیں بلکہ "اخرجت للناس" مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی نسبت اللہ تبارک و

تعالیٰ کی طرف ہے، "خروج" اور "اخراج" میں فرق ہے، خروج اپنا ذاتی فعل ہے۔ انفرادی فعل ہے۔ اور "اخراج" کسی دوسری طاقتِ بالا اور ہستی کا فعل ہے۔ یعنی یہ امت کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسانیت کی حفاظت اور فاطرِ کائنات کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے وجود میں لائی گئی ہے۔

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو نبوت و رسالت کو رسول اللہ ﷺ پر ختم کرنا تھا، اور قیامت تک کے لئے آپؐ کے دین کو قائم رکھنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی گاڑی چلانے کے لئے اور اس کے چلتے رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ آپؐ کے ساتھ ایک پوری امت کی بعثت فرمائی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس حقیقت کو جانتے تھے اور اپنے لئے اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ جب رستم نے حضرت ربعی ابن عامرؓ سے پوچھا کہ "مالذی جاء بکم" (تمھیں کون سی چیز یہاں لائی) تم اپنے صحرا سے نکل کر یہاں کیوں آئے، اس کا محرک کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا "اللہ ابتعثنا" اللہ نے ہم کو بھیجا ہے۔ تاکہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی اور اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے ان کو نکال کر کونین کی بے کراں وسعتوں سے آشنا کریں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف کے مزہ سے آشنا کرائیں، اسی لئے انھوں نے اس موقع پر "ابتعثنا" کا لفظ استعمال کیا۔

"تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو، اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔ یہ امتِ محمدیؐ کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے

کہ وہ دنیا میں (بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور بُرائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے۔

"امر بالمعروف، نہی عن المنکر" دین کا زبردست رکن اور عالمگیر شعبہ ہے جس سے دنیا کی تمام چیزیں وابستہ ہیں، اس لئے یہ شعبہ خاص طور پر اس امتِ محمدیہ کے لئے الاٹ کیا گیا ہے۔ امت محمدیہؐ کی فضیلت و برتری کی علت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے ذریعہ ایک اعلیٰ اور برتر کام لیا گیا ہے، جس کی وجہ سے "خیر الأمم" کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خصوصیت ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت منفرد ہوئی تھی، ان کی ذات کی بعثت ہوتی تھی، لیکن آپؐ کی بعثت کی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کے ساتھ ایک "امت" بھی مبعوث کی گئی، اور اس امت کو دنیا میں وہ ضرورت پوری کرنا ہے جو کہ انبیاء و مرسلین کرتے تھے، حالانکہ یہ امت خود نبی نہیں ہے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپؐ کی بعثت کے ساتھ آپؐ کی امت بھی دعوت کے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے مبعوث کی گئی ہے، لیکن یہ بعثت نبی والی بعثت نہیں ہے۔ "نبوت" اور "بعثت" الگ الگ دو لفظ ہیں، نبوت کا لفظ صرف اس برگزیدہ انسان کے لئے آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے منتخب فرمایا ہو، اور "بعثت" کا لفظ قوم کے لئے بھی آسکتا ہے، حضور ﷺ نے یہ لفظ اپنی امت کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے کہ "انما بعثتم

میسرین ولم تبعثو معسرین" اس میں "بعثت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ تم بھیجے گئے ہو، تمھیں مقرر کیا گیا ہے، تمھیں نامزد اور نصب کیا گیا ہے، تمھاری ایک حیثیت متعین کی گئی ہے، اور تمھاری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ اور "میسرین" سہولت پیدا کرنے والے کی حیثیت سے، "معسرین" مشکلات پیدا کرنے والے کی حیثیت سے نہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ امت زندگی کا ایک خاص متعین مقصد رکھتی ہے، دنیا کے لئے اس کے پاس ایک مکمل دعوت ہے اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی جد و جہد اور عمل اور اس کی ہر قسم کی سرگرمی اور نشاط، اس کے عقیدہ، مقاصد اور پیغام کی تابع ہے، اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اس امت کا خاص فریضہ اور اس کا مقصد آفرینش ہے۔(۱)

---

(۱) (۱) تحفۂ پاکستان صفحہ ۱۹۔ (۲) اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ ۲۷۸ تا صفحہ ۲۹۰۔
(۳) اسلام کے قلعے صفحہ ۱۱۔ (۴) الفرقان اشاعت خاص ربیعین ۱۳۷۱ھ صفحہ ۹۹۔
(۵) حدیث پاکستان صفحہ ۲۷۔ (۶) تحفۂ انسانیت صفحہ ۲۰۔ سے مشترک طور پر اخذ کیا گیا۔

أمر بالمعروف و نهی عن المنکر

ھـــی

انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ.

تم امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے
اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)

عالمگیر شعبہ اور امت محمدیہ

امر بالمعروف -یہ شعبہ عالمگیر ہے اس لئے خاص طور پر اس کو امتِ محمدیہ کے لئے الاٹ کیا گیا ہے، امتِ محمدیہ کی فضیلت و برتری کی علت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے ذمہ ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خیر الامم کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا ہے، دین کی تبلیغ کا کام یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کو خدا نے اس امت کے سپرد کیا ہے اور خدمتِ خلق کا جذبہ امت کو

دوزخ سے بچانے کا نام ہے اور اس کا نشیمن اس کی دعوت کی شاخ پر ہے، درحقیقت دنیا کی پیدائش کا اصلی مقصد خداوند قدوس کی ذات و صفات کی معرفت کا ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے، اس لئے فرمادیا گیا کہ فلاح و بہبود انھیں لوگوں کے لئے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

بعثت محمدیؐ کا مقصد

اس امت کی بعثت آپ کی بعثت کا پھیلاؤ ہے اس لئے دین کی اشاعت کی ذمہ داری و باگ ڈور امت کے ہاتھ میں دے دی ہے اس کے کرنے میں کامیابی ہے اور نہ کرنے میں دو نقصان ہیں۔ (۱) اپنے کو نااہل قرار دینا ہے یا یوں کہئے کہ اپنے سر بہت بڑا الزام قائم کر لینا ہے۔ خدا نے انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کو انجام نہ دے، ہزار کام کرے تو بے کار ہے، بلبل کی سریلی دل آویز آواز ہے، اگر وہ بولے نہیں تو کوا بہتر ہے، طاؤس رقص نہ کرے تو اس سے ہنس اچھا ہے، نمک کے اندر نمکین پن نہ ہو اس کی جگہ یاقوت و جواہرات ہوں تو بے کار ہے جو چیز جس کام کے لئے بنائی گئی ہے وہی کام انجام نہ دے تو کیا فائدہ؟

جاں بلب دنیا اور حیات بخش پیغام

بھٹکی ہوئی اور ٹھوکر کھائی ہوئی انسانیت جو آج گہرے غار میں گرنے کے لئے تڑپ رہی ہے، اس کو کون بچائے گا؟ ایک انسانیت کیا بیمار ہے بلکہ سب بیمار ہیں، اخلاق بیمار، معاشرت بیمار، روح بیمار، عقیدہ بیمار، ایمان بیمار، ساری انسانیت بیمار ہے اس کا علاج کون کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ تعلق مع اللہ اور دعوتِ الی اللہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ ع

"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"

امت محمد یہ جب اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب و آلام اور ذلت خواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ اس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا اور اس کی قدر نہ کی اور جس کام کے انجام دہی کی ذمہ داری تھی اس سے غافل رہی اور اس کو بھلائے رکھنے سے سستی و کاہلی عام ہو جائے گی، گمراہی و ضلالت کی شاہراہیں کھل جائیں گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں ویران ہو جائیں گی۔ مخلوق تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے (لیکن) اس تباہی و بربادی کی خبر اس وقت ہو گی جب میدانِ حشر میں خدا کے سامنے باز پرس کے لئے بلایا جائے گا۔

مسیحا خود بیمار ہے

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر" دین کا زبردست رکن ہے جس سے دین کی

تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس سے ہمارے لئے یہ بات صاف واضح ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض روح اسلامی سے بیزاری ہے جو در حقیقت ایمان کا ضعف ہے، ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے، ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی- اور کمزوری کا سبب اصل شئے کو چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقا اور دار و مدار ہے اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے اور سب کام ہو رہے ہیں۔ صرف دعوت کا کام نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ یہ محاذ جن سپاہیوں کو الاٹ کیا گیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے آپ بھی اس منصب سے محروم اور اس سے ملنے والی اشیاء سے بھی محروم ہو گئے۔

دعوت واصلاح کا کام

شریعت اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتایا ہے، اور امتِ مسلمہ کو ایک جسم قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے اس وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور لازمی جزء قرار دیا ہے تاکہ اس کی انجام دہی کے لئے اپنے اندر خوبی و کمال پیدا کریں- ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک افراد خوبیوں اور کمالات کے زیور سے آراستہ نہ ہوں، اب ہمارے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوت بڑھے اور اسلامی فتوحات ابھریں، ہم خدا اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں، کیونکہ یہ کام خدا کی ایک اہم عبادت اور سعادتِ عظمیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی امانت ہے، اس کام کا مقصد دوسروں کی ہدایت

نہیں بلکہ اس سے خود اپنی اصلاح اور عبدیت کا اظہار مقصود ہے، اگر ہم اس کو صحیح طور پر انجام دیں گے تو عزت و آبرو اور اطمینان و سکون کی زندگی پالیں گے۔(۱)

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ-۱۰ر جولائی ۱۹۹۰ء

باب ۳

ایمان و استقامت

- جب حالات سازگار ہوں اور ہوا موافق چل رہی ہو۔
- جب کسی مسلک پر قائم رہنے پر انعام ملتا ہوں اور پھول برسائے جاتے ہوں۔
- جب کسی قوم و جماعت کا ستارۂ اقبال بلند ہو اور اس کا بخت یاور۔
- جب کسی جماعت میں شرکت باعثِ اعزاز اور سرمایۂ افتخار ہو۔

تو اس وقت اس مسلک پر قائم رہنا اور اس عقیدہ کا اظہار کرنا کوئی مردانگی نہیں!

لیکن!

- جب حالات ناسازگار ہوں اور بادِ مخالف تیز و تند چل رہی ہو۔
- جب بڑے بڑے جوانمردوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں۔
- جب کسی اصول اور عقیدے کو اختیار کرنا، دار و رسن کو دعوت دینے کے مترادف ہو
- جب کسی قوم کے تنزل کا زمانہ ہو، اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا ہو اور زمانہ کی نگاہیں اس سے پھری ہوئی ہوں۔

اُس وقت!

اس مسلک پر ثبات و استقامت اور اس جماعت سے انتساب و نسبت بڑے شیر مردوں کا کام اور بڑی وفاداری اور نمک حلالی کی بات ہے۔

لیکن اسلام پر قائم رہنا، اس سے اپنی نسبت اور علانیہ اس کے شعائر کا اظہار اس وقت بھی سعادت و فخر کی بات ہے اور اس میں اس وقت بھی مزہ ہے جب حالات اس کے لئے سازگار ہوں اور جب مسلمانوں کی کامیابی کا دور اور دنیا میں اسلام کا دور دورہ ہو اور کسی معاملہ میں ان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا ہو۔ لیکن آزمائش و امتحان کے موقع پر وفاداری اور جاں نثاری میں جو لذت ہے وہ لذت کسی چیز میں نہیں!

یہ وہ وقت ہے جب حق پر قائم رہنے والوں، حق و صداقت کی تبلیغ کرنے والوں، اور اپنے عقیدے و ضمیر کے خاطر مفادات اور اعزازات کی قربانی کرنے والوں کو اس دنیا ہی میں جنت کا مزہ آنے لگتا ہے اور ان کے بدن کے روئیں روئیں سے خدا کی حمد و شکر کا ترانہ بلند ہوتا ہے"۔

ماخوذ از "دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں" صفحہ ۲۴۔۲۸۔۲۹۔

قصہ سات جواں مردوں کا

اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی. وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِہٖ اِلٰھاً لَّقَدْ قُلْنَا اِذاً شَطَطاً.

(سورہ کہف۔ ۱۳۔ ۱۴)

میں نے آپ کے سامنے سورۂ کہف کی ایک آیت پڑھی ہے، اس کا عنوان اگر اس زمانہ کے اسلوب اور اسٹائل میں مقرر کروں تو کہوں گا "قصہ سات جواں مردوں کا"(۱)۔

نوجوان عنصر کیلئے خصوصی پیغام

اس قصہ میں نسل انسانی کے نوجوان عنصر کے لئے خصوصی پیغام اور ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں کام دے سکتا ہے، اور جو صرف دماغ و دل پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانہ کا کام دے سکتا ہے، وہ کبھی شبنم

(۱) قرآن مجید میں آتا ہے کہ کسی نے کہا چار تھے، پانچواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا چھ تھے، ساتواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا، اس کے بعد قرآن مجید نے آگے کوئی ہندسہ نہیں بتایا، مفسرین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ تعداد میں سات ہی تھے۔

ٹپکاتا ہے، کبھی پھول کی جھڑیاں لگاتا ہے، مجھے بھی آج نوجوانوں کے سامنے نوجوانوں کا قصہ سنانا ہے، اور میں کیا سناؤں گا، قرآن مجید سناتا ہے، یہ وہ نوجوان ہیں جن کو قرآن نے ان کا تذکرہ کر کے لافانی بنا دیا ہے، اور ہر دور کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اور آئیڈیل، بات بڑی مختصر، بڑی سادہ، لیکن بڑی عمیق اور سبق آموز ہے۔

قصہ یہ ہے کہ رومن امپائر کے ایک حصہ میں جو شام و فلسطین کہلاتا ہے، ایک دعوت پیدا ہوئی، جس کے لانے والے سیدنا مسیح علیہ الصلاۃ والسلام تھے، جو ہم مسلمانوں کے نزدیک بھی خدا کے پیغمبر برحق ہیں، انھوں نے توحید کی دعوت دی، اس وقت ساری دنیا میں شرک پھیلا ہوا، اور ہر طرف گھٹاٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس اندھیرے میں ایک روشنی چمکی، حضرت عیسیٰؑ نے شرک، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی، اور انسانیت کے استحصال کے خلاف ایک آواز بلند کی، جس کی اصل اساس توحید، اور سچی خدا پرستی تھی، اس دعوت کو کچھ لوگوں نے تسلیم کیا اور وہ اس کے حامل و داعی بن گئے، انھوں نے اپنے اس قلمرو سے باہر قدم نکالا، اور رومی شہنشاہیت کے مرکز کے قریب جاکر دعوت پیش کی، اکثر دیکھا گیا ہے، کہ سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے مقابلہ میں (جن کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم و رواج، اور خوف و امید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اور ان کو کسی نئے تجربے اور انقلابی اقدام سے باز رکھتی ہیں) نوخیز اور جواں سال (جن کے پاؤں میں یہ بیڑیاں نہیں ہوتیں) اور ان کی وابستگیاں، اور ان کا (Attachment) ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا، جن کے ساتھ عموماً بڑی

عمر والوں کا ہوا کرتا ہے، نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید ان نوجوانوں کی عمر کا تعین نہیں کرتا، اور یہی قرآن مجید کا طریقہ ہے، اگر وہ کہتا کہ ۱۸۔۲۰ سال کے نوجوان تھے، تو اس سے اوپر اور اس سے نیچے کی عمر والوں کو بہانہ مل جاتا کہ ہمارا قصہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ" وہ چند نوجوان تھے۔ جو حضرات عربی کا ذوق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ "فتية" کے لفظ میں عمر کی جوانی کے ساتھ دل و دماغ، اور حوصلوں اور عزم وارادہ کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آگیا ہے، اس لئے اس کے ترجمہ میں میں نے "جواں مرد" کا لفظ اختیار کیا، "فتية" "فتى" کی جمع ہے "فتى" کی جمع "فتيان" بھی آتی ہے، لیکن "فتية" جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، اور یہی ہمیشہ ہوا ہے کہ جب خدا پرستی اور اصلاح حال کی صحیح دعوت آئی ہے تو اس کے ماننے والے ابتداء میں تھوڑے ہوئے ہیں، جن کو خدا نے اس کی توفیق دی اور ان کو یہ ہمت ہوئی۔

مسئلہ ربوبیت کا تھا

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات میں سے "رب" کا لفظ استعمال فرمایا ہے "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ" یہ بات بہت معنی خیز ہے، اس لئے کہ حکومتوں کو اپنے یہاں کے باشندوں کا رازق ہونے کا بھی (کبھی زبان قال سے اور کبھی زبان حال سے) دعویٰ ہوتا ہے، اور ان کے ساتھ اس طرح کے خیالات اور عقیدے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر اپنی پرورش کا سامان کرنا ہے، اور عزت و

راحت کی زندگی گزارنی ہے، تو ان حکومتوں سے اپنے کو متعلق کرنا پڑے گا، ان کا غاشیہ بردار ہو کر رہنا، اور ان کی رکاب میں چلنا پڑے گا، ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگا، اس کے بغیر رزق اور خوش حال و فارغ البال زندگی کے دروازے یکسر بند ہیں، قرآن جو لفظ کہتا ہے، وہ اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتا ہے، پوری پوری کتابوں کا مضمون ایک لفظ میں آجاتا ہے، یہ جواں مرد انسانوں کے اس جنگل میں کھڑے ہوگئے، جہاں اس رومن امپائر کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جو اس وقت دنیا کی سب سے منظّم، سب سے متمدن، دنیا کو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ قانون دینے والی، دنیا کے سب سے وسیع خطہ پر حکومت کرنے والی شہنشاہی تھی، انگریزی محاورہ کے مطابق اس حکومت کی ناک کے نیچے، اور بالکل آنکھوں کے سامنے چند نوجوان کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس دعوت کو قبول کر کے اس کا اعلان کرتے ہیں، جو اس وقت کا صحیح مذہب، اور اس عہد کا اسلام تھا، اس وقت تک مسیحیت میں تحریف نہیں ہوئی تھی، اس کے وہ داعی وہاں پہونچے تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کے صحیح علمبردار تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارا رازق اور ہماری پرورش کی ذمہ دار حکومت نہیں ہے، ہمارا رازق اور پروردگار خدا ہے، اور وہی ہماری پرورش کا ذمہ دار ہے، "رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضِ" ہماری پرورش کرنے والا وہ ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، یہ بات اس منظّم سلطنت میں کہی گئی تھی، جس نے وسائل معیشت پر قبضہ کر رکھا تھا، گویا وہاں کے باشندوں کی قسمت و روزی کی مالک بن گئی تھی، اور بظاہر نفع و ضرر کی ساری طاقتیں اس کے ہاتھ میں آگئی تھیں، اس وقت دانشمندی اور حقیقت پسندی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ حکومت کے دامن

سے وابستہ ہو کر حکومت کے عقیدے کو اختیار کر کے کم سے کم اس عقیدہ پر سکوت اختیار کر کے اس قلمرو میں اچھی زندگی گزاری جائے، انھوں نے پوری یونانی دیومالا (Greek- -Mythology) اور رومی دیومالا (Roman Mythology) کا انکار کیا، جو اس وقت کی رومی تہذیب، تمدن و معاشرت، اور عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی تھی، اور پورا معاشرہ مشرک، اور توہم پرست بن گیا تھا، یونان اور رومہ (اور قدیم ہندوستان میں بھی) صفاتِ الٰہی کا تصور دیوتاؤں کی شکل میں کیا جاتا تھا، اور ان کے نام پر بڑے بڑے معبد اور ہیکل بنے ہوئے تھے، یہ محبت کا دیوتا ہے، یہ شفقت کا، یہ روزی دینے والا، یہ جنگ کا، یہ ہیبت و جلال کا، یہ بارش کا۔ ان نوجوانوں نے بیک زبان ان سب کا انکار کیا اور کہا:-

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا. هٰۤؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً. لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ. فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا.

ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہیں پکاریں گے (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی، ہماری قوم کے ان لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، یہ (ان کے خدا ہونے پر) کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لائے۔

آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے

یہاں قرآن مجید نے ایک اور حقیقت بیان کر دی وہ یہ کہ پہلا قدم آدمی کی طرف سے اٹھتا ہے، پہلے ہمت اس کی طرف سے ہونی چاہئے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے مدد،...... جب انھوں نے یہ منزل طے کر لی تو "زدناهم هدىً" ہم نے

ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی معرفت ہے، ہدایت وہاں سے ملتی ہے، اپنی دماغی صلاحیت، اپنی ذہانت سے، تحریروں سے، محض مطالعہ سے، کتب خانہ کے علمی ذخیرہ سے نہیں ملا کرتی، ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اور بادشاہوں کے اندازِ خطاب کی طرح جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، "زدناھم ھدیٰ" ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا تو وہ کہیں سے کہیں پہونچ گئے، اللہ کے سامنے سر جھکایا، اس سے مانگنا شروع کیا، اس کی معرفت پر محنت کی، اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنٰی کی معرفت و فہم حاصل کرنے میں انھوں نے غور و فکر سے کام لیا تو ہم نے ان کی ہدایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

(ہدایت میں اضافہ کیا) اگر آدمی اس کا منتظر رہے کہ کوئی چیز خود بخود دل میں نفوذ کر جائے یا اس کے گلے منڈھ دی جائے تو یہ صحیح نہیں، پہلے خود فیصلہ اور ہمت کرنی ہوگی، اس کے بعد خدا کی مدد آتی ہے، فرماتا ہے "وربطنا علٰی قلوبھم" (ہم نے ان کے دلوں کو سہارا دیا) اس لئے کہ ان کا واسطہ اس زمانہ کی سب سے عظیم اور قہرمان سلطنت سے تھا، وہ "سرکاری" مذہب کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کر رہے تھے۔

نوجوانوں کا جذبۂ عمل:

یہ اصحابِ کہف کا واقعہ ہے۔ مجھے شرق اردن کے سفر (۱۹۷۳ء) میں اس غار

کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں وہ محو خواب ہیں، اردن کے آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر محقق فاضل رفیق وفا الدجانی صاحب نے اس کی زیارت کرائی اور علمی و فنی دلائل سے ثابت کیا کہ یہی اصحابِ کہف کی جگہ ہے(۱)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس واقعہ کو صدیوں تک نظم کیا جاتا رہا ہے اور وہ وہاں کی ادبیات کا ایک جزء بنا رہا ہے۔ میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "معرکۂ ایمان و مادیت" میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی ہے، تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں میں سے اکثر اہل دربار کی اولاد تھے، یعنی یہ سلطنت کے خاندانی نمک خوار تھے، کسی کے باپ، کسی کے چچا، کسی کے بڑے بھائی اس وقت رومن امپائر کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، اس لئے یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا کہ بات صرف اتنی نہ تھی کہ چند بے تعلق اور سر پھرے نوجوان کھڑے ہو گئے، انھوں نے بغاوت کا نعرہ لگایا، اور کہہ دیا کہ ہم سرکاری مذہب کو نہیں مانتے، ہم نے ایک نیا دین قبول کیا ہے...... یہ وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ پورے پورے خاندان اور ان خاندانوں کی قسمت اور عزت وابستہ تھی، ان کے اس اقدام سے ان کے والدین، ان کے خاندان کے بزرگ اور ذمہ دار نازک پوزیشن میں مبتلا ہو گئے، ان سے براہ راست سوال کیا جا سکتا تھا کہ تم نے اپنے فرزندوں اور خوردوں کو اس باغیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ دوسری طرف خود ان بزرگان خاندان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی کہ وہ ان نوجوانوں کے متکفل تھے، وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے

---

(۱) ملاحظہ ہو ان کی کتاب "اکتشاف الکهف واصحاب الکهف" میں نے اپنی کتاب "معرکہ ایمان ومادیت" میں اس کی وہ جگہ متعین کی تھی جو اس وقت تک کے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ تھی، بعد میں میری رائے بدل گئی۔

اور ان کو ان کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا، ایک جگہ قرآن مجید نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں کو نوجوانوں کے اس طرح کے اقدام سے پیش آتی ہے، بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے، جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود میں توحید اور دین حق کی دعوت پیش کی، تو قوم کے سر بر آوردہ لوگوں نے بڑے درد اور دل کی چوٹ کے ساتھ کہا کہ صالح! تم سے تو آئندہ کے لئے بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، خیال تھا کہ تم سیدھے سیدھے اس لائن پر چل کر (جس پر قوم چل رہی ہے) اور اس میں کچھ امتیاز پیدا کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے اور اپنی قوم کے لئے عزت و افتخار کا باعث بنو گے "قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا" (صالح تم تو ہماری امیدوں کا مرکز تھے) تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم یہ نئی دعوت لے کر کھڑے ہو گئے، اور پوری قوم کو مخالف بنا لیا "مرجو" کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں لفظ (Promising) کا ہے، جو کسی ایسے ہونہار طالب علم، یا نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ نوجوان گنتی میں بہت تھوڑے تھے، اور بعض قرائن و قیاسات کی بناء پر سات سے زیادہ ان کی تعداد نہیں تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی سو آدمیوں کی قسمت وابستہ تھی، ہر ایک کے ساتھ پورا پورا خاندان اور برادری کا سلسلہ تھا اور وہ سب ان کے اس اقدام کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، اور شک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے، وہ کتنے خاندانوں کی امیدوں کا مرکز تھے اور کتنے گھروں کی ترقیاں و خوش حالیاں ان سے وابستہ تھیں؟ اس کی طرف لوگوں کی کم

نظر جاتی ہے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سات آٹھ کا معاملہ کیا؟ پکڑے گئے تو پکڑے گئے، اور مارے گئے تو مارے گئے! اگر زندگی کی آسائشوں سے محروم ہوئے تو سات ہی آدمی تو محروم ہوئے، یہ نہیں سوچتے کہ معاملہ کبھی ایک اکیلے آدمی کا نہیں ہوتا، متمدن زندگی میں فرد واحد (اکائی) کا تصور مشکل ہے، شعراء تو اس کا تصور کر سکتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں اکثر فرد واحد کا وجود نہیں ہوتا، اس کے تعلقات و روابط کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں، اس لئے فرد واحد نہیں ہوتا، اگر یہ سات بغاوت کرتے ہیں، تو سمجھئے کہ ستّر خاندان زد میں آجاتے ہیں، اس لئے مسئلہ بہت اہم تھا اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے، اس وقت تاریخ کی کتابوں میں یہ تفصیل نہیں مل سکتی کہ کس کس طرح سے ان کو ڈرایا دھمکایا گیا اور کس کس طرح کی ان کو لالچیں دی گئیں اور سبز باغ دکھائے گئے، ایسے اقدامات سے روکنے کے لئے (خاص طور پر جبکہ مقابلہ میں نوخیز اور نوجوان ہوں) ترہیبات (ڈرانے والی چیزوں) کے ساتھ ترغیبات (راغب کرنے والی چیزیں) بھی ہوتی ہیں، اور اکثر ترہیبات کے مقابلہ میں ترغیبات زیادہ مؤثر اور کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ نے جن کا دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا، فرمایا کہ توڑے، کوڑوں سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، طاقتیں اور حکومتیں کبھی کوڑے سامنے لاتی ہیں اور کبھی توڑے (اشرفیوں کی تھیلیاں)۔ ان نوجوانوں کے سامنے کوڑے بھی آئے ہوں گے اور توڑے بھی، انھوں نے کوڑوں کو بھی سہہ لیا اور توڑوں کا بھی توڑ کر لیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت و سکون، اور صبر و تحمل، اور قربانی و ایثار کی دولت عطا فرمائی "وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ"۔

ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا

"وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا، باندھ دیا، اس لئے کہ جب کوئی چیز کھلی ہوتی ہے تو ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے، کسی چیز سے بندھی ہو تو پھر وہ قائم رہتی ہے، تو ہم نے ان کے دلوں کو باندھ رکھا، وہ اِدھر اُدھر ہلنے جُلنے نہ پائیں "اِذْقَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ کھڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیٹھے تھے اور کھڑے ہوگئے، بلکہ ان کے اندر ایک عزم پیدا ہو گیا، انھوں نے اعلان کیا کہ "ہمارا پروردگار وہ ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے"۔

"لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهاً لَقَدْ قُلْنَا اِذاً شَطَطاً" ہم اس کے سوا کسی الٰہ، کسی معبود کی پرستش نہیں کریں گے، اگر ہم نے اپنی زبان سے یہ بات نکالی تو بڑی بے جا بات ہوگی، بڑی خلاف واقعہ بات ہوگی "هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ آلِهَةً" یہ ہماری قوم کے لوگ بڑے اچھے سنجیدہ لوگ معلوم ہوتے ہیں، بڑے باوقار لوگ ہیں، تجربہ کار ہیں، اس کے باوجود انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں، "لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ" اس پر کوئی دلیل کیوں نہیں لائے اور کون ہے اس شخص سے بڑا ظالم کہ جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِباً"۔

تین باتیں

یہ میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیتیں پڑھی ہیں، اس کی تشریح کی ہے، اس میں ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہونا چاہئے، بہت بصیرت کے ساتھ، قوت کے ساتھ، ہمارا ایمان اللہ پر، اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "زِدْنَاهُمْ هُدىً" اس سرچشمۂ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہئے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے، کتاب و سنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول اور صحابہ اور مجاہدین اسلام کے حالات سے ہمیں طاقت حاصل کرنا چاہئے، جس طرح کہ بیٹری چارج کی جاتی ہے۔ سیل (Cell) جب ختم ہو جاتے ہیں تو بدلے جاتے ہیں، ہم اور آپ اس مادّی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں، ایسے اساتذہ سے بھی پڑھتے ہیں، جن کو خود بھی پورے طور پر ان دینی و غیبی حقائق پر یقین حاصل نہیں ہوتا، ہمارا دور ایسی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن کو دیکھئے، ریڈیو سنیئے، اخبارات پڑھیے، حتیٰ کہ خالص ادب، جس کو پاک، معصوم اور غیر جانبدار ہونا چاہئے، وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہا، وہ فسق کا ایجنٹ (Agent) بنا ہوا ہے اور بہت ہی سستا ایجنٹ باطل اقدار کا، ہمارا ادب اس وقت مشاطہ بنا ہوا ہے معصیت اور سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا، یہ ساری چیزیں جو ہمارے چاروں طرف دریا کی طرح موجزن ہیں اور دریا میں ہم کو ڈال دیا گیا ہے، ہمارے حالات نے، ہمارے

نظام تعلیم نے، ہم کو اس دریا کے حوالہ کر دیا ہے، پھر اس کا کہنا یہ ہے کہ ؏

"دامن تر مکن ہشیار باش"

خبردار بیٹا دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ "زدناهم هدی" پر غور کریں، ایمان کا چراغ روشن کریں، اور حرارت و محبت پیدا کریں، جس کے بغیر ہم ان نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم ان چیزوں کا مقابلہ خالی نظامِ جماعت اور ضابطۂ اخلاق سے نہیں کر سکتے، تجربہ کی بات بتاتا ہوں کہ زمانہ اتنا جابر واقع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قاہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے (۱)۔

---

(۱) تحفہ دکن ص ۶۰ تا ص ۶۷۔

(۲) حدیث پاکستان ص ۱۲۰ تا ص ۱۲۶ سے مشترک ماخوذ ہے۔

ایمانی دعوت کا ابتدائی مرحلہ

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(سورہ الانفال: ٢٦)

یہ سورہ انفال کی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرماتا ہے "وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْأَرْضِ" یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، برائے نام تھے، انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اور بہت کمزور سمجھے جا رہے تھے، جو کمزور کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے وہ تمھارے ساتھ کیا جاتا تھا، تم کو جو چاہتا تکلیف دیتا، اور جو چاہتا پریشان کرتا، اور تمام روئے زمین پر تم کو کمزور سمجھا جاتا تھا، "تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ" ہر وقت ڈرتے تھے کہ کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے "فَاٰوٰاكُمْ" تو اللہ نے تم کو پناہ دی، "وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ" اور تمھاری مدد کی اپنی نصرت خاص سے، اور تمھاری حفاظت فرمائی اور دستگیری کی، "وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ" اور تم کو عطا کیں بڑی بڑی نعمتیں، "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" تاکہ تم شکر کرو۔

قرآن مجید کی اس آیت پر غور کیجیے اور پہلی صدی ہجری کے ان حالات کو یاد

کیجئے جو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ طیبہ میں پیش آئے تھے۔

دارِ ارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا

جب میں قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھتا ہوں تو ذہن "دارِ ارقم" اور "شعب ابی طالب" کی طرف جاتا ہے، وہ "دارِ ارقم" کون سی جگہ تھی؟ "دارِ ارقم" وہ گھر تھا جس میں مسلمان کفار کی اذیت سے اور ان کی سنگدلی سے اور ان کے وحشتناک معاملات سے بچنے کے لئے، اللہ کا نام اطمینان کے ساتھ لینے اور نماز ادا کرنے کے لئے پناہ لیتے تھے، اور بہت بڑے بڑے جلیل القدر نامی گرامی صحابی وہیں جاکر اسلام لائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ بھی وہیں گئے اور انھوں نے بھی کلمہ پڑھا۔ یہ تھا "دارِ ارقم" جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا۔

اور "شعب ابی طالب" وہ جگہ تھی جہاں حضور ﷺ اور صحابۂ کرام کو پناہ لینی پڑی اور ان کا مقاطعہ اور بائیکاٹ کیا گیا تاکہ کوئی سودا بیچنے والا ان کے پاس نہ پہونچے، کوئی غذائی سامان نہ پہونچائے، لیکن اس میں بعض بعض شریف انسان مکہ مکرمہ کے تھے، جو کسی طرح سے کچھ غذا پہونچا دیتے جس سے ان کی زندگی قائم رہے، ورنہ ان کی موت کا پورا سامان کیا گیا تھا، اور چاروں طرف ایسے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے اور ایسا حصار قائم کیا گیا تھا کہ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ اور تعلق نہ پیدا ہو پائے، یہ تھا اس وقت کا نقشہ!

قرآن مجید مسلمانوں کو مخاطب کر کے (جن کی تعداد اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی) کہتا ہے "اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ" جب تم تھوڑے

تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، "تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ" ہر وقت ڈرتے تھے کہ تم کو کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے جائے، (یہاں پر قرآن مجید نے "تَخَطُّفْ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی جھپٹا مارنا اور اڑا کر لے جانا ہیں) حالت یہ تھی کہ تم لقمۂ تر تھے، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو چھوڑیئے کہ حجاز بلکہ قریش کا قبیلہ ہمیشہ کے لئے اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی ہوتا، قرآن مجید کے اندر مندرجہ ذیل آیت میں پھونک مار کر بجھانے کی تعبیر استعمال کی گئی ہے:

"يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَاللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ"

یہ صرف ادبی لفظ نہیں، اس کے سارے الفاظ معجز ہیں، اس لفظ میں ایک سچی اور صحیح تصویر ہے، حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کا چراغ اور اسلام کے چراغِ نور کو ہر وقت گُل کیا جا سکتا تھا، اس کے بجھانے کے لئے کسی پنکھے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ وہ منہ کی پھونک سے بجھایا جا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے دو تین جگہ قرآن مجید میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے حالات کی صحیح اور سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَاٰوٰكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" اور تم کو پناہ دی، اور تم کو نصرتِ خداوندی اور آسمانی مدد کے ذریعہ تمھاری تائید کی، اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے حلال و پاک چیزوں میں سے تم کو عطا فرمایا تاکہ تم شکر ادا کرو، "طیبات" کا لفظ عام ہے، سلطنت سے لے کر مطلق العنان و با اختیار سلطنت تک اور سلطنت کے دنوں میں جو عزت ہوتی ہے، جو اعزاز و اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جو قانون سازی کی طاقت،

آزادی و خود مختاری اور بلندی و برتری حاصل ہوتی ہے، یہ سب "طیبات" میں آتا ہے۔

"وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"

کہ شاید تم شکر کرو، اور تمھارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

جب تک یہ آیت پڑھی جائے گی، جو لوگ سیرت پاک سے واقف ہیں یا آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک پڑھیں گے اور جنھوں نے اسلام کی تاریخ پڑھی ہے اور ادیان کی بھی تاریخ پڑھی ہے، مذاہب و انقلابات کی تاریخ پڑھی ہے ان کو "دارِ ارقم" ضرور یاد آئے گا۔(۱)

(۱) دو مختلف تقریروں سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

(۱) زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو۔ (دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقعہ پر)۔

(۲) دارِ ارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا۔ (تعمیر حیات ۲۵؍مارچ ۱۹۹۴ء)

یقین و ایمان کا سودا

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھٰجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُوْلٰئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَۃَ اللّٰہِ.

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت اور محنت کی،
راہِ خدا میں وہی اُمیدوار ہو سکتے ہیں رحمت حق کے)

گوہرِ مقصود۔ یوں ہاتھ نہیں آتا!

سارے علم و مطالعہ، عبادات و ریاضات اور ساری اصلاح و تربیت کا مقصود و ماحصل معرفت اور یقین ہے، لیکن یہ معرفت و یقین کوئی ایسا گرا پڑا مال نہیں ہے جو راستہ چلتے مل جائے ہم اپنے مشاغل اور تفریحات، اپنی معاشی جدوجہد، اپنی خواہشات کی تکمیل اور زندگی کے لگے بندھے نظام میں مشغول رہیں اور یہ گوہر مقصود ہمارے ہاتھ آجائے۔ یہ بات غیرتِ خداوندی کے خلاف ہے، نعمتِ ایمان اور دولتِ یقین کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر کسی کے گلے لگا دی جائے، چاہے اس کو اس کی طلب ہو چاہے نہ ہو، چاہے اس کو اس کی قدر ہو چاہے نہ ہو۔ قرآن شریف میں ایک پیغمبر کی زبان سے آتا ہے۔ "أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ"۔ (کیا ہم

ایمان کی دولت تمھارے گلے لگا دیں گے چاہے تم اس کو ناپسند کرتے ہو)۔ اس کے لئے بند ہمتوں اور حقیقت شناسوں نے بڑے بڑے ہفتِ خواں سر کئے ہیں، سمندر کھنگالے ہیں پھر گوہر مقصود ہاتھ آیا ہے۔ ایک امام غزالیؒ ہی کی مثال لیجئے...... وہ امام غزالیؒ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی بادشاہی عطا فرما رکھی تھی اور جو بوریے پر بیٹھ کر بادشاہت کر رہے تھے ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ میرے اندر جو یقین ہونا چاہئے وہ نہیں ہے...... آخر میں اس پوری شان و شوکت کو ٹھکرا کر چلے گئے کہ جب تک وہ یقین کی کیفیت میرے اندر پیدا نہیں ہوگی میں واپس نہیں آؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"

جو اللہ کے راستے میں نکلتا ہے اللہ اس کی مدد فرماتا ہے خدا نے ان کو ان کی جستجو میں کامیاب کیا اور وہ دولت عطا کی جس کی ان کو تلاش تھی، وہ ایسا یقین لے کر آئے اور ایسی معرفت لائے جو آج بھی ہزاروں نہیں لاکھوں دلوں کو گرما رہی ہے آج بھی اس سے ایمانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے صدقِ طلب کی ان کو یہ جزا عطا فرمائی، یہ صلہ دیا کہ خود بھی ان کو یقین عطا فرمایا اور دوسروں میں یقین پیدا کرنے کی بھی ان میں طاقت پیدا کر دی، وہ ہزاروں آدمیوں کے یقین کا سبب بن گئے۔

اسی طرح مولانا خالد رومی کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی اور ان کو اپنے اندر ایک باطنی خلا محسوس ہوا کہ سب کچھ ہے، باہر سے عالموں کا لباس ہے، عالموں کی زبان ہے، عالموں کا دماغ ہے، عالموں کا علم ہے، کتب خانہ کا کتب خانہ

میرے دل میں بھرا ہوا ہے لیکن جو چیز ہونی چاہئے وہ نہیں ہے، میرے اندر وہ احسانی کیفیت جس کا داعی حضورؐ کا ارشاد "أن تعبدالله کأنك تراه" (تمھاری عبادت ایسی ہونی چاہئے گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو) اس سے میرا دل خالی ہے۔

جب حضورؐ سے حضرت جبرئیل نے پوچھا:- ماالاحسان (احسان کسے کہتے ہیں، کمال کیا ہے) فرمایا "أن تعبدالله کانك تراه" (تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور مشاہدہ کر رہے ہو) "فان لم تکن تراه" اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو پھر خیال کرو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے (فانه يراك)۔

خالد رومی کو بھی اسی شدید احساس نے بے چین و مضطرب کر رکھا تھا اور اس کی ان کو ہر وقت فکر رہتی تھی کہ میں پڑھتا ہوں پڑھاتا ہوں، قال اللہ اور قال الرسول میری زبان پر رہتا ہے لیکن میرے اندر جس درجہ کا یقین ہونا چاہئے، میرے اندر جو سوز ہونا چاہئے، میرے اندر دین کی جو تڑپ ہونی چاہئے، میرے اندر جو مشاہدہ کی کیفیت ہونی چاہئے، میرے اندر جو احسانی کیفیت ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہے۔

یہ احسانی کیفیت، یہ مشاہدہ، یہ تڑپ اور بے چینی، اور یقین و توکل کی وہ طاقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ایک ایسے صاحبِ یقین، مرد باخدا کی صحبت درکار ہے جو بڑے سے بڑے یقین سے خالی دل کو بھی یقین کی دولت بخش سکے، اس کے لئے ایک ایسے یقین و ایمان سے معمور ماحول کی ضرورت ہے جس میں آکر بڑے سے بڑا تشکیک و تذبذب سے مارا ہوا انسان یقین و ایمان کی دولت سے سرفراز ہو جائے...... ان کو یہ معلوم ہوا کہ اس وقت دہلی میں اللہ کا ایک بندہ

ہے جو یقین کا سودا بیچتا ہے، جو یقین کی دولت بانٹتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے سے قلب گرما جاتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے سے یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، تو اس اللہ کے نیک بندے کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش نے ان پر اپنے بستر پر میٹھی نیند حرام کر دی، اب ان کا جی نہیں لگتا تھا، بس وہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے ...... چنانچہ وہ اس خانقاہ میں ایسے پڑے اور ماسوا سے ایسے کٹے کہ وہ دولت لے ہی کر اُٹھے اور خدا نے ان کی طلبِ صادق اور محنت شاقہ سے ان کو ایسا سر فراز کیا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب کے خلفاء کبار میں ہوئے ...... شاہ غلام صاحب نے ان کو رخصت کیا اور پورے عراق، کردستان، اور ترکی کی اصلاح کا کام سونپا۔ اور جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ "مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا"۔ اللہ تعالیٰ نے خالد رومی کو اس آیت کا مصداق بنا دیا۔ ڈیڑھ سو برس ہو گئے لیکن آج بھی ان کا نام زندہ اور ان کے ہی صدقے سے ان علاقوں میں دین کی بہار ہے ...... یہ اس اخلاص کی برکت ہے اور اس طلب کی برکت ہے جو شاہ غلام علی صاحب کے پاس مولانا خالد رومی لے کر آئے تھے۔

رحمت الٰہی کے امیدوار

میں نے شروع میں پڑھا "إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ أُولٰئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللهِ"۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کے راستے میں اپنا گھر بار چھوڑا اور اللہ کے راستے میں انتہائی کوششیں کیں، وہی

لوگ کچھ اُمید کر سکتے ہیں اللہ کی رحمت کی......! "رحمت" کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے کہ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے تو اس سے ایک ایسی رحمتِ مطلق مراد ہوتی ہے جو غیر معین اور غیر محدود، زمان و مکان کی تمام پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں علم ہے، اس میں معرفت ہے، اس میں یقین ہے، اس میں تقویٰ ہے، اس میں احسان ہے، اس میں مقبولیت ہے، اس میں محبوبیت ہے، اس میں کرامت ہے، اس میں خوارق ہیں، اس میں نصرت ہے، اس میں تائید ہے، اس میں غلبہ ہے، اس میں عزت ہے سب کچھ اس میں آتا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے "رحمت" کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے ورنہ ہو سکتا تھا "اولئك يرجون الرحمة" فرما دیتا، تاکہ معلوم ہو کہ یہ رحمتِ الٰہی کیسی ہوگی۔ وہ کوئی ایسی ویسی رحمت نہ ہوگی۔ ایک عام آدمی کی مہربانی بھی مہربانی ہے، ایک امیر آدمی کی مہربانی اس سے زیادہ ہوتی ہے، ایک بادشاہ کی مہربانی اس سے بڑھ کر ہوتی ہے لیکن اللہ کی مہربانی کا کیا کہنا "مالا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علىٰ قلب بشر" کوئی قیاس وہاں تک نہیں پہونچ سکتا اور اس میں کوئی حدود قائم نہیں ہو سکتے کہ اتنی اور اتنی دور، یہاں سے وہاں تک، کوئی اس کا رقبہ نہیں، کوئی اس کی پیمائش نہیں، کوئی اس کا عمق اور اس کا کوئی عرض و طول نہیں، یہاں تک کہ کوئی اس کا نام نہیں۔ بس وہ اللہ جس طرح چاہے۔ جیسے کہ روزے کے لئے ہے کہ "الصوم لي وأنا أجزي به" روزہ خاص میرے ہی لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا- اب کیا بدلہ لیں گے؟ بس میں جانوں کہ میں کیا بدلہ دوں گا۔ بدلہ جس کو ملے وہ اس کو سمجھ سکتا ہے یا جو دینے والا ہے وہ جانے۔ ایسے ہی یہاں بھی "اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ"۔ کس

شکل میں اللہ کی رحمت ظاہر ہو گی۔ جماعت کے ساتھ کیا ہو گی۔ فرد کے ساتھ کیا ہو گی، امت کے ساتھ کیا ہو گی۔ ملک کے ساتھ کیا ہو گی، زمانہ کے ساتھ کیا ہو گی؟ کوئی نہیں بتلا سکتا-! وہ فرماتا ہے مگر اس کے لئے شرط کیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" ایمانؔ، ہجرتؔ، جہادؔ- تین چیزیں ہوں اس کے بعد أولئك يرجون رحمة الله۔ "اُولٰئک" کو مقدم کہا۔ وہ ہی کچھ امید کر سکتے ہیں اللہ کی رحمت کی، وہ ہی کچھ اللہ کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں، اس کے منتظر رہ سکتے ہیں ......! مگر پہلے پیاس تو ہو۔ طلب تو ہو، اپنے اندر کمی کا احساس تو ہو۔ یہ شرط پائی جائے تو خدا کی رحمت خود دستگیری کے لئے بڑھتی ہے "جاهدوا فینا" کی توفیق عطا ہوتی ہے اور انسان امام غزالی، مولانا خالد رومی اور اصحاب نبیؐ کی صفات و اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین (۱)

"حقیقت یہ ہے کہ ذاتی جدوجہد اور شخصی عزم کے بغیر دین اور علم دین کے صحیح ثمرات حاصل نہیں ہونے پاتے ...... دین کی اللہ کے یہاں جو قدر ہے اس کے اور اللہ کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی کو بلا طلب مل جائے! بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رحمت کو اپنے راستہ میں جدوجہد کے ساتھ وابستہ کیا ہے"۔

(ایک اہم دینی دعوت۔ صفحہ ۱۲)

---

(۱) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔ بابت شوال، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

دینی سرحدوں کی حفاظت

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ.

(آل عمران۔ ۲۰۰)

اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے:۔

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، "وَصَابِرُوْا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کا ماحول پیدا کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کی ترغیب دو، "وَرَابِطُوْا" اور جمے رہو، سرحد کی حفاظت کرو، سرحدوں پر جمے رہو، "وَاتَّقُو اللّٰہَ" اور اللہ سے ڈرو، احتیاط سے کام لو، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر کام کیا کرو، "لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" تاکہ تم کامیاب ہو!

"صبر" کے معنی

اس آیت میں پہلا جو حکم ہے اور جو پہلا خطاب ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو، "صبر" عربی کا لفظ ہے، اور ایسا ہوتا ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے اور بہت لمبا سفر کرتا ہے، اور وہ

سفر مکانی بھی ہوتا ہے یعنی بہت دور سے آتا ہے وہ لفظ، اور بہت دور تک جاتا ہے، اور وہ سفر زمانی بھی ہوتا ہے کہ کہیں اس کو آج ہزار برس ہو گئے!

اب عربی زبان ہندوستان میں کب آئی تھی اور کب سے یہ لفظ "صبر" کا داخل ہوا اور مسلمانوں کی زبان پر چڑھا، مسلمانوں کے قلم سے نکلا، مسلمانوں کی گفتگوؤں میں آیا، اس کو بھی بارہ سو برس گذرے ہوں گے۔

تو جب کوئی لفظ کسی زبان میں جاتا ہے اور لمبا سفر طے کر کے کسی زمانہ میں پہنچتا ہے، کسی دور کے لوگوں تک پہنچتا ہے، تو اسکے معنیٰ میں کچھ فرق آ جاتا ہے، یا معنیٰ محدود ہو جاتے ہیں، یعنی وہ لفظ بہت وسیع تھا، وہ بہت پھیلا ہوا تھا، اور بڑے میدان کو اور رقبے کو گھیرتا تھا اور سب زندگی کی چیزوں پر، زندگی کے شعبوں پر وہ محیط تھا، اور وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

"صبر" بھی ان ہی لفظوں میں سے ہے!!

یہ جس کے ساتھ تھوڑی سی حق تلفی، ناانصافی ہوئی مگر اس نے صبر سے کام لیا، اور وہ یہ کہ صبر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اگر کوئی صدمہ پڑ جائے، کوئی حادثہ پیش آ جائے، کوئی ناانصافی ہو، کوئی تکلیف ہو تو زیادہ روؤ دھوؤ نہیں، زیادہ شکایت نہ کرو!۔ لیکن عربی میں "صبر" کے معنیٰ اس سے بہت وسیع ہیں، "صبر" کے معنیٰ ہیں جم جانا، پختہ رہنا، اور مقابلہ کرنا، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ چھوڑنا۔ یہ معنیٰ ہیں "صبر" کے عربی میں۔

''صابروا'' کی حکمت

اس آیت میں ''اصبروا'' کے ساتھ ''صابروا'' کی ہدایت وتلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام وملل کی زندگی اور قوموں کے عروج وزوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر واستقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر واستقامت اور ہمت واستقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر ومستقیم اور دوسروں کے لئے صبر واستقامت کا داعی ومبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان ویقین، اس کا صبر وتوکل، اس کا عزم وحوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند ومستحکم ہو جائیں۔ اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد وتذبذب کے ماحول اور خوف وہراس کے عالم میں صبر وہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت،

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یا ایھا الذین آمنوا! اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ''اِصبروا'' صبر سے اور قوت برداشت سے کام لو۔ اور پھر قرآن کا معجزہ ہے، جو عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ باب مفاعلہ لازم چیزوں کے لئے اور جو ذاتی چیزیں ہیں ان کے ساتھ یہ باب بہت کم آتا ہے، وہ متعدی چیزوں کے ساتھ آتا ہے جیسے ''مقاتلہ'' ایک دوسرے سے لڑنا، ''محاربۃ'' ایک دوسرے سے

جنگ کرنا، "مناصرۃ" ایک دوسرے کی مدد کرنا، لیکن یہاں "صبر" جو ایک ذاتی فعل اور ایک ذاتی اقدام اور ذاتی طرز عمل ہے، اس کے لئے مفاعلہ کا صیغہ ہے، "وصابروا" اور صبر کی فضا پیدا کرو۔ صبر کی تلقین کرو، قوت برداشت کا مظاہرہ مردانہ وار، بہادرانہ اور صابرانہ طریقے پر تم نے اسے برداشت کیا ہے لیکن اس کو جائز قرار نہیں دیا، ایک برداشت کرنے کے معنی ہماری اردو میں یہ بھی ہوتے ہیں، اچھا بھائی ہو گیا کیا کیا جائے مجبوری ہے، یہ نہیں۔

تم نے اسے برداشت کر لیا، اسے سہہ لیا اور اس کے بعد تم وہی کے وہی رہے، تمھاری قوت ایمانی وہی ہے، تمھارے اعتقادات وہی ہیں، تمھارے توکل علی اللہ کی کیفیت وہی ہے، اور اللہ کو قادر مطلق ماننے کی تمھاری صفت وہی ہے، تو ارشاد ہے "وصابروا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، یعنی صبر کا شامیانہ تمھارے سروں پر چھایا نظر آئے، صبر کے بادل کا سایہ تمھارے سروں پر رہے اور جو دیکھے وہ کہے کہ یہ امت بڑی قوت برداشت والی ہے، اس میں بڑی قوت مقابلہ ہے، لیکن اسے کسی حکمت کی بناء پر اور اللہ کی مدد کے انتظار میں، اور انسانی محبت و برادری کا اور ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اور حدود سے تجاوز نہ ہو، اس کے لئے اسے ایک مناسب وقت کا انتظار ہے، یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ہماری مان لی، گر گئے، پاؤں کے نیچے پڑ گئے، نہیں "وصابروا" صبر کی فضا چھائی ہو، اور معلوم ہو کہ اس کے اندر بڑی قوت مقابلہ ہے، یہ قوت مقابلہ بیرونی حملوں کے لئے نہیں بلکہ اندرونی حملوں کے لئے بھی ہے، جی اس وقت بھی چاہتا ہے کہ ماریں اور مر جائیں، لیکن انھوں نے اپنے کو قابو میں رکھا ہے، مفاد عامہ ان کے سامنے ہے، ان کے

سامنے ملک کی مصلحت ہے، ان کے سامنے پڑوسیوں کے حقوق ہیں، ان کے سامنے ظلم و سفاکی اور خونریزی کی قباحت ہے، ان کو ایمانی طاقت روک رہی ہے، ان کا ایمان ان کو روک رہاہے، ان کو جو تربیت دی گئی ہے، ان کے سامنے جو اسوۂ رسول ہے جو صحابہ کا نمونہ ہے، وہ ان کو روک رہاہے، ورنہ یہ میدان میں آجائیں، یہ بھی بتاسکتے ہیں، کہ یہ کیا کر سکتے ہیں- اور دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک قلیل گروہ نے کیا کیا، اقلیت نے کیا کیا، چند آدمیوں نے کیا کر لیا، ملک کے ملک تباہ کر کے رکھ دیئے، جلا کر کے رکھ دیا، خاک کر کے رکھ دیا، "وصابروا" صبر ہی کافی نہیں تم امت ہو فرد نہیں ہو، تمھارے لئے امت کے احکام ہیں، تمھارے لئے ارشاد خداوندی ہے، فرمان نبویؐ ہے، اسوۂ رسولؐ ہے، تم اپنی مرضی کے مختار نہیں ہو، غصہ آیا جوش آیا، کھڑے ہوئے، قریب کا گھر تھا، پڑوسی کا گھر تھا، اسے جلا دیا، اپنا غصہ نکالنے اور اس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تم نے اسے جلایا، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے آگ نہیں لگائی جاتی، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے زیادہ حکیمانہ، زیادہ مشفقانہ، زیادہ مصلحت اندیشانہ، زیادہ مبصرانہ افعال ہوتے ہیں طرز عمل ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اعجاز ہے کہ آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو۔ "وصابروا" اور جمے رہو، دیوار بنے رہو، ان فسادات، ان نازک حالات، ان حملوں، تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلہ میں چھاؤنی بنے رہو۔

حفاظت دین وملت کا مورچہ

پھر فرمایا "ورابطوا" (اور مورچوں پر جمے رہو)

"رباط" کہتے ہیں ایسی مامون اور محفوظ جگہ کو جہاں لوگ مل جل کر رہیں، "ورابطوا" اور جمے رہو، اور دیوار بنے رہو، ان کے سامنے تم چھاؤنی معلوم ہو اور پھر آخر میں فرمایا، اور یہی فرق ہے کسی قائد کی تلقین، کسی سیاسی رہنما کی تلقین میں، کسی سیاسی مبصر اور فلسفی کی تلقین میں، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلقین میں، کوئی اور ہوتا تو بس یہیں تک کہتا کہ: "یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا" اور یہ بھی کہہ دیتا "ورابطوا" اور جمے رہو، سیسے کی دیوار اور پہاڑ بنے رہو، لیکن "واتقوا اللہ" یہ اللہ کہے گا، اور اس کا رسول کہے گا، اور یہ فرق ہے اس دین میں جو اللہ کی طرف سے آیا، اور اس کے پیغمبر نے پہونچایا، اور اس فلسفہ، اس رہنمائی، اس قیادت میں جو انسان اپنے تجربہ، اپنے حالات، اپنی خواہشات، اپنی قوم و جماعت کے مطابق قیادت کا جو نقشہ پیش کرتا ہے، اس میں فرق ہے، کوئی نہیں کہتا سوائے اللہ اور اس کے رسول کے اور اس کے کلام کے "واتقوا اللہ"......! یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا تھا، یہ تو صبر کی تلقین کی جارہی ہے، اور صبر کے معنیٰ ہیں کسی نے حملہ کیا ہے، کسی نے زیادتی کی ہے، اور کوئی ہمارے مقابلہ میں ظالم ہے، اس موقع پر نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ سے ڈرو، پہلے کہے، بعد میں کہے، قرآن شریف کی تفسیر میں کہے- لیکن ایسے موقع پر کہ ہمارے سامنے ایک طاقت ہو اور وہ طاقت تمام حدود کو پار کر رہی ہو، نہ عورتوں کی عصمت

مانع ہے، نہ بوڑھوں اور ضعیف العمر کی ضعیفی مانع ہے، نہ ان کی پیرانہ سالی مانع ہے، نہ پڑوسی کا پڑوس مانع ہے، نہ پڑھے لکھے کا علم مانع ہے، جیسا کہ آپ نے اخبار میں دیکھا اور پڑھا، اس موقع پر "واتقوا اللہ" کہنا، یہ بس خدا ہی کہہ سکتا ہے، اور خدا کا رسول کہہ سکتا ہے اور دنیا میں جتنے لٹریچر ہیں میں ان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا نہیں، یہ موقع تو ہے کہ ان کو سبق دو، ان سے منوالو کہ یہ تمھارے قدموں پر گر جائیں، اور کچھ پرواہ نہ کرو، تمام حدود پار کر جاؤ، جو کچھ کر سکتے ہو کرلو، یہ موقع اس کے کہنے کا تو ہوتا ہے، لیکن یہ شریعتِ الٰہی، تعلیماتِ نبوی، دین سماوی کا اعجاز ہے کہ اس موقع پر کہا کہ جب تمھیں موقع ملے تو یاد رکھو "اتقوا اللہ" اللہ سے ڈرو بھی، ان کی طرح تم بے احتیاطی، ان کی طرح تم حدود سے تجاوز، ان کی طرح تم درندگی، ان کی طرح حقائق سے چشم پوشی، ان کی طرح ملک، ماحول و معاشرہ اور بستی، حال و مستقبل اور وقت سے آنکھیں بند کر لینا، یہ تمھارا کام نہیں، "واتقوا اللہ" تم حدود الٰہی اور حدود شرعی کے پابند ہو، اس سے آگے تم نہیں بڑھ سکتے، بس میرے بھائیو! یہ ہمارے لئے پوری تلقین اور ہدایت نامہ ہے(۱)۔

اس آیت کو ہم اپنے دل پر لکھ لیں

"...... ہم آپ سب قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں، اور قرآن مجید کو خدا کا معجزہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور اللہ کا کلام سمجھتے ہیں، لیکن سب یہ حقیقت نہیں جانتے، اور اس حقیقت کے نہ جاننے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ علم

کے درجے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید مجموعی اور کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے، لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مستقل ایک معجزہ ہے، اور اس کا اعجاز مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے، کہ آفتاب کی مثال دینی بھی بے ادبی ہے اور میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کی جو آیت پڑھی ہے، بالکل یہ ایک اعجاز کامل ہے۔

...... اس کا حال بھی یہی ہے کہ یہ جب سے نازل ہوئی ہے، کوئی گن نہیں سکتا کہ کب کب اور کیسے کیسے موقعوں پر اور مایوسی کے عالم میں اس نے رہنمائی کی، اور مسلمانوں میں ایک روحانی، جسمانی، قلبی اور ذہنی، فکری اور دعوتی طاقت پیدا کر دی۔

اس آیت کو اگر ہم اپنے دل پر رکھ لیں اور ہمارا ذہن اس کو قبول کر لے اور اللہ توفیق دے تو ہر زمانہ کے لئے یہ پورا پیغام رکھتی ہے اور اس زمانہ میں خاص طور سے ایسا معجزہ معلوم ہوتا جیسے اسی زمانہ میں اُتری ہو اور ان ہی لوگوں سے خطاب ہو۔"(۲)۔

---

(۱) تعمیر حیات جلد ۳۰ شمارہ ۸ (۲۵ر فروری ۱۹۹۳ء

(۲) تعمیر حیات جلد ۳۴ شمارہ ۱۵ (۱۰ر جون ۱۹۹۷ء۔ دو مختلف تقریروں سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

مسلمان کا مقام اور پیغام

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَلاَ تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ. (آل عمران۔ ۱۳۹)

اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، غالب تمھیں رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

تو "ہما" کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری(۱)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام دور طفولیت میں تھا، اس وقت تک کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، اسلام جزیرۃ العرب اور عربوں ہی میں محدود و محصور تھا، عرب نہایت عسرت و تنگی اور فقر و فاقہ کی زندگی گذار رہے تھے، ان کا کھانا عام طور پر کھجور، اونٹ کا گوشت اور جو کی روٹی تھا، لباس موٹا جھوٹا

---

(۱) یہ اقبال کا مصرعہ ہے، پورا شعر اس طرح ہے ؎

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری　　　نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

اقبال کا مخاطب وہ مرد مسلمان ہے جو خودی کے وصف سے آراستہ ہو۔

اور کھردرا، مکانات خام اور مٹی کے تھے، یا ادنیٰ خیمہ کی شکل میں، ان کا حال زار موسم سرما کی شبِ باراں میں بھیگی اور ٹھنڈک سے ٹھٹھری اور سمٹی ہوئی بکریوں کے گلہ کا سا تھا، جس کو جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں، عربوں کی اس زبوں حالی کی صحیح اور سچی تصویر کشی قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی اور نہیں کر سکتا، آپ قرآن کے یہ الفاظ پڑھئے اور عربوں کی بیچارگی و بے کسی کا عالم دیکھئے، قرآن کے الفاظ ہیں۔

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ. (الانفال ۲۶)

اور تم اس حالت کو یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ لیں۔

عربوں کا تو یہ حال تھا، اور ان کے برعکس روم و فارس دنیا کے حاکم و فرمانروا تھے، وہ تہذیب و تمدن کے بام عروج پر تھے، پوری دنیائے انسانیت ان کے زیر اثر و تابع فرمان تھی، ان دو بڑی طاقتوں نے مشرق و مغرب کو باہم بانٹ رکھا تھا، مشرق اہل ایران کے زیر فرمان تھا، اور مغرب رومیوں کے، یہ زندگی کے مزے اڑا رہے تھے، دنیا کا دامن ان کے لئے وسیع و کشادہ تھا، ضروریات زندگی کی فراوانی تھی، رزق کے دہانے کھلے ہوئے تھے، کائنات ان کے لئے جود و سخا کا مینھہ برسا رہی تھی، ممالک و اقوام ان کے زیر فرمان تھے، اور انھیں کے چشم و ابرو کے اشارے پر چل رہے تھے، ان کا ہاتھ مٹی کو لگ جاتا تھا تو سونا بن جاتی تھی، مشرق و مغرب پر انھیں کا پرچم لہرا رہا تھا۔

اس تیرہ و تاریک فضا میں، یاس و ناامیدی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا، آس اور امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں

آرہی تھی، قرآن مجید طاقت کی متوالی ان دونوں حکومتوں کو چیلنج کرتا ہے، اور لٹے پٹے عرب مسلمانوں میں اعتماد و افتخار کی روح پھونکتا ہے اور کہتا ہے۔

وَلاَ تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ.

اور ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

قرآن نے قریش مکہ کو چیلنج کیا، روم و فارس کے امپائر کو چیلنج کیا، پھر اس مٹھی بھر جماعت مسلمہ کے قائد و رہبر نبی مرسل محمد ﷺ کی تسکین و تسلی کے لئے سورہ یوسف نازل ہوئی، قرآن مجید نے اعلان کیا۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهِ ايَاتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ.(۱)

وہ جو پوچھتے ہیں ان کے لئے نشانیاں ہیں، یوسف اور ان کے بھائیوں (کے قصے) میں۔

اس سورہ کو ان الفاظ پر ختم فرمایا۔

حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَائَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ. مَا كَانَ حَدِيْثاً يُّفْتَرىٰ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدىً وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ.(۲)

یہاں تک کہ پیغمبر ناامید ہوگئے اور ان کو گمان غالب ہوگیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہونچی پھر ہم نے جس کو چاہا بچالیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ٹلتا، ان کے قصوں میں سمجھدار لوگوں کے لئے عبرت ہے یہ قرآن کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں ہو چکی ہیں، یہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر ضروری بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت و رحمت ہے۔

---

(۱) یوسف: ۷ (۲) یوسف: ۱۱۰-۱۱۱

اسی طرح سورۂ قصص کی یہ آواز دنیا کی فضاؤں میں گونجی، اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو ظلم و جور اور خوف و ہراس کی تاریک فضا میں نازل فرمایا۔

طٰسٓمّٓ. تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ. نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَ هُمْ. اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ. وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ. وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ.

(سورہ قصص: ۱ تا ۶)

طسم۔ یہ کتاب واضح کی آیتیں ہیں، ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا، اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسموں میں بانٹ رکھا تھا، ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا، اس طرح سے کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا، اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، واقعی وہ بڑا مفسد تھا، اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زور گھٹایا جا رہا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو مالک بنائیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں، اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان کی جانب سے وہ واقعات دکھلائیں جس سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔

ایسے پُر خطر و نازک حالات میں کسے خیر کی امید ہو سکتی تھی، کس کا دل و جگر تھا، جو پیشین گوئی کرتا کہ مسلمانوں کی یہ کمزور و بے حقیقت جماعت، ظلم و جور کی ماری ہوئی ہر قسم کے وسائل سے خالی اور تہی دست جماعت، افق پر ابھرے گی، کیا

دنیا کا بڑے سے بڑا شخص خواہ کتنی ہی دور بیں نگاہ اور فراست رکھتا ہو، اور کتنا ہی جری اور عقابی صلاحیتوں سے مالامال ہو، مسلمانوں کی اس مٹھی بھر کمزور و بے حیثیت جماعت کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"؟۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

لیکن اس اعتماد و یقین نے عربوں کے سینے کو جرأت و حوصلہ اور جوش و ولولہ سے بھر دیا تھا، اور انھیں ایسی عقابی روح عطا کی تھی کہ وہ ان بڑی بڑی طاقتوں کو سجی سجائی بے جان گڑیوں کی طرح دیکھ رہے تھے، یہ طاقتیں ان کو کرم خوردہ ستون اور بے جان ڈھانچے معلوم ہو رہی تھیں، قرآن کریم ان بے روح حکومتوں کی بالکل سچی تصویر کشی کرتا ہے، اور قرآن سے بڑھ کر صحیح تصویر کشی کون کر سکتا ہے؟ ذرا قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑھئے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ. وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ. كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ.

(منافقون: ۴)

اور جب آپ انھیں دیکھیں تو ان کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر یہ باتیں کریں تو آپ ان کی باتیں غور سے سننے لگیں (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) گویا یہ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی ہیں۔

یہی کمزور و بے مایہ عرب جب دولتِ ایمان و یقین کو سینے سے لگا کر اس پر فخر و ناز کرتے ہوئے جزیرۃ العرب سے باہر نکلے تو یہ بڑی بڑی طاقتیں ان کو ہیچ نظر

آئیں اور انھیں تہ و بالا کر کے رکھ دیا اقبالؔ کے الفاظ میں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو　　عجب چیز ہے لذت آشنائی

یہ عرب جب دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے ہیں، بلکہ انسانیت کا نجات دہندہ بن کر نکلے، اس مقصد سے نکلے کہ انسانیت کو وحشت و بربریت کے چنگل سے چھڑائیں اور انسانیت کو اس ظلم و جور سے نجات دلائیں جو صدیوں سے جاری تھا، تب ان پر وہ حقیقت کھلی جو اوپر بیان ہوئی، وہ جب لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت و اطاعت کی طرف بلانے کے لئے نکلے، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف لانے کی غرض سے نکلے، ادیان و مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلامی عدل و انصاف کی طرف بلانے کے مقصد سے نکلے، تو یہ بے روح جاہ و جلال ان کو ہیچ نظر آئے، بڑی بڑی حکومتیں ان کو کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہوئیں، ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بچوں کا کھیل معلوم ہوا، آسمان سے باتیں کرنے والی فلک بوس عمارتیں ان کو خس و خاشاک کا ایک تودہ معلوم ہوئیں، بڑے بڑے لشکر ان کو بھیڑ بکری کا گلہ معلوم ہوتے، انھوں نے ان کو غیر عاقل اور بے شعور جانور سمجھا جس میں نہ رحم و کرم کا مادہ ہے، نہ لطف و مہربانی کا جذبہ، وہ انھیں انسانوں کی شکل میں بھیڑیئے اور درندے نظر آئے۔

قرآن پاک نے ان اَن پڑھ عربوں کو، قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے عربوں کو، تہذیب و تمدن سے ناآشنا عربوں کو، قوت و طاقت اور حوصلہ سے بھر دیا، انھوں نے ان کے سرد اور خالی دلوں کو اس نعمتِ عظمٰی پر فخر و ناز، خود اعتمادی و

خود شناسی اور رفعت و بلند پروازی کے نئے "سیل" اور نئے مسالہ سے بھر دیا، اس نے ان اشیاء کے خواص واثرات کو جاننے کا ملکہ عطا کیا، وہ ان ساری توانائیوں سے مالا مال ہو کر نکلے اور سارے عالم کو زیر کر لیا، اس لئے نہیں کہ وہ اس کے مالک بن جائیں، نہ اس لئے کہ اس پر حکومت و فرمانروائی کریں، جیسا کہ ان قوموں نے کیا تھا، بلکہ وہ اس لئے نکلے تھے کہ گم کردہ راہ اور در در کی ٹھوکر کھاتی ہوئی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکائیں اور اسے اسلامی عدل و انصاف کے سائے میں لائیں۔

اس فخر واعتماد کے ہم زیادہ مستحق ہیں

اس وقت ہم اقوام متحدہ کے مرکز میں ہیں، آج جب کہ ہم متعدد حکومتوں کی نمائندگی کر رہے ہیں، اس فخر واعتماد کے زیادہ مستحق ہیں، جو ان عربوں کو حاصل تھا، ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ہم کو اس آسمانی آواز میں مخاطب کیا جائے، جس سے وہ مخاطب کئے گئے تھے، "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس وقت عربوں کی کوئی حکومت نہیں تھی، خود جزیرۃ العرب میں ان کی کوئی حکومت نہیں تھی، اسلام کو وجود میں آئے ہوئے دس سال سے زائد ہو چکے تھے، اور وہ ابھی طفل شیر خوار کی طرح دھیرے دھیرے چل رہا تھا، اور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اس کا اہل دیکھا کہ وہ ان الفاظ سے مخاطب کئے جائیں، تو کیا ہم اس خدائی فرمان کے مخاطب بننے کے اہل نہیں جب کہ ہم چالیس ملکوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور اس

وقت ہمارے کثیر التعداد جھنڈے اقوام متحدہ کی عمارت پر یہاں لہرا رہے ہیں، اگرچہ ہم موجودہ عہد کی ایٹمی قوت و شوکت کے مالک نہیں، ہم جدید ترقیات اور علم و تمدن کے میدان میں کوتاہی کا شکار ہیں، اپنی سستی و کاہلی اور باہمی نااتفاقی و انتشار، اور اسلامی تعلیمات کو حقیر سمجھنے اور نعمت اسلامی کی ناقدری کے سبب ان حکومتوں کے معیار پر نہیں ہیں، تاہم دور اول کے عربوں سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں، جن کی ایک حکومت بھی نہ تھی، تو کیا ہم اس آیت کا مخاطب بننے کے لائق نہیں کہ "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" یہ ایمان ہی مومن کی قیمت ہے، ایمان ہی ٹارچ کی اصل قیمت ہے اگر سیلز نہ ہوں تو ٹارچ کی کوئی قیمت نہیں، یہ ایمان ہی وہ پاسنگ ہے کہ اس کو ترازو کے جس پلڑے میں رکھ دیا جائے وہ جھک جاتا ہے، یہ وہی پاسنگ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر ان مبارک الفاظ میں رکھا تھا۔

اللھم ان تھلك ھذه العصابة من اھل الاسلام لا تعبد.(۱)	اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو مٹا دے گا تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔

حضور ﷺ سمجھ گئے کہ اس وقت رجوع و انابت کی ضرورت ہے، آپ کی ذات گرامی وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی تھی، حقیقت حال کو ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، اگر فیصلہ قوت و طاقت یا کثرت تعداد پر ہوتا تو اسلام و مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہ ہوتا، اور روئے زمین پر

---

(۱) مسلم شریف ج ۲ ص ۹۳

اس کا وجود بھی نہ ہوتا، اہلِ بدر کُل تین سو تیرہ تھے، ان کے مد مقابل ہتھیار سے لیس ایک ہزار کا جم غفیر تھا، مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت کفار کے اس لشکر جرار پر کیسے فتحیاب ہو سکتی تھی، اس نازک گھڑی میں حضور ﷺ نے دعا و تضرع کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا، اور بارگاہ ایزدی میں ان الفاظ کے ساتھ دعا و التجا کی "اللھم ان تھلك ھذہ العصابة لن تعبد"۔

جب ہمیں اسلام پر فخر و ناز ہوگا، اسلام ہمارا اور ہم اسلام کے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارا معین و مددگار ہوگا، اور ہمارا محافظ و نگہبان ہوگا، اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے، اور اس کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ. (سورہ محمد: ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جمادے گا۔

لیکن اگر ہم صرف نام کے مسلمان رہے، اور حقیقت اسلام ہم میں نہ پائی گئی تو پھر ہم امیر شکیب ارسلان کے اس جملہ کا مصداق بنیں گے، جو انھوں نے پرانی لیگ آف نیشنز پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ "جمیعۃ اقوام (League of Nations) فنِ عروج کی بحر کی طرح محض نام کی بحر ہے جس میں پانی کا نام و نشان نہیں" اگر ہم بے پانی کا سمندر رہنے تو ہم پر ہزار حیف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں کسی مدد کی امید نہیں رکھنی چاہئے، بارگاہ خداوندی میں تو ایمان ہی کا وزن ہوتا ہے، ایمان ہی کی قدر اور ایمان ہی کا اعتبار ہوتا ہے(۱)۔

(وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ)

---

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں تلخیص از ص ۶۷ تا ص ۷۸

اسلام کے مردانِ باوفا

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَه وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ. وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً.

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انھوں نے (اپنے رویہ میں) کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ (الاحزاب: ۲۳)

قرآن شریف کی یہ آیت

ایک عہد، ایک نسل، ایک تحریک، ایک دعوت، ایک صداقت، ایک بطولت، وفاداری پر اور اسلام کو ایک صحیح شکل میں پیش کرنے پر اور اس کے لئے ہر چیز کو قربان کر دینے پر اس کی پوری تاریخ مجسم طریقہ پر میرے سامنے آگئی ہے۔

جماعت مجاہدین کے کارنامے کی تعریف اس آیت سے بہتر کی نہیں جا سکتی، یہ آیت نہ صرف اس عہد کو یاد دلاتی ہے، بلکہ قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے سامنے ایک نمونہ پیش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ مسلمان کا مقام کیا ہے، اور ہر

مسلمان کا اپنے اپنے عہد میں کیا فریضہ ہے، اور وہ کس چیز کا مکلف ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کن نعمتوں کا نزول اس پر ہوتا ہے، اور اس کی طرف سے قبولیت کا استحقاق کس چیز میں پیدا کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے سامنے اسلام کا معیاری نمونہ سامنے رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْهِ".

(اہل ایمان کی جماعت تو بہت بڑی ہے، اور وہ ایک بڑا دائرہ ہے اس کے اندر بھی تخصیص کر کے فرمایا جارہا ہے کہ اہلِ ایمان میں کچھ مردانِ کار اور اہل عزیمت ایسے ہیں)۔ بلکہ اس کا ترجمہ یوں کر لیجئے کہ اہلِ ایمان تو بہت ہیں، خوش نصیب ہیں، اللہ کے وعدے پر یقین رکھتے ہیں، اور اللہ کے ایسے شیر مرد اور ایسے باہمت اور باحوصلہ لوگ ہیں۔

"صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْهِ" انھوں نے اللہ سے جو عہد اور جو وعدہ کیا تھا سچ کر دکھایا:

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" اور ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو وقت پورا کر چکے اور اللہ کے پاس جا چکے، اللہ کے یہاں ان کو انعام ملے گا، ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ آخرت کا تو کہنا ہی کیا، ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ﴾ اور جن کا ابھی وقت نہیں آیا، وہ انتظار میں ہیں، اور اپنے عہد پر قائم ہیں، ﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾ اور انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

پورا اسلام ایک عہد و معاہدہ کا نام ہے

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں اسلام کی تعریف آگئی ہے،

قرن اول کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک معیاری چیز ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والوں کے لئے یہ ایک نمونۂ عمل ہے اور ایک معیار، اور اللہ کی طرف سے ایک سند ہے، مسلمان اصل میں محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں ہے اس کو ہم مسلمان کہیں گے، ہم اس کے اسلام میں شک نہیں کریں گے، جو کلمہ پڑھے گا۔ ہم اس کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، لیکن اسلام اس پر ختم نہیں ہو جاتا کہ کلمہ پڑھ لیا جائے، مسلمان خاندان میں کوئی بچہ پیدا ہو جائے، پھر عقیقہ ہو، پھر وہ مسلمان کہلائے، اور وہ خود بھی اپنے کو مسلمان کہے۔ یہ کافی نہیں بلکہ "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ". اس نے اللہ کے ساتھ کوئی عہد کیا، یہ اللہ کے ساتھ ایک عہد ہے وہ عہد یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذاریں گے، اس دنیا کا خالق اور رازق، نافع اور ضار وہی ہے، وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے اور کارساز حقیقی اور مالک الملک ہم اسی کو سمجھیں گے۔ کلمہ "لا اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ" بھی ایک عہد اور ایک اعلان ہے کہ ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں زبان قال سے بھی اور زبان حال سے بھی کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والی اور چلانے والی تنہا خدا کی ایک ذات ہے، "الا له الخلق والأمر"۔ (یاد رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے حکم چلانا) وہ اس کا خالق بھی ہے اور منتظم بھی ہے، یہ نہیں کہ پیدا کر دیا اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، یا دوسروں کے حوالہ کر دیا، کہ اب جو کچھ ہو آدمی کی کوششیں ہیں۔ نتائج ہیں، مواقع ہیں، اور اشیاء میں نفع و ضرر کی صلاحیت ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو ایک ایک ذرہ کا مالک ہے، کوئی پتہ بغیر اس کی اجازت کے ہل نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی ذرہ اپنی جگہ سے

ہٹ سکتا ہے، کوئی کام اور کوئی تبدیلی دنیا میں آ نہیں سکتی، نہ قسمتیں بدل سکتی ہیں، نہ حالات بدل سکتے ہیں، جب تک اس کی مرضی اور حکم نہ ہو۔ اصل میں اسلام ایک عہد ہے، اب اس عہد کو دیکھنا ہے، وہ عہد یہ ہے کہ ہم اس دنیا کا پیدا کرنے والا، چلانے والا خدا کو سمجھیں گے، اس کو مالک حقیقی مانیں گے، اور اپنی قسمت اسی کے ہاتھ سمجھیں گے، اور نافع و ضار اسی کو مانیں گے، اس کے سوا کسی کے سامنے نہ سر جھکائیں گے اور نہ کسی کے سامنے احتیاج اور التجا کا ہاتھ اور دامن پھیلائیں گے، یہ ایک عہد ہے، پورا اسلام ایک عہد و معاہدہ کا نام ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جو عہد کر کے بھول جاتے ہیں، ہم بھی عہد کر کے بھول گئے، اس میں صحابہ کرامؓ کی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں، جب کلمہ پڑھا تو ان کو نہ اپنی جان کی پرواہ رہی اور نہ مال کی رہی، نہ اہل و عیال کی پروا، نہ عزت و ذلت کی پرواہ رہی، نہ صحت کی پرواہ رہی اور نہ رزق اور مال کی پرواہ رہی، اور نہ تعریف اور مذمت کی، کسی چیز کی انھیں پروا نہیں رہی۔

یہ وہ بات ہے جو مسلمانوں کو سمجھنی چاہئے خاص طور پر اس ابتلاء و آزمائش کے دور میں سمجھنا چاہئے کہ ...... یہ اسلام جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز فرمایا ہے اور ہم پر احسان فرمایا ہے، اسلام کے ذریعہ، یہ اسلام نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کا نام رکھ لیں، یا مسلمانوں کی سی معاشرت، یعنی گھر کا نقشہ مسلمانوں کا سا ہو، مسجد بھی کبھی کبھی جائیں، یا پابندی کے ساتھ جائیں یا اپنے کو مخاطب کر کے کہیں، یہ ایک عہد ہے، یہ ایک (خدا کرے بے ادبی نہ ہو) چیلنج ہے زمانے کے لئے ایک چیلنج ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے عقائد میں مسلمان

ہیں، ہم عبادات میں مسلمان ہیں، اپنے اخلاق میں مسلمان ہیں، معاملات میں مسلمان ہیں، اپنے طرزِ معاشرت میں مسلمان ہیں، ہم آپس کے تعلقات، جو میاں بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں، باپ بیٹے کے تعلقات ہوتے ہیں، بھائی بھائی کے تعلقات ہوتے ہیں، ہمسایوں سے تعلقات ہوتے ہیں، ہم ان سب چیزوں میں قانون الٰہی کے پابند ہیں، ہم کچھ نہیں جانتے، ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ حکم کیا ہے اس موقع پر، اللہ کے اس حکم سے اگر ہماری ساری جائداد جاتی ہو، ہماری ساری کمائی اور سرمایہ پر پانی پھر جاتا ہو، اور ہم ایک ایک لقمہ کے محتاج ہو جائیں جب بھی ہم یہی کریں گے، یہ ہے اصل اسلام، اسلام صرف ایک قومیت کا نام نہیں ہے، اسلام کسی تہذیب کا نام نہیں ہے، اسلام کسی آبادی کے ایک عنصر کے کچھ امتیازات اور اپنے کو ایک خاص نام سے موسوم کرنے کا نام نہیں ہے، جو اس وقت عام طور پر ہو رہا ہے، اسلام اول سے آخر تک ایک عہد ہے اور ایک پیمان ہے اللہ کے ساتھ ایک اعلان ہے دنیا کے سامنے ہمارے لئے فیصلہ کن، قابل عمل اور قابل غور چیز وہ ہوگی جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حکم دیا جائے گا، رسول اس کی تشریح فرمائیں گے۔ جو اللہ کا حکم ہوگا اور جو رسول کی تشریح ہوگی یا جو اسوۂ رسول ہوگا یا جو رسول کا نمونہ ہوگا ہم اس پر عمل کریں گے، اگر ہمیں اپنی جائداد، اپنی مالی منفعت اور تمام سہولتوں سے دست بردار ہونا بلکہ نشانۂ ملامت بننا پڑے گا ہمارے لئے زندگی گذارنا وہاں دشوار ہو جائے، پھر آخری درجہ کی چیز یہ ہے کہ پھر کسی ملک میں (جہاں حالات مختلف ہوتے رہتے ہیں) وہاں ہم نگاہ پر چڑھ جائیں، بلکہ نگاہ پر چڑھنا نہیں ہم پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیئے جائیں،

ہمارے ساتھ بالکل ایک مخالف قوم یا ایک بے وفا اور ایک غدار قوم کا سا سلوک ہونے لگے، ہمارے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہو جائیں۔ ہمارے بچوں کی تعلیم مشکل بلکہ بنیادی معاشی ذرائع کا حصہ حاصل کرنا بھی مشکل ہو جائے، پھر بھی ہم وہی کریں گے جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

سو فیصدی سچ کر دکھایا

اللہ فرماتا ہے: "من المؤمنین رجال" اہل ایمان میں وہ شیر مرد لوگ ہیں، وہ جانباز لوگ ہیں، جنھوں نے "صدقوا" عہد کے سچے ہونے کا نمونہ دکھایا۔ قرآن مجید "صدقوا" کا لفظ بولے تو اس کی عمومیت، اس کا عمق اور اس کی طاقت کا کوئی شمار نہیں، اور ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اور جب "صدقوا" کا لفظ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ سو فیصدی سچ کر دکھایا، نہ اس میں مداہنت تھی، نہ نفاق تھا، نہ مصلحت اندیشی تھی، نہ تاخیر تھی، کچھ بھی نہیں، سب سے بڑے عزت والے کی طرف سے عزت کی جو سب سے بڑی سند دی جا سکتی ہے اور جو توثیق کی جا سکتی ہے، وہ ان الفاظ میں موجود ہے، جن لوگوں پر یہ آیت نازل ہوئی تھی ان پر اگر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اگر اپنا گھر بار لٹا دیتے، اور لٹا دیا انھوں نے، اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے "صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" انھوں نے سچ کر دکھایا جس کے لئے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا، اور ذرا بھی وہ اپنی جگہ سے ہٹے نہیں۔

آج ہم مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ ہم مسلمان دیکھتے ہیں کہ اس بات کی کتنی

گنجائش ہے، اس میں نفع و نقصان کا کیا توازن ہے، نفع کتنا ہے، نقصان کتنا ہے، نیک نامی ہے یا بدنامی، سیاسی بدگمانیاں اور اقتصادی پریشانیاں تو اس میں نہیں شامل ہو جائیں گی، ہماری اولاد اور خاندان کا مستقبل تو نہیں مشکوک ہو جائے گا، ہم خطرے میں تو نہیں پڑ جائیں گے، یہاں تک کہ آخری درجہ یہ ہے کہ ہم الکشن جیت سکیں گے یا نہیں جیت سکیں گے، ہم کوئی عہدہ پا سکیں گے یا نہیں پا سکیں گے، ملک میں باعزت طریقہ سے زندگی گذار سکیں گے یا نہیں گذار سکیں گے۔ یہ سب خیالی چیزیں ہیں اللہ کے یہاں اس کا کوئی گذر نہیں ہے۔ "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَهُ" اور ان میں سے کچھ وہ تھے جو آخری درجہ تک پہونچ گئے، جب انھوں نے اپنا وقت پورا کر لیا، تو موت کے گھات اتر گئے، شہادت کا درجہ انھوں نے حاصل کر لیا، خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔ "وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ" اور کچھ لوگ تھے جن کا ابھی وقت نہیں آیا تھا اللہ کی طرف سے۔ وہ ایک تقدیری بات ہے، موت کا وقت مقرر ہے، شہادت بھی موت ہی کی ایک قسم ہے اس کا بھی وقت مقرر ہے، ایسے واقعات ہم دیکھتے ہیں، فتوحات اور جہاد کی تاریخ میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے جنگ کر رہے ہیں، اس میں کسی قسم کی آڑ نہیں، ذرا بھی اس میں تردد نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سلامت رکھتا ہے، کتنی جنگوں کو فتح کیا، اور کتنی جنگوں کا سہرا ان کے سر ہے۔ "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَهُ" کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنا وقت پورا کر دیا، اللہ نے جو وقت مقرر کیا تھا وہ وقت آ گیا۔ جہاد میں آیا یا گھر پر آیا، "وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ" اور کچھ لوگ انتظار میں ہیں ان کی طرف سے کوئی کمی نہیں، وہ ہتھیلی پر سر رکھ کر پھر رہے ہیں میدان جہاد میں اور دعوت

دے رہے ہیں شہادت کو، ان کی شہادت کا وقت نہیں آیا۔ اللہ ان کو میدان جنگ سے زندہ و سلامت لے آتا ہے اپنے گھر، لیکن وہ انتظار میں ہیں، "وما بدلوا تبدیلا" انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

ایک منشور ایک عہد نامہ

یہ ہے نمونہ ہمارے لئے اگر اس وقت ہم سے پوچھا جائے میری تمام نااہلیوں، بے عملی، تمام کمزوریوں اور گناہوں کے باوجود مجھ سے پوچھا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک منشور اور ایک عہد نامہ چاہئے اور ایک ایسا دستور العمل جو ان کے سامنے رہے، آپ لکھ کر دے دیجئے میں لکھ کر دوں گا۔ "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْاللهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَه وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ. وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً.[۱]".

اصل میں اسلام کیا ہے؟ اسلام صرف یہ نہیں ہے کہ صرف مسلمان کا نام رکھ دیا، یا اسلام کا طرزِ معاشرت اختیار کر لیا، صرف یہ اسلام نہیں، بلکہ اسلام ایک عہد ہے کہ اے حاضر و ناظر، اے علام الغیوب، اے خلاقِ دو جہاں! تو شاہد رہ، گواہ رہ کہ ہم شریعت کو ترجیح دیں گے طبیعت پر، شریعت کو ترجیح دیں گے رسم و رواج پر، ہم شریعت کو ترجیح دیں گے منافع پر، شریعت کے احکام کو پہلے پوچھیں گے دیکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ان چند اولوالعزم اور اعلیٰ طبقہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلمانوں کی پہلی نسل کے برگزیدہ حضرات کے متعلق کہا ہے، لیکن یہ الفاظ قیامت تک کے لئے ہیں، "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا

عَاهَدُوْاللهَ عَلَيْهِ"۔ اہل ایمان وہ شیر مرد لوگ ہیں، جنھوں نے سچ کر دکھایا جس کا عہد کیا تھا یہی ہمارے لئے خدا کا حکم ہے یہی ہمارے لئے منشور ہے کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھ کر ایک عہد کیا ہے ...... وہ عہد یہ ہے، اللہ اور رسول کی بات کو، اللہ اور رسول کی طرف سے آئی ہوئی بات کو، اللہ اور رسول سے مانگی اور مطالبہ کی ہوئی بات کو ترجیح دیں گے تمام حقیقی، یقینی اور متخیلہ اور ممکن الوقوع تمام خطرات پر اور نقصانات پر۔

یہ اسلام ہے، اسلام وہ ہے جو اللہ اور رسول کی طرف سے آیا۔ اس کا تعلق عقائد سے بھی ہے، معاملات سے بھی ہے، عبادات سے بھی ہے، رسم ورواج سے بھی ہے، شادی بیاہ کی رسموں سے بھی ہے، اور وراثت کے قانون سے بھی ہے، میاں بیوی کے تعلقات سے بھی ہے، اور اپنے پڑوسی کے تعلقات سے بھی ہے۔(۱)

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵؍ جنوری ۱۹۹۴ء

باب ٤

دین وعبادات

"دعوت کا تعلق:-

عبادات سے بلکہ پورے دین سے - ایسا ہے جیسا کہ بارش کا تعلق نباتات سے۔
اگر بارش خوب ہوتی ہے تو نباتات بھی خوب اگتی ہے اور
اگر بارش نہ ہو تو زمین چٹیل میدان بن جاتی ہے۔

اسی طرح:-

اگر دعوت رہتی ہے تو عبادات وغیرہ دین کے سارے شعبے قائم رہتے ہیں،
اور ساتھ ہی ساتھ ان کی روح بھی قائم رہتی ہے
جس دور میں دعوت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے لوگوں میں دین کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ فرائض کو پورا کرنے کا احساس بیدار ہوتا ہے،
حقوق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے،
اور جب دعوت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو ان چیزوں کا نمو بھی ختم ہو جاتا ہے،

اور دین کی مثال:-

ایک سوکھے درخت کی سی ہو جاتی ہے، جو نہ پھیلتا ہے اور نہ پھولتا ہے،

لہٰذا امت میں:-

دین کو باقی رکھنے اور اس کی استعداد پیدا کرنے کے لئے بھی دعوت ضروری ہے،

دعوت کے بغیر:-

اعمال پنپ نہیں سکتے اور ان میں کونپلیں نہیں آسکتیں"۔(علی میاں ندوی)

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً.

(المائدہ۔ ۳)

آج میں نے تمھارے لئے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا۔

یہ آیت کب نازل ہوئی؟

یہ حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا میں صرف ۸۱ روز (پونے تین مہینہ سے ایک روز زائد) قیام فرمایا، صحیح روایتوں میں آتا ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کی کتاب میں ایک آیت ہے، جس کو آپ پڑھتے ہیں، اگر کہیں ہم یہودیوں پر اتری ہوتی تو ہم ضرور اس دن کو تیوہار بناتے، اور اس کی یادگار منایا کرتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آیت ایک نہیں بلکہ ہمارے دو تہواروں کے موقعہ پر نازل ہوئی، جمعہ کا دن اور عرفہ کا روز۔ دونوں بحمد للہ ہماری عیدیں ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت اتنی ہی اہم، اتنی ہی قابلِ فخر و شکر اور ایسا ہی تاریخی یادگار ہے کہ قیامت تک اس کی یادگار منائی جاتی رہے۔

مکمل ہونے کے کیا معنی ہیں؟

مکمل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ غرض، مقصد، اصول اور ضروریات کے مطابق کوئی چیز اتنی کامل اور کافی ہے کہ کسی اضافہ کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت! اگر گنجائش نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے تو وہ باوجود خانہ پری اور ظاہری تکمیل کے ناقص اور نامکمل ہے،...... دین کے مکمل ہونے کا یہی مطلب ہے کہ مکمل کرنے والے کے اصول اور عمل کرنے والوں کی ضروریات کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے۔

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے!

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے، کل کا نام ہے، جزء کا نام نہیں،...... دین میں عقائد بھی ہیں، اعمال بھی، عبادات بھی، معاملات بھی، حقوق اللہ بھی، حقوق العباد بھی، اس میں نماز بھی فرض ہے، اور (قرآن کے مطابق) تقسیم میراث بھی۔

"وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" (اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا) حقیقی مسلمان پر (اور یہاں انھیں کو خطاب ہے)۔ اللہ کے بہت سے احسانات ہیں، ان میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ایمان و اسلام نصیب کیا، یہ احسان اس کا ہے، ہمارا نہیں، چنانچہ ایک موقعہ پر فرماتا ہے:-

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. (الحجرات۔۱۷)

یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا، ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے، کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت دی، اگر واقعی تم (اپنے دعوئی ایمان میں) سچے ہو۔

حقیقت میں یہ خدا ہی کی دین ہے، ورنہ کتنے بڑے بڑے عالم، کیسے کیسے شریف و معقول لوگ دنیا میں موجود ہیں، اور ہر زمانہ میں موجود رہے، جن کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی، اور یہ اتنی آسان بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی، اگر اس پر غور کیا جائے کہ کتنے انبیاء کے آباء و اجداد، والدین، اور کتنے انبیاء کی اولاد، ابراہیمؑ کے باپ آذر اور نوحؑ کا بیٹا اس سے محروم رہے۔ تو اس ذرہ نوازی پر شادی مرگ ہو جائے، اور شکر سے سر کبھی زمین سے نہ اٹھے، یہ احسان خالی اعراب پر نہیں ہے بلکہ سارے عرب پر، تمام صحابہ پر اور ہر سچے مسلمان پر قیامت تک ہے۔ ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنم　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

پھر اسلام و ایمان ایک احسان نہیں بلکہ احسانات کا مجموعہ ہے، یعنی سچا اسلام عطا کیا، جانور سے انسان بنایا، اپنی پہچان اور وحدانیت عطا فرمائی، دنیا کی ہر گری پڑی چیز کی پوجا، پرستش سے بچایا، زندگی کا مقصد بتایا، انجام کی فکر دی، مرشدِ کامل (ﷺ) کا دامن پکڑایا، جہنم کے عذاب اور آخرت کی حسرت سے بچایا، دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا مستحق بنایا۔ چنانچہ فرمایا:-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ، فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً، وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (آل عمران.۱۰۳)

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے انصار کے بھرے مجمع میں فرمایا:-

"أما أتيتكم ضآلا فهداكم الله بي، وعالةً فأغناكم الله وأعداءً فألف بين قلوبكم" انھوں نے کہا، "لله ورسوله المن والفضل" بے شک اللہ و رسول کا احسان اور صدقہ ہے۔

"وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً" اور تمھارے لئے پسند کر چکا اسلام کو دین، تمھاری زندگی کے لئے بھی اور تمھاری موت کے لئے بھی۔

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ، وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران: ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور جان نہ دینا بجز اس کے کہ تم مسلم ہو۔

اور یہ وہی وصیت ہے جو ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو فرمائی:-

يَا بُنَيَّ اِنَّ اللهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (البقرہ:)

میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمھارے لئے منتخب فرمایا ہے لہٰذا تم بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان نہ دینا۔

یاد رکھو! مسلمان مرنے کے لئے، مسلمان زندہ رہنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، تو ہر وقت مسلمان رہنا چاہئے، اگر کسی وقت موت آجائے تو اسلام کی حالت میں! اور مسلمان زندہ رہنے کے لئے اسلامی عقائد، اسلامی رسوم، اسلامی معاشرت، اسلامی صحبت کی ضرورت ہے، ورنہ:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَالْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. (آل عمران:)

جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

تو جس شان اور آن بان اور احسان و امتنان کے انداز میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً.

اس کا تقاضہ ہے کہ ہم عقائد و عبادات کے علاوہ اخلاق و معاشرت، تہذیب و تمدن میں بھی خود کفیل اور خالص اسلامی تعلیمات، قرآنی رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے رہنما اصولوں اور حدود کے پابند ہوں، اور معاشرتی و تمدنی طور پر مغرب کی نقالی کے مرتکب اور اس کا سایہ بن کر نہ رہ جائیں۔

ہم کو اللہ تعالیٰ نے اصول و عقائد کے ساتھ ایک مستقل نظام معاشرت اور ممیّز تہذیب و تمدن بھی عطاء فرمایا ہے۔ اور ہم کو ہر جگہ، ہر دور میں، اور ہر وقت اسی کا نمونہ پیش کرنا چاہئے (۱)۔

---

(۱) مشترک ماخوذ از (۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ار دسمبر ۱۹۷۶ء

(۲) کاروان زندگی حصہ سوم ص ۳۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

بسم اللہ کے اندر کیا پیغام ہے؟

سب لوگ جانتے ہیں کہ بسم اللہ کیا ہوتی ہے اور کب پڑھی جاتی ہے، لیکن بہت کم لوگوں نے غور کیا کہ بسم اللہ کے اندر کیا پیغام ہے جب کوئی اہم کام شروع کرنا ہوتا تھا تو حضور ﷺ پیغمبر اسلام، صحابہ کرامؓ، بزرگان دین اور علماء کرام سب کا طریقہ یہ تھا کہ بسم اللہ سے کام شروع کرتے۔ اور یہاں ہندوستان میں بھی آپ دیکھیں مولانا آزاد ہوں یا اور کوئی، دیش کے بڑے خدمت گذار اور اس کو آزاد کرنے والے وہ بھی بسم اللہ پڑھنے کے کتنے عادی تھے، یہاں تک کہ کھانا کھانے کے لئے بھی یہی سنّت ہے کہ پہلے بسم اللہ کی جائے پھر اسکے بعد کھانا شروع کیا جائے، اور کوئی بڑا یا چھوٹا کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہہ کر شروع کیا جائے مگر آپ یہ سوچئے کہ جب اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا جارہا ہے تو اللہ کے نام تو بہت ہیں۔ "وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" قرآن شریف میں خود آتا ہے کہ اللہ کے بڑے اچھے نام ہیں وہ جبّار بھی ہے، قہار بھی ہے، طاقت والا قوی بھی ہے، توانا بھی ہے، قادر بھی ہے، اور وہ بڑے جلال والا ہے، بڑے کمال والا ہے اور بڑے جمال والا ہے، سب کچھ ہے مگر کیوں ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب ہم کام شروع کریں تو اللہ کے نام سے شروع کریں اور اس کی صفتوں میں سے یہ دو صفتیں الرحمن الرحیم۔ بڑی رحمت والا اور بڑا رحمان ہے۔

ہماری زندگی کا رخ رحمٰن کی طرف ہو

یہی مزاج بناتا ہے یہی مسلمان ہی کا نہیں انسان کا مزاج بناتا ہے کہ خدا کی صفتوں میں سے ان دو صفتوں کو خاص طور پر یاد رکھئے کہ ہم یہ کام شروع کر رہے ہیں۔ اُس خدا کے نام سے جو بڑی رحمت والا ہے، اور بڑا مہربان ہے یہاں کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہم جو کام شروع کر رہے ہیں۔ اللہ کے نام سے جو بڑا قوی ہے، بڑا توانا ہے، بڑا قادر ہے، بڑی سلطنت والا ہے، بڑی قوت والا ہے لیکن یہ الرحمٰن الرحیم کی صفت اس میں اس لئے داخل کی گئی ہے۔ تاکہ ہماری زندگی اس کے سانچے میں ڈھلے اور ہم یہ سمجھیں کہ خدا جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے، اور جو ایک ساتھ زندگی گزارنے کا موقع دے رہا ہے۔ ایک ملک میں ہمیں بسایا ہے اور ایک جگہ ہمیں پیدا کیا ہے، وہی کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ وہ خدا جس کی یہ شان ہے وہ تو ہے ہی، لیکن "الرحمن الرحیم" بڑی رحمت والا اور بڑا مہربان اور بڑا ہی شفیق ہے۔ تو وہ اس سے ہماری زندگی کا رُخ معین کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا رخ رحمٰن کی طرف ہو، ہم یہ سمجھیں کہ ہم جس خدا کے بنائے ہوئے ہیں جس خدا کے بندے ہیں، جو خدا ہمیں کھلا رہا ہے پلا رہا ہے، ہماری حفاظت کر رہا ہے اور پھر اس نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بسایا ہے۔ وہ الرحمٰن الرحیم ہے بڑی رحمت والا ہے، بہت بڑا مہربان ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی پیروی کرو، اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو بندے اختیار کر سکتے ہیں جو Character بنا سکتے ہیں اس Character میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ان صفتوں کو جگہ دی گئی اور اسی طرح

سورۂ فاتحہ۔ الحمد للہ رب العالمین میں کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

یہ وہ چیزیں ہیں جب کوئی چیز بہت زیادہ کان میں پڑتی ہے، ہر وقت سنائی دیتی ہے، اذان ہی ہے، کیا اذان کوئی نہیں سنتا، لیکن اذان پر، اذان کے الفاظ پر، اذان کے معنیٰ پر غور کرنے والے کتنے ہیں، کسی چیز کا علم ہونا، آسان ہو جانا، قابو میں آجانا، ہر وقت سننا اور ہر وقت اُسے دیکھنا، وہ ایک حجاب بن جاتا ہے، ایک پردہ بن جاتا ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ الحمد للہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رب العالمین ہے سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ایک جہاں کا نہیں، ایک ملک کا نہیں، ایک سوسائٹی یا ایک ذات کا نہیں، ایک کلاس ایک طبقہ اور ایک درجہ کا نہیں، ایک Standard کا نہیں۔ وہ تو رب العالمین ہے سارے عالموں کا ساری دنیاؤں کا پالنے والا ہے۔ ہماری دنیا، ستاروں کی دنیا، آسمانوں کی دنیا اور پھر کہاں کہاں کی دنیا، کتنے براعظم کتنے ملک، یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ کے نیچے ہیں لہٰذا ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہم رحمت کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہونے کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کو اپنا بھائی سمجھنے کو، اس کی ضرورت پوری کرنے کو، اس کی تکلیف دور کرنے کو اور اس کے غم و رنج میں شریک ہونے کو اپنا فرض سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ یہ خدا کی شان اور خدا کی صفتیں ہیں، ہمیں ان کو اپنا Ideal بنانا چاہئے، اپنا پیشوا اور اپنا رہنما بنانا چاہئے(۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ۔ ۲۵ / جون ۱۹۹۷ء

پوری زندگی عبادت ہے

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

"(اے محمدؐ! یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت، اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے، اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں"۔(الانعام: ۱۶۲۔۱۶۳)

عبادت کا مفہوم

اول تو عبادت کا مفہوم سمجھ لیں۔ عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ عبادت کا مفہوم ہے کسی کام کو اللہ کی خوشی کے لئے، اللہ کے حکم کے مطابق، اجر و ثواب کی لالچ میں کرنا، ہر وہ عمل جو اللہ کی خوشی کے لئے ...... اور اتنا ہی کافی نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے اور شریعت کی تعلیم کے مطابق، اور اگر اس میں کوئی سنت ثابت ہے تو اس کی سنت کے مطابق اس کو ادا کرنا، اجر و ثواب کی امید پر، اور اس پر جو وعدے ہیں، ان پر یقین کے ساتھ انجام دینا عبادت ہے، اور یہ بات ہر عادت کو عبادت بنا دیتی

ہے، اور یہ روح نکل جائے تو ہر عبادت خالی عادت، اور محض رسم، اور نفس کی پیروی رہ جاتی ہے(۱)۔

اللہ تعالیٰ ایک جامع چیز ارشاد فرماتا ہے کہ:-

"کہہ دیجئے (اے محمد ﷺ) "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ." بے شک میری نماز، میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

پہلے مذاہب کی تقسیم

پہلے مذاہب کی تقسیم یہ تھی۔ (اللہ کی طرف سے تو نہ تھی) کہ مذاہب والوں نے اپنے انحطاط و تنزل اور انحراف کے زمانہ میں، جب مذاہب میں تحریف ہوئی اور خارجی اثرات غالب آگئے، ماحول جن قوموں سے منتقل ہو کر آئے تھے، جنھوں نے اُس دین کو قبول کیا تھا، ان کی تہذیب ان کی صنمیات، جس کو دیومالا کہتے ہیں، MYTHOLOGY اور نسلی اثرات مذہب پر غالب آئے، تو انھوں نے مذہب میں یہ تقسیم کی، کہ عبادات تو اللہ کے لئے اور باقی زندگی میں آزاد، اس میں جیسی مصلحت ہو ویسا کیا جائے گا، جیسا قانون ہو اس پر چلایا جائے گا، اور اس میں ہم آزاد رہیں گے، اور اس میں ہماری نیت کوئی اللہ کو راضی کرنے اور خوش کرنے کی نہیں ہے، بلکہ ضرورت پورا کرنے کی ہے۔

یہاں تک کہ پھر یہ تقسیم ہوئی (جس کو مسیحی تاریخ کا یہ پرانا فقرہ ادا کرتا ہے)

---

(۱) تحفہ دین ودانش ص ۵۳

کہ جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دے دو، اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو، انھوں نے مذہب میں (گویا) رسمی تقسیم کی۔ اور ظاہر ہے کہ "تلك اذاً قسمة ضيزى" کہ جب ایسی ایسی تقسیم ہوگی تو اللہ کا حصہ تو کم نکلے گا، قیصر کا حصہ زیادہ نکلے گا، اس لئے کہ اس سے واسطہ ظاہری طور پر پڑتا ہے، اور اس کا ڈر بھی رہتا ہے، معرفت صحیح "تِلْكَ اِذاً قِسْمَةٌ ضِيْزٰى"

نہ ہونے کی بنا پر، اور اسکے جو مظاہر ہیں، طاقت کے، اور سلطنت کے، وہ سامنے ہوتے ہیں، اور اس کو راضی رکھنے میں فائدہ بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے مادی نگاہوں سے۔

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ خاص طور سے عیسائیت (جو اسلام سے پہلے کا سب سے آخری دین ہے وہ) عقائد و عبادات کے بہت تھوڑے سے حصہ میں محدود ہو کر رہ گئی، اور ساری زندگی- وہ دنیاداری بن گئی، مادہ پرستی کی، دولت پرستی کی، طاقت پرستی کی زندگی ہو کر رہ گئی۔ اور عیسائی بالکل اپنے معاشرہ میں، اپنے حدودِ عیسائیت میں (وہاں مذہب تو عیسائی تھا مگر وہ) شُتر بے مُہار ہو کر رہ گئے، جس میں فائدہ دیکھتے چار پیسے کا وہ کرتے، چاہے مذہب کے بالکل خلاف ہو، مذہب ایک نقطہ بن گیا، سمٹتا سمٹتا جیسے صفحہ پر ایک نقطہ ہو، وہ نقطہ بن کر رہ گیا، چرچ میں جائیں تو وہ عیسائی تھے، اور چرچ میں جائیں تو صرف اتوار کے دن، اور کتنی دیر کے لئے جائیں؟ اور وہاں بھی رسوم زیادہ تر ہوتیں، یوں کرو، اس طرح بیٹھو۔ اس طرح اقرار کرو۔ گناہوں کا۔ پادریوں کے سامنے اس طرح بیٹھو۔ اور گانا بجانا بھی ہو رہا ہے۔ کچھ پڑھا جا رہا ہے۔ بس۔ اور اس کے بعد وہ بالکل آزاد......!

اسلام نے اس کو پلٹ دیا

لیکن اسلام نے، حضور ﷺ نے اس کو بالکل پلٹ دیا، اور پوری زندگی کو اللہ

کی اطاعت اور اللہ کی عبودیت میں ڈھال دیا، اور اللہ کی عبودیت میں پوری زندگی کو تحلیل کر دیا، کہ اب سب کچھ اللہ کا ہے۔ غیر اللہ کا کچھ نہیں، بے شک تمھیں کھانے پینے کی آزادی حدود کے اندر کہ "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِىْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" کھاؤ پیو، حلال و پاک چیزیں، لیکن جو کام کرو، اول تو اللہ کے احکام دیکھ کر کے کرو، پھر اللہ کی رضامندی کی نیت کر کے کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری زندگی عبادت بن جائے گی۔

پوری زندگی کے لئے کافی ہے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت صاف لفظوں میں کہا "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ." کہ میری "صلاۃ" (جو عبادت کا سب سے بڑا نمائندہ ہے) میری بندگی، میرا زہد، میری قربانی، میری زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔

یہ بہت بڑی چیز ہے، پوری زندگی کے لئے کافی ہے، کہ جن کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبودیت میں اور اپنی محبوبیت میں ڈھال دیا تھا، بالکل اس کو خالص عبادت ہی بنا دیا تھا، وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ کہہ رہا ہے، پھر اس کی زبان سے کہلوایا گیا قرآن مجید میں تاکہ قیامت تک کے مسلمان اس کو پڑھیں، اور اس کو اپنے لئے مشعلِ ہدایت بنائیں۔

کہ کہہ دیجئے (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) "ان صلاتی" میری نماز، میری عبادت، "وَنُسُكِیْ" میری قربانی۔

"نُسُكْ" کا لفظ بھی بہت وسیع ہے، میرا زہد، میرا تقویٰ، میرا کسی چیز کو چھوڑ دینا، اور نہ کرنا، اور میری قربانی، "وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ" جینا اور مرنا، "لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سب اللہ کے لئے ہے۔

کون سا اللہ؟ اور میں کیوں یہ کرتا ہوں؟ "لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کوئی شریک نہیں اس کا، تو کسی میں کوئی شریک نہ ہونا چاہئے، "لَا شَرِيْكَ لَهٗ" یہاں ایک نگینہ کی طرح آگیا ہے، کہ نماز، روزہ اور کھانے پینے کو کیوں اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اس لئے اس کا کوئی شریک ہی نہیں، اگر کوئی شریک ہوتا تو میں کہتا، کہ نماز اللہ کی اور کھانا دوسرے کا، لیکن جب اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں، حقیقت میں اس کا وجود ہی نہیں ہے، تو اپنی کوئی چیز دوسرے کو کیوں دوں، سب اللہ کا ہے، پھر جب وہ وحدہ لاشریک ہے تو میری زندگی بھی ایک اکائی ہونی چاہئے، میری زندگی بھی اکائیوں میں تقسیم نہ ہونی چاہئے، اور اگر زندگی سب رضائے الٰہی کے لئے ہو جائے تو وہ ایک اکائی بن جاتی ہے، اور وہ ایک اکائی ہے...... بندگی!

"لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" فرماتے ہیں کہ مجھے اسی کا حکم دیا گیا، اور میں پہلا اس کو ماننے والا ہوں اور پہلا سر جھکا دینے والا ہوں۔

یہ آیات بہت جامع ہیں اور اپنے اندر زندگی کا پورا دستور العمل رکھتی ہیں، اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہیں! (۱)

---

(۱) غیر مطبوعہ تقریر (تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ میدان پور رائے بریلی کی مسجد میں کی گئی) محترم جناب مولانا سید بلال عبدالحئی حسنی ندوی صاحب نے قلمبند کر کے ہمیں عنایت فرمائی۔ (مرتب)

اخلاق ورجحانات پر نماز کا اثر

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ.

"بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے"۔

(سورہ عنکبوت: ۴۵)

نماز اخلاقِ رزیلہ، برائی و بے حیائی کے کاموں، اور وقتی لذت پسندی اور ہوس پرستی کو ختم کرنے میں جو تاثیر رکھتی ہے، وہ کلمۂ توحید کے سوا کسی اور چیز میں نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز انسان کا رخ تبدیل کر دیتی ہے۔ اور اس کو ایک نیا ذوق، نئی طلب اور نیا ذہن عطا کرتی ہے، وہ اس کو حقیر و پست کاموں سے نکال کر بلند کاموں کی طرف لے جاتی ہے، "تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" اس کے دل میں ایمان کی محبت اور ایمان کا شوق پیدا کرتی ہے، اور کفر و فسق و نافرمانی کو اس کے لئے مکروہ و مبغوض بنا دیتی ہے، "تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ"!

لیکن یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ نماز حقیقی ہو، "أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" (اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) کی کیفیت

سے سرشار ہو، اور وہ زندگی، حرارت اور قوت سے لبریز ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر چیز میں ایک چیز "لازم" اور ایک "متعدی" ہوتی ہے، "لازم" تو یہ ہے کہ اس کا عمل اسی تک محدود رہ جائے، اس سے تجاوز نہ ہو، نماز کا "لازم" یہ ہے کہ نماز میں "کأنه" ہر اک کا منظر ہو، احسان کی صفت نماز کے اندر پیدا ہو جائے، اگر یہ (نمازی) خدا کو نہ دیکھے تو خدا اسے دیکھ رہا ہے، یہ خیال دل میں پیدا ہو جائے، یہ نماز "لازمی" ہے!

اور ایک نماز "متعدی" بھی ہے، اور وہ کس طرح؟ دو طرح سے نماز متعدی ہے، ایک نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے متعدی ہے، اور دوسرے کے لحاظ سے بھی متعدی ہے، نماز کا تعد یہ ہے کہ "ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر" نماز جب ختم ہو جاتی ہے تب بھی متعدی رہتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ نماز، نماز پڑھنے والے کو "فحشاء" سے روکتی ہے، متعدی نماز سے اس بات کی توقع ہو جاتی ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے کو گناہ سے روکے گی، تو متعدی نماز کے لئے یہ معیار مقرر کیا ہے "ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر" کہ نماز ہو تو گناہ نہ ہو، اور اگر نماز پڑھنے کے بعد نفس کی ترغیب رہی اور گناہ کی طرف چل پڑا تو یہ نماز لازمی ہے، متعدی نہیں ہے، اگر نماز پڑھنے والا گناہ سے رک گیا تو یہ نماز متعدی ہے، نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے۔

پھر اگر نماز میں زیادہ مستعدی کی صفات ہوں تو یہ اس پر ہی انحصار نہیں ہے کہ وہ نماز خود گناہ سے روکتی ہے، بلکہ اگر نماز صحیح ہو جائے تو یہ نماز وہاں کے ماحول سے ٹکراتی ہے اور وہاں کے ماحول اور نماز کے مابین جنگ ہوتی ہے، پھر یہ نماز اصلاح،

تذکیر، محاسبہ اور احتساب پر آمادہ کرتی ہے۔

اسی لئے آپ دیکھئے کہ حضرت شعیبؑ نے جب اپنی قوم کو توحید اور تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی، اور ظلم و حق تلفی اور ناپ تول میں کمی کے انجام سے ان کو ڈرایا تو انھوں نے حضرت شعیبؑ کی زندگی میں جستجو کی اور دیکھا کہ ان میں اور قوم میں کیا فرق ہے؟ یہ جو حلال و حرام میں، اور فساد اور صلاح میں، اور خدا کی اطاعت اور معصیت میں، اور مسئلہ و غیر مسئلہ پر فرق کو معلوم کیا، تو ان میں بعض فراست والوں نے سمجھ لیا کہ ان میں یہ چیز پیدا کرنے والی ان کی نماز ہے، وہ یہ سمجھ گئے اور کہنے لگے:-

"يَا شُعَيْبُ أَصَلوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ" کہ اے شعیبؑ! کیا تمھاری نماز اس سے روکتی ہے؟ اور قرآن نے ان کے اس سوال کی تردید نہیں کی۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں، یہ متعدی ہونے کا دوسرا پہلو ہے، پہلا متعدی پہلو یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، پھر دوسرا متعدی پہلو یہ ہے کہ وہ نماز دوسروں کو برائی سے روکنے والی بنتی ہے، ورنہ حضرت شعیبؑ کی قوم ان کو نہ پہچانتی لیکن یہ پہچان لینا کہ اس نماز نے ہی حضرت شعیبؑ کو ہم سے الگ کر دیا ہے، یہ متعدی پہلو ہے(۱)۔

---

(۱) رمضان اور اس کے تقاضے ص ۵۲ تا ص ۵۴۔ (۲) ارکان اربعہ ص ۴۲۔ ۴۳ مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

سورۂ فاتحہ کا جمال وجامعیت

اور

زندگی پر اس کا اثر

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

أَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝. (آمین)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، انصاف کے دن کا حاکم ہے، اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، ہم کو سیدھا راستہ چلا، ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا، نہ ان کے جن پر غصہ ہوتا رہا، اور نہ گمراہوں کا۔

ایک بے مثال شہ پارہ

یہ سورہ آسمانی معجزات کا ایک لعلِ بے بہا، اور قرآن مجید کی آیاتِ بینات کا ایک بے مثال شہ پارہ ہے، اگر ساری دنیا کے ذہین اور ساری قوموں کے ادیب و

انشاء پرداز، ماہرینِ نفسیات، معلمینِ اخلاق اور روحانی پیشوا یکجا ہو کر کوئی ایسا مضمون تیار کرنا چاہیں جو تمام انسانی طبقات کے لئے ان کی ضرورتوں اور خواہشات کے اختلاف کے باوجود کافی ہو، اور وہ اس کے ذریعہ اپنی عبادتوں میں اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کر سکیں تو وہ سورۂ فاتحہ جیسا مضمون تیار نہیں کر سکتے جو ہر انسانی گروہ اور فرد کی تسکین کیلئے کافی ہے ...... اس سورہ کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:-

وَلَقَدْ آتَيْنٰكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمِ. (حجر۔۸۷)

اور بالیقیں ہم نے آپ کو (وہ) سات آیتیں دیں (جو) مکرر (پڑھی جاتی ہیں) اور قرآن عظیم (دیا)۔

”حمد“ بہترین وسیلہ ہے

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ جو شکر و تعریف کا جامع کلمہ ہے، اور ان معجزانہ اور بلیغ کلمات میں سے ہے، جن کا کسی اور زبان میں صحیح ترجمہ بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

”حمد ہی وہ بہترین وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک وفاشعار اور محسن شناس بندہ اپنی دعاو مناجات کا آغاز اور اس مقامِ محمود اور قیام و سجود (نماز) کا افتتاح کر سکتا ہے۔

پھر نمازی یہ محسوس کرتا ہے کہ جس رب کی وہ حمد و ثنا بیان کر رہا ہے اور جس کی عبادت میں مشغول ہے، وہ صرف کسی قبیلہ اور قوم، کسی خاندان اور برادری، اور کسی ملک و وطن کا رب نہیں، بلکہ ”رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ“ ہے۔

دو وحدتوں کا اعلان

یہ انقلاب آفریں اور نیا عقیدہ ان تمام مصنوعی اور خود ساختہ تقسیموں کے

خلاف اعلانِ جنگ ہے، جنھوں نے انسانیت پر ظلم عظیم کیا ہے۔ اس طرح مسلمان دو وحدتوں کا اعلان کرتا ہے اور ان ہی دونوں وحدتوں پر انسانی معاشرہ کے امن و سکون کی بنیاد ہے اور انھیں دونوں ستونوں پر اسلام انسانیت کی تعمیرِ نو کا کام انجام دیتا ہے۔ ایک نوعِ انسانی کے خالق و صانع کی وحدت اور ایک نسلِ انسانی کے بانی و مورث کی وحدت، اس طرح رنگ و نسل اور ملک و وطن کی تفریق کے بغیر نسلِ انسانی کی وحدت ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے دوہرا رشتہ رکھتا ہے، ایک روحانی اور حقیقی طور پر۔ وہ یہ کہ ان سب کا رب ایک ہے! دوسرے جسمانی و ثانوی طور پر۔ وہ یہ کہ وہ سب ایک باپ (آدم) کی اولاد ہیں!

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْرًا وَّ نِسَاءً. وَاتَّقُوْاللهَ الَّذِيْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ. إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً.

(سورہ نساء۔۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو) بیشک اللہ تمھارے اوپر نگراں ہے۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. (سورہ حجرات۔۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور مختلف قومیں اور خاندان بنا دیئے ہیں کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں سے پرہیزگار اللہ کے نزدیک معزز تر ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے، پورا خبردار ہے۔

اس حکم اور اصول کی شرح و تفصیل میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

"اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا تعصب اور آباء و اجداد کا فخر تم سے دور فرمادیا ہے، اب صرف (دو قسم کے لوگ ہیں) پرہیزگار مسلمان یا بدنصیب فاسق و فاجر، سب انسان آدم کے بیٹے ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ"۔ (ترمذی)

صفت رحمت کا استحضار

نمازی اللہ تعالیٰ کی ان بہترین صفات کریمہ میں سے جن پر وہ پہلے ہی ایمان لاچکا ہے، سب سے پہلے اس کی صفتِ رحمت کا استحضار کرتا ہے۔ (الرحمن الرحیم) اس لئے اس موقع اور محل کے لئے اس سے بہتر صفت کوئی اور نہیں ہو سکتی، یہ وہ موقعہ ہے جب مسلمان خشوع و عبادت، دعا و ابتہال، توبہ و انابت اور احتیاج و فقر کا استحضار کرتے ہوئے خدا کے حضور سر بسجود ہوتا ہے۔ یہ امید اور خوش گمانی کا موقع ہے، نہ کہ ناامیدی و بدگمانی کا۔

اس کے بعد وہ آخرت اور جزاء و سزا کا دن (ملك يوم الدين) یاد کرتا ہے۔ وہ دن جس میں اللہ تعالیٰ کی حکومتِ مطلقہ اور اقتدار اعلیٰ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگا، اور کسی بادشاہ، امیر اور وزیر کو اس کے حضور میں دم مارنے کا یارانہ ہوگا۔ "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" آج کے روز کس کی حکومت ہے؟ بس اللہ واحد و غالب ہی کی ہے۔ (سورہ مؤمن۔ ۱۶)

اس وقت وہ اپنے دل میں آخرت کے ایمان کو از سر نو تازہ کرتا ہے، جو ہر

خوف، باز پرس کے ڈر اور نفس اور ضمیر کی نگرانی کا سرچشمہ ہے، ایک مسلمان کو جو ترغیبات سے بھری ہوئی دنیا میں رہتا ہے اس ایمان اور یقین کی جو شدید ضرورت ہے، اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر وہ عربی زبان کے (جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا اور جس کو نماز کی عالمی اور سرکاری زبان قرار دیا گیا) پورے زور اور کلام اور بلیغ انداز میں کہتا ہے کہ "وہ نہیں عبادت کرتا کسی کی سوائے اللہ کے، اور نہیں مدد چاہتا کسی سے سوا اس کے" "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ".

عبادت واستعانت

زندگی دراصل عبادت و استعانت کا دوسرا نام ہے، اسی سے ایک انسان دوسرے انسان سے، کمزور کا طاقتور سے، غریب کا امیر سے، محکوم کا حاکم سے، اور عابد کا معبود سے رشتہ قائم ہوتا ہے، اگر یہ دونوں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دی جائیں تو زندگی کے سارے بندھن اور آہنی زنجیریں خود بخود پاش پاش ہو جائیں گی، اور شرک اور دوسرے تمام فتنے ختم ہو جائیں گے، وہ یہ سب سے بڑا معاہدہ اور اعلان ہے جو مسلمان اپنے خدا سے دن رات میں بار بار کرتا ہے، اس کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نماز سے باہر زندگی کا سارا انظام اس کو دو چیزوں پر ہمہ وقت مجبور کرتا ہے، ایک خضوع و استکانت پر، دوسرے سوال و استعانت پر، اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جن کے خلاف وہ پہلے ہی بغاوت کر چکا ہے۔

ہدایت کی دعاء

پھر وہ اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا کرتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یہ وہ ہدایت ہے جو اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اور جس کے دم سے جنت کی رونق قائم ہے، وہ ہدایت جس سے محروم ہو جانے کے بعد کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں، اور اس سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد کسی چیز کے چھوٹنے کا کوئی غم نہیں، اس کی طلب و جستجو انسان کی فطرت میں داخل اور اس کی آرزو قلب و روح میں پیوست ہے۔

لیکن یہ ہدایت خلا میں قائم نہیں ہو سکتی، یہ اسی وقت قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہو سکتی ہے، جب اس کے زندہ اور عملی نمونے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم تاریخ انسانیت میں انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کے نام سے یاد کرتے ہیں، ﴿أُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾ قرآن مجید اور تمام گذشتہ آسمانی صحیفوں نے دنیا کے عام انسانوں کو ان کی پیروی و تقلید، ان کی محبت و اطاعت، ان کی جماعت میں شمولیت اور ان کی طرف اپنا انتساب کرنے کی دعوت دی ہے۔

أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده. (سورہ انعام۔ ۹۰)

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی، سو آپ بھی ان کے طریقہ پر چلئے۔

اور اسی کے ساتھ ان لوگوں سے برأت اور بے تعلقی کا مطالبہ کیا ہے جو ہدایت کی راہ سے ہٹ کر ناشکری، ہوا پرستی اور تباہی و خودکشی کے راستہ پر پڑ گئے، جنھوں

نے سرکشی اور انتہا پسندی کی حد کر دی، اور غضب الٰہی کے مورد قرار پائے، یا دین میں تحریف، تفریط اور ترمیم و تنسیخ کے مرتکب ہوئے، اور کھلی ہوئی گمراہی کے شکار ہوئے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ.

چلا ہم کو سیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو زیرِ غضب آچکے ہیں، اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔(۱)

قرآن مجید کا کھلا اعجاز

یہاں پر قرآن مجید کا کھلا اعجاز معلوم ہوتا ہے، تاریخ و مذاہب و ادیان کا ایک انصاف پسند طالب علم اگر صرف اس ایک جملہ پر ایمان لے آئے کہ صحرا میں پیدا ہونے والے اور صحرا میں زندگی گزارنے والے ایک اُمّی پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی زبان سے کتنی بڑی تاریخی حقیقت ادا کی گئی ہے کہ مسیحیت کے پیروؤں کو "ضآلین" کے وصف و لقب سے مخصوص کیا گیا ہے، یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس پر خود تاریخ ادب سے اپنا سرخم اور پورا تاریخی ذخیرہ سرافگندہ ہو کر اس کی تصدیق کرتا ہے اور مؤرخین حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں آپ کی توجہ اس لسانی تجربہ پر مبذول کرتا ہوں کہ جو الفاظ دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں، بعض اوقات ان کی طاقت اور ان کے اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں فرق واقع ہو گیا ہے، الفاظ کا بھی تاریخی سفر ہوتا ہے، جیسے انسانی قافلوں، تہذیبوں اور افکار انسانی کا تاریخی سفر ہے، جب وہ سفر طے کرتے ہیں تو اپنی بہت سی تازگی کھو دیتے اور بہت سے خارجی و مقامی اثرات قبول کر لیتے ہیں،

(۱) ارکان اربعہ ص ۵۷-۶۱

اردو میں بھی عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جن کو اپنے صحیح مفہوم و معنیٰ میں سمجھنا مشکل ہو گیا ہے، اور ان میں وہ زور و قوت باقی نہیں رہی جو اصل زبان میں تھی۔

ان میں ایک لفظ "ضلالت" بھی ہے۔ "ضلالت" کو ہر طرح کے فسادِ عقیدہ، ہر درجہ کے فسادِ عمل، معمولی انحراف، اور چھوٹی بڑی غلط فہمی کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے، لیکن لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجۂ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، ویسے ہی الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے، اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ جس برگزیدہ ہستی نے مسیحیت کی تاریخ نہیں پڑھی تھی، اس کے لئے کوئی ذرائع معلومات نہیں تھے، اور جس کا ایک مسیحی ملک میں جانا صرف چند دن کے لئے، اور کسی مسیحی سے ملنا چند منٹوں کے لئے ثابت ہے اس کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت ادا کی ہے، کہ یہودیوں کے لئے "المغضوب علیهم" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عیسائیوں کے لئے "ولاالضآلین" کا لفظ آیا ہے۔

تنہا یہ لفظ قرآن مجید کے منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہونے کے لئے کافی ہے، مسیحیوں کے لئے دس الفاظ استعمال کئے جا سکتے تھے، عربی جیسی وسیع زبان میں پچاس لفظ ہو سکتے تھے اور سب منطبق ہوتے، لیکن اس میں ایک کھلا ہوا فرق رکھا گیا ہے، یہود کے لئے "المغضوب علیهم" کا لفظ آیا ہے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ "المغضوب علیهم" (غضب الٰہی کے مورد و مستحق) ہیں، انھوں نے انسانی اخلاقیات و رجحانات، انسانی کردار و عمل اور معاشرۂ انسانی پر جو سلبی اور انتشار انگیز اثرات ڈالے ہیں، اور صدیوں تک تاریخ انسانی میں

تخریبی و سازشی کردار ادا کیا ہے، ان کے ساتھ خدا کا جو معاملہ رہا ہے، اور ان میں ہر دور میں جس طرح کی بغاوت اور جس طرح کی سرکشی پیدا ہوئی ہے، انھوں نے جس طرح اپنے آپ کو خدا کی برکتوں اور نصرتوں سے محروم کیا ہے، ان کے لئے "**المغضوب علیھم**" سے زیادہ کوئی اور لفظ موزوں نہیں(۱)۔

اور یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لئے "الضآلین" کا لفظ استعمال کیا ہے! "ضآلین" کے کیا معنیٰ ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے، منزلِ مقصود سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جارہی ہے (ہوائی جہاز بھی اسی کے پیروؤں کی دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں، اپنے مذہبی اور دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزلِ مقصود سے دور نہیں بلکہ اڑ کر دور ہوئی۔ آج کی موجود مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس کو سینٹ پال کا تحفہ اور اس کی دین کہنا چاہئے!(۲)۔

(۱) نبی خاتم ودین کامل ص ۱۵۔۱۸ (۲) "خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی" ص ۱۷۔۱۸

رمضان المبارک کا پیغام

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ!" (البقرہ۔ ۱۸۳)

قرآن کریم کی یہ وہ آیت ہے جس سے رمضان المبارک میں روزہ کی فرضیت کا اعلان ہوا، اور تمام مسلمانوں کو، اُس زمانہ کے مسلمانوں کو اسی آیت سے علم ہوا، اور قیامت تک یہی آیت اس کی دلیل رہے گی، اس میں کچھ باتیں ہیں سوچنے اور غور کرنے کی، نکتہ کی ہیں، پہلے ہم اس کا ترجمہ کریں گے، پھر ایک خاص بات کی طرف اشارہ کریں گے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: -اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔

پہلے ایمان کا تذکرہ کیا گیا

اس خطاب میں بھی بڑی بلاغت و حکمت ہے، کہ ایک ایسی چیز جو نفس پر شاق اور دشوار ہے، جس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے، اس کی بنیاد ایمان

کو بنایا گیا، اسی لئے پہلے ایمان کا تذکرہ کیا گیا، کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، اللہ تعالیٰ کی تمام باتوں کو قبول کرنے کا عہد کر چکے ہو، اور دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہو اور اپنے کو اللہ کے حوالہ کر چکے ہو، کہ وہ ہمارا مالک ہے، ہمارا حاکم ہے، جو حکم دے گا ہم اس پر عمل کریں گے، اس سے مطلب نہیں کہ اس میں کچھ مزہ ملے گا یا نہیں، دنیا میں فائدہ ہوگا یا نہیں، وہ آسان ہے یا مشکل ہے، ایک بات ہے یا دس بات ہیں، ایک مرتبہ کرنا ہوگا، دس یا بیس مرتبہ کرنا ہوگا، سو پچاس مرتبہ کرنا ہوگا، اس سے کوئی بحث نہیں، جب ہم نے اللہ کی غلامی قبول کر لی، اس کی عبودیت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا، اور اعلان کر دیا کہ ہم تو حکم کے بندے ہیں جو وہ حکم دے گا ہم اسی پر عمل کریں گے، اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی حکیم ذات ہی اس حکم کو اس طرح شروع کر سکتی ہے، ورنہ دنیا کے جو قوانین ہیں، جن باتوں کا حکومتیں اعلان کرتی ہیں، اور جو نئے قوانین بنتے ہیں، اور جو نئی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ کروگے تو بچ جاؤ گے، اس پر عمل نہ کروگے تو سزا پاؤ گے، بس، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، حالانکہ وہ حاکم مطلق ہے، زمین و آسمان کو پیدا کرنے والا ہے، اور سب کی زندگیاں، سب کی جانیں، سب کی عزتیں اسی کے قبضہ میں، کسی طرح کہہ دیتا، کہہ سکتا تھا، اس کا حق تھا، لیکن اس نے کہا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔

تو اللہ تعالیٰ نے ہم تمام مسلمانوں کی قوت ایمانی کو آواز دی ہے، قوت ایمانی کو جگایا اور اس کو بنیاد بنایا ہے، اے وہ لوگو! جو اس بات کا عہد کر چکے ہو کہ ہمیں تو

بات ماننا ہے، ہم تو حکم کے بندے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ. — تم پر روزے فرض کئے گئے، جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔

روزے کی فرضیت میں انسانی فطرت کی رعایت

یہ انسان کی فطرت ہے، اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کا بنانے والا اس کا خالق ہے، اس کی رعایت کرنے والا بھی ہے، کسی مجبوری سے نہیں، اپنی حکمت سے بھی، اپنی رحمت سے بھی، کہ جب وہ کسی بات کا حکم دیتا ہے، تو اس بات کے لئے زمین تیار کر دیتا ہے تاکہ انسان اس کو آسانی سے قبول کر سکے، اس لئے انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کو انوکھی اور نرالی معلوم دیتی ہے، اس سے گھبراتا ہے اور چونک اٹھتا ہے، اچھا یہ بھی کرنا ہوگا؟ لیکن جب اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہوتا آیا ہے، لوگ کرتے آئے ہیں، تو پھر وہ اس کو سنتا ہے، خوشگواری کے ساتھ مانتا اور آسانی کے ساتھ تابع داری کرتا ہے۔

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، چنانچہ مذاہب اور اخلاقیات کی تاریخ، اور قوموں اور ملکوں کی تاریخ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں روزہ رہا ہے، مذہبی اور تاریخی کتابوں میں تفصیل موجود ہے، کہ اس کی کیا شکل اور کیا تعداد تھی، کیا وقت تھا، کہاں سے شروع ہوتا تھا، کیا پابندیاں تھیں، یہ ایک علمی تاریخی مسئلہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. — تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

تقوے کا صحیح مفہوم

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلائی ہے، جب کسی زبان کا لفظ کسی زبان میں آتا ہے تو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصلی معنیٰ کھو دیتا ہے، اور اس کے ساتھ ذہن کے سوچنے کے بہت سے طریقے لگ جاتے ہیں، انہی میں سے ایک لفظ "تقویٰ" اور متقی کا ہے، ہمارے یہاں متقی کے معنیٰ ہیں، بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو، اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے، اور نہ کھاتا ہو، اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو، تو اور بڑا متقی ہے، اور کثرت سے نماز پڑھتا ہو، نماز ہی میں اس کا دل لگتا ہو، جب دیکھو نماز پڑھ رہا ہے تو اور بڑا متقی ہے اور ذرا ذرا سی چیز میں شبہ سے بچتا ہو، متقی ہے! لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے، "تقویٰ" کے معنیٰ زیادہ عبادت گذار اور زیادہ شب بیدار کے نہیں ہیں، کہ بڑا عبادت گذار، شب بیدار، دن کو روزے رکھنے والا، رات کو عبادت کرنے والا، نمازیں پڑھنے والا ہے بلکہ عربی زبان میں "تقویٰ" ایک مستقل صفت کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں، تقویٰ خوف کا نام ہے، تقویٰ تلاوت یا تسبیح کا نام نہیں، تقویٰ ایک مستقل صفت ہے، تقویٰ ایک مزاج ہے، تقویٰ ایک ملکہ ہے، تقویٰ ایک طبیعت ہے، رمضان تو اس لئے آتا ہے کہ ہم کو متقی بنائے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" دیکھنے میں یہ چھوٹا کلمہ ہے، اور اگر کہا جائے تو بھی یہ چھوٹا سا کلمہ ہے، ورنہ تو قرآن کا چھوٹا کلمہ بھی معجزہ ہے، تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رمضان ہے تو تقویٰ ہے، اور رمضان گیا تو اب وہ تقویٰ نہیں ہے، اس کا نام تقویٰ نہیں ہے۔

''تقویٰ'' کے معنی ہیں لحاظ و شرم کی عادت، پاس و لحاظ کی عادت پڑ جانا، مثلاً یہ کہ کوئی بچہ ہے، اس کو اگر صحیح تعلیم دی گئی ہے، اسے اچھا ماحول ملا ہے، اور اس کی صحیح تربیت کی گئی ہے تو بڑوں کا ادب کرنے لگتا ہے، بڑوں کا ادب کے کیا معنی ہیں کہ بڑوں کے سامنے کوئی ایسا کام، ایسی حرکت نہیں کرے گا جو بے ادبی میں شمار ہو، جس سے ان بڑوں کی توہین ہوتی ہو یا اُن بڑوں کا مذاق اُڑتا ہو، یا حقارت ہوتی ہو، تو کہا جائے گا اس لڑکے کو بڑا پاس و لحاظ ہے، ادب سیکھ گیا ہے، ایسے ہی طالب علم کا ادب و لحاظ، ایسے ہی مرید کا ادب و لحاظ، ایسے ہی ملازم کا ادب و لحاظ، تو تقویٰ کے معنی ہیں ادب و لحاظ کے، کہ کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ یہ کام کیسا ہے، اس کو خوش کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا ہے، اور اگر دین کے دائرہ میں دیکھئے، تو یہ دیکھنا کہ دین و شریعت کے مطابق ہے یا نہیں اس کی عادت پڑ جانا، یہ ہے تقویٰ! چنانچہ اس کی دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاروق اعظم اور امیر المومنین ہیں، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد صحابہؓ کرامؓ میں سب سے بڑا درجہ انھیں کا ہے، مسلمانوں کے خلیفہ تھے، امیر المومنین تھے، قرآن مجید ان کے سامنے ہی نازل ہوا اور پھر اہل زبان ہیں، اور اہل زبان بھی کیسے ہیں کہ اس زمانہ کی ٹکسالی زبان جو ہر زمانہ میں معتبر رہے گی، سکّہ رائج الوقت کی طرح، وہ وہیں پلے بڑھے، وہی زبان بولنے والے اور صحابہ کرام وہ تھے کہ کسی چیز کے پوچھنے میں ان کو کوئی شرم نہیں آتی تھی، وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ اپنے علم کو صحیح کریں، اور بڑھائیں، تو انھوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا نام لے کر کہا، یہ بتاؤ کہ ''تقویٰ'' کسے کہتے ہیں، تو انھوں نے کہا امیر المومنین! آپ ایسے راستہ چلے

ہیں، کہ دونوں طرف کانٹوں کی باڑھ لگی ہو، (ادھر بھی کانٹوں کی قطار ادھر بھی کانٹوں کی قطار ہے) اور راستہ تنگ، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں! ایسا اتفاق ہوا ہے، انھوں نے کہا، پھر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمر نے فرمایا، دامن سمیٹ لیا، آستین وغیرہ دیکھ لی کہ کہیں کانٹوں میں پھنس نہ جائے، کہا: یہی تقویٰ ہے! کہ زندگی اس طرح گذاری جائے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کام ایسا کر بیٹھے جو خدا کو ناراض کرنے والا ہو، مسئلہ کے خلاف ہو، ناجائز ہو، تو اس آیت میں جس میں بہت سے لوگ غور نہیں کرتے کہ عربی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزے اس لئے فرض کئے گئے کہ ہم متقی بن جائیں، کہ جو ۲۹ دن یا ۳۰ دن روزے رکھے گا رمضان ختم ہو گیا، عید کا چاند نکلنے لگا، تو وہ متقیوں میں ہو گیا، ''اللہ اکبر'' کہ جس نے دن کو روزہ رکھا، کچھ کھایا نہیں، اور کئی کئی قرآن شریف ختم کئے، رات میں عبادت کی اور تراویح سنی، یہ متقی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امتحان میں پاس ہو گیا چھٹی ملی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں حلال، پاک طیّب چیزیں رمضان کے دن کے اوقات میں اللہ کے حکم سے، اللہ کی مرضی سے پاک و صاف چیزیں چھوڑیں، ایک دن دو دن نہیں، ۲۹ دن ۳۰ دن پانی نہیں پیا، حالانکہ پانی سب سے بڑی نعمت ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ہے۔

اور کھانا نہیں کھایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا، گھر میں وہ چیزیں موجود تھیں حلال کمائی سے تھیں، لیکن نہیں کھایا، کیوں نہیں کھایا، کیوں نہیں پانی پیا، وہ چیزیں

جو انسان بہ حیثیت انسان کے اور بشری تقاضوں کے کرتا ہے، تعلقات بھی اس میں ہیں، تصرفات بھی اس میں ہیں، اس میں اعمال بھی ہیں، یہ سب چیزیں ہم نے چھوڑ دیں محض اللہ کے حکم سے، کہ اللہ تعالیٰ نے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک حلال و پاک چیزوں کے استعمال سے بھی روکا ہے، کہ تمھارے حلق سے پانی کا ایک قطرہ نہ اترنے پائے، تمھارے حلق میں کھانے کا ایک دانہ نہ جانے پائے، تو جب ہم نے اللہ کے حکم سے یہ پاک وطیّب چیزیں چھوڑی ہیں تو اب جب رمضان المبارک ختم ہو گیا، تو اس سے یہ بات بھی ہم پر واضح ہو جانی چاہئے کہ جو ناپاک چیزیں ہیں اور ناپاک کیا ہیں؟ ہم آپ سمجھتے ہیں کہ جسے گندگی لگ جائے، گندی چیز پڑ گئی، وہ ناپاک ہو گئی جب کہ سب سے بڑی ناپاک چیز گناہ، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔

تو جس طرح ہم نے اللہ کے حکم سے رمضان کے دنوں میں حلال و پاک طیّب چیزیں چھوڑیں تو اسی اللہ کے حکم سے غیر رمضان کے دنوں میں گناہوں کا ارتکاب کیسے کریں، ہم اللہ کو ناراض کرنے والی چیزیں کیوں کر گذریں، ہم جھوٹ کیوں بولیں، ہم جھوٹی گواہی کیوں دیں؟ ہم کسی مسلمان کی دل آزاری کیوں کریں، ہم کسی کا حق کیوں ماریں، ہم بہتان کیوں لگائیں، ہم چوری کیوں کریں، ہم ظلم کیوں کریں، ہم کسی کا خون کیوں بہائیں، ہم کسی کا دل کیوں توڑیں، بس ساری چیزیں جو آپ جانتے ہیں، ان چیزوں سے بچنے کی عادت، خیال، دھیان پیدا ہو جائے، یہ ہے تقویٰ۔!

’’تقویٰ‘‘ مزاج کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں ہے

عبادت اور ہے اور تقویٰ اور ہے، تقویٰ مزاج کا نام ہے۔ انسان عبادت تو کر

رہا ہے لیکن معاملات میں اور غصہ کی حالت میں اور دنیاوی حالات میں انسانی عبادت دھری کی دھری رہ جاتی ہے، تو اس کا نام تقویٰ نہیں ہے، اسی طرح صرف طاعات میں لگنا، معصیت سے بچنا، یہ "تقویٰ" نہیں ہے، بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ "مزاج" بن جائے، روزہ فرض اس لئے کیا گیا ہے تاکہ تمھارے اندر صفتِ تقویٰ آجائے "لعلکم تتقون" کہا، لعلکم تعبدون یا لعلکم تشکرون یا لعلکم تحتجون نہیں کہا، بلکہ یہ کہا "لعلکم تتقون" کہ عبادت میں لگنا یہ کسی مصلحت پسندی یا نفس پرستی کا نہ ہو، بلکہ اللہ سے شرم کرنا، یہ تمھارا مزاج اور طبیعت بن جائے۔

تو "تقویٰ" کے معنی ہیں لحاظ و شرم کی عادت، پاس و لحاظ کی عادت پڑ جانا، کہ کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ یہ کام کیسا ہے؟ خدا کو خوش کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا، اور اگر دین کے دائرہ میں دیکھئے تو یہ دیکھنا کہ دین و شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس کی عادت پڑ جانا، یہ ہے تقویٰ، اور یہی "لعلکم تتقون" کا مفہوم ہے(۱)۔

---

(۱) (۱) تعمیر حیات ۲۵ر فروری ۱۹۹۲ء۔ (۲) ارکان اربعہ ص ۲۵۷ تا ص ۲۵۹ (۳) رمضان اور اس کے تقاضے (از حضرت مولانا مد ظلہ) ص ۳۳۔ ۳۴۔ ۴۵۔ ۵۱) سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

عید الفطر کا پیغام

﴿يُرِيْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوْا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوْااللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْن.﴾

''اللہ تمھارے حق میں سہولت چاہتا ہے، اور تمھارے حق میں دشواری نہیں چاہتا، اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو، اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمھیں راہ بتادی، عجب نہیں کہ تم شکر گزار بن جاؤ، اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں، دعا کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعاء کرتا ہے، پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں''۔

یہ سورۂ بقرہ کی وہ آیتیں ہیں، جن کا تعلق رمضان المبارک سے ہے، اور جن کی ابتدا ہوتی ہے ''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' اور اسی میں یہ آیت ہے ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ''۔

اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، اُس کا منشا اور ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، "وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" وہ تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، یہ ۳۰ یا ۲۹ دن کے جو روزے ہیں کوئی پہاڑ نہیں ہیں، یہ مسلسل چلتے ہیں اور جلد ختم ہو جاتے ہیں، اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰاكُمْ" اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر کہ اللہ نے تم کو ہدایت دی، اللہ نے ہدایت کی جو نعمت تم کو عطا فرمائی ہے، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ "وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" اور تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں عید کا بھی ذکر کر دیا

اللہ جل شانہ نے اس آیت میں عید کا بھی ذکر کر دیا، عید کا نام تو نہیں آیا، لیکن عید کا منشا، عید کا مقصد، اور عید کا وظیفہ، عید میں کرنے کا کام، یہ سب اس میں آگیا، کہ جب اللہ تعالیٰ رمضان میں روزہ کی توفیق دے، کہ رمضان آئے اور خیریت کے ساتھ، توفیق الٰہی کے ساتھ، دن کے روزوں کے ساتھ، رات کی عبادتوں کے ساتھ گذر جائے، "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰاكُمْ" اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اللہ نے ہدایت دی، ایمان و اسلام کی دولت سے نوازا، اور پھر توفیق دی، اگر ان میں سے ایک چیز بھی نہ ہوتی تو کہاں کا رمضان اور کہاں کا روزہ، دنیا میں پچاسوں قومیں ہیں، سیکڑوں قومیں ہیں وہ اتنا جانتی ہیں کہ رمضان کا مہینہ مسلمانوں میں آتا ہے، جیسے ہمارے یہاں مہینہ آتا ہے، انھیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب رمضان آیا اور کب ختم ہو گیا، اور ان کے مہینوں اور رمضان میں کیا فرق ہے۔

تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا، جس نے ہمیں صحت دی، ایسی صحت جس سے روزہ رکھ سکیں، اور پھر اس کے بعد سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ توفیق دی، سب کا انحصار توفیق پر ہے، ساری چیزیں جمع ہیں مگر توفیق نہیں تو کچھ نہیں، یعنی روزہ رکھنے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، عمر! تو اللہ کے فضل سے زندگی ہے، جوانی چاہئے، بلوغ چاہئے، تو وہ بھی موجود ہے، صحت چاہئے تو وہ بھی موجود ہے، اور روزے کے مسئلے معلوم ہونے چاہئیں تو وہ بھی معلوم ہیں، حکومت روکتی، قانون روکتا، یا ڈاکٹر ہی نے کہا ہوتا کہ تمھارے لئے روزہ رکھنا نامناسب ہے، نقصان دہ ہے، تو یہ بھی نہیں ہے، پھر روزہ کیوں نہیں ہو رہا ہے، توفیق نہیں ہے۔

توفیق کا مطلب

توفیق وہ چیز ہے جس کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا، توفیق کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا رحمت کا ارادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا اس کے دل میں یہ خیال اور جذبہ ڈال دینا کہ یہ کام کرنا ہے، کہ تمام رکاوٹوں اور موانع کو ہٹا دینا ہے، اور پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کام ہو، یہ شخص روزہ رکھے، نماز پڑھے، ان سب کے مجموعے کا نام توفیق ہے، اتنی لمبی جو ہم نے عبارت بیان کی وہ عربی کے قرآن مجید کے ایک لفظ میں آگیا ہے اس کا نام ہے ''توفیق''۔

آپ دیکھیں گے، اپنے محلّہ میں دیکھیں گے، کہ ماحول موجود، سارے اسباب موجود، شرائط موجود، فضا موجود، لیکن روزہ نہیں اس لئے کہ توفیق نہیں،

اب اللہ نے تم کو ساری چیزیں اور ساتھ میں توفیق بھی عطا فرمائی، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو، "ولتکبروا اللہ علٰی ما ھداکم"۔

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

چنانچہ مسنون بھی یہ ہے کہ عید آئے، عیدالفطر ہو، تو آہستہ آہستہ تکبیر کہتا ہوا آئے، اور عیدالاضحیٰ ہو تو ذرا بلند آواز سے "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد" پکارتا ہوا آئے، اور مسنون یہ ہے کہ ایک راستہ سے آئے، اور دوسرے راستہ سے جائے، تاکہ ساری فضا اس سے معمور ہو جائے، اور وہاں کے رہنے والوں کے کانوں میں یہ فضا پڑ جائے، اور وہ زمین گواہی دے، اور جب تک عید کی نماز کے انتظار میں بیٹھا رہے، یہ کہتا رہے، "وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُم وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" تاکہ تم شکر کرو، کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی، اللہ نے ہم سے روزے رکھوائے، کوئی بیماری وغیرہ کے باعث چھوٹ گیا تو اس کے لئے بھی نیت اچھی کی، اور دنیا میں جتنے بھی خوشی کے تہوار ہیں سب میں خوشی ہوتی ہے، یعنی اس میں جو فرائض ہوتے ہیں، روزمرّہ کا جو معمول ہے، وہ بھی معاف ہو جاتا ہے، لیکن اسلام تنہا مذہب ہے، کہ اس میں خوشی کے دن کام بڑھا دیا جاتا ہے، کام ایسا بھاری نہیں ہوتا کہ آدمی کہے کہ کام نہ ہوتا، نہیں بلکہ کام ایسا مبارک ہوتا ہے، ترقی دینے والا ہوتا ہے، اور معقول ہوتا ہے، اور انسانیت و شرافت کا ہوتا ہے، یہ جو دو رکعتیں آپ نے پڑھیں وہ روز کی نہیں ہوتیں، ہاں کوئی اشراق و چاشت پڑھے، جو فرض و واجب نہیں ہیں، لیکن عید کی نماز بڑھا دی گئی، اور تہوار آپ

دیکھیں گے تو اس میں عبادات معاف ہو جاتے ہیں، کوئی پوجا کرے یا نہ کرے، چرچ جائے یا نہ جائے، کرسمس ہے چھٹی کا دن ہے، اور یہاں تو کام بڑھا دیا گیا کہ فجر کی نماز پھر ظہر کی نماز درمیان میں دوگانہ اور بڑھا لیں، یہ ہے اسلام میں شکر کا طریقہ، شکر کا طریقہ چھٹی نہیں ہے، بلکہ بات یہ ہے ع

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

اس اُمّت کو سبق یاد ہو گیا ہے الحمد للہ۔ ساری اُمّتیں سبق بھلا بیٹھیں، بات یہ ہے کہ روئے زمین میں کوئی اُمت ایسی نہیں جس کو سبق یاد ہو، تنہا یہ اُمّت ہے جس کو سبق یاد ہے، کچا پکا جیسا بھی ہو، تو جب اس کو سبق یاد ہوا چھٹی نہیں ملی، سبق یاد کرنے والے لڑکے کو، مکتب میں پڑھنے والے کو چھٹی نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داریاں ہیں، اور اس کو اپنی اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے اس میں اضافہ ہوگا کمی نہیں ہوگی۔

تو دو رکعت یہ، اور فطرہ الگ دینا پڑتا ہے، ہر وقت کی بات نہیں دوسرے ادیان کے تہواروں میں یہ نہیں بلکہ وہاں تو کھاؤ پیو، وہاں معاملہ یک طرفہ ہے، اور یہاں لینے سے زیادہ دینا ہے، غریبوں کو فطرہ دو، اللہ کے سامنے دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھو، اور پھر تکبیر پڑھو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ ”وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُم وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ“(۱)۔

---

(۱) ”عید الفطر کا پیغام“ مطبوعہ تقریر سے تلخیص کی گئی۔

نبیؐ خاتم ودین کامل

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (سورہ المائدہ۔ ۳)

آج ہم نے تمھارے لئے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے تعلق سے دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا وعدہ اور مذاہب و ادیان کو بنیادی طور پر ان کی ضرورت ہے ایک اشاعتِ دین دوسرے حفاظتِ دین۔

اشاعتِ دین

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، قرآن مجید میں دونوں کے بارے میں واضح اشارات موجود ہیں، مثلاً اشاعتِ دین کے لئے صاف کہا گیا ہے:-

ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ. وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ.

(سورہ التوبۃ۔ ۳۳)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک ناخوش ہی ہوں۔

اور کہیں فرمایا گیا:-

وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ. — اگرچہ کافروں کو بُرا ہی لگے۔

(سورۃ التوبۃ ـ ۳۲)

"لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو کر رہے گا اور محض سیاسی، انتظامی طور پر اور اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دلائل کے لحاظ سے بھی اور تسخیر ذہنی و تسخیر عقلی کے میدان میں بھی۔

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کو بشارت دی گئی اور پیشین گوئی کی گئی ہے:-

اِذَا جَآءَ نَصْرُاللهِ وَالْفَتْحُ. وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجاً. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ. اِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً.

(سورہ النصر)

جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح (حاصل ہوگئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو وہ معاف کرنے والا ہے۔

"يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجاً." کا دل کش منظر آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں دکھا دیا گیا، لیکن یہ منظر بارہا سامنے آتا رہا ہے۔

تیسری طرف سورۂ نور میں کہا گیا ہے:-

وَعَدَاللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ. وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْناً. (سورۃ النور ـ ۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار کر دے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔

"تَمْكِيْنَ فِي الْاَرْضِ" کا نتیجہ اشاعتِ دین بھی ہے اسی لئے فرمایا گیا:-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (سورہ الحج۔۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔

یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع، معنیٰ خیز اور فکر انگیز ہیں، اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے۔

حفاظتِ دین

جہاں تک صیانت و حفاظتِ دین کا تعلق ہے جو دوسرا رکن ہے، اور بہت اہم رکن ہے، قرآن میں اس کی ضمانت دی گئی ہے، اور اس کے لئے ایک عظیم اور چونکا دینے والا اعلان کیا گیا ہے، اور تاریخ کو اس کا شاہد بنایا گیا ہے، وہ خدا کا یہ فرمان اور قرآن مجید کا یہ اعلان ہے:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (سورہ الحجر۔۹)

بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

صاف صاف کہا گیا ہے کہ ہم نے "الذّکر" یعنی قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے براہ راست اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے(۱)۔

---

(۱) تلخیص از نبی خاتم و دین کامل ادیان و ملل کی تاریخ میں اس کی اہمیت و خصوصیت ص ۵ تا ص ۱۰

باب ۵

تہذیب و معاشرت

"ہر دور میں:-
دنیا کے لئے ضرورت رہی ہے کہ ایک مکمل معاشرہ، ایک ملت اور عالمگیر دعوت کی سطح پر اسلامی زندگی پائی جائے......
آج بھی:- دنیا کی ضرورت یہ ہے کہ:-

- ☆ کسی ملک کا پورا معاشرہ اسلامی زندگی کی نمائندگی کر رہا ہو!
- ☆ اسلامی اخلاق کیسے ہوتے ہیں؟
- ☆ مسلمان کس طرح اس پر یقین رکھتا ہے کہ "الصدق ینجی، والکذب یھلک"؟
- ☆ اس کے دل کی گہرائی میں یہ بات بیٹھ گئی ہو کہ صحیح کردار نجات دیتا ہے! کامیاب کرتا ہے اور غلط بیانی اور غلط طرز زندگی انسان کو ہلاک کرتی ہے!
- ☆ اس کو یقین ہو کہ "اَلعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" انجام متقین ہی کا ہوتا ہے!
- ☆ اس کو یقین ہو کہ "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا" (کامیاب ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور ناکام ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا دیا)!
- ☆ اس کو یقین ہو "وإن الدار الأخرة لهي الحيوان" (آخرت کی زندگی ہی حیات اصل ہے)
- ☆ اس کو یقین ہو کہ نصرت اللہ کی طرف سے آتی ہے!

اچھے اعمال میں تاثیر ہے، غلط اعمال کرنے سے ناکامی ہوتی ہے اور صحیح زندگی اختیار کرنے سے کامیابی ہوتی ہے!!"۔

ماخوذ از "تحفۂ پاکستان صفحہ ۲۰۔۲۱۔"

اسلامی معاشرہ

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ. فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (الحجرات: ۷)

قرآن مجید صحیح اسلامی معاشرہ کا معیار یہ پیش کرتا ہے کہ اس کے ضمیر و خمیر میں صالح اقدار و اخلاق کی محبت رچ بس گئی ہو اور اس کا مزاج بن گئی ہو، اس کو فسق سے، ظلم سے اور نفس پرستی سے طبعی و مزاجی طور پر وحشت اور اِبا ہو، اس میں کوئی ایسی دعوت جس میں سرکشی، ہوا و ہوس، انسانوں کے حقوق کی پامالی، انسانی طبیعت کو بے مہار چھوڑ دینے کی دعوت ہو، جس میں تفریح طبع یا نفس کی خواہشات و جذبات کی تسکین کے لئے بڑے سے بڑے ملی اور اجتماعی مفاد کو قربان کر دینے کی صلاحیت ہو اس دعوت و تحریک سے یہ معاشرہ اِبا اور انکار کر رہا ہو اور اس کو اس سے ایسی نفرت ہو جس کو اردو میں "گھن آنا" کہتے ہیں، اس کو اس کے معاملہ میں ایسی کیفیت کا سامنا کرنا ہوتا ہو جس کو تکدر و تنغّص کے الفاظ سے ادا کیا

جا سکتا ہے۔

قرآن مجید اس اسلامی معاشرہ کے بارہ میں (جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی صحبت و تربیت اور قرآن مجید کی تعلیمات پر پڑی تھی) شہادت دیتا ہے، قرآن کہتا ہے:۔

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ. فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (الحجرات: ۷)

"لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنایا، اور اس کو تمھارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا، ایسے ہی لوگ تو راہ راست پر ہیں، اللہ کے فضل و انعام سے"۔

جو حضرات عربی داں ہیں وہ ان الفاظ کی قوت کو اور ان کا جو درجۂ حرارت ہوتا ہے، (الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے وہ اہل زبان ہی سمجھتے ہیں) یعنی تمھیں ایمان اور اس کے مظاہر کو دیکھ کر وہ مسرت و اہتزاز اور انبساط کی وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو کسی جمیل سے جمیل پیکر، اور کسی دل کش سے دل کش چیز سے طبعی طور پر حاصل ہوتی ہے، "وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" یہ عقیدہ اور عقل و شعور کے دائرہ سے آگے کی بات ہے، یہ ایک طبعی و نفسیاتی کیفیت ہے، معاشرہ اور ان صالح اقدار و اخلاق اور مفید و نافع دعوتوں کے درمیان وہ رشتہ قائم ہو جائے جس کو کسی عملی دلیل، اور عمیق غور و فکر کی ضرورت نہ ہو، خود بخود دل اس کی طرف کھنچے۔

اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا لیکن قرآن مجید کا اعجاز اور فطرت انسانی کی وہ

عمیق و دقیق معرفت ہے جو صرف خالق کائنات کو حاصل ہوتی ہے کہ اس کے بالمقابل صفتوں کا بھی ذکر کیا، اور فرمایا:-

"وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرِ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ"

اور ناگوار و ناخوش گوار، اور گویا ناقابل برداشت بنادیا، کفر کو، فسق کو، عصیان و نافرمانی کو، وہ اسلامی معاشرہ جو دنیا کے لئے قابل تقلید ہو سکتا ہے، جس کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہیں، جو زمانہ کی گرم و سرد ہواؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے، جو ہر قسم کے امتحانات اور آزمائشوں سے کامیاب طریقہ پر گزر سکتا ہے، یہ وہ معاشرہ ہے جس کے اندر نیکی کی محبت رچ بس گئی ہو، اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسی معاشرہ کی تعریف میں کہتا ہے:-

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ. وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا. وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾. (الفتح: ٢٦)

"جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی، اور ضد بھی جاہلیت کی، تو خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی، اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اسی کے مستحق اور اہل تھے"۔

ان الفاظ پر آپ غور کیجئے "اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ" دل میں اہل کفر کے حمیت جاہلیت نے انگڑائیاں لیں، قوم پرستی، نسل پرستی، مفاد پرستی، نفس پرستی، یہ سب "حمیت جاہلیت" میں شامل ہے، یہاں تک کہ لسانی عصبیت بھی اسی میں آتی ہے، آپ نے دیکھا ہے کہ لسانی عصبیت

نے کتنے طاقتور عامل، کتنے بڑے (Factor) کا کام کیا ہے، اس لسانی عصبیت نے ماضی قریب میں وہ گل کھلائے، خون کے دریا بہائے اور اس طرح انسانیت اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کیا گیا، اس طرح انسان نے انسان کو شکار کیا، اور اس طرح انسان نے انسان کا خون بہایا، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے، یہ سب حمیت جاہلیت کا کرشمہ تھا، ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل!

اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر فرماتا ہے، "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" اس مفہوم کو کئی طرح سے ادا کیا جا سکتا تھا، اللہ نے ان کی زبان پر کلمہ تقویٰ جاری کیا، لیکن نہیں "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" فرمایا، ان کے لئے کلمہ تقویٰ کو لازم و ملزوم بنا دیا، یعنی وہ ان کا شعار بن گیا، شعار ہی نہیں بلکہ مزاج بن گیا، آپ جانتے ہیں کہ مزاج، عادتوں، تربیت و صحبت کے اثرات، عقلی و تعلیمی جدوجہد کی کوششوں سے ماوراء چیز ہے، مزاج وہ ہے جو ہر چیز پر غالب ہو کر رہتا ہے۔

ہم میں سے بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا کہ یہاں پر "اَلْزَمَهُمْ" کیوں کہا؟ یعنی کلمہ ان کا شعار، ان کا مزاج بن گیا، ان کو كَلِمَةَ تَقْوٰى ...... کے حدود سے کوئی باہر نہیں لے جا سکتا، "وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" فرما کر اس پر اور مہر لگا دی، کلمہ تقویٰ کو انھوں نے آگے بڑھ کر بے اختیارانہ طریقہ پر قبول کیا، ان کے اندر وہ کلمہ تقویٰ جذب ہو گیا، پھر اس سے بڑھ کر قرآن ایک نازک پیمانہ بیان کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انسانی اخلاق و نفسیات کی پوری تاریخ میں (جہاں تک میرا مطالعہ ہے) قرآن مجید نے اس معاشرہ کی جو خصوصیت بیان کی ہے وہ ایسی ہے کہ

اس کے آگے خود انسانی تخیل کا جانا بھی مشکل ہے، کہتا ہے:-

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ﴾ (النور:)۔

"جب تم نے وہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا، اور کیوں نہ کہا یہ صریح طوفان ہے"۔

جب تمھارے سامنے ایک مومن فرد پر، ایک پاکباز ہستی پر تہمت لگائی گئی تو تم نے اپنے اوپر قیاس کیوں نہ کیا، آئینہ میں اپنی صورت کیوں نہیں دیکھی، اور سنتے ہی یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ہم نہیں کر سکتے تو وہ ہستی بھی نہیں کر سکتی، خدا نے اسلامی معاشرہ کو ایسا بنایا کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا آئینہ ہے، ہر فرد دوسرے فرد کا مصدق و شاہد ہے، شاہد ہی نہیں مدعی ہے، اس کی طرف سے مدافعت کرنے والا، سینہ سپر ہے اور خم ٹھونک کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایسا نہیں ہو سکتا، معاشرہ نبوت کے سانچہ میں ایسا ڈھل کر نکلا تھا کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا آئینہ تھا ؎

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

یہ ہے اسلامی معاشرہ جس پر پورے طور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جس پر ذمہ داری اور دنیا کی رہنمائی کا بڑے سے بڑا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے، اس پر نسل انسانی کی رہبری اور قیادت کے بارہ میں پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے (۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵/ جولائی ۱۹۸۶ء

معاشرت انسانی بلکہ حیات انسانی

مرکب ہے مرد وعورت سے

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّیْ لَا أُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ
مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ.

ہم نے آپ کے سامنے سورۂ آل عمران کی آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اہل ایمان کی دعاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان اہل ایمان نے خوب دل کھول کر دعائیں کیں، معمولی دعائیں نہیں تھیں، بڑی مومنانہ دعائیں، بڑی مبصرانہ دعائیں، بڑی مردانہ دعائیں! مردانہ لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے ﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیَ یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا﴾۔ ایک مردانہ دعا ہے، ﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ، رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾۔ ایسی بلند ہمتی کی دعائیں تھیں۔ انھوں نے ایک بات اور کہی تھی ﴿"رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا

(۱) سورہ الفتح: ۲۶

مُنَادِیَ یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ ہم نے ایک پکارنے والے کو، تیرے ایک منادی کو پکارتے ہوئے سنا کہ "آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ" (اپنے رب پر ایمان لاؤ) "فآمنّا" (ہم ایمان لائے) "وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَا" ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہمارے گناہوں سے درگذر کر۔

ظاہر ہے کہ ان دعاؤں میں ذہن مردوں ہی کی طرف جائے گا، منادی اور قبول کرنے والے مرد، اور میں یہ کہوں کہ پیش پیش رہنے والے اور اس کو مردانہ وار لبیک کہنے والے مرد تھے تو یہ بھی صحیح ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ جب اجر کا اور دعاؤں کی قبولیت کا ذکر کرتا ہے تو مردوں کے ساتھ۔ حالانکہ وہاں پر کوئی سیاق و سباق اور قرینہ نہیں ہے۔ خاص طور سے عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔ دوسری جنس، جنس لطیف کا بھی ذکر کرتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ" دعا کرنے والے مرد ہیں اور فرماتا ہے اللہ نے ان کی دعا قبول کی۔

رحمتِ الٰہی میں مساوات کامل ہے

یہاں پر کوئی ادیب ہوتا، کوئی انشاء پرداز ہوتا، کوئی مقنن ہوتا، کوئی ماہر نفسیات ہوتا، کوئی بڑا عورتوں کی آزادی کا حامی اور محرک ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں پر عورتوں کو فراموش کر دیتا...... کیا موقع تھا، کیا ذکر تھا، ساری دعائیں مردوں کی اور سارے کاموں میں مرد ہی پیش پیش تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت دیکھئے وہ خالق ذکور و اناث دونوں جنسوں کا خالق ہے، دونوں پر اس کی یکساں شفقت کی نظر ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ فرماتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّی لَا اُضِیْعُ

عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی اور جواب دیا کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا "عامل" کا لفظ تذکیر کا ہے۔ یہاں تک مردوں ہی کا ذکر تھا "لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا، کسی محنت کرنے والے کی محنت کو، کسی کوشش کرنے والے کی کوشش کو، کسی قربانی دینے والے کی قربانی کو، ضائع نہیں کرتا۔ "مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى"۔ یہاں پر ایک دم سے عورتوں کو یاد فرمایا اور ان کو شرف بخشا، وہ عمل کرنے والا، وہ دعا کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت۔ اس سے زیادہ، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت میں، (میں اور کسی چیز میں نہیں کہتا، لیکن میں اس کو پورے وثوق کے ساتھ اور خم ٹھونک کر کہتا ہوں) اور کسی چیز میں مساوات ہو یا نہ ہو اور بعض چیزوں میں مساوات، اسلامی شریعت سے تحفظ، اور فطرت انسانی کی معرفت پر مبنی بصیرت سے کام لیتی ہے لیکن ایک چیز ڈنکے کی چوٹ پر کہی جا سکتی ہے کہ رحمتِ الٰہی اور بخشش الٰہی میں مساوات کامل ہے اس میں کوئی تحفظ نہیں ہے، کسی قسم کا ریزرویشن نہیں، کسی قسم کا امتیاز نہیں اور اس کی دلیل یہ آیت ہے، "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ"۔

پورا سیاق و سباق دیکھئے تو آنکھیں کھل جائیں گی اور اعجاز قرآنی سے بڑھ کر رحمت یزدانی کا آدمی قائل ہو جائے گا اور کوئی جھوم اٹھے اور کسی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے اور خاص طور پر میں اپنی عزیز بہنوں سے کہتا ہوں، اگر ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے اور اگر کسی بڑے شکر کی حالت میں مدہوشی کی حالت طاری ہو جائے اور اس کے رونگٹے رونگٹے سے شکر کے ترانے نکلیں بلکہ اُبلیں تو بھی

بالکل بجا ہے اور برمحل ہے، یہاں یہ کوئی موقع نہ تھا مردوں نے بھی (اللہ ان کو معاف کرے) اپنی دعاؤں میں اپنی بہنوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا، اپنی ماؤں تک کا تذکرہ نہیں کیا تھا، حالانکہ ماں تو ماں ہے ہی۔ انھوں نے دعا اپنے لئے کی تھی ساری ضمیریں مذکر کی۔ لیکن اس رب العالمین کی رب العالمینی دیکھئے اور اس کی رحمۃ للعالمینی دیکھئے فرماتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّىْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى" اور پھر اس کے بعد مہر لگاتا ہے "بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ" تم بھول کیوں گئے تھے یعنی گویا تنبیہ کی گئی ان دعا کرنے والے مردوں کو کہ تم اپنے جسم کے اتنے بڑے حصہ کو، حیات انسانی کے ایک اتنے اہم عنصر کو بھول کیوں گئے تھے؟ بلکہ اپنے لئے شرط حیات کو بھول گئے تھے۔ تو تم بھولے، ہم نہیں بھولے، تم سو بار بھولو، ہزار بار بھولو لیکن ہم بھولنے والے نہیں ہیں۔ ﴿فِىْ كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسىٰ﴾ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا تو ان کے رب العزت نے جواب دیا "اَنِّىْ لَا اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں، بغیر سیاق و سباق کے فرماتا ہے "مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" چاہے وہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت، کیا تعجب کی بات ہے؟ تم ہو ہی ایک دوسرے سے مستغنیٰ نہیں۔ معاشرت انسانی بلکہ حیات انسانی مرکب ہے ان دونوں عنصروں سے، ان کا انفصال ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

عربی کا لفظ "اضاعت"

جب میرا ذہن اس آیت کی طرف گیا تو معانی اور مضامین کا ایک عالم سامنے

آگیا کہ لا اضیع کی وسعت اور اس کی بے پایانی دیکھئے کہ اس نے یہاں پر "لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" فرمایا، میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ عربی کا لفظ "اضاعت" کا استعمال ہوا ہے یعنی اس کی کوشش کا نتیجہ یہاں دنیا میں بھی ظاہر ہوگا اور آخرت میں بھی ہوگا۔ یہ آیت دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہے۔ آیت یہ نہیں کہتی کہ عورتیں عبادت کر کے دنیا میں تو کوئی نتیجہ نہ پائیں گی۔ محنت کریں علم کے لئے اور علم حاصل نہیں ہوگا، محنت کریں تربیت میں اور اس کا نتیجہ حاصل نہیں ہوگا، محنت کریں زندگی کو پُر لطف، بامعنی اور بارونق بنانے کی اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے اور سارا اجر آخرت کے لئے اٹھا رکھا جائے بلکہ جس میدان میں تم دونوں محنت کروگے، اس میں انہی کوششوں کا نتیجہ دیکھو گے، چنانچہ میں عبادت کے متعلق تو کیا کہوں عبادت میں اگر آپ صرف اسلام کی تاریخ دیکھئے اور حقیقت میں محفوظ تاریخ تو وہی ہے، ہماری مجبوری، انسانیت کی مجبوری، علم انسانی کی مجبوری، تقدیرات انسانی کی مجبوری کی تاریخ تو محفوظ امتِ محمدیؐ سے ہے، وہ علمی ترقیوں کی ہے، روحانی ترقیوں کی ہے اور مسائل کے نتائج ظاہر ہونے کی ہے، آپ دیکھئے کہ اس کا پورا امکان تھا کہ ولایت کے میدان پر پوری اجارہ داری مردوں کی ہوتی، اس لئے کہ ولایت کا میدان، قبولیت عند اللہ کا میدان بڑی خصوصیات کا طالب ہے اور اس کو مردوں سے کچھ مناسبت ہے، مجاہدہ کرنا، جہاد کرنا، رات رات بھر نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور یہ مردوں کے لئے آسان ہے۔

میں اس میں تفصیل کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ میں تو قرآن مجید کے اس اعجاز

کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ"...... "عمل" بھی یہاں نکرہ، "عامل" بھی یہاں نکرہ، کسی عمل کرنے والے کے عمل کو میں ضائع نہیں کرتا جس میں تم کوششیں کروگے، کوشش کروگی اگر تم نے عبادت میں کوشش کی تو ہم تم کو رابعہ بصریہ کے مقام اور اس سے بھی آگے کے مقام تک پہونچا سکتے ہیں(۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء

معاشرۂ انسانی کا باہمی ارتباط

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً. وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَام. اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً.

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک شخص (یعنی آدم) سے پیدا کیا، اس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیئے، اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو، اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو)، کچھ شک نہیں کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے"۔ (النساء: ۱)

یہ آیت سورہ نساء کی ہے، سورہ نساء کا نام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے طبقہ اناث کو اور جنس لطیف کو کیا مقام دیا ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ طبقۂ اناث کے متعلق اسلام کا تصور اور مرد و عورت کی باہمی ذمہ داری اور تعلقات کی نوعیت پر یہ آیت پوری روشنی ڈالتی ہے، پہلے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ ان دو طبقوں کی خلقت ایک ہی طرح ہوئی

ہے، اور ان دونوں کی قسمت ایک دوسرے سے ایسی وابستہ ہے گویا ایک جسم کے دو حصے ہوں، مرد و عورت کی جسمانی ساخت میں معمولی تبدیلی اس وجہ سے ہے کہ دونوں زندگی کا سفر خوشگواری سے طے کر سکیں۔

پہلے تو ان دونوں طبقوں کا وجود نفس واحدہ سے ہے پھر اس نفس واحدہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اس تقسیم کے باوجود ان میں کوئی تضاد کوئی بیر نہیں بلکہ وہ جا کر ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں، اس دنیا میں سفر کرنے والے انسان کو ہم سفر اس کی جنس سے دیا گیا ہے، اور وہ اسی کے جسم کا حصہ ہے، پھر اس کے بعد ان دونوں سے نسل انسانی کی آفرینش، اور افزائش ہوئی، اللہ تعالیٰ نے دونوں کی رفاقت محبت اور ہم سفری میں بڑی برکت عطا فرمائی کہ جو دو تھے ان سے ہزاروں ہوئے اور ہزاروں سے لاکھوں، کروڑوں ہوئے، یہاں تک کہ صحیح تعداد کا شمار کمپیوٹر بھی نہیں لگا سکتا کہ کتنے انسان پیدا ہوئے؟ اس کو صرف خدا جانتا ہے، ''کثیراً'' کے لفظ سے خدا نے ان کی کثرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

سائل بھی اور مسئول بھی

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم اس خدا سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو'' قرآن مجید میں انقلابی طور پر یہ تصور پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ہر فرد ایک دوسرے کا محتاج ہے ہر ایک سائل ہے اور ہر ایک مسئول ہے، پھر تقسیم اس طرح نہیں کہ سائلین ایک طرف ہیں اور مسئولین دوسری طرف بلکہ جو سائل ہے وہ مسئول بھی ہے، اور جو مسئول ہے وہ

سائل بھی ہے "تساؤل" (مشترک سوال و جواب) ایک ایسی زنجیر ہے جس میں ہر ایک بندھا ہوا ہے، ہماری تمدنی زندگی ایک جال ہے، جس میں ہر ایک دوسرے کا ضرورت مند ہے۔

مرد عورت کے بغیر اپنا قدرتی اور فطری سفر خوشگوار طریقہ سے طے نہیں کر سکتا اور کوئی شریف خاتون، رفیق حیات کے بغیر خوشگوار طریقہ سے زندگی نہیں گزار سکتی، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو دوسرے کا ایسا سائل اور محتاج بنا دیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی نہیں گذر سکتی۔

خدا کا نام بیگانوں کو یگانہ بناتا ہے

پھر بھی یہ فرمایا گیا کہ سوال جس کے نام پر تم کرتے ہو وہ خدا ہے، اسلامی معاشرہ خدا کے عقیدے، خدا کی عظمت، خدا کی قدرت اور خدا کی وحدت کے عقیدے پر وجود میں آتا ہے، ایک مسلمان مرد کی مسلمان خاتون سے ہم سفری اور رفاقت جب جائز ہوتی ہے، جب وہ خدا کا نام بیچ میں لائیں، خدا کا نام ہی بیگانوں کو یگانہ بناتا ہے، دور کو نزدیک کرتا ہے، غیروں کو اپنا بناتا ہے، اور جن کی پرچھائیں بھی پڑنا گوارا نہ تھی ان کو ایسا قریب اور عزیز بنا دیا جاتا ہے کہ ان کے بغیر زندگی کا صحیح تصور بھی نہیں ہو سکتا، وہ ایک دوسرے کے رفیق حیات اور ذمہ دار بن جاتے ہیں، شوہر اور بیوی کا تعلق ایسی محبت و اعتماد کا تعلق ہے کہ بعض اوقات وہ والدین کے تعلق سے بھی بڑھ جاتا ہے، جو بے تکلفی، جو اعتماد، جو الفت، جو سادگی، جو فطریت ان کے درمیان ہوتی ہے، کسی اور رشتہ میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، یہ سب

اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، خدا کا نام بیچ میں آتا ہے تو ایک نئی دنیا وجود میں آجاتی ہے، کل تک جو غیر تھا، یا غیر تھی، وہ اپنوں سے بھی زیادہ بڑھ کر اپنا بن جاتی ہے، ایک مسلمان مرد، ایک مسلمان عورت، ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے ساتھ بعض اوقات سفر بھی نہیں کر سکتے، ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں لیکن جب خدا کا نام بیچ میں آجاتا ہے تو ایک مقدس رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

یہ ایک قرآنی معجزہ ہے کہ "تساء لون بہ" کہہ کر معاشرۂ انسانی کا باہمی ارتباط، پیوستگی، وابستگی اور ہر ایک کا ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہونا ایسا بیان کر دیا کہ کوئی بڑے سے بڑا منشور اور بڑے سے بڑا چارٹر بھی اس کو بیان نہیں کر سکتا، فلسفۂ اجتماع و عمرانیات (سوشیالوجی) کی بڑی ضخیم کتاب بھی اس کو نہیں بیان کر سکتی۔

پھر یہ فرمایا کہ جس کا نام بیچ میں لاکر حرام کو حلال کرتے ہو، ناجائز کو جائز کرتے ہو اور اپنی زندگی میں انقلاب عظیم لاتے ہو، اس پاک اور بڑے نام کی لاج بھی رکھنی چاہئے، زوجین کے گہرے اور محکم تعلق کو قرآن مجید نے ایک دوسرے انداز میں بھی بیان کیا ہے، فرمایا "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (تم ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہو) یہ بھی قرآن مجید کا ایک معجزہ ہے، کہ اس کے لئے "لباس" کا لفظ استعمال کیا، جو ستر پوشی اور زینتِ زندگی کی اہم ضرورت ہے، "لباس" کے لفظ میں وہ سب کچھ آگیا جو زوجین کے باہمی تعلق و اعتماد کے متعلق زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے، تم ان کے لئے لباس ہو اور وہ تمھارے لئے

لباس ہیں، لباس کے بغیر جس طرح انسان حیوانیت سے قریب تر نظر آتا ہے، ایک صحرائی مخلوق نظر آتا ہے، ویسے ہی ازدواجی زندگی کے بغیر انسان غیر متمدن نظر آتا ہے، اس کو غیر متمدن اور غیر مہذب سمجھنا چاہئے(۱)۔

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔

اسلامی معاشرہ میں عورتوں کا مقام ومرتبہ

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ.

أَعَدَّاللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّأَجْراً عَظِيْماً.

"بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مؤمن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑے احسان کا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔ (الاحزاب۔ ۳۵)

اللہ کو اپنی بندیوں سے کتنی محبت ہے

جس وقت قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی میرا ذہن ایک دم سے ایک

عجیب و غریب نکتہ کی طرف گیا مجھے ایک سرور و کیفیت حاصل ہوئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو دیکھئے کہ جب ذکر کرتا ہے بڑے بڑے مقامات کا، ہم جیسے ٹوٹی پھوٹی عربی جاننے والے اس کو دو جملوں میں ادا کر سکتے ہیں مرد اور عورت سب شریک ہیں تو دس مرتبہ دو الگ الگ ضمیریں لاتا ہے اور ایک ایک صفت کا ذکر کرتا ہے، اللہ کو اپنی بندیوں سے کتنی محبت ہے ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ اَلْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ. ﴾

اگر خدا کا معاملہ نہ ہوتا تو میں کہتا اللہ کو بڑا مزہ آ رہا تھا ہر ایک کا الگ الگ ذکر کیا۔ کسی باپ سے پوچھئے جس کے چار یا سات بیٹے ہوں اس کا جی چاہے گا کہ ہر ایک کا نام لے کر وہ بتائے اور ہر ایک پر اس کو لطف آئے گا، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بہت عالی ہے۔ انسانی خصوصیات اس کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں، لیکن اس کو انسانی ادب و انشا کے لحاظ سے دوسرے طریقہ سے بھی ادا کیا جا سکتا تھا "وغیرہ" کا لفظ تو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا مگر مسلمان مرد اور عورتیں اور ایمان لانے والے اور ایمان لانے والی عورتیں اور اس طریقہ سے دوسرے تمام فضائل میں شریک ہونے والے مرد اور عورت، لیکن ایک ایک کو الگ الگ کر کے بیان کیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسلام اور ایمان میں تو مرد اور عورت شریک ہو سکتے ہیں، قانتات فرمانبرداری میں، اس میں بھی ممکن ہے لیکن صادقین اور صادقات

میں تو مشکل ہے، اس میں عورتیں جھوٹ بول دیتی ہیں کبھی اپنی کمزوری چھپانے کے لئے بھی، کبھی اپنے کھانے کی خرابی چھپانے، کبھی اپنے بچے کی بُری عادت پر پردہ ڈالنے کے لئے، کبھی سو جانے کی کمزوری پر، اور عورتیں سچائی میں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں یہ تو مردانہ کام ہے، بہادری کا کام ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن الصابرین والصابرات، وہ صبر کہاں کر سکتی ہیں ہمیشہ یہی دیکھا ہے سب سے پہلے ان پر صدمہ کا اثر پڑتا ہے، سب سے پہلے ان ہی کی زبان سے فریاد نکلتی ہے، بعض وقت تو ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے، بعض وقت تو اولاد کا غم۔ اللہ محفوظ رکھے یا عزیزوں کا غم سب سے پہلے عورت پر پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فطرت انسانی سے واقف تھا، اللہ تعالیٰ دلوں کے چور سے واقف تھا کہ ہم اپنی بہنوں سے بدگمانی کریں گے الصابرین والصابرات جی نہیں صبر کے میدان میں عورتیں کسی حال میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخَاشِعَاتِ۔ اب آیا معاملہ مال کا تو عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ حاتم کا نام تو سنا ہوگا حاتمہ کا نام نہیں سنا ہوگا، اس لئے صدقہ میں عورتیں کیا دیں گی وہ تو جمع کرنے والی ہیں وہ بڑی سوگھڑ عورتیں ہیں۔ بہت گرہست عورت ہے یعنی بچا بچا کر رکھنے والی۔ اس لئے فرمایا، وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ، اچھا صاحب روزہ بڑا مشکل معاملہ ہے، وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِیْنَ وَالْحَافِظَاتِ

وَالذَّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً وَّالذَّاکِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَغْفِرَۃً وَّاَجْراً عَظِیْماً.

اتنی لمبی اعمال کی فہرست یہ کیوں بیان کی تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جس طرح اپنے بندوں پر شفقت کرتا ہے اسی طرح اپنی بندیوں پر شفقت

کرتا ہے، اس کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک ساتھ کام کرتی ہے اور ان پر سایہ فگن ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اتنے جمع مذکر سالم، جمع مونث سالم ...... میں کتنی چیزیں جمع کر دیں کہ دوسرا آدمی اس کو سمجھے گا کہ یہ اس کے بلاغت کے خلاف ہے کیا اندازہ تھا کہ یہ سمجھا جائے کہ ایک طرف تو بیبیاں اور شریف بیٹیاں اور خواتین سمجھیں کہ ہر میدان میں فضائل انسانی میں، مکارم اخلاق میں، فضائل اعمال میں وہ مردوں سے پیچھے نہیں ہیں اور ان کو اجر و انعام ملے گا اور ان کی صنف اس کے مغائر نہیں ہے اُن کے مقصد آفرینش کے مغائر نہیں ہے ان کی صنفی خصوصیات مجروح کرنے والی نہیں ہیں۔

قرآن کریم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے ذکر کا اہتمام

ہم آپ سے ایک طالب علم اور عربی جاننے والے کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ یہ صرف کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ مرد و عورت سب کے سب درجے حاصل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جب ذکر کرتا ہے ایسے مراتب کا، تو مردوں کے لئے صیغہ الگ اور عورتوں کے لئے الگ ذکر کرتا ہے: "إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ"۔ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک مرد کے لئے صیغہ ہے، ایک عورت کے لئے، کوئی پوچھے کہ بھئی اتنا کہہ دیا ہوتا کہ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ نہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ عبادت کی یہ قسم صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورت اس میں کوئی

درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔ روزہ رکھنے میں ان کا ذکر ہے، عبادت کرنے میں ان کا ذکر ہے، اور اللہ کی یاد کرنے میں ان کا ذکر ہے "وَالذّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَّ الذّاكِرَاتِ" اللہ کا ذکر کرنے میں الذاکرین مذکر کا صیغہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور مؤنث کا بھی۔ اس لئے کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ اور ان کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہاں بہت سے کمالات اور بہت سی صفات صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں اور یہ بات دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بالکل بدیہی بات سمجھی جاتی تھی کہ یہ صرف مردوں کا کام ہے عورت اس میں ہاتھ نہ لگائے، وہ ترقی نہیں کر سکتی ہے، اس کو اس سے بڑا کوئی امتیاز نہیں حاصل ہو سکتا ہے لیکن قرآن میں ایک ایک عبادت کے ساتھ، عبادت کی ایک ایک قسم کے ساتھ مردوں کے لئے الگ لفظ اور الگ صیغہ ہے اور عورتوں کے لئے الگ صیغہ ہے۔

قرآن مجید میں عورتوں کے نام سے مستقل ایک سورۃ

اور پھر دیکھئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کی بڑی سورتوں میں سے ایک سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام پر رکھا گیا ہے "سورۃ النساء" کیا ہندو مذہب کا کوئی جاننے والا بتائے گا کہ اس کے مذہب میں اور اس کی کسی مقدس کتاب میں عورت کے نام سے کوئی لیکھ ہو یا اس کے عنوان سے ذکر ہو۔ لیکن جہاں پر ایک سورۃ سورۂ بقرہ ہے، سورۂ آل عمران اور پھر ساری سورتیں قرآن مجید کی ہیں وہیں ایک سورۃ النساء بھی ہے اور پہلے دن سے اس وقت تک اس کا یہ نام چلا آرہا ہے اور یہ عورتوں کے لئے ہے، ترقی اور علم دین حاصل

کرنے اور دین میں ترقی اور اس میں امتیاز پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور اللہ کا مقبول بندہ اور بندی بننے اور اس کے یہاں اونچا مقام حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت اور پورے امکانات اور پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک موجود ہیں اور آج بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

اخلاقی احتساب میں بھی شریک ہیں

قرآن مجید صرف طاعات و عبادت اور مذہبی فرائض ہی کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کی مساوات و شرکت کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ اس کی تعلیمات کی رو سے باصلاحیت مرد علماء اور بڑے ہمت و عزم رکھنے والے مردوں اور نمایاں افراد کے ساتھ ساتھ اخلاقی احتساب "امر بالمعروف، نهي عن المنكر" یعنی اسلامی معاشرے کی نگرانی و رہنمائی، اس کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے اور صحیح راستہ پر چلانے کے سلسلہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ذمہ داری میں شریک ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ایمان والے مردوں، ایمان والی عورتوں کو ایک متحدہ اور خیر و تقویٰ پر تعاون کرنے والی جماعت کی ایک محاذ کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ فرماتا ہے:-

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ

ایمان والے (مرد) اور ایمان والی (عورتیں) ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، نیک باتوں کا آپس میں حکم دیتے ہیں، اور بُری باتوں سے روکتے ہیں، نماز کی پابندی رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں، اور اللہ اور اس کے

وَرَسُوْلَهٗ، أُوْلٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(سورۂ توبہ:۷۱)

رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحمت کرے گا، بے شک اللہ بڑا اختیار والا ہے، اور بڑی حکمت والا ہے۔(۱)

---

(۱) ۱۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء

۲۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر اپریل ۱۹۸۶ء

۳۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۶ء

تینوں مختلف تقریروں سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

اچھی زندگی کی ضمانت

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

''جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت۔ بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے، اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے''۔(سورہ نحل۔ ۹۷)

مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ

یہ آیت ذہن کو بہت متوجہ کرنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے تذکرہ میں مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے۔ اس طرح عورت کو بھی اسی توجہ کا مستحق دکھایا ہے جس کا مرد کو، اور عملِ صالح کا جو فائدہ بتایا ہے وہ بہت عظیم ہے، عمل صالح کا فائدہ یوں تو سب کو معلوم ہے اور اس کا ذکر بھی سب کرتے ہیں لیکن اس آیت میں جو فائدہ بتایا گیا ہے وہ اپنی خاص نوعیت و اہمیت رکھتا ہے جو بہت اہم ہے لیکن اس کی طرف اس آیت کے پڑھنے

والوں کا ذہن عموماً کم گیا ہے، گذشتہ زمانے سے لے کر اس وقت تک کتنے حفاظ گزرے ہیں اور حافظوں کو قرآن حفظ یاد ہے اور ہو گا اور عالموں نے اس کی تفسیر بیان کی ہے لیکن بہت کم اس پر غور کرنے کی نوبت آئی کہ اس میں کتنی بڑی بشارت سنائی گئی ہے وہ یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

کہ جو بھی نیک کام کرے گا (مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ) مرد ہو یا عورت (من ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً) ہم اس کی ضرور اچھی زندگی گزروائیں گے۔

یہ سب ساری دوڑ دھوپ دنیا میں جو ہو رہی ہے، امریکا سے لے کر انڈونیشیا تک اور ہماری اسلامی دنیا میں مراکش سے لے کر شمالی افریقہ پھر یمن، انڈونیشیا اور ملیشیا تک سب کا حاصل یہ ہے کہ اچھی زندگی کیسے حاصل ہو، اس کے لئے کیا کوشش کی جائے، اور اس کے کیا اسباب اور کیا ذرائع ہیں اور کس طرح یہ دولت حاصل کی جائے، آپ دیکھیں گے کہ پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک، یونیورسٹیوں کے بعد خاص مضمون کی بڑی بڑی جو یونیورسٹیاں، جامعات اور بڑی اکیڈمیاں ہیں، جو غور و فکر کرنے کے لئے ہی بنائی اور قائم کی گئی ہیں اور بڑے بڑے مصنفین ہیں ان سب کا جو مشترک موضوع ہے وہ یہ کہ ایسی زندگی کیسے حاصل ہو۔ یہاں تک کہ سیاست اور انتخابات اور جمہوریت اور صحافت، یہ ساری چیزیں بھی اس کی معاون ہیں، کم سے کم یہ کہ وہ اس کا اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس کا راستہ دکھائیں گے، رہنمائی کریں گے۔

اچھی زندگی کی ضمانت

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بہت بڑی بشارت سنائی ہے ”مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

الصَّالِحَاتِ'' جو اچھے کام کرے گا اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، کام اللہ کی منشاء کے مطابق ہوں، اس کے رسولؐ کی منشاء و فرمان کے مطابق ہوں اور دینی احکام کے مطابق ہوں، پھر آخری آسمانی صحیفہ قرآن مجید کے مطابق ہوں تو ہم اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے، اس میں دنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں صرف آخرت ہی کی بشارت دی گئی ہے، ''حیٰوۃً طیّبۃً'' جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں نکرہ کا لفظ ہے ''الحَیٰوۃَ الطَّیِّبَۃَ'' بھی نہیں کہا گیا ہے۔ ''فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً'' ہم ہر طرح کی اچھی زندگی اس کی گزروائیں گے۔ یہ ساری کوشش اس بات کی ہو رہی ہے، یہ دوڑ دھوپ، یہ محنتیں، اور یہ راتوں کا جاگنا، اور یہ کتابوں پر محنت کرنا، پرائمری سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھنا پڑھانا، اور پھر اس کے بعد ڈگریاں حاصل کرنا، کوئی انجینیرنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور کوئی ادب اور لٹریچر کا راستہ اختیار کرتا ہے، سب کا مشترک مقصد اور ہدف و نشانہ یہ ہے کہ اچھی زندگی حاصل ہو۔

اور کیا آدمی چاہتا ہے کہ بڑی تنخواہ ہو، رہنے کے لئے اچھی بڑی کوٹھی اور سواری کے لئے اعلیٰ درجہ کی موٹر اور ہوائی جہازوں پر سفر کرنا اور پھر اس کے بعد سیاست میں آئے تو وزیر اعظم بن جانا اور پھر پارلیمنٹ میں ممبر بن جانا سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم آرام اور سُکھ کی زندگی گذار سکیں، اس کو سُکھ کہتے ہیں، یہ ایک عام لفظ ہے اور بہت وسیع کہ ہم سُکھی ہوں، دُکھی نہ ہوں، ہم سُکھ کی زندگی گذار سکیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی ضمانت لے لی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ نیک عمل کرے، ہمارے احکام کے مطابق اگر عمل ہوگا

"فَلَنُحْيِيَنَّهُ" لام کے ساتھ کہا، جب کہنا ہوتا ہے عربی میں ایسا ضرور ہوگا، ایسا ضرورکریں گے تو اس کو لَنَفْعَلَنَّ، لَنَذْهَبَنَّ لِنَعْلَمَن کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حالانکہ اللہ کا قول، فرمان خداوندی ہے، اس میں شک کیا ہو سکتا تھا، لیکن ہمیں اطمینان دلانے کے لئے مردوں اور عورتوں کو اطمینان دلانے کے لئے ہم ضرور اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے اور کیا چاہئے کہ دنیا میں یہ کس لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے، کس لئے اپنی صحتیں خطرے میں ڈالی جارہی ہیں، کس لئے مقابلے ہیں، کس لئے یہ دوڑ دھوپ ہے؟- سب اسی لئے ہے کہ اچھی زندگی گزرے-!

اب اچھی زندگی کسی نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اچھی تنخواہ ہو، حالانکہ اچھی تنخواہ میں اچھی زندگی گزرنا ہرگز یقینی نہیں۔ لاکھوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ اچھی بڑی تنخواہ ہے لیکن زندگی اچھی نہیں۔ یا صحت خراب ہے۔ یا آپس میں نااتفاقی ہے، یا اطمینان قلبی نہیں ہے، کوئی ڈر لگا ہوا ہے، یا کوئی خطرہ ہے، یا کوئی ایسا مرض ہو گیا ہے، کوئی عارضہ ہو گیا ہے، کچھ ہو گیا ہے، وہم ہونے لگا ہے، یا صحت میں بھی خرابی آگئی ہے کہ بڑی تنخواہ، بڑی کوٹھی، شاندار موٹر سب ہے، اولاد ہے، لیکن مزہ نہیں آرہا ہے زندگی میں۔

نعمت، جس کو زندگی کی نعمت کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہو رہی ہے، تو یہ بات سوچنے کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ہمارے احکام پرعمل کرے گا، ہماری شریعت پر عمل کرے گا، ہمارے رسولؐ کے فرمانوں پرعمل کرے گا، نہ وہ دیکھے گا کہ رسموں میں کیا ہوتا ہے، نہ یہ دیکھے گا کہ کون سی چیز بڑے فخر کی سمجھی جاتی ہے، کس بات پر

تعریفیں ہوتی ہیں، کس بات میں عزت ملتی ہے، کس بات میں دولت ملتی ہے، کوئی اس کا خیال نہیں کرے گا، کوئی اس کا خیال نہ کرے۔ صرف یہ کہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، شادی بیاہ کس طرح ہونا چاہئے، بچوں کی پرورش کیسے کرنی چاہئے، گھر میں کس طرح کی زندگی رائج کرنی چاہئے، نمازوں کی پابندی ہو، پردہ ہو، حیا وشرم ہو، ایک دوسرے کا احترام ہو، غرور نہ ہو، تعلّی نہ ہو، اسراف و فضول خرچی نہ ہو، ناجائز رسمیں نہ ہوں، اور یہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے۔ اللہ کو ناراض کرنا بالکل آسان سمجھا جائے یہ نہ ہو......

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں گی تو ہم ضرور اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے یعنی دنیا میں بھی، اور اس کی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ہیں، اگر آپ حدیث پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جن گھروں میں اور جن خاندانوں میں شریعت کی پابندی کی گئی، احکامِ خدا اور احکامِ رسولؐ پر عمل کیا گیا اور اسلامی زندگی کا جو نمونہ اور سانچہ ہے، اسلامی زندگی کا جو ماڈل ہے۔ وہ اختیار کیا گیا، رسموں کو نہیں دیکھا گیا، رواج کو نہیں دیکھا گیا، بلکہ یہ دیکھا گیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم کیا ہے؟ جن لوگوں، خاندانوں، برادریوں اور جن ملکوں اور جن معاشروں نے اور جس سوسائٹی نے اس پر عمل کیا اس کو اللہ نے دنیا میں جنت کی زندگی کا مزہ چکھا دیا۔ اس میں شبہ نہیں، ہم مبالغہ سے نہیں کہہ رہے ہیں، دنیا ہی میں ان کو جنت کی زندگی کا مزہ آگیا کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ ہم جنت میں ہیں، محبت کا دور دورہ ہے، ایک دوسرے کا حق ادا کیا جاتا ہے، یہاں کسی کا حق مارا نہیں جاتا، کسی کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا، کوئی فضول بات نہیں کہی جاتی، کوئی ناجائز آمدنی

باہر سے نہیں، بس اللہ پر توکل اور اللہ کا نام لینا، پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا، حلال روزی کھانا، حرام کا پیسہ کیا حرام کی پائی بھی گھر میں نہ آنے پائے، جن گھروں میں اس کی پابندی کی گئی ان کے گھر جنت کا نقشہ ہیں، ان گھروں پر بادشاہوں کے محلات اور شاہوں کی کوٹھیاں قربان، ان کے سامنے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جیل خانہ ہے، دیکھنے میں باہر سے کتنی شاندار کوٹھی ہے، بڑی بڑی دیواریں ہیں، یہ سب ہے لیکن اندر جہنم کی زندگی ہے۔ بیوی اور شوہر میں محبت نہیں ہے، ماں بیٹے میں محبت نہیں ہے، نہ ماں میں وہ شفقت ہے، نہ بیٹے میں وہ احترام ہے، نہ کسی کمزور پر ترس آتا ہے نہ کسی غریب کی مدد کی جاتی ہے اور سوائے کھانے پینے اور سوائے فخر و غرور کے اور دکھاوے کے لئے مظاہرے کرنے کے کوئی اور یہاں کام ہی نہیں ہے۔

آپ اس بات کا خیال رکھیں اور یہ اللہ نے موقع دیا ہے کہ مرد عورت دونوں کوشش کر کے اور شریعت کے مطابق زندگی گزار کر اور اللہ کی فرمانبرداری کر کے اور اس کے رسولؐ کی شریعت پر چل کر وہ بڑی سے بڑی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں اور ترقیاں بھی کیسی روحانی ترقی ...... اس لئے کہ یہ دولت، علم کی دولت مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں، مرد و عورت دونوں کے لئے ہے(۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۶ء

ازدواجی زندگی کے رہنما خطوط

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً(۱). يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ(۲). يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْداً يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً(۳).

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اُس سے اُس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے، اور خدا سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو، ڈرو اور (قطع مؤدت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے۔ مؤمنو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ مؤمنو! خدا سے ڈرا کرو، اور سیدھی بات کہا کرو، وہ تمھارے اعمال درست کر دے گا، اور تمھارے گناہ بخش دے گا، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا، تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔

(۱) سورہ النساء: ۱۔ (۲) سورہ آل عمران: ۱۰۲۔ (۳) الاحزاب: ۷۰ تا ۷۱

نکاح ایک مسلسل عبادت ہے

یہ نکاح، یہ عقد کوئی غیر اجتماعی یا فطری ضرورت کی تکمیل نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے، انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے اور سید الانبیاء محمد رسول اللہؐ کی محبوب سنت اور شعار ہے، اس لئے اس کے ساتھ جیسا کہ اسلام کا قاعدہ ہے ایک پیغام ہے اور اہم ذمہ داری کا احساس دلایا گیا ہے۔ اللہ کی بندگی کا، عبودیت کا، اور اپنی ذمہ داری کا، اور اس کے متعلق جو احکام ہیں، شریعت کے جو حقوق و فرائض ہیں، ان کی بھی یاد دہانی کی گئی ہے۔

یہ جو آیتیں پڑھی گئیں یہ نکاح کے خطبہ کی آیتیں ہیں اور وہ مشہور ہیں، ثابت ہیں، ان میں پورا پیغام ہے، خوشگوار فریضہ کے لئے بھی اور ساری عمر کے لئے بھی، اور ساری زندگی کے لئے ضابطۂ حیات اور ہدایات ہیں، اور پوری زندگی کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام اور اس کی ہدایات کا ذکر آگیا ہے۔ یہ آیت سورۃ النساء کی ہے، اسی سے عورتوں کا درجہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام سے ایک طویل سورۃ نازل ہوئی جس کا نام سورۂ نساء ہے اس سے معلوم ہوا کہ پورے اسلامی معاشرے میں عورتوں کا ایک درجہ، ان کا ایک مقام ہے اور ان کے حقوق ہیں اور اس کے فرائض ہیں، ان کے بارے میں احکامات ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:- یاایھا الناس سے خطاب کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ انسانی حیثیت رکھتا ہے، قلبی حیثیت رکھتا ہے، یاایھاالناس سے خطاب کیا گیا ہے کہ اے انسانو! کہ جب تم انسان ہو، تمھاری ضروریات ہیں، فطری

تقاضے بھی ہیں بلکہ شرعی، فطری، اخلاقی تقاضہ یہ ہے کہ ایک رفیق حیات ہو، کوئی بھی ایسا جوڑا ہو، جس سے وہ اپنی زندگی کو شرعی طریقے پر بھی، طبعی طریقے پر بھی اور فطری طریقے پر بھی مکمل کر سکے، خود اللہ نے خطاب کیا ہے کہ اے لوگو! ڈرو اور لحاظ کرو اپنے پروردگار کا کہ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا۔

نسل انسانی کے آغاز کا ذکر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے آغاز کا ذکر کیا ہے۔ یہ مبارک ترین آغاز ہے دنیا کی تاریخ جس سے بنتی ہے اور جس سے ہم سب کا تعلق ہے، ہمارے آباو اجداد کا تعلق ہے، اگلی نسلوں کا بھی تعلق ہے، اور انشاء اللہ پچھلی نسلوں کا بھی ہوگا۔ نسلِ انسانی کے آغاز کا جس سے اس دنیا میں اور زندگی میں معنویت پیدا ہوئی اور اس کی قدر و قیمت پیدا ہوئی، جس کا اللہ تعالیٰ ذکر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک انسان سے شروع کیا لیکن اسی کے ساتھ اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں کے مل جانے سے، نکاح سے اور شرعی طریقہ پر اخلاقی اور قانونی طریقہ پر اللہ کے حکم کے مطابق جو ان لوگوں نے تعلق قائم کیا اس میں ایسی برکت ہوئی کہ آج ساری دنیا، یہ خرابہ، زمین جس کو کہتے ہیں یہ آباد ہے، یہ دنیا ویران ہوتی اگر انسان نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آغاز کا ذکر کر کے گویا فال نیک کے طور پر، بشارت کے طور پر کہا کہ دو کے ملنے کو تم معمولی بات نہ سمجھو، دو ہی تھے جو ملے تھے شروع میں جن سے اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی نسل پیدا کر دی۔

یہ ایک ایسے مبارک واقعہ کی یاد دہانی ہے جس سے انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور اطمینان و اعتماد حاصل کر سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو اس کا پاس و لحاظ کرو جس نے تم کو ایک اکیلی ہستی سے پیدا کیا تھا، اتنی بڑی دنیا اور ایک اکیلی ہستی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اس کی شریک زندگی پیدا کیا، ان دونوں کو ملایا اور ان دونوں کے ملنے سے مردوں اور عورتوں کی وہ تعداد پیدا کی جن کو کوئی دنیا کا اعداد و شمار کرنے والا، کوئی تاریخ داں اور نہ کوئی حساب داں شمار کر سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو، شرم کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، یہ ایک خاندان کا دوسرے خاندان سے، ایک شریف مسلمان خاندان کا دوسرے شریف مسلمان خاندان سے سوال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو سب کچھ دیا ہے ہمارے فرزند کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے۔ زندگی عطا کی، عقل و ہوش عطا کی، علم عطا کیا اور دوسری صلاحیتیں بھی دے رکھی ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک خلا ہے، وہ خلاء پر نہیں ہو سکتا بغیر ایک رفیقۂ حیات کے، ایک شریک زندگی کے، آپ ہمیں ایک شریک زندگی دیجیے۔

سوال وجواب کا رشتہ

یہ بھی ایک سوال ہے، نہایت مہذب سوال ہے، لیکن بہر حال سوال ہے اور ہماری پوری زندگی سوالات و جوابات کا ایک جال ہے جس میں ہر حلقہ جال کے

دوسرے حلقہ سے پیوست ہے، اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، ہر انسان سائل ہے، ہر انسان مسئول ہے۔ ایک بڑے سے بڑا انسان بھی سوال پر مجبور ہے، یہ بیع و شراء کا، یہ خرید و فروخت کا معاملہ کیا ہے؟ سوال ہے، یہ حاکم و محکوم کا تعلق کیا ہے، سوال و جواب ہے یہ آپس کے عزیزانہ تعلقات کیا ہیں سوال و جواب، یہ تعلیم و تعلم کیا ہے، پڑھنا لکھنا کیا ہے، استاد و شاگرد کے درمیان سوال و جواب ہے۔

سوال و جواب کا رشتہ آپ دیکھیں گے ہماری پوری زندگی میں چھپایا ہوا ہے، اگر ایک طالب علم پڑھتا ہے تو وہ سائل ہے، ایک استاد پڑھاتا ہے تو وہ مسئول ہے، اسی طرح سے جس کے پاس کوئی چیز ہے اور دوسرا اس کا محتاج ہے جو محتاج ہے وہ سائل ہے اور جس کے پاس چیز ہے وہ مسئول ہے، لیکن وہی مسئول جو کسی کو دے رہا ہے وہ کسی اور کا سائل ہے، اس دنیا میں کوئی فرد سائل ہونے سے مستثنیٰ نہیں ہے، بڑے سے بڑا معزز یہاں تک کہ کسی مملکت کا صدر بھی ایک طرح کا سائل ہے، نہایت معزز سائل، بڑے اختیارات رکھنے والا سائل، لیکن ہے وہ بھی سائل ہی، اس کو بھی ضرورت ہے، اگر اس کی مملکت کے انسان نہ ہوں اس کے کام چلانے والے نہ ہوں، جن پر حکومت کرتا ہے کم سے کم وہ نہ ہوں تو وہ کاہے کا حاکم ہوا اور کاہے کی اس کی مملکت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو، اس کا پاس رکھو، جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، تمھیں کیسے جرأت ہوئی ایک خاندان کی ایسی ہستی کو مانگنے کی جس پر کسی غیر کی نگاہ نہیں پڑ سکتی، جس کو پردہ میں رکھا جاتا ہے، جس کی عزت کو اپنے خاندان کی عزت سمجھا جاتا ہے، اس کو مانگنے کی تم کو جرأت

کیسے پیدا ہوئی؟ یہ اللہ کے نام کا واسطہ تھا، یہ اسلام کا رشتہ تھا، یہ اسلام کا اشتراک تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو دو خاندانوں کو ملاتی ہے، جو افراد کو ملاتی ہے، بعض اوقات قوموں کو ملاتی ہے، بعض اوقات نسلوں کو ملا دیتی ہے، تو جس خدا کے نام پر تم سوال کر رہے ہو، لڑکے والوں نے لڑکی والوں سے سوال کیا تو اس نام کا اتنا ہی فائدہ نہ سمجھو کہ کام نکال لیا بلکہ اس نام کا ہمیشہ ادب ملحوظ رکھو اور جب یہ نام لیا جائے تو اس کا احترام کرو اور اس نام کا حق ادا کرو، اگر اذانیں ہو رہی ہیں تو اس میں اس کا نام لیا جا رہا ہے اگر شریعت کا حکم بیان کیا جا رہا ہے تو اس میں اس کا نام لیا جا رہا ہے۔ اگر حلال و حرام کی بحث ہے تو اس میں اللہ ہی کا نام بیچ میں ہے، اگر کوئی کسی کو ڈراتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو اس میں بھی خدا ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہے اور شرافت کے معیار سے گری ہوئی بات ہے کہ آدمی اپنا کام نکال لے اس کا نام لے کر پھر بھول جائے ایک مسلمان کو یہ نہیں چاہئے۔ فرماتا ہے کہ واتقوا اللہ الذی تسآءلون بہ اس خدا سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔

رشتہ داریوں کا بھی خیال کرو

"وَالْاَرْحَامِ" اور رشتہ داریوں کا بھی خیال کرو۔ آج نیا رشتہ قائم ہو رہا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا رشتہ قائم ہوتا ہے تو پرانے رشتوں کو بھلا دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بعض بعض معاشرتوں میں اور بعض تہذیبوں میں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نہیں، یہ رشتہ مبارک لیکن اس سے پہلے کے جو رشتے

ہیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں، جو حقوق و فرائض ہیں، ان کی ذمہ داریاں اپنی جگہ پر ہیں، ماں اپنی جگہ پر ہے باپ اپنی جگہ پر ہے، بہنیں اپنی جگہ پر ہیں، بھائی اپنی جگہ پر ہے، ایک نئے رشتہ سے وہ رشتے ختم نہیں ہوں گے، فرمایا "وَالْاَرْحَامِ" رشتہ داریوں کا خیال رکھنا جس کا جو حق ہے اسے ادا کرنا۔ لڑکے کو بھی یہ نصیحت ہے، لڑکی کو بھی یہ نصیحت ہے، ان کے گھر والوں کو بھی یہ نصیحت ہے۔

اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو وقت کی بات ہے کون دیکھتا ہے اور کون جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً" بے شک اللہ دیکھنے والا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ ہے اور ہر وقت ہے۔

مرتے دم تک مسلمان رہنا

دوسری آیت جو میں نے پڑھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جتنا کہ ڈرنے کا حق ہے اپنی طرف سے معیار مقرر نہ کرو کہ ہم تو بہت ڈرتے ہیں جسے اللہ کہے کہ ہاں یہ ڈرنا ہے، جسے شریعت کہے کہ ہاں یہ ڈرنا ہے، جس کو خوف کہتے ہیں، جس کو ڈرنا کہتے ہیں، جس کو احتیاط کہتے ہیں، جس کو قانون پر چلنا کہتے ہیں وہی معتبر ہے، تو اللہ سے ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ" یہ خدا کے پیغمبر ہی کے کہنے کی بات تھی ورنہ کوئی مبارکباد دینے والا، کوئی عزیز بھی اس موقع پر یہ نہیں کہتا، پیغمبر پیغمبر ہے وہ ایسی ابدی حقیقتوں کا اعلان کرتا ہے جو حقیقتیں کبھی فنا نہیں ہوتیں، اللہ تمھیں مبارک کرے ایسی بہت سی خوشیاں تمھیں مبارک کرے۔ اور

یہ خوشیوں کا ایک سلسلہ ہوگا انشاء اللہ، لیکن اس کو نہ بھولنا کہ تمھیں اس دنیا سے جانا ہے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ" زندگی گذارو فرمانبرداروں کی طرح اور جب جاؤ تو فرمانبرداروں کی طرح، ہمارا سر خدا کے سامنے جھکا ہوا ہو، ہمارے دل میں خدا کی محبت اور اس کے رسول کی عظمت ہو، ہماری زبان پر اس کا کلمہ ہو۔

قولِ مرداں جان دارد

اس کے بعد آخری آیت جو ایجاب و قبول سے پہلے پڑھنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً" اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو کہ "قول مرداں جان دارد" یہ پتھر کی لکیر نہیں ہے کہ زبان ہلا دی اور کہہ دیا کہ ہم نے قبول کیا بلکہ جب یہ کہو کہ ہم نے قبول کیا تو سوچ سمجھ کر اور اس کی پوری ذمہ داریوں کو اپنے ذہن میں تازہ کر کے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، ان کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں، اس کا سلسلہ کہاں تک جائے گا؟

فرماتا ہے کہ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچی و پکی بات زبان سے نکالو اگر تمھیں سچی اور پکی بات زبان سے نکالنے کی عادت پڑ گئی تمھارا کیریکٹر بن گیا، تمھارا کردار بن گیا، تمھارا اصول زندگی بن گیا تو کیا نتیجہ ہوگا یہی نہیں کہ یہ عقد صحیح ہو بلکہ، "یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ" اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام کاموں کو درست کر دے گا۔

آج دنیا کی ساری خرابی، ہمارے تمدن میں سب کچھ ہے، سارے وسائل و ذرائع موجود ہیں، کتنی ایجادات ہیں اور کتنے آرام حاصل کرنے کے ذرائع ہیں،

لیکن کیا چیز کم ہے؟ ذمہ داری کا احساس نہیں......! آدمی جو چاہتا ہے اپنا کام نکالنے کیلئے، نکال لیتا ہے پھر بھول جاتا ہے......فرمایا "یُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ" اس کی برکت سے تمھارے سارے اعمال کو اللہ درست فرمادے گا، تمدن کی چول بیٹھ جائے گی، معاشرہ کا مزاج درست ہو جائے گا، ہر ایک کو راحت ملے گی اور یہ نہ ہوگا کہ انسان ایک بازار میں ہے یا جنگل میں ہے جہاں پرندوں سے کام ہے یا سوداگروں سے کام ہے اور کسی کو کسی سے مطلب نہیں، جیسی ضرورت سمجھی ویسی زبان سے نکال دیا۔ "یُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ" اللہ اس کی برکت سے تمھارے سارے اعمال درست فرمادے گا۔

"وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" اور پھر یہ ایک عبادت ہے، نبی کی سنت ہے، اس لئے اس کے ذریعہ سے اللہ تمہارے گناہوں کو بھی معاف کر دے گا......

عام طور سے نکاح کی تقریب کو ایک رسمی، فکری اور معاشرتی تقریب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ عبادت ہے اس کے بعد جو زندگی گزرے گی وہ عبادت میں گزرے گی اور جیسا کہ اس زمانے کے شاہ محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ آدمی جب تک نماز پڑھتا ہے اس کو ثواب ملتا ہے، سلام پھیرا تو ثواب ختم ہو گیا لیکن نکاح کرنے کے بعد سے آخر وقت تک ثواب ملتا رہے گا، کما کر لائے گا کھلائے گا۔ اس نیت سے ثواب ملے گا، محبت کے ساتھ بولے گا، ساتھ رہے گا اس کا ثواب برابر رہے گا۔ فرمایا: "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا"۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ پورے طور پر کامیاب ہوا۔(۱)

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۸ء و ۲۵ر جولائی ۱۹۹۷ء کی دو مختلف تقریروں سے مشترک ماخوذ ہے

انسانی معاشرہ میں عدل و احسان (انصاف و نیکی) کی اہمیت

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ. يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.

(النحل۔ ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان کا اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور ظلم سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔

زندگی کا دستور العمل

قرآن مجید کی یہ آیت نماز جمعہ کے خطبہ کا جزء ہے، ہر ہفتہ مسلمان اسے سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، چونکہ ہم عربی زبان سے ناواقف ہیں، عام طور پر خطبہ اور نمازوں میں جو عربی میں پڑھا جاتا ہے، اس کو غور کرنے کی چیز نہیں سمجھتے، بلکہ عبادت کا ایک وظیفہ سمجھتے ہیں، اس میں کیا سبق ہے؟ کیا پیغام ہے؟ اس پر غور کرنے یا کسی جاننے والے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، انہی میں یہ آیت بھی ہے جو دراصل پوری زندگی کا منشور ہے MANIFESTO

دستور العمل، ضابطہ، قانون، ہدایت نامہ (Directive) ہے، اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل کا، احسان کا، یہ نہیں کہتا کہ کس کے ساتھ انصاف و احسان کرنا چاہئے بلکہ مطلق انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے، ہر شخص کو انصاف، احسان اور نیکی کرنا چاہئے، اس کے بعد جب دینے دلانے کا ذکر آتا ہے تو اس میں تھوڑی سی تخصیص کرتا ہے "وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبیٰ" پھر اس میں بھی ذکر خونی رشتہ کا نہیں کہ چچا زاد بھائی ہوں، ماموں زاد ہوں، اولاد ہو، بلکہ کہتا ہے قربت والے لوگ، قربت کئی طرح کی ہوتی ہے، رشتہ کی قربت، پڑوس کی قربت، ہم وطنی کی قربت، پیشے کی قربت، قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کی ذرا سی تشریح آئی ہے، زیادہ دور کے، زیادہ قریب کے، اس میں بھی کچھ گنجائش ہے، صرف یہی نہیں بلکہ خونی رشتے ہوں۔

پھر اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں، نامعقول باتوں اور نامناسب رویئے سے روکتا ہے، تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

آج انصاف صورت پہچان کر، ناپ تول کر، دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے، معاملہ اپنے کسی عزیز، کسی ہم مذہب، ہم برادری، ہم قبیلے کا ہو تو انصاف کے لئے دل کھل جاتا ہے، تقاضہ پیدا ہوتا ہے، انصاف کرنا آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن انصاف کا معاملہ کسی ایسے فرد کا ہو جس سے کوئی خونی رشتہ نہیں، جس کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی خاص مادّی فائدہ نہیں، تعریف و تحسین نہیں بلکہ تنقید کا اندیشہ ہے تو وہاں انصاف کے لئے قدم نہیں اٹھتا، قلم نہیں چلتا۔

انصاف کیلئے بھی کسی ٹریڈ مارک، برادری، خاندان، دیش اور قوم (Nation)

کی ضرورت پڑتی ہے۔

مگر وہ انصاف جو برائے انصاف ہو، وہ انصاف جو خدا کا حکم سمجھ کر، کسی کا حق مان کر، کسی سچائی کو تسلیم کر کے کیا جائے اور جو بے لاگ ہو، غیر جانبدار ہو، وہ انصاف بہت مشکل ہے، اور اس انصاف کے لئے وہی اللہ کے بندے تیار ہوتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور انسانیت کا احترام ہوتا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔

ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

حدیث میں آتا ہے "الخلق عیال اللہ" ساری مخلوق اور جتنے انسان ہیں، وہ خدا کا کنبہ ہیں، یہ آخری بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عقیدۂ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں، آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ہر وہ چیز جس سے توحید مجروح ہوتی ہو ناپسندیدہ ہے، یہاں تک کہ گنتی میں بھی وتر کو پسند کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں جو مذہب اتنا حساس (Sensitive) ہو وہ مذہب تمام مخلوق کو خدا کا کنبہ کہتا ہے، یہ کتنی بڑی بات ہے، قرآن مجید کا تہائی حصہ عقیدۂ توحید پر مشتمل ہے، سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا تہائی حصہ کہا گیا ہے، اس میں ہے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُواً اَحَدٌ" (اے محمد ﷺ! کہد یجئے اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے۔ سب اس کے ضرورت مند ہیں اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں۔ نہ اُس نے کسی کو جنم دیا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں)۔

وہ اسلام جس نے سورۂ اخلاص کو "قلب قرآن" اور ثلثِ قرآن کہا ہے، خدا کی مخلوق اور خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کو چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملت کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی دیس اور ملک کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی نسل یا رنگ کے ہوں، چاہے کسی بھی خاک و خون کے ہوں، اللہ کا کنبہ اور خاندان قرار دیا ہے، اللہ نے سب انسانوں کی پرورش اپنے ذمہ لی ہے۔

انسانوں میں خدا کا پیارا کون ہوگا؟ وہ نہیں جو بہت زیادہ عبادت کرے اور مالا جپے، بلکہ وہ زیادہ پیارا ہوگا جو اس کے کنبے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے، تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ کوئی اور مذہب قرار دیتا تو ذہن اسے قبول کر سکتا تھا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مذہب جو توحید کے بارے میں ایسا ذکی الحس ہے کہ دوسرا کوئی مذہب نہیں، وہ اسلام کہتا ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، یہ آخری بات ہے جو اس مذہب نے کہی، اب کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔

انصاف بے رنگ ہوتا ہے

انصاف و احسان کو اللہ تعالیٰ نے کسی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، وہ تو آسمان سے برسنے والے پانی کی طرح بے رنگ ہوتا ہے، اگر آپ اس پانی کو کسی رنگین بوتل میں ڈالتے ہیں تو رنگین نظر آتا ہے، لیکن جب آسمان سے پانی برسا تھا تو اس کا کوئی رنگ نہیں تھا، اسی طریقہ سے انصاف و احسان کا کوئی رنگ نہیں ہے، ہاں اگر انصاف کرنے والا مسلمان ہے تو اس کی نسبت سے کہا جائے گا کہ مسلمان مُنصف، اگر ہندو ہے تو کہا جائے گا کہ ہندو مُنصف۔ مسلمان اور ہندو یہ تو

بوتلوں کے رنگ ہیں، لیکن انصاف اور احسان کا کوئی رنگ نہیں، یہ تو بے رنگ ہیں، بے رنگ رہیں گے اور انھیں بے رنگ رہنا چاہئے۔

کہا گیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" یہ عمومی حکم ہے، "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ مَعَ الْمُسْلِمِیْنَ، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْاِحْسَانِ اِلَی الْمُسْلِمِیْنَ" نہیں کہا گیا، الحمدللہ رب العٰلمین کہا گیا ہے، دنیاؤں کا پالنے والا "رب المسلمین، رب الھنود، رب المسیحیین، رب العرب، رب العجم"، یعنی مسلمانوں کا رب، ہندوؤں کا رب، عیسائیوں کا رب، عربوں کا رب، عجمیوں کا رب نہیں کہا گیا۔

تمام جہانوں کا پالنہار، ستارے، چاند، سورج، کہکشاں، نظامِ شمسی، دنیا کے تمام براعظم، نباتات، حیوانات غرض پوری کائنات کے رب نے عدل و انصاف کو بالکل عام رکھا ہے، وہ قومی انصاف، ملکی انصاف، خاندانی انصاف (Family Justice) نہیں، عام انصاف ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" میں یہی عمومیت ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا "وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَئَانُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا. اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" کسی گروہ، کسی جماعت، کسی برادری سے اگر تم کو تھوڑی شکایت ہو، کدورت ہو، دل میں میل ہو تو یہ بات تمھیں اس حد تک نہ آمادہ کرے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرو، جب بھی موقع انصاف اور تول کا آئے تو ترازو جھکنے نہ پائے، پورا پورا حق دو، انصاف سے کام لو کیوں کہ یہ خدا کو خوش کرنے والی چیز اور اس کی ہدایت پر عمل ہے۔

یاد رکھئے! عدل و انصاف اور احسان کو عام ہونا چاہئے، ہم سب کو، خواہ ہم کسی

قوم، کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہمارے پیدا کرنے والے نے، ہمیں روزی پہونچانے والے ہمارے مالک نے حکم دیا ہے کہ انصاف و احسان میں تفریق نہیں ہونی چاہئے، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دینی چاہئے(۱)۔

"إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انصاف کے اصول کو اپنایئے، اور احسان کو اپنا شعار بنایئے، انصاف تو یہ ہے کہ جتنا دینا ہے دے دو، اور احسان یہ کہ اس سے بھی زیادہ کرلو، اگر تمھارے ساتھ کسی نے ناانصافی کی اور تم انصاف کرو، یہ احسان ہوگا، یہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے(۲)۔

---

(۱) تحفہ انسانیت ص ۶۰۔۶۸ تلخیص۔ (۲) تحفہ دین ودانش ص ۱۷۔

صحت مند معاشرہ کی زندگی کے تین ستون

لَاخَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍمِّنْ نَّجْوٰھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ.

(النساء۔ ۱۱۴)

ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی نہیں، ہاں (اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے۔

آپ غور کریں گے تو یہ تین چیزیں ایسی ہیں، جن پر ایک صالح معاشرہ قائم ہو سکتا ہے، وہ معاشرہ کے تین ستون ہیں، صدقہ، جب تک کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ عملی ہمدردی نہ ہوگی، آدمی کی مدد کا جذبہ سینہ کے اندر کارفرما نہ ہوگا، اور وہ ایثار نہ کرے گا، کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا، "او معروف" معروف بھی قرآن مجید کا ایسا لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا یعنی معقول و مستحسن بات، جو چیز عُرف میں داخل ہے، اور جس کو فطرتِ سلیم رکھنے والے سب بالاتفاق اچھا کہتے ہیں، اس کا جو حکم دے گا، اب ہر جگہ کا معروف الگ ہوگا، یہاں کا معروف یہاں کے لحاظ سے ہوگا، دوسرے مقام کا معروف وہاں کے لحاظ سے ہوگا، "او معروف او اصلاح بین الناس" عام طور پر قبیلوں، خاندانوں میں "افساد ذات

البین" کا منظر نظر آتا ہے، یعنی آپس کے تعلقات کشیدہ ہیں، بستی بستی، گاؤں گاؤں، قصبے قصبے یہ بیماری پھیلی ہوئی ہے، خاص طور پر جہاں شرفاء آباد ہیں، کسی دل سوختہ شاعر نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

بہ ہر جا جمع می آیند سادات

فسادات، فسادات، فسادات

اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاں سادات جمع ہوں، پھر ماشاء اللہ سادات ہی سادات ہیں، اور یوں بھی تشریح ہو سکتی ہے کہ پھر ناانصافیاں ہی ناانصافیاں اور جنگ و جدل ہی کا منظر نظر آئے گا۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، چور وہیں آتا ہے، جہاں مایہ ہوتی ہے، تو جو جتنا اونچا ہوتا ہے، اسی پر شیطان حملہ کرتا ہے، تو یہ سادات، شیوخ، صدیقی، فاروقی، انصاری، قریشی اور ان کی مختلف شاخیں عثمانی، علوی، عباسی جہاں ہوتے ہیں، ان میں شیطان بہت کامیاب ہو جاتا ہے، اس لئے کہ ان کو ایک دوسرے سے مکدر کرنے اور شاکی بنانے کا کام دوسروں کے مقابلہ میں آسان ہوتا ہے، ان کی حیثیت، حیثیتِ عُرفی بلند ہوتی ہے، کچھ ان کی توقعات ہوتی ہیں، کچھ ان کی عادتیں ہوتی ہیں، کچھ وہ اپنا حق سمجھتے ہیں، شیطان اسی راستہ سے آتا ہے، دیکھو فلاں نے تمھیں سلام ٹھیک سے نہیں کیا، وہ حقیر سمجھتے ہیں، مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی ہے، اب وہ اس طرح جُھک کر سلام نہیں کرتے، اب دل صاف نہیں ہے۔

ہر مقام کو ان کی ضرورت ہے

یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ یہ واقعی ہر جگہ مشترک ہیں، صدقہ، معروف، اصلاح بین الناس، ہر مقام کو ان کی ضرورت ہے، جہاں صدقہ بند ہو جائے، محبت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، ہنس کر بولنا بھی صدقہ ہے، میٹھی زبان رکھنا اور خوش کلامی بھی صدقہ ہے، اگر کسی کا کوڑا گر جائے، اور وہ سواری پر ہو تو اٹھا کر اس کو دے دو یہ بھی صدقہ ہے، راستہ سے کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، صدقہ کی سیکڑوں قسمیں ہیں، ایک صدقہ کہہ دیا اس لئے کہ یہ سب پر حاوی ہے، یعنی خیر سگالی کا جذبہ، خیر خواہی اور مدد کا جذبہ، اس کے بغیر کوئی معاشرہ، کوئی اجتماعی زندگی اول تو وجود میں نہیں آسکتی اور اگر آئے تو رہ نہیں سکتی، اور پھر معروف "او اصلاح بین الناس" یہ قرآن ہی کہہ سکتا تھا، یہ آیت بھی معجزہ ہے، پورا تمدنِ انسانی پورا معاشرۂ انسانی اسی پر قائم ہے، صدقہ معروف، اصلاح بین الناس، آج ہر جگہ آپ دیکھیں گے کہ اس کے خلاف ہو رہا ہے، کہیں صدقہ کا دروازہ بند ہے، تو کہیں معروف کا دروازہ بند ہے، تو کہیں دونوں چیزیں ہیں، لیکن اصلاح بین الناس کا دروازہ بند ہے، بگاڑنے والے، لڑانے والے پچاس اور ملانے والا ایک .... تو ان تین چیزوں کا خیال رکھئے صدقہ، معروف، اصلاح بین الناس۔

چوتھی شرط اللہ نے یہ لگائی ہے، اس کار خیر میں نیت ہونی چاہئے رضائے الٰہی کی "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ" ایک اچھا عمل، سیاسی اغراض سے بھی ہو سکتا ہے، تمدنی اور مادّی اغراض سے بھی ہو سکتا ہے، یہ سب اغراض ہیں،

لیکن یہاں اللہ نے فیصلہ کر دیا، "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْراً عَظِيْماً"۔ جو اللہ کی رضا کے لئے کام کرے اس میں ثواب ہے، یہ نہیں کہ صاحب ہم کریں گے تو وہ بھی کرے گا، اور اچھا ہے کہ اچھی زندگی گذرے گی، یہ نہیں، بلکہ خالص اللہ کی رضا کے لئے۔(۱)

(۱) تحفہ دین ودانش ص ۸۹ تا ص ۹۳

باب ٦

تعلیم و تربیت

"میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں، اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں، اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ "وحدت" سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اس کو پانے کی خوشی ہے،..........

"میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت، کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے، وہی "عالم" اور "دانشور" ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے، نہ لائقِ سماعت، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے، اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں"۔ (مولانا علی میاں ندوی)

ایک غیر متوقع آغاز

إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ.

"آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ، جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ آپ (قرآن) پڑھا کیجئے، اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے، (جس نے) انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتے تھے"۔

(العلق: ۱۔۵)

غارِ حرا میں نبی اُمّیؐ پر یہ پہلی وحی اترتی ہے (جبکہ چھ سو سال(۱) کے طویل وقفہ کے بعد زمین کا آسمان سے بلکہ آسمان کا زمین سے وحی و نبوت کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا تھا) تو اس میں عبادت کا حکم اور اللہ کی معرفت اور اطاعت وغیرہ کوئی ایجابی، یا بتوں کے ترک کرنے یا جاہلیت اور اس کے عادات و اطوار پر نکیر جیسی کوئی سلبی بات نہیں کہی گئی، اگرچہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اہم تھیں اور

(۱) یہ طویل مدت سیدنا عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر گذری تھی۔

اپنے اپنے موقعہ پر ان کی وضاحت و تبلیغ کی گئی، بلکہ کلمہ (اِقرا) سے اس وحی کا آغاز ہوا :-

اس طرح یہ تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس نے مؤرخین و مفکرین کے غور و فکر کے لئے نئے اور وسیع آفاق مہیا کیے، اور یہ اس حقیقت کا بلیغ اور واضح اشارہ تھا کہ اس نبی امّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ انسانیت اور مذاہب کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا، جو وسیع و عمیق معنوں میں قرأت (خواندگی) اور پڑھنے لکھنے کا وسیع و ترقی یافتہ دور اور علم کی حکمرانی کا عہد زرّیں ہوگا، اور علم و دین دونوں مل کر نئی انسانیت کی تشکیل و تکمیل کریں گے۔

مگر اس (علم و تعلّم) کا آغاز اس نبوت کی آغوش میں اور اس مالک کے نام سے ہوگا (جس نے اس کائنات اور انسان کو پیدا کیا ہے) تاکہ وہ اللہ کے یقین اور اس کی صحیح معرفت کے رنگ میں رنگا ہو اور اس کی روشنی و نگرانی میں اپنا سفر جاری رکھ سکے، اس لئے فرمایا :-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. — آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے۔

اس کے ساتھ انسان اپنی حقیقت اور خلقت کو بھی جانتا ہو، تاکہ اپنی ہستی کو نہ بھولے اور حد سے نہ بڑھے، اور علم و عقل، صنعت و حرفت اور تسخیر کائنات کے سلسلے میں اپنی فتوحات سے دھوکہ نہ کھائے، اس لئے فرمایا :-

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. — جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

پھر قلم کی عزت افزائی کی اور اس کی قدر و قیمت بڑھائی، اور علم و قرأت اور

تعلیم و تربیت کے میدان میں اس کے کارنامے کا ذکر کیا، جس کا مکہ اور جزیرۃ العرب میں جاننا آسان نہ تھا، جہاں وہ صرف چند آدمیوں ہی کے پاس تھا، اسی لئے جزیرۃ العرب میں پڑھے لکھے شخص کو "الکاتب" کہا جاتا تھا، اسی سیاق میں فرمایا گیا:-

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. جس نے کہ قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی۔

پھر انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ دینی و کائناتی حقائق علوم و صنائع، انکشافات و ایجادات کی جدید ترین معلومات حاصل کر سکتا ہے، اور اپنے علم کے حدود بڑھا سکتا ہے، مگر ان سب کا ماخذ و مصدر تعلیم الٰہی اور انسان کی ایسی تخلیق ہے کہ وہ مجہول کو معلوم اور مفقود کو موجود کر سکے، اس لئے فرمایا گیا:-

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَم. انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتا تھا(۱)۔

(۱) ماخوذ از تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات ص ۷۹ تا ۸۹

منصبِ نبوت کے فرائض چہار گانہ

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیِّیْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ، وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ.
(الجمعہ۔ ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیغمبر، بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں، اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ساتھ میں آپؐ کے منصبِ نبوت کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فرمایا "ھو الذی بعث......والحکمة"!

یہ ہیں نبوت کے چار شعبے جو اللہ تعالیٰ ان کے نائبین کو بطریقِ نیابت، بطریقِ خلافت عطاء فرماتا ہے، جو گویا فرائض چہار گانہ ہیں۔

تلاوت

پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، تلاوتِ آیات، قرآن مجید کی آیات کو پڑھ کر

سنا دینا، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت کے شعبوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا۔ اس کے بعد بعض آیتوں میں آتا ہے "يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ" تعلیم کتاب و حکمت کو مقدم کیا ہے، اور یہ سیاق و سباق کے مطابق ہے، یہ بڑے اہل نظر کا کام ہے۔ وہ بتائے گا کہ یہاں کیوں مقدم کیا ہے۔ اور یہاں کیوں مؤخر کیا ہے، کیا ماحول ہے، سورہ کا مرکزی نکتہ کیا ہے، یہ تو کام کرنے کا ہے، کتاب کی تعلیم یہ علومِ دینیہ ہیں، قرآن و حدیث ہیں، تفسیر ہیں!

تزکیۂ نفس

دوسرا فریضہ ہے، یعنی نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اخلاقِ رذیلہ کو نکال دیتا ہے، حسد کو، قہر کو دور کرتا ہے، حُب دنیا اور حُب جاہ کو نکالتا ہے، اس کے بجائے اللہ کی محبت، آخرت کا، جنت کا شوق دل میں بٹھاتا ہے، "یزکیھم" نفوس کی تربیت کرنا، نفوس کو مہذب بنانا، اخلاقِ رذیلہ نکالنا، اور اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنا، اور وہ صفت پیدا کرنا، جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ، وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ، وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ.

لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا، اور اس کو تمھارے دلوں میں سجا دیا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بے زار کر دیا، ایسے ہی لوگ تو راہ راست پر ہیں۔

(الحجرات۔ ۷)

قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ نہیں کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں، کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے، لوگ اس کو پڑھ سکیں، اور اس کو سنا سکیں، اور اس کو یاد کریں، اور پڑھتے رہیں۔ بلکہ نزول قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، اور قلوب و نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی، صحابہؓ کرام آپؐ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے۔

تعلیم کتاب

تیسرا اور چوتھا کام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے، ''حکمت'' سے مراد اخلاقِ فاضلہ ہیں، جیسا کہ ہمارے استاد اور اپنے زمانہ کے محقق مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے کہ ''حکمت'' کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں آیا ہے، اس سے مراد اخلاق ہے، ''وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ'' اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ اخلاق ہی اخلاق ہے، پہلے ''حکمت'' کا لفظ استعمال کیا ہے، پھر اس کے بعد اس کی جو انواع بیان کی ہیں وہ سب اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، سورۂ اسراء میں سارے اخلاق بیان کرنے کے بعد فرمایا ''ذٰلِكَ مِمَّآ أَوْحٰى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ'' (اے پیغمبر یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمھاری طرف وحی کی ہیں) یہاں اخلاقِ فاضلہ بیان کرنے کے بعد ''حکمت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ''حکمت'' سے مراد اخلاق ہے، اخلاقِ فاضلہ!

تو تیسرا اور چوتھا کام ''کتاب و حکمت کی تعلیم'' دینا ہے، پہلے قاری تلاوت کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تزکیہ کا عمل کرتا ہے، اس میں قرآن مجید کی تفسیر،

اس کے حقائق کا بیان، اس کے علوم کا اظہار اور مقاصدِ قرآن اور مقاصد و حق کی تشریح و تفصیل سب شامل ہے، یہ ہے "یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"!

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں میں اور اس کے حاملین میں اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، اور یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے کہ "من یرد اللہ به خیراً یفقه فی الدین" اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یہ درحقیقت حاملِ قرآن کے فرائض چہارگانہ اور حاملِ قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے کمالات اور اس کی گویا سیرت ہے! کوئی بھی جامعہ یا دارالعلوم ہو، اس کا مقصد ان فضلاء کو تیار کرنا جو تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ چاروں شعبوں میں انبیائے کرام کی نیابت کا حق ادا کر سکیں، تلاوت و حکمت ناقص رہے گی جب تک کہ تزکیہ اس کے ساتھ نہ ہو یعنی ہمارے علماء نفس کی غلامی کے پھندے سے نکل چکے ہوں، ان کو دولت اور عزت کی بڑی سے بڑی مقدار، اپنے اصولوں سے، اپنی دعوت سے، اپنے معیار سے، اپنی زندگی کے نہج سے نہ ہٹا سکیں (۱)۔

(۱) ا۔ حدیث پاکستان ص ۱۴۲ ص ۱۴۳۔ ۲۔ تعمیر حیات جلد ۳ شمارہ ۱۳ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ مشترک ماخوذ ہے

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ.

(العلق۔۱۔۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ

مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند ﷺ اور نہ سرسبز (۱)، تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش آیا تھا، اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں، بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس کا اس ''لوح و قلم'' سے خاص تعلق ہے، جس پر

---

(۱) اس موقع پر مقرر نے کہا کہ وہ سرزمین خشک اور وہ پہاڑ غیر سرسبز تھا لیکن حفیظ جالندھری نے خوب کہا ہے

نہ یاں پر گھاس اُگتی ہے، نہ یاں پر پھول کھلتے ہیں مگر اس سرزمین سے آسمان بھی جھک کے ملتے ہیں

علم و تہذیب اور تحقیق و تصنیف کی اساس ہے، اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانشگاہیں وجود میں آتیں، اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدر و قیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے، جو ۶/اگست ۶۱۰ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر مکہ کے قریب غارِ حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ. (العلق۔ ۱۔۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط، اور بارانِ رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخّر اور ملتوی نہیں فرمایا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے، غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی اُمّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا، کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس نبی اُمّی پر ایک امت اُمّی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانشگاہیں تو بڑی چیز ہیں، حرف شناسی بھی عام نہ تھی) پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے، اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، تو اس کی ابتداء ہوتی ہے "اقرا" سے، اس کی ابتدا "اُعبد" سے نہیں، اس کی ابتدا "صَلِّ" سے نہیں بلکہ اس

کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" سے۔

جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "پڑھو" یہ اشارہ تھا، اس طرف کہ آپ کو جو امت دی جانے والی ہے، وہ امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی، بلکہ معلّم عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے، وہ دور "اُمیّت" کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔

علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے

"بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" (اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا) بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستہ سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، اس کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آگاہی دی گئی کہ اس علم کی ابتداء "اسم رب" سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز تھی جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا، اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے کہ جو وحی نازل ہونے والی

ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اوّلیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس اُمّی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ...... جو پہلی وحی نازل ہوگی وہ "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہوگی۔ "پڑھو" "اقرأ" قرأت کا لفظ ہے، یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے، یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے، اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے، وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے، کاغذ کے ساتھ ہے، صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تجربوں کے ساتھ ہے، ذہانتوں کے ساتھ ہے، "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ"۔

یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بتا دیا گیا کہ یہ دین کبھی علم سے الگ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں خود کہا گیا کہ "پڑھو" تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑ لے، وہ اسلام کا صحیح نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پہلی بات تو یہ انقلاب انگیز دعوت کہ "اقرأ" پڑھو" بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" اپنے رب کے نام سے پڑھو ...... کہ علم کا سفر خدائے حکیم و علیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہئے، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل، بہت پُر پیچ اور بہت پُر خطر ہے، یہاں دن دھاڑے قافلے لٹتے ہیں، قدم قدم پر مہیب و عمیق گھاٹیاں ہیں، گہرے دریا

ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے، ...... اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، اس لئے "إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" پڑھو، لیکن وہ مجرد علم و ادب نہیں، وہ علم مقصود نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، جو محض کھلونے سے کھیلنے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدے کی خندق کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے، بلکہ "إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقْ. إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ." پڑھو تمھارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمھاری ضرورتوں سے تمھاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے، "اِقْرَا وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غارِ حرا کی پہلی وحی نے بھی قلم کو فراموش نہیں کیا، وہ قلم جو شاید ڈھونڈھنے سے بھی مکہ کے کسی گھر میں نہ ملتا، اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل(۱) کے یا کسی "کاتب"(۲) (جو دیارِ عجم سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر آیا ہو) کے گھر میں ملتا ...... اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے، آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں، پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت کم پائیں گے۔

---

(۱) عہد بعثت کے ایک عرب فاضل جو توارۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے اور عبرانی زبان سے خوب واقف تھے۔

(۲) عرب بھی پڑھے لکھے آدمی کو "کاتب" کہتے تھے۔

سب کا خلاصہ علم الانسان مالم یعلم

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" سائنس کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" ٹکنالوجی کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" انسان چاند پر جارہا ہے یہ کیوں؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" یہ جو خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں اور دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور سورج کی شعاعوں کو بقول اقبال کے گرفتار کر لیا ہے اور ستاروں کے درمیان اپنی رہگذر پیدا کی ہے، کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" علم اشیاء کی جہانگیری، یہ سب "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟(۱)

---

(۱) ۱۔ حدیث پاکستان ص ۹۰ تا ۹۴ اور

۲۔ تحفہ کشمیر ص ۹۵ تا ۹۸ سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

مدارسِ دینیہ کی افادیت اور فضلائے مدارس کا فرض

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.

"(اور دیکھو) یہ تو ممکن نہ تھا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں (اور تعلیم دین کے مرکز میں آکر علم و تربیت حاصل کریں) پس کیوں نہ ایسا ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئے تاکہ دین (کا علم سیکھے اور اس میں) سمجھ پیدا کرے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہوشیار کرے تاکہ وہ برائیوں سے بچیں"۔ (التوبہ: ۱۲۲)

مدارس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن مجید میں مدارس دینیہ کا تذکرہ ہے؟ کیا ان کے فرائض اور واجبات کا ذکر ہے؟ تو میں کہوں گا کہ قیامت تک کے لئے...... اس آیت میں مدارس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے، اس آیت میں مدارس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے...... "یہ تو عملاً ممکن نہیں کہ سب مسلمان گھروں سے نکل آئیں، تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ

مومنوں کی ہر جماعت میں سے ایک جماعت دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لئے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی، تاکہ جب یہ لوگ دین سیکھ کر اور اس میں گہری سمجھ پیدا کر کے اپنے ملک و قوم میں واپس جائیں، تو انھیں عصر حاضر کے فتنوں سے ڈرائیں، اور باخبر کریں، تاکہ ان کی قوم ان فتنوں سے چوکنا ہو جائے، اور ان فتنوں سے بچنے کی کوشش کرے"۔ حقیقت میں مدارس کا کام یہی ہے، کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو اپنے زمانہ کے نئے نئے فتنوں اور سازشوں سے واقف ہوں اور ان کے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار ہوں!

اس آیت میں اگرچہ مدارس کا نام نہیں لیا گیا ہے، (اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند بھی ہے) لیکن اس آیت میں بالکل مدارس کی تصویر آگئی ہے، اور ان کی ضرورت و افادیت بھی، اور اس میں مدارس کا فرض بیان کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے !" وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً " یہ تو ممکن نہیں۔ اور آسان نہیں کہ مسلمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ اور ضروریات سے بالکل آنکھیں بند کر لیں، یعنی یہ ایک غیر ممکن سی چیز ہے، غیر طبعی ہے کہ سب مسلمان سب کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے کے لئے نکل جائیں، نہ دوکان پر کوئی بیٹھنے والا، نہ کوئی خرید و فروخت کرنے والا، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا، مدرسہ کا طالب علم بن کر، تو یہ تو ہونے والی بات نہیں، اور یہ ممکن العمل بات نہیں، اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا، نہ اس کا مکلّف قرار کر دیتا ہے، نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے

انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے (اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْر) اسی کی رکھی ہوئی کمزوریاں ہیں انسانی فطرت میں ، انسانوں کی ضروریات سے واقف ہے، حالات سے واقف ہے، اسی لئے وہ ایسی چیزوں کا مکلّف نہیں کرتا جو انسان کے بس سے باہر ہو۔ فرمایا! یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام مؤمنین سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر نکل جائیں ، مدرسوں میں جاکر نام لکھالیں، یا ہجرت کر جائیں، وہاں جہاں علم حاصل ہوتا ہے۔وہاں علم کی تحصیل میں لگ جائیں اللہ تعالی نے اس کا مکلّف نہیں کیا۔

خود ہی قبل اس کے کہ کوئی عذر کرتا، اور کہتا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالی نے پہلے ہی فرما دیا، کہ ہونے والی بات نہیں کہ سب مسلمان کھڑے ہو جائیں ہاتھ جھاڑ کر، دامن جھاڑ کر، سب کاموں کو چھوڑ کر طالب علم بن جائیں، "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّة"!

تفقہ حاصل کریں

پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر فریق میں سے، ہر جماعت میں سے اور ہر حلقہ میں سے کچھ لوگ اس کام کے لئے تیار ہو جائیں، کمربستہ ہو جائیں کہ وہ دین سیکھیں، "فَلَوْلَا نَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" یعنی جو انسانی گروہ ہیں، پیشے ہیں، برادریاں ہیں، محلے ہیں، شہر ہیں، ان سے ایک ایک ٹولی اس کے لئے بالکل وقف ہو جائے کہ وہ دین سیکھے، "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" دین کی سمجھ حاصل کریں، دین میں گہری اور وسیع سمجھ (تفقہ) یعنی وہ دین کے احکام و

مسائل کا علم حاصل کریں۔

"تفقہ" بہت جامع لفظ ہے، اس میں احکام و مسائل، ان کی حکمتیں، مواقع استعمال، ان کے تطبیق کے مواقع، خطاب کے طریقے سب اس کے اندر آجاتے ہیں، "تفقہ" کا لفظ ایسا اللہ تعالی نے استعمال کیا ہے کہ اس سے جامع لفظ ہو ہی نہیں سکتا ہے، کہ "دین کی سمجھ حاصل کریں"! عربی زبان میں "سمجھنے" کے لئے بیسوں لفظ ہو سکتے ہیں، "فہم، معرفت، تعقل"۔ لیکن "تفقہ" کا لفظ خاص معنی رکھتا ہے، اس کے معنے ہیں، "دین میں گہری سمجھ حاصل کرنا" "دین کے ذخیرہ پر عمیقانہ نظر رکھنا" "زمانہ کی ضرورت کو سمجھنا اور بدلتے ہوئے زمانہ اور دائمی دین کے درمیان رشتہ پیدا کر سکنا"۔

فضلائے مدارس کا فرض

اس کے بعد فرمایا : " لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" پھر اپنی قوم (مسلمانوں) میں تبلیغ و انذار کا فرض انجام دیں۔ یعنی اتنا ہی کافی نہیں کہ خود اپنی ذات کے لئے سیکھ کر بیٹھ گئے، اپنا کام نکال لیا، بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی کہ خود دین سیکھ لیں، دین کی سمجھ حاصل کرلیں، فقیہ بن جائیں، عالم بن جائیں، محدث بن جائیں۔ بلکہ اس کے بعد فرمایا " وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" جاکر اپنی قوم کو سمجھائیں۔ "قوم" کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان ایک قوم ہیں، ہندو، ایک قوم ہے، ہندوستانی ایک قوم ہے، عرب ایک قوم ہے، اس کے لئے تو عربی میں "شعوب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، "قوم" کے معنی ہیں "انسانوں کا مجموعہ"

انسانی جماعتیں،!"تو اپنی قوم" کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی ہندوستانیوں کو جاکر سمجھائیں، عرب عربوں کو سمجھائیں۔ نہیں بلکہ جہاں سے آئے ہیں اپنے اپنے خاندانوں کو، محلے والوں، گاؤں والوں کو، قصبے والوں کو، برادری والوں کو جاکر سمجھائیں۔ "لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ"!

تو اللہ تعالی نے جس چیز کا مکلّف کیا ہے، جس کی ترغیب دی، اس آیت میں اس کے مقصد بیان کئے ہیں، ایک خود علم حاصل کریں، سمجھ حاصل کریں، علم یہ نوشت وخواند کا علم نہیں، اس کو علم و تفقہ نہیں کہا جاتا،" من یرد الله به خیرا یفقه فی الدین" میں دین کے مسائل و احکام اور ان کی علتیں ان کے مواقع استعمال، ان کی تعمیم وتخصیص کے مواقع سب اس کے اندر آجاتے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ ہم دعوت دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ اپنی اصلاح کرلیں، اپنے لئے سامان نجات وہدایت مہیا کرلیں۔

"لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" جاکر اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں، وعظ و ارشاد کا کام کریں، اور ان کو خطرات سے، مہلکات سے، کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے، ان اعمال سے کہ جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کر جاتا ہے، اور مسلمانوں میں اس کا شمار نہیں رہتا، بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے، بالکل آدمی نے گویا ارتداد اختیار کرلیا، "لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" تاکہ اپنی قوم (مسلمانوں) میں تبلیغ و انذار کا فرض انجام دیں، اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ پیش آجائے، حلال و حرام، کفر وایمان کا کوئی مسئلہ آجائے تو اس میں وہ رہنمائی کرسکیں،

بتا سکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے، اس کے بعد کفر ہے، اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو، تو ہم تمہیں بتاتے ہیں، ”قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِا الطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى“ (البقرہ-۲۵۶) یہ رشد ہے، یہ غی ہے، یہ اسلام ہے، اور یہ جاہلیت ہے، یہ بتا سکیں، اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے“!

” لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ“ اپنے لوگوں کو جا کر ڈرائیں، ”لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ“ تاکہ وہ احتیاط کریں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ”لعل“ کا لفظ قرآن مجید میں شک کے لئے نہیں آتا ہے، (کہ شاید ایسا ہو اللہ تعالی کے لئے ہر چیز یقینی ہے) علت اور تعلیل کے طور پر آتا ہے، تاکہ وہ ڈرائیں تاکہ وہ ڈر اور خوف کی زندگی گذارنے لگیں، حرام و حلال کا فرق سمجھنے لگیں، کیا چیز مہلک ہے، اور کیا چیز نجات دینے والی ہے، ان کو جاننے لگیں، اور اسی کے مطابق وہ عمل کریں،” لعلم یحذرون“ اس میں سب آتے ہیں!

یہ دین دائمی ہے

ایک بات یاد رکھئے کہ یہ دین تو دائمی ہے، لیکن زمانہ بدلنے والا ہے، زمانہ ظرف ہے، اور زمانہ بدلتا رہتا ہے، لیکن دین کی حقیقت اور دین کی بنیادی باتیں اور تعلیمات نہیں بدلتیں، اس بدلنے والے زمانہ اور اس نہ بدلنے والے دین کے درمیان رشتہ پیدا کرنا، اور پیوند لگانا، یہ ”تفقہ“ کو چاہتا ہے، جو دین کی گہری سمجھ

اور انذار (دین پر عمل کرنے کی دعوت اور عمل نہ کرنے کی حالت میں انذار و تخویف اور برے نتائج سے ڈرانے) کا نام ہے۔

دین کی اصلیت اور حقیقت، دین کے واجبات و فرائض، دین کے حقائق و مطالبات میں تو ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، لیکن وہ دین زمانہ کا ساتھ دے سکے، زمانہ کی رہنمائی کر سکے، زمانہ کتنا ہی بدل جائے، تمدن کتنا ہی وسیع ہو جائے، مختلف علوم کی کتنی ہی ترقیاں ہو جائیں۔ انسان ہوا پر اڑنے لگے اور پانی پر چلنے لگے اور زمانہ لاکھوں میل حساب سے آگے بڑھ جائے۔ جس کو "تفقه في الدين" کی دولت حاصل ہے وہ ذہنی، فکری اور عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہے کہ دین اس زمانہ میں بھی رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج بھی وہ تمام مسائل اور ضروریات یہاں تک کہ زمانہ کے معموں اور پہیلیوں کو بجھا سکتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ چلنے ہی نہیں بلکہ قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور زمانہ کو بے راہ روی اور نسلِ انسانی کو خود کشی سے بھی بچا سکتا ہے۔ وہ اپنی جگہ، اپنی تعلیم و حقائق میں ابدی ہے، زمانہ کتنا ہی ترقی کر جائے، دین میں فرسودگی اور قدامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کو (Out of Date) کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ زمانہ بدلنے والا ہے یہ اس کی تعریف ہے۔ برائی نہیں، زمانہ کہتے ہی اسے ہیں جو بدل سکے۔ وہ آثارِ قدیمہ ہیں جو بدل نہیں سکتے، یا ایسی چیز ہے جس میں زندگی نہیں، زندگی کے ساتھ تغیر و تبدل اور نمو نہ وار تقاء لگا ہوا ہے۔ زمانہ تو بدلے گا اور بدلنا چاہئے لیکن دین زمانہ کی طرح بدلتا بھی نہیں اور زمانہ کے پیچھے بھی نہیں رہ جاتا.........

مدارس دینیہ اور ان کے علمبرداروں کی ضرورت وافادیت یہ ہے کہ اس

خصوصیت اور امتیاز کو اور خدا کی اس نعمت کو باقی رکھیں۔ ایک تو یہ کہ دین اپنی اصلی حالت میں ہو، جو اللہ کے رسولؐ لے کر آئے، اور خلفائے راشدین اور سابقین اولین اور عمومی طور پر پوری امت اس پر چلتی رہی اور تمام دنیا میں اس پر عمل رہا، دوسرے یہ کہ بالکل زمانہ کی ضرورت کو نہ سمجھیں۔ اور آنکھیں اور کان بند کرلیں۔ بلکہ زمانہ کی تبدیلی کو دیکھیں اور اس کا جائزہ لیں کہ کس حکم سے اس کا تضاد اور ٹکراؤ ہے اور کتنی چیزوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور اس کی رعایت کی جاسکتی ہے۔

دین اپنی اصل پر بھی رہے اور وہ زمانہ کی رہنمائی بھی کرسکے اور زمانہ کا احتساب بھی، زمانہ کے جائز تقاضوں کو بھی سمجھ سکے۔ اور (دین وشریعت کے دائرے میں رہ کر) ان کو بھی پورا کرسکے۔ اسی کا نام "تفقہ" ہے اس سے بڑھ کر "اجتہاد" کا منصب قابلیت ہے جس کے لئے خاص شرائط اور معیار ہے۔

مدارس کے قیام وترقی، ان کی رہنمائی اور ان کے ذریعہ سے رہنمائی کرنے کے سلسلہ میں یہ سب حقائق پیش نظر رہنے چاہئیں۔ والحمدللہ اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً (۱)

---

(۱) ۱۔ کاروان زندگی حصہ ششم ص ۲۰۲ تا ص ۲۰۸

۲۔ تحفۂ دین ودانش ص ۳۷ تا ص ۳۸

۳۔ تعمیر حیات ۱۰؍جون ۱۹۸۶ء سے مشترک اخذ وتلخیص ہے۔

صحیح دینی تعلیم وتربیت کے انتظام کے سلسلہ میں والدین اور سرپرستوں کی ذمہ داری

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَایَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَااَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ. سورہ التحریم:۶

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں۔ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔

اے وہ لوگو! جو ایمان لاچکے ہو

آیت بڑی چونکادینے والی ہے، اورایسی ہے کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہو کہ بار بار جو چیز سامنے ہوتی ہے اس پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے وہ روزمرہ کی چیزوں میں سے سمجھی جانے لگتی ہے۔ تو میں عرض کرتا اور اصرار کرتا کہ یہ آیت جلی حروف سے لکھواکر دیواروں پر لگوادی جائے، مسجدوں میں بھی آویزاں کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو۔"یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" یہ "آمنوا" ماضی کا صیغہ ہے، ہر لفظ پر غور کیجئے، قرآن مجید کا کوئی لفظ

اتفاقی یا بھرتی کا نہیں ہوتا یہ کوئی شاعری نہیں "اَیُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ" کہا جاسکتا ہے "اَیُّهَا الْمُسْلِمُوْنَ" کہا جاسکتا تھا، اے مسلمانو! اے جماعت مومنین! لیکن فرمایا "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَاراً وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" بچاؤ اپنی جانوں کو، گھر والوں کو، اپنے متعلقین کو، اپنے ماتحتوں کو آگ سے جس کا ایندھن ہے آدمی اور پتھر۔

اس آیت کے مخاطب مسلمان تھے، صحابہ تھے، جو قرآن مجید کے نزول کے وقت موجود تھے۔ وہ اولین مخاطب تھے، یوں قیامت تک کی تمام مسلمان نسلیں اور جو بھی پیدا ہو اور اپنے کو مسلمان کہے وہ سب مخاطب ہیں، لیکن پہلے مخاطب اس کے وہ لوگ تھے جو رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ایمان لاچکے تھے، آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تھا، جن کو شرف صحابیت حاصل تھا، اور اس میں یقیناً وہ لوگ بھی تھے جو بیعتِ رضوان میں شریک رہے ہوں گے، جنھوں نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے جان دینے پر بیعت کی تھی، اور جن کے متعلق ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِیْباً. (سورا لفتح: ۱۸) (اے پیغمبرؐ) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا، وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی۔

جن کو یہ انعام ملا تھا، اور جن کو قیامت تک کے لئے سند دی گئی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، ایسے سند یافتہ اور بلند مرتبہ لوگ بھی اس آیت کے مخاطب

ہیں جو بیعت رضوان میں شریک ہوئے تھے، اور عشرہ مبشرہ بھی اس میں یقیناً شامل ہیں اور کبارِ صاحبہ بھی اس میں شامل ہیں اور بدر اور اُحد کے "زندہ شہید" بھی مخاطب ہیں۔

پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی آدمی جان بوجھ کر اپنے لڑکوں کو اپنے گھر والوں کو آگ میں جھونکتا ہے۔ آگ میں گھسنے دیتا ہے؟ اس کا کیا مطلب کہ اللہ کہتا ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو، اب تمھارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بچاؤ۔ اپنے گھر والوں کو بچاؤ۔ دوزخ کی آگ سے، کیا کوئی واقعہ آپ نے سیرت میں ایسا پڑھا ہے کہ صحابہ کرام نے (معاذ اللہ) ارادہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو آگ کے حوالہ کردیں، یا بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے اور صحابہ کرام اور اس وقت کے مسلمان خاموش بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے، اور اس صورت حال پر راضی تھے، کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ تو کیا بے ضرورت یہ بات کہی گئی ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو تمھارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو، اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ یہ کون سی آگ تھی، اور کب یہ واقعہ پیش آیا تھا، یا پیش آنے والا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کے بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے۔ اور ماں باپ سو رہے تھے، فکر نہیں کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس وقت وحی نازل کی، سب چونک گئے اور سب اپنے بچوں کی فکر میں لگ گئے کہ آگ میں چھلانگ نہ لگائیں، پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو، اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں، جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کون سے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو روک نہ لیں؟ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے نتیجہ میں جلنا ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ایسے اسباب سے بچاؤ جو دوزخ کی آگ تک پہونچانے والے ہیں۔ اس کو فقہ کی زبان میں "اسباب مؤدیہ" کہتے ہیں، یعنی وہ اسباب جو کسی نتیجہ تک پہونچانے والے ہوں، فقہاء کے نزدیک وہ بھی نتائج کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایسی دوا دے رہا ہے جس کے نتیجہ میں موت ہوتی ہے، چاہے وہ دیر سے ہو، یہ عمل قتل ہی کے مرادف ہے۔ اس لئے کہ اس نے وہ سبب اختیار کیا جس کے نتیجہ میں موت کا آنا یقینی ہے تو قانون بھی اس کو قاتل کہے گا۔ حکیم صاحبان ڈاکٹر صاحبان بھی اس کو قاتل ہی سمجھیں گے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک پہونچا دینے والی ہیں۔

صورت حال اس وقت یہی ہے

اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صورت حال اس وقت یہی ہے، بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کر دینا اور ان کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلّف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ وہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے۔ پیغمبروں

کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جارہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (SECULAR) نہیں، وہ ایک مثبت و معین نظام تعلیم (POSITIVE SYSTEM OF EDUCATION) ہے، ہندو دیومالا (HINDU MYTHOLOGY) اس میں شامل ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزی پڑھی ہے۔ اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں سے نہ کسی کے عقیدہ پر اثر پڑتا تھا نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے۔ ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورت حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباق، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں رہ جاتی ہے وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی ہیں۔

اگر آپ نے بچہ کا نام کسی اسکول میں لکھایا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں کیا گویا آپ نے بچہ کو ایک طرح کی ترغیب دی ہے کہ وہ ہر غیر اسلامی بات مانتا چلائے جائے، اب اگر وہ مانتا چلا گیا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں ہے نہ اردو جانتا ہے کہ دینی کتابیں پڑھ سکے، نہ محلے میں کسی مکتب کا انتظام ہے تو آپ بتایئے کیا آپ "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً" کے مخاطب نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو اور اپنے تعلق والوں کو اور اپنے متعلقین کو۔ ان میں گھر والے اعزہ بھی شامل ہیں اور بچے اولاد اور پورا خاندانی سلسلہ بھی اس میں داخل ہے۔ "قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَاراً" اپنی جانوں کو بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بچاؤ دوزخ کی آگ سے۔"

دھوکہ میں نہ رہنا

جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ انسان بہت سی چیزوں سے بچ جاتا ہے۔ اپنی ترکیبوں سے بھی اور رشوتوں سے بھی اور سازشوں سے بھی اور ذہانت سے بھی اور زور آزمائی سے بھی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب ہے، اور انسانوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْر" (کیا وہ اپنے پیدا کئے ہوئے کو نہیں جانے گا) یہ ہو سکتا تھا کہ ذہن میں یہ بات آتی کہ اس دنیا میں اس کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی میں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں اور بہت دور دور تک اور دیر دیر تک نگاہ دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہاں پہونچ جائیں گے دیکھا جائے گا۔ وہاں کچھ کرلیں گے۔ کوئی ترکیب نکال لیں گے۔ بہت سے تجربے ہیں زندگی کے کہ آدمی سمندر کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور بچ جاتا ہے۔ بالاخانہ کے بالکل سرے پر کھڑا ہوتا ہے اور پھر بعض مرتبہ وہ وہاں سے گرتے گرتے بچ بھی جاتا ہے۔ ترکیب کوئی ہو جاتی ہے اتفاقات بھی ہوتے ہیں اور اس طریقے سے آدمی کچھ دے دلاکر بھی بچ جاتا ہے۔ بلکہ دھینگا مشتی سے بھی بچ جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب ہے لہٰذا اس نے اس کے بعد فرمایا، اس میں بڑی حکمت ہے (عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ) اس دھوکہ میں نہ رہنا کہ وہاں پہونچ کر بھی ہم بچ جائیں گے۔ جہنم کے کنارے پہونچ کر ہم خود بچ جائیں گے۔ اپنے کو بچالیں گے یا اولاد کو بھی بچالیں گے۔ اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو "غلاظ شداد" بڑے سخت ہیں اور بڑے درشت ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جب کوئی لفظ فرمائے تو پھر اس کے بعد کوئی ٹھکانہ ہی نہیں اس کا، تو رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیے۔ "غلاظ شداد" عربی کے ایسے سخت الفاظ ہیں جو عربی جاننے والے ہیں وہ ان لفظوں کی طاقت کو سمجھیں گے۔ اور اس کا زور سمجھیں گے۔ ایک ہی لفظ کافی تھا۔ "غِلَاظٌ" لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا "غلاظ شداد" بڑے سخت، بڑے درشت، بڑے بات کے پکے، دُھن کے پکے، کرگذرنے والے۔ "يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ" اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اور تاکید فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کام ان کے سپرد کیا ہے، جو ان کا فرض ہے اور جس کام پر مقرر ہیں اس میں نافرمانی نہیں کر سکتے۔

تو یہ تعلیم کا مسئلہ اپنے گھر والوں کو دین پر لگانے کا مسئلہ، دین سکھانے کا اور اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دینے کا مسئلہ اور ان کو ایسی تعلیم دینا کہ جس سے وہ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں اور خدا کے غضب سے اور خدا کے غضب کے مستحق بننے سے بچ جائیں ان کی زندگی ہدایت کی زندگی ہو اور ان کی موت سعادت کی موت ہو، اور ان کی آخرت فلاح ونجات کی زندگی ہو!! (۱)

---

(۱) آئندہ نسلوں کے اسلام کی حفاظت اور ایمان کی ذمہ داری دونوں مختلف تقریروں سے مشترک اخذ وتلخیص ہے۔

صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیم کی افادیت واہمیت

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ.

(الحدید:)

اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے۔ اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے خدا اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کرے، بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔

قرآن مجید میں صنعت کا ذکر

بہت سے لوگوں (خاص طور پر جن کی تعلیم جدید علوم کے اندر محدود ہے) کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں صنعت کا بھی ذکر ہے۔ اور ان ماہرین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اُپنے وقت میں صنعت سے تعمیری کام کیا اور خدمت خلق انجام دی اور انسانیت کی اور اپنے ہم اعتقاد اور زیر اثر حلقہ کی حفاظت کی، یہ کم لوگوں کے ذہن میں آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ احسان رکھتے ہوئے اہمیت کے ساتھ ذکر فرماتا ہے کہ ہم نے لوہے

کو نازل کیا، پہلے خیال کیجئے کہ اس کے لئے عربی میں کئی لفظ ہو سکتے تھے۔ ''خلقنا'' کہا جاسکتا تھا یعنی ''ہم نے پیدا کیا'' لیکن نازل کرنے میں جو خصوصیت اور اہتمام ہے اور اس کے ساتھ قدرت اور رحمت خداوندی کا جو عنصر شامل ہے وہ کسی اور لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا، آپ جانتے ہیں کہ ٹکنالوجی "Technology" اور تکنولوجی ہی نہیں بلکہ فن تعمیر (آرکی ٹیکچر) بھی ہے اور دوسری چیزیں فن حرب وغیرہ ہیں۔ جنگی مشقیں ہیں اور جنگی کارروائیاں ہیں، اور کتنے تعمیری اور دفاعی وحفاظتی کام ہیں ان سب میں لوہا ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے اور کوئی نظام صنعت وحرفت اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

صفتِ ربوبیت کا مظہر

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ بیسیوں معدنی دھاتوں کو چھوڑ کر حدید (لوہے) کا انتخاب فرمایا اور (وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ) ہم نے لوہے کو نازل کیا اس میں بڑی طاقت ہے، وہ اللہ کی صفت ربوبیت کا مظہر ہے اور اس سے رفعت کا بھی ظہور ہوتا ہے وہ صرف تلوار بنانے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف بندوق ڈھالنے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف گولی کو وجود میں لانے کے لئے نہیں ہے اور اس کی شکل دینے کے لئے نہیں ''فيه منافع للناس'' جو عربی داں حضرات ہیں وہ جانتے ہیں کہ نکرہ کا صیغہ جو ہوتا ہے اس میں بڑی عمومیت وکثرت ہوتی ہے، تو اس وقت ''فيه منافع للناس'' اس میں بہت سے منافع ہیں لوگوں کے لئے۔

پھر اس کے بعد اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک پیغمبر حضرت داؤدؑ کا ذکر کرتا ہے کہ ''وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ'' ہم نے ان کو زرہ بنانے کا علم دیا۔ ہم

نے ان کو وہ علم دیا کہ جس سے وہ اجسام انسانی کی حفاظت کا کام لے سکیں، ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کردیا، ان کو وہ حکمت عطا فرمائی جس سے کہ وہ لوہے سے شیشہ کا کام لے سکیں۔ لوہے سے کسی بہت کمزور دھات کا کام نے سکیں۔ اور تخریب ہی نہیں بلکہ تعمیر کا کام لے سکیں۔ یہ ایک ایک لفظ معجزہ کی حقیقت رکھتا ہے۔

پھر ایک فرد کا معاملہ نہیں بلکہ قرآن مجید آگے بڑھتا ہے اور حضرت سلیمان بن داؤد کے خدام (جن میں جن وانس ہیں) ان کے احکام ومنشاء کی تعمیل کرتے ہیں اور صنعتی وتعمیری کارنامہ انجام دیتے ہیں اور جو وہ چاہتے ہیں بناتے ہیں اس میں اس کی بھی تصریح کردی کہ وہ تخریبی مقاصد کے لئے نہیں کرتے جب اس میں سلیمانؑ کی رہبری شامل ہے اس میں ان کا حکم چلتا ہے اور ان کے اشارے سے کام ہوتا ہے تو وہ تعمیری ہوگا اور نافع خلائق ہوگا۔ "یَعْمَلُوْنَ لَهُ مَایَشَاءُ" یہ نہیں کہ جو چاہیں وہ بنالیں جو وہ چاہتے ہیں بناتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، ان چیزوں کی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کو اللہ کے منشا کے مطابق اور نبی کو جو پیغام دیا جاتا ہے اور جو مقام عطا ہوتا ہے اس کے تقاضوں اور اس کی خصوصیات کے مطابق اس کو استعمال ہونا چاہئے، ساری دنیا کی خرابی یہ ہے کہ وہ چیزیں تخریبی اور سلبی (DESTRUCTIVE & Passive) مقاصد کے لئے استعمال کی گئیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمادیا کہ "یَعْمَلُوْنَ لَهُ مَایَشَاءُ" وہ آزاد نہیں تھے جو چاہتے بناتے، لوگوں پر حملہ کرتے اور قوموں کو تباہ کرتے اور ملکوں کو پامال کرتے۔(۱)

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۳ء

ایسے علماء بنو جن کے اندر تربیت کا مادہ ہو

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آل عمران: ۷۹)

لیکن تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ" لیکن تم اللہ والے بنو، پھر اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ربانیین کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں تربیت بھی داخل ہے، یعنی وہ عالم جو ایک طرف رب سے تعلق رکھتا ہو، رب سے اس کا تعلق صحیح ہو، اخلاص اس کو حاصل ہو، اور دوسری طرف اس کو ایمان واحتساب کا درجہ حاصل ہو، یعنی وہ دعوت وتربیت اور اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع ومعنی خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہو سکتا ہے، علمائے امت اور علمائے اسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ ربانیین کے لفظ سے یاد کرتا ہے، "اللہ والے بنو" لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت میں "رب کا" لفظ انتخاب فرمایا گیا کہ ایسے علماء بنو جن کے اندر

تربیت کا مادہ ہو، تربیت کی صلاحیت بھی ہو، انھیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں۔
حقیقت میں علمائے ربانیین وہ ہیں "وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ" کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لے اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی اور شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے کا بھی، اور جو چیز ان کی امتیازی ہے وہ ایمان اور احتساب ہے اور یہی ربانیین کے لئے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے، اللہ کی قدرت اور استعانت پر یقین کرتے ہوئے بھی اور پھر اجر وثواب کی لالچ سے کیا جائے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ "بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ" کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کے ساتھ "تَدْرُسُوْن" کا لفظ بھی لگایا گیا جو ہمارے اور آپ سب کے لئے قابل غور ہے کہ عالم ربانی عالم کامل اور باکمال بن جانے کے بعد بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ جاری رہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے۔

طالبین علوم دینیہ امت کے نمائندہ وترجمان اور کتاب وسنت کے شارح اور دین حق کی طرف بلانے والے ہیں۔ اور ان علماء کو تیار کرنے کے لئے جو مدارس قائم ہیں ان کے لئے یہ آیت ایک پوری موعظت، پوری دعوت اور ایک پوری کتاب ہے۔ یعنی ایک عالم کو، ایک دینی مدرسہ کے فارغ کو، کس کو اپنا مقتدی بنانا چاہئے۔ اور کیا اس کو طرز اختیار کرنا چاہئے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے اور کس جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے کہ ایک طرف تو علم راسخ ہو، علوم نبویہ پر پورے طور پر قدرت ہو، استحکام ہو، اتقان ہو، اتقان علمی ہو، پھر اس

کے ساتھ ساتھ عمل ہو، عالم کے شایانِ شان جو عمل ہے جو ذوق عبادت ہے جو ذوق طاعت ہے اور جو ایمان واحتساب کا مادہ ہے وہ پیدا ہونا چاہئے کہ آج ہم اللہ کی رضا کے لئے پڑھ رہے ہیں اور ہم یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دین کا کام کریں گے۔ یہ نہیں کہ پڑھ کر نکلے، خلیج چلو، دوبئ چلو، شارقہ چلو، سعودی عرب چلو، نام توحج وعمرہ کا لیکن مقصود یہ کہ کہیں جگہ مل جائے اور مل جاتی ہے کوئی صاحب کسی سفری ایجنٹ کے یہاں کام کررہے ہیں کوئی صاحب دواؤں والی دوکان میں کام کررہے ہیں اور کچھ نہیں تو مسجد کے مؤذن بن گئے، خطیب بن گئے، یہ اس علم کی قیمت نہیں، یہ "کونوا ربانیین" کے انداز کی بات نہیں یہ اس کے خلاف ہے۔

یہ آیت تو قیامت تک پڑھی جانے والی آیت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت تک اس امت میں علماء کو پیدا کرتا رہے گا اور پھر ایسے روحانی تربیت کرنے والے، اور پھر دینی تعلیم دینے والے اور پھر دین کے لئے کوشش ومجاہدہ کرنے والے پیدا کرنے کی دعوت دی جاتی رہے گی تو اس لئے ایک ایک لفظ معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قرآنی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔ (تعمیر حیات لکھنؤ)

باب ۷

احکام و مطالبات

”......میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں
اور واقعہ یہ ہے کہ میری تمام فکر، تحریر و تقریر
اور اظہار خیال کا مظہر اور مرکز بلکہ اس کا سرچشمہ
قرآن مجید کا محدود مطالعہ ہے۔
”چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی“
لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ع
آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم
اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی
اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے
سامنے رکھ دیا، وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے......“

(مولانا علی میاں ندوی)

کل مسلمان اور مکمل اسلام

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ.

سورہ البقرہ: ۲۰۸

اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔

یہ آیت مستقل ایک دعوت فکر ہے

یہ سورہ بقرہ کی ایک بہت مختصر سی آیت ہے۔ لیکن یہ آیت زندگی کے لئے بلکہ پوری کائنات کے لئے اور زندگی کی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اور خاص طور سے امت اسلامیہ کے لئے یہ آیت مستقل ایک درس گاہ ہے اور مستقل ایک دعوت فکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اے ایمان والو! تم "سلم" میں داخل ہو جاؤ اور "سلم" کا ترجمہ میں نے مستند اور معتبر تراجم میں دیکھا حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولوی فتح محمد صاحب جالندھریؒ تک سب میں "سلم" کا ترجمہ اسلام سے کیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں "مسلمانی" سے کیا گیا ہے،

یعنی اے ایمان والو! مسلمانی اور اسلام میں داخل ہو جاؤ، "وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰن" اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے

پہلی بات یہ ہے کہ پہلے اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، میں معذرت کیساتھ یہ بات عرض کروں گا، بہت سے حضرات کے ذہن میں جنھوں نے تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے، اور مذاہب کی تاریخ پر ان کی نظر نہیں ہے، ان کے ذہن میں شاید یہ بات مستحضر اور تازہ نہیں ہو گی کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے دنیا کا ایک اصول و عقیدہ اور مسلک زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ورنہ جتنے مذاہب ہیں وہ سب (مذاہب کے بانی نہیں کہتا اور نہ کوئی مذہب کا بانی ہوتا ہے) مذاہب کے داعیان اول کے نام پر یا ملکوں کے نام پر، یا طبقوں اور نسلوں کے نام پر وہ مذاہب ہیں، مثال کے طور پر (مجھے معاف کیا جائے) یہودی مذہب ہے، اس کی نسبت یہودا کی طرف ہے جو خاندانِ نبوت کے ایک فرد تھے، عیسائی، اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے، پھر مجوسی، وہ پارسی کہلاتے ہیں، فارس (ایران) ایک ملک ہے، کوئی عقیدہ یا کوئی طرز زندگی ایک دعوت الٰہی نہیں ہے، ہندویت، ہند ایک ملک ہے اور وہ اس کی طرف منسوب ہے، برہمنیت، الگ طبقہ اور ایک خاص نسل کی طرف منسوب ہے، بدھ مت گوتم بدھ کے نام سے موسوم و مشہور ہے، ایسے ہی جینی مذہب، واحد مذہب جو ایک مسلک زندگی، عقیدہ اور نبوت کی طرف منسوب ہے، وحی الٰہی اور اللہ کی براہ راست رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے احکام اور شریعت کی طرف منسوب ہے، وہ اسلام ہے۔ تو اسلام کا پورا دارومدار عقیدہ پر ہے، شریعت پر ہے، اور وہ بالکل ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

اب اس کے بعد سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً. اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ "فی السلم" کے بجائے "فی الاسلام" کہا جاتا، یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، مگر نہیں یہاں "سلم" میں داخل ہونے کو کہا گیا۔ یعنی خدا کے ساتھ تمھارا معاملہ فرماں بردارانہ، مطیعانہ، مصلحانہ اور مکمل ہونا چاہئے، عقائد میں بھی، فرائض و عبادت میں بھی، طرزِ معاشرت اور طریقہ زندگی میں بھی، تمھیں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے احکام کا پابند ہونا چاہئے اور تعلقات میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اللہ کے دشمن سے وفاداری اور اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق نہ ہو۔

"اسلام" کا لفظ "مسلم" ہی سے نکلا ہے، عربی زبان و لغت کے لحاظ سے "اسلام" کے معنی ہیں "اپنے کو حوالہ کر دیا، سلنڈر SURUENDER کر دیا، اور اپنی ہر چیز سے دستبردار ہو گیا۔ اپنی ملکیت سے، خواہش سے، مصالح و مفادات سے، فوائد و ضرر اس فرق کے لحاظ اور احساس سے دستبردار ہو گیا۔ اپنے کو خدا کے احکام کے قدموں میں ڈال دیا، اور اپنے کو بالکل سپرد کر دیا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" خدا کا مطالبہ سو فیصدی ہو۔

اس میں یہ بات لحاظ کرنے کی ہے کہ اس میں بتایا گیا کہ سو فیصدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے، مسلمان بھی سو فیصدی ہوں، اور اسلام بھی سو فیصدی ہو، نہ مسلمانوں میں کوئی تحفظ یا ریزرویشن (RESERVATION) ہے۔ نہ اسلام میں کوئی تحفظ، استثناء یا ریزرویشن ہے، یہ ایک نکتہ ہے جس کو آپ ساتھ لے جائیں اور اس کی اشاعت کریں، خدا کا

مطالبہ اور قرآن مجید کی صریح آیت ہے کہ سو فیصدی مسلمانوں کو سو فیصدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے اور مذاہب کی طرح نہیں کہ عقائد لے لئے اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ عبادات لے لئے اور اس کے زندگی کے قانون اور زندگی کے طرزِ حیات اور طرز معاشرت سے اور باہمی حقوق اور فرائض سے اور شرعی قانون پر چلنے سے تعلق نہیں ہے۔ ہر مذہب نے ایک ایک حصہ لے لیا ہے، کسی نے دو لیا ہے کسی نے تین، یہاں مطالبہ یہ کیا جارہا ہے کہ سو فیصدی مسلمانوں کی سو فیصدی مسلمانوں کو سو فیصدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے۔ مسلمانوں میں تحفظ اور ریزرویشن نہیں ہے کہ مسلمان پچاس فیصدی کے پابند ہیں اور قائل اور عامل ہیں، اور پچاس فیصدی سے مستثنیٰ ہیں، یا پچھتّر فیصدی رکھ لیجئے، یہاں تو مطالبہ ہے کہ سو فیصدی اسلام ہونا چاہئے۔ ایک فیصدی بھی خارج نہیں ہونا چاہئے، کسی قسم کے استثناء یا رعایت یا کسی قسم کا خصوصی معاملہ نہیں کیا گیا، ہم کو ملت اور اپنا جائزہ لینے کا ایک رہنما اصول دیا گیا ہے، بلکہ پیمائش کا آلہ دیا گیا ہے، پہلا مطالبہ اللہ کا یہ ہے اور قرآن مجید کا صریح حکم یہ ہے سو فیصدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے نہ تو یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ مستثنیٰ ہے، شریف النسب اور عالی نسب لوگ مستثنیٰ ہیں، یہاں تک کہ حاکم مستثنیٰ ہیں، کسی بڑے سے بڑے حاکم (جو تصور اسلام میں حاکم یا خلیفہ کا ہے) کسی بڑے سے بڑے شہنشاہِ وقت، کسی بڑے سے بڑے سربراہ مملکت اور کسی بڑے سے بڑے قانون ساز، کسی بڑے سے بڑے فاتح اعظم، کسی کے لئے بھی کوئی استثناء نہیں ہے کہ اس کو نماز پڑھنے کی فرصت نہیں اس کو نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، فلاں کو حج سے مستثنیٰ کیا جائے، کسی کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ جس پر حج فرض ہے اور وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے وہ حج چھوڑے۔

اسی طریقہ سے "عائلی قانون" کہ سب مسلمان اس کے پابند ہیں، ترکہ اور میراث کے قانون کے سب مسلمان پابند ہیں، یہ بات چونکا دینے والی ہے ایک تازیانہ ہے ہمارے لئے

اس وقت ساری چیزیں اس کے ماتحت آجاتی ہیں۔

مطالبہ صرف اتنا نہیں کہ اسلام قبول کرو اور اسلام میں داخل ہو جاؤ، بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اسلام میں سو فیصدی داخل ہو، تم بھی سو فیصدی ہو اور اسلام بھی سو فیصدی ہو، نہ اس میں ریزرویشن، نہ اس میں ریزرویشن...... "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً" اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سو فیصدی مسلمان اور سو فیصدی اسلام ہونا چاہئے۔

اس کا امکان ہے کہ ایک آدمی اسلام کا دعوی بھی کرے اور اللہ سے بندگی کا اعتراف اور بندگی کا تعلق قائم کرے اور بعض چیزوں میں ریزرویشن اور تحفظ کے ساتھ اپنی مرضی کو داخل کرے، کہ اچھا صاحب! ہم عقائد کو مانتے ہیں، بیشک توحید برحق، معاد اور آخرت کا عقیدہ برحق، حساب وکتاب برحق، لیکن معاشرت میں، تہذیب میں، اپنی گھریلو زندگی میں، اپنے عزیزوں کے ساتھ تعلقات میں، لین دین میں، کاروبار میں، تجارتی معاملات میں ہم آزاد ہیں۔ تو اللہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ آیت اسی لئے نازل ہوئی ہے اور یہ آیت گویا تازیانہ عبرت ہے۔ ایک بہت بڑے خطرہ کا اعلان ہے کہ خدا فرماتا ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً" اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، مسلمانی میں شامل ہو جاؤ، "کافۃ" کا تعلق دونوں سے ہے۔ داخل ہونے والوں سے بھی ہے اور جس دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں اس سے بھی ہے وہ بھی کافۃ یہ بھی کافۃ اس طرح نہیں کہ مسجد جائیں اور ایک قدم مسجد کے اندر رکھا بس ہم مسجد میں داخل ہو گئے، یا دونوں قدم اندر رکھ دے اور اندر نہ جائے یا اندر تو جائے لیکن نماز نہ پڑھے یہ نہیں، "ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً" پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور عامل بن جاؤ۔ "داخل" بھی بنو اور "عامل" بھی بنو۔

شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو

"وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ" (اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو) اور خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ میں بھی بڑی بلاغت ہے کہ اگر تم نے یہ نہیں کیا تو پھر اتباع خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ ہوگا۔ یہاں پر اس لئے اس کا بھی ذکر کیا اللہ صرف فرمادیتا "ادخلوا فی السلم کافۃ" لیکن اس کا جو متوازی ہے وہ "وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ" ہے، آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خطوات الشیطان ہے، یہ گھروں کو لٹادینا، یہ جائدادوں کو قرق کردینا یہ سودی قرض لینا اور اس خوشی میں راتوں کو جاگنا، صحت کو خراب کرلینا، یہ سب اس لئے ہے کہ نام ہو جائے اور شان ہو کہ فلاں صاحب کے یہاں بارات آئی تھی، اس میں ۲۰۰ موٹریں تھیں اور اتنی بڑی بارات تھی اور اس سب کو (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، میرے نام دعوت نامے آتے ہیں، اس میں لکھا ہوتا ہے کہ آپ (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہریں گے، یہ ساری چیزیں "عرف" میں داخل ہو گئی ہیں جو عربی کا بہت بلیغ لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے رسم ورواج اور اصولِ زندگی۔

تو اللہ فرماتا ہے: "وَلَاتَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّمُّبِیْنٌ" اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دیکھئے یہاں "نقشِ قدم" (واحد) نہیں استعمال کیا گیا بلکہ "خطوات الشیطٰن" جمع کا صیغہ لایا گیا، معلوم ہوا کہ اس شیطان کے بہت سے نقش قدم ہیں۔ اس میں وسعت آگئی خواہ اعتقادی چیزیں ہوں، خواہ عملی چیزیں ہو، خواہ اخلاقی چیزیں ہوں یا تہذیبی، خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب اس میں شامل ہیں۔

اس آیت کو اپنے دل پر نقش کرلیں "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" جو لوگ عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ محسوس کریں گے کہ ان الفاظ میں بھی کتنا زور اور بلاغت ہے، یہ کھلا اعجازِ قرآنی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جلالِ الٰہی بھی شامل ہے، میں عربی کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ بالکل الفاظ بتارہے ہیں کہ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ کے غضب سے ڈرو، اور اللہ کی طرف سے بے برکتی پر ڈرو اور برے نتائج سے ڈرو۔ "یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" اس سے اور صاف بات کیا کہی جاسکتی ہے۔(۱)

---

(۱) ا۔ کل مسلمان اور مکمل اسلام
۲۔ قرآن کا مطالبہ۔ مکمل اطاعت وکامل سپردگی۔ دو مختلف تقریروں سے مشترک طور پر اخذ و تلخیص کر کے مرتب کی گئی ہے۔

سیرت وکردار کی تبدیلی کی ضرورت

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ.
(سورہ الاسراء: ۸۰)

اور کہو کہ اے پروردگار مجھے اچھی طرح داخل کی جیو اور اچھی طرح نکالیو۔

کہ ہر بن مو سے صدا آئے

اصل چیز ہے سیرت وکردار اور وہ طرز زندگی جو ایک سلطنت ہی نہیں بلکہ سلطنت سے بڑی چیزیں یعنی معرفت الٰہی، اللہ کے یہاں کی مقبولیت نظر کی تاثیر اور خیر عام اور ہدایت ورحمت الٰہی کا دروازہ کھولنے کا کام کرتی ہے، سلطنت تو اس کا ایک ہلکا اور ایک پھیکا سا نشان ہے۔ ایمانی سیرت وہ چیز ہے جو آفاق وانفس کی فتوحات عطا کرتی ہے اور وہ جہاں گیری عطا کرتی ہے جس کے سامنے سلطنتیں ہیچ ہیں، وہ اصل چیز جو ہر خیر کا منبع وسر چشمہ ہے وہ ہے سیرت، میں نے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ ”ارادے اداروں کو پیدا کرتے ہیں، ادارے ارادوں کو پیدا نہیں کرتے“ اصل چیز ہے صحیح ارادہ، جب صحیح ارادہ ہو جاتا ہے تو پھر سیکڑوں ادارے وجود میں آتے ہیں، ادارے جیتے ہیں، مرتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں لیکن ارادہ انسانی جب صحیح ہو جائے اور انسانی کی نیت صحیح ہو جائے انسان کی سیرت، شریعت کے

سانچہ میں ڈھل جائے، انسان کے اعمال و تصرفات منشائے الٰہی کے تابع ہو جائیں، منشائے الٰہی کے سانچہ میں ڈھل کر نکلیں، اور ذہن کا رخ صحیح ہو جائے کہ ہر بُنِ مُو سے صدا آئے۔

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا" تو ان کے غلاموں کے قدموں کے نیچے کسریٰ و قیصر کے تاج آتے ہیں ؎

در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم　　تا بتخت خسروی خوابیدہ قوم

اقبال کہتے ہیں کہ آپ کی امت تخت خسروی پر آکر سو گئی، یعنی اس نے تخت خسروی کو ایک معمولی چارپائی اور ایک سریر سمجھا اس کو خاطر میں نہیں لائی، جہاں بیٹھنا چاہئے تھا جاہ و جلال کا اظہار کرنے کے لئے وہاں وہ سو گئی۔

تو اصل چیز کیا ہے؟ خدا کو جب منظور ہوگا اور خدا کی حکمت کا تقاضا ہوگا تو سلطنت وجود میں آئے گی، اور جب خدا کی حکمت کو کچھ اور تقاضہ ہوگا تو اس سے بھی بڑی چیزیں وجود میں آئیں گی۔ یہ درویشان بے نوا، یہ فقیران کج کلاہ، آپ کی سرزمین میں آرام فرما ہیں۔ انھوں نے بادشاہوں پر حکمرانی کی ہے، حضرت خواجہ برہان الدین غریب کے واقعات پڑھئے، حضرت خواجہ زین الدین کے واقعات پڑھئے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ شیخ زین الدین کو بادشاہِ وقت نے طلب کیا جو اس وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، کسی بات پر اس کو ناگواری ہوئی، تو انھوں نے خواجہ برہان الدین غریب کی قبر پر آکر اپنی لاٹھی گاڑ دی اور کہا اب جس میں دم اور ہمت ہو وہ یہاں سے اٹھا کر دیکھے، تو اس کے سامنے بادشاہ ہی جھکا وہ اس کے سامنے نہیں جھکے، ایسی نظیروں سے پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

ہماری باگ شریعت کے قبضہ میں ہو

اصل چیز کیا ہے، وہ ہے سیرت کا پیدا کرنا، جس کا عنوان ہے "ادخلنی" میں داخل ہوں تو تیرے حکم کے مطابق نکلوں تو تیری تعلیم اور منشاء کے مطابق جس کو "مدخل صدق" اور "مخرج صدق" کہا گیا۔ وَاجْعَلْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَاناً نَّصِيْراً" (الاسراء:۸۰، اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیو) کہا گیا۔ آپ کے سوا مدد کرنے والی کوئی ذات نہیں ہے، میرے لئے آپ اپنی طرف سے طاقت پیدا کر دیجئے۔ اصل مسلمانوں کی طاقت اس میں مضمر ہے، کس کی سلطنت رہی ہے؟ اگر کسی کی سلطنت رہتی تو خلافت راشدہ رہتی، اور اس کے بعد کوئی شہنشاہی رہتی تو سلطنت عباسیہ، جو پورے متمدن افریقہ اور ایشیا کے عظیم ترین ممالک پر حکومت کرتی تھی۔ یہ مغلوں کی سلطنت خود کتنی بڑی سلطنت تھی، یہ چیز یعنی نعمت اللہ تعالیٰ کسی کو دے تو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میں اس کی تحقیر نہیں کرتا لیکن یہ مسلمان کے لئے موت وزندگی کا سوال نہیں۔ یہ نہیں کہ سلطنت ختم ہو جائے تو یہ امت مرگئی، اور جب سلطنت آئے تو یہ امت زندہ ہو گئی، امت سلطنت سے بالاتر ہے، سلطنت امت سے بالاتر نہیں، سلطنت امت کے لئے ہے، امت سلطنت کے لئے نہیں۔ سیرت سلطنت بھی پیدا کرتی ہے اور سلطنت سے بھی عظیم تر چیز پیدا کرتی ہے اور وہ سیرت خود خدا کو پسند ہے جس کے انعام میں وہ ساری دنیا بھی عطا کر دے اور ہفت اقلیم کی سلطنت بھی عطا فرمادے، اور عطا بھی فرمائی ہے، کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو اور کبھی اپنے کسی اور محبوب بندے کو۔

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" میرا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا سب تیرے لئے ہو، اور الفاظ قرآنی میں وہ کہا جاسکے جس کی نبی کو تعلیم دی

گئی ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذَالِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

(الانعام: ۱۶۲)

(یہ بھی) کہدو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں۔

مسلمان کی زندگی شریعت کے سانچہ میں، قرآن وحدیث کے سانچہ میں، سیرت نبویؐ کے سانچہ میں ڈھل کر نکلے، نہ اپنی خواہش سے جانا، نہ اپنی خواہش سے آنا، نہ اپنی خواہش سے اٹھنا، نہ اپنی خواہش سے بیٹھنا، نہ اپنی خواہش سے حکم چلانا، نہ اپنی خواہش سے حکم ماننا اور نہ اپنی خواہش سے کسی کو زیر کرنا، نہ اپنی خواہش سے کسی کے سامنے زیر ہونا، یہ ہے "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ."

ہر کام کے لئے شریعت کی دلیل چاہئے، خدا تعالیٰ کیا چاہتا ہے اس وقت کا فرمان کیا ہے ،اس وقت کا حکم کیا ہے؟ اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم جھک جائیں، اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم رک جائیں، حالیؔ نے صحابہ کرام کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم نرماگئے وہ جہاں کردیا گرم گرماگئے وہ

مجھے ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے پرانی یادیں ستائیں اور میرے دل میں چٹکی لیں، یہ الگ بات ہے لیکن قرآن ازلی وابدی کتاب ہے اور وہ خدا کا فیصلہ ناطق ہے، اصل چیز ہے اسلام کی سیرت بنانا، یعنی نفس کی خواہش اپنے ذاتی مفادات اور وقتی تقاضوں کو شریعت کے سامنے جھکا دینا اور اس کے تابع بنادینا، یہ جھوٹی عزت، یہ ناموری، یہ شہرت، ہم چشموں

میں عزت کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز امر الٰہی ہے اور امر الٰہی کیا ہے؟ اس کو تلاش کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہماری کیسی زندگی چاہتا ہے اس وقت اسلام کی مصلحت کا تقاضا کیا ہے؟ معیار اور کسوٹی یہ ہے کہ ہمیں کیا ملے گا؟ ساری جدوجہد سیاسی جدوجہد سے لے کر معاشی جدوجہد تک اسی مرکز کے گرد گھومے وہ کیا؟ کہ ہمیں اس سے کیا ملے گا؟

اسلامی سیرت کی کمی ہے

آج تمام دنیا میں مسلمان ہیں، کون سا ملک ہے جہاں آپ کے ملک کے لوگ موجود نہیں؟ لیکن کس کے لئے ہیں بس یہی مسئلہ ہے دعوت پھیلانے کے لئے نہیں ایسا نہیں ہے کہ انسانیت پر رحم کھاکر، انگلستان، کنیڈا، امریکہ خود عرب ملکوں کی موجودہ خطرناک حالت دیکھ کر وہ بے چین ہو کر اپنے گھروں سے نکلے ہوں، یہ "اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" نہیں ہے، اور وہاں جو گئے تو یہ "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ" نہیں ہے، معاشی مصلحت کے مفاد نے ان کو نکالا، معاشی مفاد نے ان کو وہاں داخل کیا، معاشی وذاتی وخاندانی مفاد نے ان کو وہاں رکھا، جب اس کا تقاضا ہوگا کہ مکہ کے بجائے نیویارک چلے جائیں تو وہ چلے جائیں گے۔ آپ جب چاہیں امتحان لے کر دیکھ لیجئے اور جب اس کا تقاضا ہوگا کہ مکہ چلے آئیں تو وہاں چلے آئیں گے، اس لئے نہیں کہ وہاں حرم ہے بلکہ اس لئے کہ معاشی مسئلہ کا تعلق وہاں سے ہے۔ یہ نہ "مدخل صدق" پر عمل کر رہے ہیں اور نہ "مُخْرَجَ صِدْقٍ" پر چل رہے ہیں، یہ اللہ کا حکم ہے، اپنے نبی کو تعلیم دی جارہی ہے اور آپؐ کے ذریعہ آپؐ کے طفیل میں امت کو تعلیم دی جارہی ہے، ہم دعا کریں "رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" ہمارا جینا، مرنا ہمارا کسی سے خوش ہونا، کسی سے ناراض ہونا، ہمارا ٹوٹنا اور جڑنا، ہمارا بگڑنا اور بننا یہ سب خدا کے حکم اور امر الٰہی کے تابع ہو، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کیا عطا کرتا ہے؟ شکوہ اس

سیرت کے بدل جانے کا ہے، اس ذہن کے بدل جانے کا ہے کہ شریعت ہماری امام نہ رہی، شریعت ہمارا فیصلہ کرنے والی نہ رہی جو ہمارے مسائل میں ایک حکم کی حیثیت رکھے، ہم نے شریعت کو حاکم نہیں بنایا، ہم نے اپنی خواہشات کو اپنے مفادات کو حکم بنایا، بس اس وقت اصل انقلاب جو مسلمانوں کے لئے ضروری ہے وہ ہے سیرت کا اختیار کرنا کہ ہماری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے منشا کے مطابق بن جائے وہ ہم سے جو کرائے وہ ہم کریں وہ جو چھڑائے وہ ہم چھوڑیں۔

تو یہ "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" ہے، مسلمان کو پہلے یہ پوچھنا چاہئے کہ شریعت کا حکم کیا ہے، یہ ہمارے لئے جائز ہے کہ نہیں؟

اس وقت جس چیز کی کمی ہے اور جو چیز فیصلہ کن اور انقلاب انگیز ہے وہ ہے اسلامی سیرت کا اختیار کرنا اور اگر ایسا اجتماعی طور پر ہو تو کیا کہنے ہیں، اجتماعی طور پر بھی الحمد للہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ انفرادی طور پر کوشش کر کے دیکھئے۔

ہر ایک شخص یہ طے کرے کہ شریعت کو مقدم رکھنا ہے، حکم الٰہی اور حکم شرعی پوچھنا ہے کوئی بھی کام ہو سیاسی انتخاب و الیکشن سے لے کر شادی بیاہ، ختنہ، عقیقہ، مکان کی تعمیر، جائیداد کی تقسیم اور کھانے پینے تک یہ دیکھنا ہے کہ شریعت کی اجازت ہے کہ نہیں اور شریعت کا حکم کیا ہے؟

بس ضرورت ہے کہ ہم اپنی سیرت بدلیں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، اور جب اللہ اپنے محبوب رسولؐ سے یہ کہے اور اس کو یہ تلقین کرے اور یہ وظیفہ بتائے کہ تم یہ دعا کرو کہ "رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔(۱)

---

(۱) تلخیص از "تحفۂ دکن" ص ۷۲ تا ص ۸۲۔

مسلمان کی اصل طاقت وقیمت ایمان وسیرت ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔
(الانفال ۲۹)

مومنو اگر تم خدا سے ڈروگے، تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کردے گا، (یعنی تم کو ممتاز کردے گا) اور تمہارے گناہ مٹا دے گا، اور تمہیں بخش دے گا، اور خدا بڑے فضل والا ہے۔

مسلمان کی دو حیثیتیں

مسلمان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت عام انسان کی ہے، جس قانون اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ کے مطابق سب انسان دنیا میں آتے ہیں وہ بھی دنیا میں آیا ہے، وہی اعضائے انسانی، وہی جسم اور جسم کے تقاضے، جسم کی کمزوریاں، جسم کی بیماریاں لے کر آیا ہے، جو انسانوں میں مشترک ہیں قانون فطرت اس کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے، وہ بچہ سے جوان ہوگا، جوان سے بوڑھا ہوگا، پھر ایک وقت عمر طبعی کو

پہونچنے کے بعد (اگر اللہ کو منظور ہوا) اس کا اخیر وقت بھی آئیگا، اور وہ کیسا ہی عبادت گزار، خدا ترس، کیسا ہی زبردست عالم مصنف ہو، مفکر ہو، فلسفی ہو، دانشور ہو، شیخ طریقت ہو، صاحب کشف و کرامات ہو، اس کو دنیا سے جانا ہے، " إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ " اللہ تعالےٰ نے یہ صاف فرمایا ہے، تو پھر مسلمان کا استثناء کیسے ہو سکتا ہے،

لیکن ایک دوسری حیثیت ہے، وہ حیثیت اگر اس کے ساتھ قائم ہو جائیگی تو پھر وہ انسان رہتے ہوئے بھی کچھ اور چیز بن جاتا ہے، پھر اس کا معاملہ براہ راست اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر وہ اللہ تعالےٰ کی تقدیر بن جاتا ہے، اس کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے قانون کو جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلا آرہا ہے، بعض اوقات معطل، بعض اوقات مؤخر کر دیتا ہے، اور اس کو غالب کرتا ہے، اس کو عزت دیتا ہے، اس کو فتح عطا فرماتا ہے، اس کو نیک نامی بخشتا ہے، اس کو فاتح اور منصور بناتا ہے، یہ حیثیت ارادی اور اضافی ہے، یعنی اس کے لئے فیصلہ اور اضافہ کی ضرورت ہے، کوئی اپنے ساتھ لے کر کے نہیں آتا اس کو، ماں کے پیٹ سے، جہاں سے جسمانی اعضاء لایا ہے، ایسے ہی ایمان اور شریعت کی پابندی بھی لایا ہے، اس کو کسی ارادہ کی، فیصلہ کی ضرورت نہیں، وہ تو اس کے ساتھ گویا جسم کا ایک حصہ ہے، اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی ایک موروثی اور پیدائشی چیز ہے، ایسا نہیں ہے۔

اسلام کا معاملہ، اور خدا کے دین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ایمان اور تقویٰ ایک ارادی و اضافی چیز ہے جو بالارادہ ہوتا ہے، اور اس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

ٹارچ کی قیمت اس سیلز سے ہے

اس کی موٹی سی مثال میں آپ کو دیتا ہوں، یہ ٹارچ ہے، اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیئے گئے اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے، آسمان و زمین کا فرق ہوگا، یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اُجالا کردے گی، روشنی کا ایک تیز دھارا اس میں سے نکلے گا، یہ ہاتھ میں ہوگی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرا جانے سے بچے گا، کسی سوتے ہوئے بچے پر پاؤں رکھ کر چلے جانے سے بچے گا، اور معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا.
(الانعام۔ ۱۲۲)

بھلا جو (پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کردی، جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے، جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو، اس سے نکل ہی نہ سکے؟

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کرکے بتاتا ہے) ہجے کرکے بتایا ہے، اور دو اور دو چار اس طریقے سے سمجھایا ہے، بھلا وہ جو مردہ تھا "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" ہم نے اس کو زندہ کیا، اور اتنا ہی نہیں "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاس" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے "كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا کہ جو اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، نکلنے کا اس کو کوئی راستہ ہی نہیں ملتا۔

معاملہ ٹارچ میں سیلز اور مسالہ رکھنے کا ہے، یہ مسالہ بارگاہ نبوت سے ملتا ہے، اس کے لئے ایک ہی جگہ، ایک ہی ٹھکانہ ہے، حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب وہ سیلز اور کہیں نہیں مل سکتے، نہ امریکہ میں، نہ روس میں، نہ دنیا کے کسے کارخانہ میں، وہ ایمانی سیلز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں، وہ اگر آپ ٹارچ میں رکھتے ہیں، فٹ کردیتے ہیں، تو ذرا سا بٹن دبایئے، ذرا سا ہاتھ کا اشارہ کیجئے اور روشنی کی ایک تیز رو نکلے گی، جس سے آپ کو بھی راستہ نظر آئیگا، دوسروں کو بھی راستہ نظر آئیگا، اور اس کی یہی قیمت ہے کہ یہی اسلام کی شان ہے کہ جب وہ سیلز بھر دیئے جاتے ہیں، تو صرف اس مسافر ہی کو جس کے ہاتھ میں وہ ہے، جو اس کا مالک ہے، اسی کو راستہ نظر نہیں آئیگا، بلکہ بیسیوں جو بالکل اندھوں کی طرح راستہ چل رہے ہیں، ان کو بھی راستہ نظر آنے لگے گا، یہ ہے مسلمان کے شان۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوْا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً.

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور اس سے شرم کرو گے اس کا لحاظ کرو گے اور اس کے احکام کا احترام کرو گے اس کی شریعت کو قبول کرو گے، اس پر چلنے کا فیصلہ کرو گے، اس پر عمل کرنا شروع کرو گے، تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کردے گا (یعنی تم کو ممتاز کردے گا)

ما بہ الامتیاز صفت

فرمایا "**يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً**" اللہ تم کو ایک ما بہ الامتیاز چیز عطا کرے گا، تمہاری سطح ایک دم سے بلند ہو جائیگی، تم اس پستی سے، ماحول کی خرابی سے نکل جاؤ گے، جب انسان اپنے کو اللہ کی روشنی سے محروم کرلیتا ہے تو پھر اس کا کیا حال ہوتا ہے؟

وہ اس ٹارچ کے طرح ہو جاتا ہے، جس کے سیلز ختم ہو چکے، یا اس میں رکھے ہی نہیں گئے۔

مسلمانوں کی اصل طاقت

ہم مسلمان کو جو اصل خصوصیت، ہمارا مابہ الامتیاز، ہمارا سرمایہ، ہمارا فخر، ہماری طاقت ہے وہ سیلز تھے، جو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے یہاں سے لے کر آئے ہیں، اور انسانوں کے دماغ اور انسانوں کے دل کے اندر رکھے، دماغ میں بھی سیلز رکھے ہیں، اور دل میں بھی، ایمان کا کچھ تعلق انسان کے ضمیر اور قلب سے ہے، کچھ انسان کے دماغ اور فکر سے ہے، اس سے خاص طرح کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، خاص طرح کا طرز عمل، زندگی کا رویہ اور مسلک پیدا ہوتا ہے، خاص طرح کے برتاؤ کرنے کا طریقہ آتا ہے، خالق کی معرفت ہوتی ہے، مخلوق سے محبت ہوتی ہے، خدا کا خوف ہوتا ہے، بندوں کی شرم ہوتی ہے، اللہ کا ڈر اور اس کی محبت ہوتی ہے، اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، غریبوں پر آدمی رحم کھاتا ہے، بے ایمانی سے بچتا ہے، چوری سے پناہ مانگتا ہے، اس کو جرائم سے، ظلم سے گھن آتی ہے، بالکل سیرت ہی بدل جاتی ہے، یہ کس کا کرشمہ ہے، یہ ان سیلز کا کرشمہ ہے۔

معنوی خودکشی

مسلمان اپنے کو ان سیلز سے محروم کر دے تو یہ معنوی خودکشی ہے، جیسے کوئی زہر کھا کر مر جائے، یا کوئی گلے میں پھندا ڈال کر کے اپنا گلا گھونٹ لے، مسلمان ہے، لیکن اس کے اندر ایمان کے وہ سیلز نہیں ہیں، عقیدہ کے وہ سیلز نہیں ہیں، وہ

"فرقان" نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوْا اللهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً. مومنو اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کردے گا۔

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرنے لگو گے، اور احتیاط کی زندگی گذارو گے، آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرو گے، اِدھر چلو، اُدھر مت چلو، اس راستہ چلو، اس راستہ نہ چلو، اس لکیر کو نہ چھوڑو، یہ سرحد پار نہ ہونے پائے، اس کا نام تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو نماز پڑھتا چلا جائے رات کو پلک سے پلک نہ لگے، اس کو لوگ متقی کہتے ہیں، تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے، اس سے بچیں، اس کے تصور سے خیال بھی آجائے تو خدا کی پناہ مانگیں، اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے، ان کی پابندی کریں، ہفت ا کی سلطنت مسلمانوں کو مل جائے، ان کے قدموں پر بادشاہوں کے تاج رکھ دیئے جائیں، اور قارون کا خزانہ ان کو مل جائے لیکن ان کے اندر وہ سیلز نہ ہوں، نبوت کی لائی ہوئی روشنی نہ ہو، وہ فرقان نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ دین پر چلنے والوں کو عطا کرتا ہے، تو دو کوڑی کی قیمت نہیں، مسئلہ بہت صاف اور بہت ہی واضح ہے، میں کوئی پہیلی نہیں بجھار ہوں، ہماری آپ کی ساری طاقت، سارا امتیاز، اللہ کے یہاں بھی جو مرتبہ اور مقام ہے، اور مخلوق کی نگاہ میں بھی جو وزن اور طاقت ہے، وہ سب ان سیلز کے صدقہ میں ہے، سیلز سلامت سب کچھ، یہ دل سلامت سب سلامت، یہ دماغ سلامت سب سلامت، عقیدہ سلامت، اخلاق سلامت، مسلمان مسلمان ہے، نہ پہاڑ اس کا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر۔

ایمان وسیرت کی کرامت

بات یہ کہ یہ سب سیلز کی کرامت ہے، یہ مسالہ جو اس کے اندر بھرا ہوا ہے، ایمان کا مسالہ، عقیدہ کا مسالہ، اخلاق کا مسالہ، مقاصد کا مسالہ، ہمارا عقیدہ الگ، ہمارا ایمان الگ، ہمارے اخلاق الگ ہونے چاہئیں، پھر کیا ہوگا "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا" اللہ تم کو ایسی مابہ الامتیاز چیز بخشے گا کہ دور سے پہچانے جاؤ گے، جہاں جاؤ گے تمہاری عزت ہوگی۔

تو اللہ فرماتا ہے، اے ایمان والو! "إِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ" اگر تم تقوی کی زندگی اختیار کرو، تمہارا مزاج بن جائے، ایک تو ہے کسی کام کو ہمت کر کے کرنا، ارادہ کر کے کرنا، اور ایک ہے مزاج بنایا جانا، اگر تم ڈھل جاؤ گے، شریعت کے سانچے میں ڈھل کر نکلو گے، تقویٰ تمہارا شعار بن جائے گا، تمہارے اندر دین کا، اللہ کا ایک لحاظ پیدا ہو جائیگا، "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا" تو اللہ تمہیں ایک شان امتیازی عطا فرمادے گا، کہ دور سے پہچانے جاؤ گے، جہاں جاؤ گے تمہاری عزت ہوگی۔

"نُوْرُهُمْ يَسْعىٰ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ" روشنی ان کے آگے چلتی ہے، وہ پیچھے ہوتے ہیں روشنی ان کے آگے چل رہی ہوتی ہے، خوش خبری سنا رہی ہوتی ہے، کہ اللہ کا ایک مقبول بندہ آرہا ہے۔

تو یہ آیت بڑی اہم ہے، (آیتیں سب اہم ہیں) یہ اعلان بھی ہے، یہ بشارت بھی ہے، یہ ضمانت بھی ہے، یہ انعام بھی ہے!

اعلان تو یہ کہ اللہ تعالیٰ جو ساری دنیا کو پیدا کرنے والا ہے، وہ اعلان کر رہا ہے،

کہ اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ کی زندگی اختیار کروگے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں "فرقان" عطا فرمائیگا!

"فرقان" کے معنیٰ کیا ہیں؟

"الفارق بین الحق والباطل، الفارق بین النور والظلام، الفارق بین الخیر والشر" ...... "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا"......ایک ایسی قوت عطا فرمادے گا، ایک ایسی شان امتیازی عطا فرمائے گا کہ تم بالکل نرالے ہوگے جیسے پتھروں میں ہیروں کوڈالدیجئے تو صاف معلوم ہوگا ہر شخص ان کو چن لے گا، علامتیں بتانے کی ضرورت نہیں، یہ ہیرا ہے یہ پتھر ہے، ایسے ہی تم ہو جاؤگے کہ جیسے پتھروں میں ہیرا کانٹوں میں پھول، جیسے اندھیرے میں روشنی، (خدانخواستہ) اندھیرا ہو جائے اور راڈ جل جائے ساری محفل روشن ہو جائے، تمہیں اللہ تعالیٰ یہ روشنی عطا فرمادے گا، "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا"!

یہ "فرقان" ملا تھا مسلمانوں کو، اور یہ "فرقان" ملا تھا، ان کی تقوی کی زندگی کی بدولت! جیسا کہ حالی نے کہا ہے۔

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی ‏ ‏ ‏ شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرماگئے وہ ‏ ‏ ‏ جہاں کرو یا گرم، گرماگئے وہ! (۱)

---

(۱) مشترک تلخیص از ۱۔ تعمیر حیات ۱۰ رجون ۱۹۸۴ء

۲۔ تحفۂ دین ودانش ص ۶۸ تا ص ۷۱

۳۔ خطرہ ارتداد اور اس کا حل (مطبوعہ تقریر)

وہ جسکی خود خدائے پاک کرتا ہے نگہبانی

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.

یہ قرآن مجید کی بہت مختصر سی آیت ہے جو چند لفظوں پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بے شک ہم نے "الذکر" کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی یقینی طور پر اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!

عظیم الشان اعلان

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا مژدہ، ایک بہت بڑی بشارت، ایک بہت بڑی ضمانت ہے، ایک عظیم الشان اعلان ہے، جس پر ساری دنیا کے کان کھل جانے چاہئیں، اور سب کو اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے، اس اعلان میں ایک عمومیت ہے، ایک زور ہے، ایک تاکید ہے، اور ایک یقین ہے، خاص کر مسلمانوں کے لئے تو یہ آیت بہت توجہ طلب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بے شک ہم نے "الذکر" کو نازل کیا" اور جہاں تک میری معلومات ہیں اور تھوڑا بہت مطالعہ ہے تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے، کہ "الذکر" سے مراد قرآن مجید ہے "بے شک ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا" اللہ

تعالیٰ جس شاہانہ، شہنشاہانہ انداز میں، جیسے شاہی فرمان ہوتے ہیں، جمع کے صیغے کے ساتھ، فرماتا ہے: "ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!

جو حضرات عربی داں ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے "ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہم اس کی حفاظت کریں گے، کتنے طریقے ہو سکتے ہیں اس کے ادا کرنے کے لئے، قرآن مجید میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل الگ ہے، اس میں کئی طریقوں سے اس بات کو کہا گیا ہے، بڑی تاکید اور بڑی شدومد کے ساتھ کہا گیا ہے، کہ "ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!...... میں عربی زبان کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تاکید کی کئی چیزیں جمع کر دی ہیں، "اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" اسم فاعل کا صیغہ ہے، پھر "اِنَّا" کے ساتھ، "له" کو مقدم کرنا" إنا لحافظون" کے بجائے "إناله لحافظون" یہ سب طریقے علم بلاغت سے تعلق رکھتے ہیں، علم نحو سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ آیت بڑی قابل غور ہے

یہ آیت جس کے الفاظ گنے چنے ہیں، صرف چند، نہ معلوم ہم نے کتنی مرتبہ اور قرآن مجید میں ہزاروں مرتبہ پڑھی ہو گی، اور علماء کی زبان سے سنی ہو گی...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پورے مطالب پر، اس کے جو آفاق ہیں، جہاں تک یہ آیت پہونچتی ہے، جن حدود کو اس آیت نے سمیٹ لیا ہے، جو وسعت اس آیت کے اندر پائی جاتی ہے، اس پر میری پوری نظر ہے، لیکن

یہ آیت بڑی قابل غور ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ "ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے" اور توریت وانجیل کے متعلق آپ کو معلوم ہے، قرآن مجید کے الفاظ کیا ہیں:-

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ وَکَانُوْا عَلَیْہِ شُھَدَاءَ

.........توریت وانجیل کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے نہیں لی تھی، انہیں قوموں کے سپرد تھی جن کے لئے یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں، پھر اس کا کیا نتیجہ ہوا، آپ تاریخ میں دیکھئے اور مصنفین نے (خاص طور پر اب جو) جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں آئی ہیں انہوں نے) بالکل اس بات کو ثابت کر دیا ہے یہ کتابیں محفوظ نہیں رہیں! ....

......اور یہ سب نتیجہ اس کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام انہی کے سپرد کیا تھا، "بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ" لیکن اس آیت میں اس کے بالکل برخلاف کہا گیا ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ". (ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

مجھے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے...... میرا ذہن اس طرف گیا کہ اس قرآن مجید کی حفاظت کے وعدے میں اور کتنے وعدے مضمر ہیں، اس پر غور فرمایئے، اور ہمارے لئے کتنی بڑی بشارت ہے، ہمارے مدارس کا اصل تعارف یہی ہے، اس کی اصل قدو قیمت یہی ہے۔

ان مدارس کی اصل، ان کا مقام کیا ہے، اور ان مدارس کی اصل قدر و قیمت کیا ہے، یہ بات صرف اس پر منحصر ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے ضمن میں، قرآن مجید کی حفاظت کے اعلان میں اور کتنی حفاظتوں کا اعلان فرمایا ہے اور اس دُنیا میں حقیقی تحفظ کا راستہ کیا ہے؟

حقیقی تحفظ کا راستہ

یہ اس آیت سے معلوم ہوگا کہ "ہم نے ہی "الذکر" کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!

جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والے ہیں، تو کیا آپ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کسی کتب خانہ کی زینت بنی رہے گی، یہ تو کوئی بچہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس زور و شور کے ساتھ، اس آن بان کے ساتھ اگر یہ صحیح ہیں بلکہ میں اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اس دھوم دھام کے ساتھ، اس شان و شوکت کے ساتھ، ساری دنیا کو تھرا دینے والی آواز کے ساتھ، جلال سلطانی نہیں، جلال شہنشاہی بھی نہیں، جلال خسروی بھی نہیں، بلکہ جلال الٰہی کے ساتھ فرمایا ہے، "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، ہم نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، ہم نے اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو اعلان اس شان کے ساتھ ہوا۔ اس اعلان کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ کتاب کسی کتب خانہ میں محفوظ

رہے گی، کوئی اس کو پڑھنا چاہئے گا تو پڑھ سکے گا...... یا یہ کہ قرآن مجید سینوں میں محفوظ رہے گا، لوگ اس کو جیسا کہ نازل ہوا تھا، من و عن یاد کرلیں گے، اور تراویح میں سنادیا کریں گے؟ نہیں!

"إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر پچاس اعلانات ہیں، اس کے اندر اعلان ہے کہ ہم اس کتاب کو، اس کتاب کے اندر جو مطالب ہیں ان مطالب کو بھی ہم زندہ رکھیں گے، ہم اس پر عمل کرنے کے سلسلہ کو بھی باقی رکھیں گے، ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والوں کی بھی حفاظت کریں گے، اس کتاب کو یاد کرنے والوں کی بھی عزت کرائیں گے، اس کتاب کا علم حاصل کرنے والوں کے سلسلہ کو بھی ہم باقی رکھیں گے، ہم اس زبان کو بھی محفوظ رکھیں گے جس زبان میں یہ نازل ہوئی ہے، اس زبان کے ان علوم کو بھی باقی رکھیں گے جو اس زبان کے سیکھنے کے لئے ضروری ہیں، ان مقامات کی بھی حفاظت کریں گے، اس ملک کی بھی حفاظت کریں گے جہاں کی اور جس ملک کی یہ زبان ہے!............

............میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کی تفسیر میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ عربی زبان بھی قیامت تک جب تک اللہ کو منظور ہے اسلام کو رکھنا اور قرآن مجید کو، یہ عربی زبان اسی قرآنی صرف و نحو میں، اسی قرآنی قواعد میں، اسی قرآنی زبان میں باقی رہے گی، "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر یہ بھی آتا ہے، کہ قرآن بھی محفوظ، قرآنی زبان کی صرف و نحو بھی محفوظ، جن ملکوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے، ان کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت اس آیت میں ہے، یہ اقوام متحدہ کے

منشور میں بھی نہیں ہے، یہ یونائیٹیڈ نیشن کے اعلانات میں نہیں ہے، یہ صدر کارٹر کے کسی بیان میں نہیں ہوسکتی، روس کے کسی صدر کے یہاں نہیں ہوسکتی، یہ صرف "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر مضمر ہے!

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں......

......میں ایک قدم اس سے آگے بڑھ کے یہ کہتا ہوں کہ مختلف ممالک کے مسلمان بھی اسی حالت میں محفوظ اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہمارے ساتھ ہیں، حفاظت کی ضمانت ہمارے ساتھ ہے، جب کہ ہم قرآنی علوم اور قرآنی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھیں، ان کی نشر واشاعت، ان کی خدمت، ان کے درس وتدریس، ان کے تعلیم وتعلم کا اہتمام کریں گے، آج ہم ہندوستانی مسلمانوں کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ "وإنا له لحافظون" ہم اس قرآن کے محافظ ہیں تو اس کے حاملین کے بھی محافظ ہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ اذان رہے مؤذن نہ رہے ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل!

......اللہ تعالیٰ نے کہا کہ "ہم نے "الذکر" کو نازل کیا، اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اس کی حفاظت کرکے رہیں گے، ساری دنیا ایک طرف ہو تو کچھ نہیں، "إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنَ"۔ اس کا تو بس "کن" کہہ دینا کافی ہے۔

ہمارے تحفظ کا راز

اس "وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" میں ساری حفاظتیں اور ضمانتیں ہیں، اس لئے مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے کو اس سلسلہ میں داخل کریں، اس کشتی نوحؑ میں اپنے کو بٹھا دیں، میں کشتی نوحؑ کہتا ہوں، کہ "لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ" ایک ہی جگہ تھی طوفان نوحؑ میں بچنے کی، اِس وقت بھی اگر کوئی جگہ ہو سکتی ہے، جبکہ ایک سیلاب امڈا چلا آرہا ہے، ساری دنیا پر مادیت کا، نفس پرستی کا، خواہش پرستی، کا قوت پرستی کا، طاقت پرستی کا، یہ سب کو لے ڈوبے گا، اس وقت کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے، پناہ کی جگہ ہے تو اس وقت کشتی نوحؑ تھی اور اس وقت کشتی محمد، کشتی اسلام ہے، کشتی قرآن ہے، جو اس میں جگہ حاصل کرلے گا، اپنی جگہ بنالے گا، وہی بچے گا، مسلمانوں کی حفاظت کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم قرآن مجید کے سائے کے نیچے آجائیں، جس کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، اس کے سائے میں جو آجائے گا وہ محفوظ ہو جائے گا، ہمارے تحفظ کا راز، ہماری صیانت و حفاظت کا راز قرآن کی بقا میں ہے، قرآن مجید کی تعلیمات کی بقا میں ہے، اور اس پر عمل کرنے میں ہے، اپنی طرف سے اس کی حفاظت واشاعت میں ہے...... یہ ضمانت اللہ کی طرف سے ہے، "وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!!(۱)

---

(۱) تعمیر حیات جلد ۱۷، شمارہ ۲۳-۲۴ تلخیص

سلف صالحین کے ساتھ حسن ظن اور ان کی خدمات کا اعتراف

وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

(سورة حشر. ۱۰)

اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے"!

مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا ہے کہ گزشتہ نسلوں کے بارے میں ان کا رویہ شرح صدر اور اعتراف حق کا ہو جائے، صدق واخلاص، اطاعت رب، خوف وانابت، دین کی خدمت اور اسلامی سرحدوں اور قلعوں کی پاسبانی و حفاظت کے میدان میں جو سبقت اور فضیلت ان کو حاصل ہے، اس کو دل سے تسلیم کرنا چاہئے، ان کی طرف سے نئی نسل کے دلوں میں کوئی کینہ اور نفرت نہ ہو، ان کی خدمات کے اعتراف میں اس کو انقباض اور تکلیف محسوس نہ ہو، اس کی زبان ان کے لئے دُعاگو اور ثناخواں رہے۔ ان کے عذر اور

مجبوریاں۔ اس کے لئے قابل قبول ہوں۔ اور وہ ان فرو گذاشتوں سے جن سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں رہتا، درگذر سے کام لے۔

اس لئے کہ جو اجتہاد کرتا ہے اس کے ساتھ خطاب وثواب کا احتمال رہتا ہے۔ گرنے کا اندیشہ اسی سے ہوتا ہے جو چلنے اور دوڑنے کا ارادہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی معصوم ﷺ کی تعلیم وہدایت کے سوا دوسرے تمام لوگوں کے احکامات وتعلیمات میں ردوقبول دونوں چیزوں کی گنجائش ہے۔

دعوت وتبلیغ کی ایک اہم ضرورت، نیز رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپؐ کی سیرت وتاریخ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحابہ کرام کے محاسن کا اعتراف کریں۔ ان کے کارنامے کی عظمت واہمیت، ان کی وفاداری، باہمی محبت وتعاون علی الحق کے نقوش کو اُجاگر کریں۔ اور اس تابناک تاریخ کا یہ روشن ورق دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کی بھول چوک، اور بشری کمزوریوں کی حیثیت تاریخ کے صاف شفاف صفحہ پر ایک سیاہ نقطہ سے زیادہ نہیں، صحیح منطق اور عقل سلیم بھی اس موقف کو قبول کرتی ہے۔ اور قرآن مجید اور مستند تاریخ سے بھی یہی موقف درست ثابت ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی سابقین اوّلین، اور سلف صالحین کے متعلق اسی روش کو قابل تعریف قرار دیا ہے:

"وَالَّذِيْنَ جَاؤُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ ......إلخ"

اس آیت کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم سلف صالحین اور ایمان واحسان کے شعبہ اُمام وپیشرو بزرگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے، انکے بارے میں کوئی رائے

قائم کرنے اور ان پر کسی قسم کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیں، اور اس میں کسی عجلت اور جذبات کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور جب تک پوری طرح کسی مسئلہ کا اطمینان نہ ہو جائے اس پر قطعی حکم لگانے سے باز رہیں۔

بعض مرتبہ کسی وجہ سے یہ ذہن بن جاتا ہے۔ اگر کسی نے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تو گویا اس نے کوئی کام نہیں کیا، چاہے وہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ ہوں، یا حضرت مجدد الف ثانیؒ یا حضرت شاہ ولیؒ اللہ۔ یہ تاریخ کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے، اس میں سب کا حصہ ہے، محدثین فقہا، صلحاء امت، اولیاء اللہ سب کا اس میں حصہ ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ امام ابو حنیفہؒ کیا کرتے تھے؟ نماز روزے کے مسائل بتاتے تھے، انہیں تو اسلامی خلافت و سلطنت قائم کرنی چاہئے"۔ تو خلافت تو قائم ہو جاتی ہے لیکن آپ کو نماز پڑھنا کون سکھاتا؟ اور وہ خلافت کس کام کی جس میں نماز پڑھنا کسی کو نہ آتا ہو؟۔

یہ خیال آپ کے دل میں نہ آئے کہ سب ناقص تھے، کسی نے اسلام کو سمجھا نہیں، کسی نے پورے اسلام کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے سب لوگ اپنے امکان و استطاعت کے مطابق دین کی خدمت اور اس کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے، کوئی وعظ کہہ رہا تھا، کوئی تقریر کر رہا تھا، اور کوئی حدیث پڑھا رہا تھا، کوئی فتوے دے رہا تھا، اور کوئی کتابیں لکھ رہا تھا، اپنی جگہ اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی تربیت کا کام کر رہے تھے۔ اور ہر ایک نے ایک محاذ سنبھال رکھا تھا۔

یہ کبھی نہ سمجھے گا کہ اسلام کو اب کچھ لوگ سمجھے ہیں۔اس سے پہلے کوئی پورے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یہ اسلام پر بڑا الزام ہے، یہ اسلام کی صلاحیت پر بڑا دھبہ ہے، اس سے قرآن شریف کی زندگی اور اس کا واضح اور قابل فہم ہونا مشکوک بن جاتا ہے جس کو " کتاب عربی مبین""لسان عربی مبین" کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جو کتاب ہزار بارہ سو برس نہ سمجھی گئی ہو، اب کیا اطمینان ہے کہ وہ صحیح سمجھی گئی ہو؟......اسلام کے بنیادی اصول، قرآن کے حقائق۔ اور دین کے قطعیات، تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ عرصہ تک نہیں سمجھے گئے تو یہ اس کی نظر کی کوتاہی ہے، ایک بات بھی کوئی ثابت کر دے کہ یہ حقیقت بالکل عالم اسلام بھول گیا۔ شیخ اسلام ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک سنت بھی نہیں ہے۔ جو پورے طور پر عالم اسلام سے کلیتہً اٹھ گئی ہو۔ اگر اس کونے پر موجود نہیں تھی۔ تو اس کونے پر موجود تھی۔ گویا بقول اقبال ؎

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

تو آپ سلف کے ساتھ حسن ظن رکھئے، اس میں ایمان کی بڑی حفاظت ہے، اور ان کے لئے دعا کرتے رہئے کہ،

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُفٌ رَحِيْمٌ. (۱)

---

(۱) ا۔ تزکیہ و احسان یا سلوک و تصوف، ص ۹-۱۰

۲۔ دریائے کابل سے دیائے یرموک تک، ص ۱۰۹

۳۔ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، ص ۱۳۳ تا ۱۳۷ سے مشترک اخذ و تلخیص

زندگی سورہ العصر کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

"قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے"

جامع ترین سورت

یہ سورت قرآن شریف کی مختصر ترین لیکن جامع ترین سورتوں میں ہے، یہاں تک کہ اسلام کے جلیل القدر ائمہ اربعہ یعنی چار بڑے اماموں میں سے ایک بڑے امام حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ ہے (بعض کتابوں میں دیکھا) کہ اگر قرآن مجید میں سے کوئی چیز سوائے والعصر کے نازل نہ ہوتی، تب بھی یہ کافی تھی یہ ایک دستور العمل ہے مسلمان کی زندگی نہیں بلکہ انسان کی زندگی کا صحیح دستور العمل ہے، جو آسمان سے نازل ہوا ہے، ایک روایت میں دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب ملتے تھے اور دیر تک ساتھ رہتے تھے تو جدا ہونے سے پہلے والعصر سنا دیا کرتے تھے، اس

لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی ملاقات کو مفید سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مواخذہ نہیں ہوگا کہ جس کا اختتام کسی پیغام اور کسی مفید کام پر ہو، دعوت پر ہو۔

زمانہ گواہ ہے

اس سورہ کا آغاز "والعصر" سے ہے، یعنی زمانہ گواہ ہے...... اس لئے کہ جو بات کہی جانے والی ہے اس کا تعلق زمانہ سے ہے، اس کے لئے بہترین گواہ زمانہ اور تاریخ ہو سکتی ہے، اس انسان کے متعلق کہا گیا ہے، جو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اور جب تک خدا کو منظور ہے وہ رہے گا، تو کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا، بڑی سے بڑی مقدس ہستی سے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ:- "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" اور آنحضرت ﷺ جو محبوب رب العالمین ہیں اور آخری پیغمبر ہیں آپؐ کے متعلق کہہ دیا گیا "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ" اور "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِمَّاتَ أَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ" کسی کو بھی دنیا میں رہنا نہیں ہے، ایسا گواہ کہاں سے لایا جائے جو دیکھتا چلا آرہا ہے اور دیکھ رہا ہے اور دیکھتا رہے گا، تمام واقعات کا شاہد ہے، کامیابوں کا بھی اور ناکاموں کا بھی، اور کبھی بڑے سے بڑے فاتحین اور کشور کشاؤں، اور اپنے زمانے کے ان لوگوں سے لے کر جن لوگوں کی خوش نصیبی کی قسم کھائی جاتی تھی، ان کی اقبال مندی ضرب المثل تھی، ان سے لے کر دنیا کے ناکام ترین انسانوں تک، تمام طبقات انسانی کو، اور جماعت انسانی کو دیکھتا رہا، اس لئے آغاز اس سے ہوا (العصر) سے کہ زمانے کی گواہی ہے، زمانہ شاہد ہے۔

چونکا دینے والا جملہ

پھر اس کے بعد وہ جملہ کہا گیا جو ذی ہوش انسانوں کو سب سے زیادہ چونکا دینے والا ہو، "الارم" جس سے انسان کے کان کھڑے ہو جائیں، اور انسان سارے کام کو چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو جائے، وہ بات کہی گئی ہے، انسان کی فطرت میں ہے، فائدے کی خواہش اور اس دنیامیں جو کچھ ترقی شروع ہوئی ہے، جو کچھ رونق ہے...... جو آپ بہار دیکھ رہے ہیں، یہ سب رہین منت ہے اس بات کا، نتیجہ ہے اس بات کا کہ انسان کی فطرت میں فائدے کی خواہش ودیعت ہے یہ دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے، اسی نے تمدن کو ترقی دی، علم وصنعت کو ترقی دی، فلسفے کو ترقی دی، علم وصنعت کو ترقی دی، فلسفے کو ترقی دی، معرفت کو ترقی دی، انسان کے باطنی کمالات کو ابھارا، انسان کی اندرونی طاقتوں کو مہمیز کا کام دیا، انسان کے اندر سے اگر فائدے کی خواہش نکال دی جائے تو انسان بجھ کر رہ جائے اور انسان ہی بجھ کر نہ رہ جائے بلکہ یہ دنیا جو آپ کو اتنی روشن نظر آرہی ہے یہ بجھ کر رہ جائے، دنیا کی جو آب وتاب ہے، جو فروغ ہے، سرگرمی ہے۔ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ انسان فائدہ چاہتا ہے، انسان کا دل اگر فائدے کی طرف سے سرد ہو جائے، اس کے اندر سے فائدے کی خواہش نکل جائے تو کچھ بھی نہ ہو، نہ وہ اپنی جگہ سے ہلے، نہ جائے نہ آئے، نہ تجارت کی سرگرمی رہے، نہ فتوحات کی جدوجہد باقی رہے۔

یہاں پر وہ جملہ کہا گیا ہے جو حقیقت میں ایسا ہے کہ اگر سوتے ہوئے انسانوں کے سامنے بھی کہا جائے تو ان کو جاگ جانا چاہئے، اور سارے کام کو چھوڑ کر

اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے، جیسے خطرے کی گھنٹی بجائی جاتی ہے، جیسے زور کی چٹکی لے لی جاتی ہے کہ سوتے ہوئے آدمی کے پہلو میں آپ چٹکی لے لیں تو وہ تلملا کر بے چین ہو کر اٹھ جاتا ہے، "إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ" سے بڑھ کر کوئی چیز، کوئی نوٹس، اپنی طرف متوجہ کرنے والا نہیں کہ بے شک انسان نقصان میں رہنے والا ہے، "الانسان" کہا کہ ہر زمانے کے، ہر حیثیت کے اور ہر طبقے کے لوگ نقصان میں رہنے والے ہیں کسی کا استثناء نہیں، یہ جملہ ایسا ہے کہ فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

اگر دو صفتیں پائی جائیں

اس کے بعد فرمایا:-

"إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" سوائے ان لوگوں کے جن کے اندر دو صفتیں پائی جائیں، ایک ایمان...... جس کا تعلق حقائق سے ہے اور ذہنی تحصیل سے ہے، اور ایک "عملوا الصالحات"...... جس کا تعلق قلب، ذات، اخلاق اور عمل سے ہے، ان دو کے علاوہ سب نقصان میں رہنے والے ہیں۔

یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی یہ کہے (چونکہ زمانہ زیادہ مناسب حال نہیں ہے ورنہ بات زیادہ سمجھ میں آتی) کہ انسان برف کا تاجر ہے، برف کا سوداگر ہے برف کا STOCKIST ہے، برف گھل جانے والی ہے، تو کہا گیا کہ اگر یہ برف جلدی بیچ نہ لی گئی، یہ برف حیات جو ہے، یہ زندگی جسے ہم قائم ودائم سمجھتے ہیں، یہ بھی پگھلنے والی ہے اگر جلدی آپ نے بیچ کر دام نہیں جمع کر لیا تو یہ پانی ہے سب پانی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ صبح سے برف کی دوکان کھول کر بیٹھیں یا برف کی مل ہی صحیح، دوکان نہ صحیح سب

سے بڑا STOCKIST شہر میں جو ہو سکتا ہے برف کا، تو اگر وہ بیٹھا رہا، سوتا رہا، باتیں کرتا رہا، تفریح میں وقت گذار دیا تو برف انتظار نہیں کرے گی۔ یہ برف پگھل کر پانی ہو جائے گی، اور ساری محنت پر اور سارے سرمائے پر پانی پھر جائے گا، یہی پانی نہیں ہو گی بلکہ پانی پھیر دے گی، انسان کی زندگی کا حال بھی یہی ہے کہ جلدی سے اس نے دام وصول نہیں کیے، اگر جلدی زندگی سے فائدہ نہیں اٹھالیا، جلدی زندگی سے معاوضہ نہیں لے لیا، جلدی سے زندگی کو قیمتی نہیں بنالیا تو یہ برف ہے، گھل جائے گی، اس کو قائم رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔

فرمایا کہ انسان نقصان میں رہنے والا ہے، بلکہ زیادہ تر وہ انسان ہیں جو سب کے سب برف کے سوداگر ہیں، اور زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو خیال نہیں کر رہے ہیں، کہ برف اپنا کام کر رہی ہے، برف اپنی فطرت پر چل رہی ہے، جیسے برف گھلتی ہے پگھلتی ہے، زندگی بھی رواں دواں ہے جو سانس باہر جاتی ہے وہ زندگی کے رقبے کو کم کرتی ہے، زندگی کی وسعت کو محدود کرتی ہے، آپ سوتے میں بھی برابر سانس لیتے ہیں اور جاگنے میں بھی، تو آپ برف کو پگھلا رہے ہیں، آپ نے اگر جلدی سے اس میں بقا کی صورت نہ پیدا کی، اس کی قیمت نہ وصول کی، تو ایسے تاجر سے بڑھ کر کوئی دیوالیہ اور ناکام تاجر نہ ہوگا۔

فرمایا کہ "إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ" کہ سب انسان برف کے تاجر ہیں اور برف کے مالک ہیں، ان کی زندگی برف، ان کی جوانی برف، ان کی طاقت برف، ان کے اعضاء برف، سب کے سب برف کی طرح جواب دے جانے والے، ٹھنڈے پڑ جانے والے ہیں، آپ کہتے ہیں خود یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ انسان ٹھنڈے

ہو گئے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے، فلاں آدمی سرد ہو گیا، یہ تو محاورے کے طور پر استعمال کرتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان پگھلنے والا، گھلنے والا اور بہنے والا ایک سیال مادہ ہے، ایک رقیق مادہ ہے کہ کہیں اس کا ٹھہراؤ نہیں اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ جلدی اس کو وصول کر لیجئے، جلدی اس کو محفوظ کرا لیجئے، کہیں اس کا کوئی بینک ہو تو وہاں اس کو محفوظ کرا لیجئے، کہیں اس کے دام کھرے کر لیجئے، قیمت وصول کر لیجئے، ورنہ یہ زندگی فانی ہے۔

زندگی کی اصل طاقت و قیمت

جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک فنا ہونے والی چیز ہے، زندگی ختم ہونے والی چیز ہے، تو اب اس کا دام کیا ہے، یہ کہ اس کی اندر یہ صفتیں پائی جائیں جو اس کے خالق نے جس نے اس کو برف بنایا ہے، جس نے اس کو سیال اور رواں دواں بنایا ہے، وہی بتائے کہ اس کے دام کیا ہیں، اسی سے اس کے دام حاصل کئے جائیں، اس لئے کہ کوئی چیز بھی ہو، جب تک کہ اس کی جو اصلی قیمت ہے، اس چیز کا جو اصلی جوہر ہے جب تک کہ اس کے دام نہ معلوم کئے جائیں اس کا کوئی فائدہ نہیں، مثلاً آپ ہیرے جواہرات کے تاجر ہیں لیکن ایسے عوام کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں کہ جو جانتے نہیں، اس کی قیمت پہچانتے نہیں تو عمر گذر جائے گی ایک آدمی بھی خریدار نہ ہوگا، اور آپ سے کچھ لے کر نہیں جائے گا، تو اسی پوچھنا چاہئے کہ اس کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟

تو بتایا جا رہا ہے "إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" ہم اس کو خریدتے

ہیں، اس زندگی کو میں نے تجارت کی مثال دی، اور بیچنے والے کی! یہ قرآن کی تعبیر ہے "إِنَّ اللهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا سودا کر لیا ان کی جانوں کا اور مالوں کا جنت کی قیمت میں، جنت کے عوض میں، وہ مشتری (خریدار) ہے، ہم بائع (بیچنے والے) ہیں، ہم برف کے تاجر اور وہ خریدار، تو وہ بتائے کہ ہم اس پر خریدتے ہیں، یہ ہماری شرط ہے جب ہی تو سودا بک سکتا ہے، ورنہ سودا بک نہیں سکتا۔

تو وہ کہتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح! تو ایمان اور عمل صالح ہے، جو زندگی کو قیمتی بناتا ہے، ورنہ یہ بالکل پانی ہے، پانی کی طرح بہہ کر بالکل ختم ہو جائیگی، کروڑوں نہیں اربوں انسانوں کی زندگی پانی کہ طرح بہہ کر چلی گئی، کچھ بھی وصول نہیں کیا انہوں نے اور ان میں بڑے بڑے بادشاہوں، بڑے بڑے قانون ساز، ذہین ترین انسان، چوٹی کے ادیب، شاعر اور موجد، صناع اور کشور کشا سب شامل ہیں کہ انہوں نے زندگی کی قیمت نہیں سمجھی اور نہ زندگی کے بنانے والے سے پوچھا کہ میں اس کو کس طرح سے قیمتی بناؤں۔

ایمان اور عمل صالح لے کر آؤ

"إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" ایمان اور عمل صالح ہے جو اس زندگی میں قیمت پیدا کرتا ہے، ہم جو اس زندگی کے بنانے والے ہیں۔ "أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" ہم بنانے والے ہیں، ہم تم سے کہتے ہیں، اور کوئی

کیا کہے گا، یہ اللہ کا کرم ہے کہ اسی کی زندگی تھی اور وہی اس کی قیمت بتا رہا ہے کہ دیکھو ہمارے یہاں اس زندگی کا دام یہ ہے، ہمارے یہاں اس زندگی کی قدر و قیمت یہ ہے، کہ ہمارے یہاں ایمان اور عمل صالح لے کر آؤ، تم کہو کہ ہم نے یہ بنایا، یہ بنایا اتنی کوٹھیاں، اتنی موٹریں، اتنے نوکر اتنے بڑے بڑے عہدے، اس کی ہمارے یہاں کوئی قیمت نہیں، ہمارے یہاں قیمت ایمان اور عمل صالح کی ہے، اس کی بڑی عنایت ہے کہ زندگی اسی نے دی اور زندگی کی قیمت بھی اسی نے بتادی (FIX) کردی، مقرر کردی، متعین کردی...... ورنہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جو ضائع ہو رہی ہیں، کیونکہ ان کی قیمت کا تعین نہیں ہوا، کسی نے جانا نہیں، سمجھا نہیں کہ اس کی کیا قیمت ہے، کتنی چیزیں ہیں کہ آدمی اس کو بناتا ہے لیکن اس کو حاصل نہیں کرسکتا ہے اس لئے کہ لوگوں نے مانا ہی نہیں، تسلیم ہی نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" اگر یہ دو صفتیں پائی جائیں گی، تو تم خطرے سے بچ جاؤ گے "خسر" نقصان سے بچ جاؤ گے۔ لیکن فرد تو بچ جائے گا معاشرہ اب بھی خطرے میں ہے جو فرد اپنے اندر یہ دو صفتیں پیدا کرے گا ایمان اور عمل صالح کا وہ تو بچ جائے گا، ناجی ہوگا، وہ کامیاب ہوگا، لیکن معاشرہ اب بھی خطرے میں ہے، سماج اب بھی خطرے میں ہے، اس کے بچنے کی صورت کیا ہے؟

معاشرہ خطرے میں ہے

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" فرد یہ کام بھی کرے کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرے، اگر اس نے یہ نہ کیا تو وہ

معاشرہ بھی ڈوبے گا اور یہ فرد بھی ڈوبے گا، جس معاشرے میں تواصی حق اور تواصی صبر نہیں ہے یعنی ایک دوسرے کو حق کی تلقین نہیں کی جاتی، خود بہت اچھے مرد صالح اور نیک سیرت ہیں، عابد و پرہیزگار ہیں لیکن کسی سے بھی نہیں کہتے، اپنے گھر والوں سے نہیں کہتے، بچوں سے بھی نہیں کہتے کہ تم نماز پڑھو، تم بھی نہیں کہتے کہ تم بھی برائیوں سے بچو، تم بھی ظلم سے بچو، تم بھی کرپشن CORRUPTION سے بچو، تو وہ معاشرہ سڑ جائے گا اس میں فساد پھیلے گا، اور پھر وہ معاشرہ بھی جائے گا اور یہ فرد بھی جائے گا۔

یہ فرد اپنی حد تک خطرے سے نکلا تھا، لیکن چونکہ معاشرہ اب بھی خراب ہے، اس لئے وہ فرد بھی نہیں بچ سکے گا، تو فرمایا کہ یہ چیز متعدی ہونی چاہئے، یعنی کہ تمہارے اندر ایمان و عمل صالح کی صفت پیدا ہوئی ہے۔ اب تمہارے اندر سے یہ کرنٹ نکلنا چاہئے، یہ روشنی تم سے پھیلنی چاہئے، معاشرے تک جانی چاہئے، تاکہ معاشرے کے دوسرے افراد جو ہیں وہ بھی تمہارے اس راستے پر آئیں، اگر وہ نہ آئے تو تمہارا بھی اس پر قائم رہنا مشکل ہو جائے گا، تمہیں بھی اس پر استقامت مشکل ہو جائے گی، اس لئے کہ جو معاشرہ فاسد ہوتا ہے، جو ماحول فاسد ہوتا ہے اس میں بڑے سے بڑے صالح انسانوں کا بھی دم گھٹنے لگتا ہے اور ان کو بھی اپنے اس صحیح راستے پر رہنا مشکل ہو جاتا ہے، ایک وقت ایسا آتا ہے، وہ معاشرہ اتنا فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ صالح کو برداشت نہیں کر سکتا جیسے کہ کسی کی سانس روک دی جائے، منھ پر ہاتھ رکھ دیا جائے تو اس میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اس کی جان پر بن آتی ہے، اور دم گھٹنے لگتا ہے۔

ایسے ہی معاشرہ خراب ہوتے ہوتے اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ صالح انسان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا، کچھ کہتا نہیں، لیکن وہ معاشرہ کہتا ہے "اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ" ایک معاشرہ ایسا بگڑا تھا اس میں ایک خاص طرح کی گراوٹ ایسی پیدا ہو گئی تھی، حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والے راستہ نہیں روکتے تھے، کچھ کہتے نہیں تھے، ان میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی، حالانکہ انھوں نے کہا بھی "آوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ" کوئی ہوتا کہ جس کی میں پناہ لیتا، وہ اتنا کمزور تھا لیکن معاشرہ اس کمزوری کے باوجود بھی برداشت نہیں کر سکا، کہتا ہے کہ نکالو ان کو، یہ بڑے پاکباز ہیں، تو جب معاشرہ ناپاک ہوتا ہے تو پاک باز کو دیکھنا اس کے برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہم سے آکر بہت سے بھائی کہتے ہیں کہ میں رشوت نہیں لیتا، بعض تبلیغی احباب ہیں بعض اور بھی ہیں جو کہتے کہ ہم رشوت نہیں لیتے۔ یہی ہمارا جرم ہے، اور ہمارا ماحول جو ہے، ان دنوں جو آفس ہے دوسرے ڈیپارٹمنٹ ہیں وہ ڈپارٹمنٹ ہمیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، ہم کھٹکتے ہیں جیسے آنکھ میں کوئی چیز پڑ جائے تو ان کو آرام نہیں ملتا، کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، ایسے ہی معاشرے کی حس جو ہے وہ برداشت نہیں کر سکتی، بھائی ہم آپ کو کیا دے سکتے ہیں، ہم خود ہی نہیں لیتے، بلکہ آپ ہمارا حصہ بھی لے لیجئے گا، ہم اس میں حصہ لگانے کے لئے تیار نہیں، آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہے، تو انہوں نے کہا کہ فائدہ و نقصان نہیں، ہم تمہیں دیکھ نہیں سکتے، وجہ کیا ہے کہ ان کو دیکھنے سے خدا نے جو انسان کے اندر ایک چیز ودیعت کی ہے، ملامت کرنے کی کارشپ جو ہے، وہ کارشب

کسی کسی وقت بیدار ہوتی، تو اس کا تو موقع ہی نہ آئے یعنی کوئی ایسا آدمی نہ آئے کہ اس کو دیکھ کر کے ہمارا دل ہم کو ملامت کرے، تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ کھٹک بھی دور ہو جائے۔

دعوت بھی ضروری ہے

قرآن شریف نے...... متنبہ کر دیا کہ صرف ایمان اور عمل صالح کافی نہیں بلکہ دعوت بھی ضروری ہے، اس لئے کہ اگر یہ دعوت نہ ہوئی تو معاشرہ اتنا بگڑے گا کہ تم اپنے ایمان اور عمل صالح پر قائم نہ رہ سکو گے، اس لئے تم...... ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ تَوَاصِیْ بِالْحَقِّ اور تَوَاصِیْ بِالصَّبْرِ کی ایک دوسرے کو تلقین کرو جہاں بیٹھو نیک بات کہو، خدا ترسی کی بات کہو، دین کی طرف دعوت دو، فرائض کی پابندی کی طرف دعوت دو، منہیات و محرمات سے بچنے کی دعوت دو، اور جب حق کی دعوت دو گے، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے کہا کہ "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" پھر جب حق کی دعوت دو گے تو مخالفت ضرور ہو گی، قربانی دینی پڑیگی، نقصانات سامنے آئیں گے، اب صبر کی ضرورت ہو گی، اس لئے تواصی بالحق بھی کافی نہیں کہ ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی تلقین کرلو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ صبر کی بھی تلقین کی ضرورت ہے کہ بھائی یہ ایسا آسان راستہ نہیں ہے جب تم صحیح راستے پر چلو گے تب مخالفین ہوں گے، نقصانات کا اندیشہ ہوگا۔ اس وقت صبر کی ضرورت ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ دستور العمل ہے زندگی کا، مکمل متواتر ہر جز دوسرے کو سہارا دیتا ہے، ہر جز دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، ہر جز دوسرے کے لئے ضروری ہے ، ایمان کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں۔

عبد و معبود کا صحیح تعلق

اصل چیز ہے عبد و معبود کا تعلق صحیح تعلق، اس تعلق کی تصحیح کہ وہ خدا ہے جو دنیا کو بنانے والا، چلانے والا "له الخلق والأمر" بنایا بھی اسی نے اور چلا بھی رہا ہے وہ، وہ ایسا نہیں کہ ریٹائرڈ ہو گیا ہو، جیسا کہ بہت سے مذاہب میں ہے کہ خالق کا یقین ہے، وہ الوہیت کو مانتے ہیں، لیکن وہ چلا بھی رہا ہے، اب بھی اس سے واسطہ ہے، اس کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے، اس کو نہیں مانتے، خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہے، جو کوئی عملی تعلق خدا سے نہیں رکھتا، اس کا ایک تاریخی تعلق ہے اس دنیا کے بارے میں کہ کبھی اللہ نے اس دنیا کو بنایا تھا، اس کائنات کی تکوین کی تھی، بس پھر آزاد ہے، بقیہ فلاں شعبہ فلاں کے پاس اور فلاں شعبہ فلاں کے پاس ہے، نفع و ضرر دوسروں کے پاس ہے، یہ ہے بات۔

پہلے تو عقیدے کی تصحیح، تمام نبوتیں اور تمام انبیاء کرام، تمام آسمانی صحیفے اور وہ دعوت جو صحیح منہاج پر ہوگی، جو دین کی صحیح روح کے ساتھ ہوگی، وہ پہلے عقیدے کی تصحیح پر اقرار کرے گی، اس میں مروت نہیں۔...... CHARCTER تو بہت اچھا (CONDUCT) تو بہت صحیح ہے، ہمارا طرز عمل تو بہت ٹھیک ہے، ہم کوئی برا کام نہیں کرتے، تو پھر کیوں جہنم میں جائیں گے، پھر ہم کیوں گمراہ ہیں؟

پہلی چیز، سب سے پہلا مطالبہ جس چیز کا ہے، وہ یہ کہ بندہ اپنے کو بندہ سمجھے، خدا کو اس کائنات کا خالق، مالک، اور حاکم سمجھے، پھر اس کے بعد "عملوا

الصالحات" اوراس کا معیار وہی ہے جو شریعت مقرر کرتی ہے، یہ عمل صالح ہے، یہ عمل صالح نہیں، اس کا فیصلہ ہم یا آپ، یا قانون ساز، یا ذہین لوگ، یا قانون داں نہیں کرسکتے، بلکہ جس کو دین کہے، نبوت کہے کہ یہ عمل صالح ہے، تو وہ عمل صالح ہے، جس کو وہ کہے کہ یہ عمل صالح نہیں ہے تو بس۔(۱)

(۱) ماخوذ از تعمیر حیات ۱۰ر مئی ۱۹۸۴ء (جلد ۲۱، شمارہ ۱۳)

نعمت اسلام کی قدر کرو

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.

(سورہ آل عمران۔ ۱۰۳)

اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

آیت کریمہ میں عظیم نعمت کا ذکر

یہ آیت کریمہ ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے دلوں پہ نقش رہنی چاہئے، اس آیت میں اس عظیم نعمت کا ذکر ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو سرفراز فرمایا ہے۔

ہم سب جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، نہ توحید و نبوت سے واقف تھے، نہ حشر و نشر کی خبر تھی، اخلاقی قدروں سے یکسر نا آشنا، اور صحیح مذہبی تعلیمات

سے قطعاً بے بہرہ تھے، اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، مظالم و جابر حکومتوں کے جور و استبداد کا شکار تھے، انسانیت ہر طرف پامال ہو رہی تھی۔

ایک طرف مطلق العنان حکمراں، دوسری طرف علم و مذہب کے اجارہ دار علماء معبود بنے بیٹھے تھے، عوام ان کی پرستش، اور اندھی اطاعت پر مجبور تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللهِ. (التوبہ۔۳۱) انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے۔

اسلام آیا، اور اس کی ضیا پاشیوں نے روئے زمین کے گوشہ گوشہ کو منور کیا، اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لئے عام تھی، وہ اس بارش کی طرح تھی، جو سپید و سیاہ اور بندۂ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی، وہ تو بادل تھا، جو پست و بلند، گلشن و صحراء سب کو سیراب کر گیا، اور حق تو یہ تھا، کہ اسے عربی شاعر کے اس قول سے مخاطب کیا جائے؎

فاذهب كما ذهبت غوادی مذنة
أثنى عليها السهل والأوغار

ایک فارسی شاعر کا قول ہے، جو زیادہ بلیغ ہے؎

پرتو مہر بویرانہ و آباد یکیست
حسن چون تیغ کشدہ بندہ و آزاد یکیست

اس نعمت سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں، یہاں تک کہ زندگی بھی جو ہزار لذت و سرور کا سرچشمہ ہے، اگر اسلام توحید خالص، اور ایمان کی نعمت نہ ہوتی، تو یہ زندگی ایک عذاب مسلسل ہوتی، اور اس کی حیثیت جہنم تک پہونچنے کے لئے ایک پل سے زیادہ

نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے ہمیں نوازا، اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اور اس نعمت کے حصول میں ہم پر نبی ﷺ کی ذات گرامی، اور آپ کی بعثت ورسالت اور دعوت وجہاد کا ناقابل فراموش احسان ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً ....

اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، "فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ" اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل ملادیئے "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا" تم اللہ تعالیٰ کے احسان وفضل سے بھائی بھائی بن گئے، بتاؤ کہاں اس طرح بڑا اور چھوٹا، امیر غریب صدر اور عام شہری کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھتا ہے، ہے کوئی جگہ دنیا میں ایسی کہ جہاں محمود وایاز کی تفریق نہ ہو؟ جب مسجد میں گئے سب ایک ہوگئے، تو "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا".

آج تاریخ میں ان جھگڑوں کا پورا ریکارڈ نہیں ہے، جو جھگڑے پہلے دنیا میں پائے جاتے تھے، نسل کے جھگڑے، رنگ کے جھگڑے، بڑے چھوٹے کے جھگڑے، طبقات کے جھگڑے، امیر وغریب کے جھگڑے، زمیندار اور کسان کے جھگڑے، زبانوں کے جھگڑے، تمدنوں کے جھگڑے، یہ سارے جھگڑے دنیا میں تھے، اور ایک دوسرے کا خون بہایا جارہا تھا "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا."

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَكُنتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا" تم جہنم کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو صاف بچالیا، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، اگر یہ دین نہ آتا، اگر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو مبعوث نہ فرماتا، اگر خدا کے آخری نبی ﷺ نہ آتے تو ہمارے جہنم کے گڑھے میں پھاند پڑنے، کود پڑنے، جست لگانے میں کوئی کسر باقی نہیں تھی۔

آج آپ دیکھئے دنیا میں کیسے بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے دانشور، کیسے بڑے بڑے اسکالرس، حکومتوں کے کیسے کیسے سربراہ، اسلام کی جیسی عام فہم (COMMON SENSE) سمجھ میں آنے والی چیز کے سمجھنے سے محروم ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اور آپ کو اسلام کی دولت نصیب فرمائی، اس اسلام کے ۔مقابلے میں کسی متوازی (PARALLEL) چیز کے فلسفہ، کسی تحریک، قومیت کے کسی نعرہ، کسی عصبیت کی دعوت کا اثر نہیں پڑنا چاہئے، بخاری شریف کی حدیث ہے "ثلاث من جمعهن فقد استكمل الإيمان" تین باتیں ہیں، اگر کسی شخص نے ان کو جمع کر لیا تو اس کا ایمان مکمل ہو گیا، "ان يكون الله ورسوله احب إليه مماسواهما" ایک یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوی اللہ سے زیادہ محبوب ہوں، اللہ ورسول کے علاوہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، سب سے زیادہ اللہ رسول محبوب ہوں، اور ایک یہ کہ "وإن يكره أن يعوده إلى الكفر كما يكره أن يقذف فى النار" اس خیال سے کہ وہ کفر کی طرف واپس جاسکتا ہے اس کو ایسی تکلیف محسوس ہو، ایسی وحشت محسوس ہو جیسے کسی کو آگ میں پھینک دیئے جانے سے محسوس ہوتی ہے، بالکل طبعی وجسمانی (PHYSICAL) طریقہ پر، وہ اگر خواب میں دیکھ لے کہ وہ کوئی کفر کا کام

کررہاہے،اسلام کو نقصان پہونچانے والا کوئی کام کررہاہے،وہ کسی سازش کا شکار ہو گیاہے،وہ اللہ ورسولؐ کے خلاف کسی اور جھنڈے کے نیچے جارہاہے تو اس کی چیخ نکل جائے ،سارے گھر کے لوگ جمع ہو جائیں اور کہیں خیریت ہے؟خیریت ہے؟آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟ تو وہ کہے کہ ڈراؤنا خواب،ڈراؤنا خواب؟کیا چیز ہے؟میں نے ایسا برا خواب دیکھا کہ اللہ پھر کبھی نہ دکھائے، میں نے دیکھا کہ میرے گھر میں کفر کی پرچھائیں آرہی ہیں،کفر کا سایہ آرہاہے۔

دنیا کی سب سے بڑی نعمت

ہم کو............اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اللہ نے ہم کو کیا دولت عطا فرمائی ہے،کلمہ نصیب ہونا،اللہ اوراس کے رسولؐ پر صحیح طور پر ایمان اور توحید کی دولت کا نصیب ہونا،یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے، ہفت اقلیم کی سلطنت کلمۂ شہادت پر قربان کر دینے کے قابل ہے،ایمان کی قیمت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کی سلطنت ایک طرف رکھی جائے،اور مسلمان سے کہا جائے کہ یہ سلطنت تم کو مل سکتی ہے،لیکن ایمان سے محروم ہونا پڑے گا،تو اس کی چیخ نکل جائے،وہ یک لخت بے ہوش ہو جائے کہ مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا،کہ یہ کہا جارہاہے کہ تم کو سلطنت دی جائے گی،ایمان لیا جائے گا۔

اس لئے کہ ہر طرف ناکہ بندی ہے،ساری راہیں مسدود،اور سارے دریچے بند ہیں صرف اسلام کا راستہ ہے،اور صرف ایک دریچہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے کھول رکھاہے،ارشاد ہے:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامِ. (آل عمران:۱۹)

بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

امت اسلامیہ کے اندر جب تک اس حقیقت کا عرفان رہے گا اور جب تک اس اصول کو وہ مضبوطی سے تھامے رہے گی بے راہ نہیں ہو سکتی، اور نہ مصائب و مشکلات کا شکار ہو سکتی ہے۔(۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از ۱۔ تحفہ مشرق، ص ۴۴ تا ۴۸
۲۔ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، ص ۱۱۷ تا ۱۲۲

اجتماعی ذہن اور قربانی وایثار کا جذبہ

وَلَا تُلقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ. (اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو)
(البقرہ:)

مسلمانوں کا ذہن اجتماعی ہونا چاہئے

اپنے ذہن کو اجتماعی بنائیے، صرف اپنے مفاد کو سوچنا کہ ہمیں فائدہ ہو جائے دین پر کچھ گزر جائے، ملت پر جو کچھ گزر جائے ہم سب کی فکر کیا کر سکتے ہیں، اس ذہن نے بڑا نقصان پہنچایا ہے، دیکھئے تو قرآن شریف میں آتا ہے "وَلَا تُلقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ." اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ اس کو بہت سے لوگ ایسے پڑھ لیتے ہیں جیسے "وَلَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ" نماز کے قریب نہ جاؤ۔ بعض بے حیا، ناخدا ترس لوگ اس طرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں صاحب! قرآن شریف میں تو ہے کہ نماز کے قریب نہ جانا۔ "لَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ".

اس طرح بدنیتی کے ساتھ تو نہیں لیکن بعض ناواقفیت کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ان کو ہر خطرہ کے کام سے بچایا گیا ہے۔ ان کو جہاں کہئے ذرا تبلیغ میں چلئے، کچھ خطرہ

مول لیجئے، اپنی تجارت کے لئے کہتے، ہیں وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ. قرآن شریف میں ہے اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ کوئی ایسا کام نہ کرو۔ جان بوجھ کر جس میں تمھیں نقصان پہنچے۔ حالانکہ اس آیت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا بالکل اس کے برخلاف ہے۔

چنانچہ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر ایسا ہی سنا تھا۔ فرمایا ٹھہرو ٹھہرو تم نہیں جانتے یہ آیت تو ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اس کی تفسیر تو ہم سے پوچھو، تم کیا جانو، قصہ یہ ہے کہ جب اسلام مدینہ میں آیا کمزور تھا، کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ تھا تو ہم انصاریوں نے اس کا ساتھ دیا اور اپنی جان ومال کے ساتھ دیا اور اپنے تقاضوں سے آنکھیں بند کرلیں، بس ہر وقت اسلام کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے، میدان جنگ میں کہا جائے تو وہاں تبلیغ کے میدان میں کہا جائے تو وہاں اور مال خرچ کرنے کو کہا جائے تو ہم حاضر، غرض کہ ہم نے پھر مڑ کر نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے کھیتوں اور ہمارے باغوں کا کیا حال ہے۔ ہماری دوکانوں کا کیا حال ہے، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ اب اللہ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد خاصی ہوگئی ہے اور اب اسلام ایسا گھرا ہوا اور میدان میں نہتا اور بے یار ومددگار نہیں ہے اور دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ ہمارے مالوں پر، ہماری جائیدادوں پر بہت اثر پڑ گیا ہے اور تجارتیں ماند پڑ گئی ہیں، کساد بازاری میں ہم مبتلا ہوگئے ہیں، دوکانوں کے دیوالیے نکلنے لگے ہیں، اور باغات خشک ہونے لگے ہیں، فرصت ہی نہیں ہم کو، تو ہم نے کہا اب ہم تھوڑے دن کی چھٹی لیں، مستقل آزادی یا مستقل چھٹی نہیں، بلکہ تھوڑے دن کی چھٹی لے لیں، سپاہی کو چھٹی ملتی

ہے، طالب علم کو چھٹی ملتی ہے، استاد کو چھٹی ملتی ہے، ہم بھی چھٹی لیں گے۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی ابھی شاید کہنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ آیت نازل ہوئی، ارے کیا کرتے ہو؟ اس وقت جب دین کو تمہاری مدد کی، تمہاری خدمت کی اور تمہاری جاں نثاریوں کی ضرورت ہے تم چھٹی کا نام لیتے ہو، یہ چھٹی سمِ قاتل ہے، یہ چھٹی خود کشی کے مرادف ہے فرمایا گیا۔ "وَاَنْفِقُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ." یہ پوری آیت ہے۔ اب لوگوں نے فتووں تک میں لکھنا شروع کر دیا۔

ملت کے تقاضوں کو دیکھنا چاہئے

حج ایک زمانہ میں ہندوستان میں مشکل ہو گیا تھا، دریائی سفر، بادبانی کشتیاں اور بدوؤں کی لوٹ مار دیکھ کر بعض علماء نے فتویٰ دیدیا کہ حج ہندوستانی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہے۔ اور استدلال کیا اس آیت سے کہ "وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ" جان بوجھ کر ہلاکت میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور درجے بلند فرمائے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے شاگردوں اور ان کے خلفاء کے کہ انھوں نے اس کے خلاف مہم شروع کی اور فتویٰ لکھا اور پھر ان کے بعض خلفاء نے، ان کے بھتیجے اور عزیزوں نے ایسی دھوم دھام سے حج کیا کہ پھر یہ خیال ہی لوگوں کے دلوں سے نکل گیا، ورنہ خدانخواستہ ہندوستان میں اس کی عادت پڑ جاتی کہ بھائی سمندر کا سفر خطرناک ہے اور حج ہمارے ذمے سے ساقط ہے تو آج حج اور کل زکوٰۃ اور پرسوں روزہ، صلوٰۃ پر برا اثر ڈالتا ہے۔ وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی

التَّھْلُکَۃِ اور پھراس کے بعد نماز کہ اس سردی میں ٹھٹھر جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کریں یااس گرمی میں چھوٹی سی رات میں ہم نکلیں اور رات خراب کریں وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ تو سارا دین ہی معطل ہو کے رہ جائے۔ تو مسلمانوں کا ذہن انفرادی ہے اجتماعی ہونا چاہئے۔ یعنی ملت کے تقاضوں کو دیکھنا چاہئے کہ اگر ہر شخص صرف اپنے اپنے تقاضوں کو دیکھنے لگے تو دین کی خدمت کہاں سے ہو گی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ دین کا تقاضا ہے ہم یہ کہتے ہیں اپنے اپنے علاقہ کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کی مسجدوں کی خبر لیجئے، مدرسوں کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کی دینی تعلیم کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کے مسلمانوں کی عادتوں اور ان کے برے اخلاق کی خبر لیجئے، جن کی وجہ سے رحمت الٰہی رکی کھڑی ہے، گھنگھور گھٹا تلی کھڑی ہے۔ لیکن برستی نہیں کہ مسلمانوں میں تو یہ یہ عیب ہیں، مسلمانوں میں تو یہ جرائم ہیں، ان ان چیزوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، ان چیزوں کی خبر لیجئے...... یہ دین کا اجتماعی تقاضا اگر آپ پر طاری نہ ہوا تو ہندوستان جیسے ملک میں دین کا باقی رہنا مشکل ہے۔

خطرناک ذہنیت

اگر اجتماعی ذہن نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا، کسی کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، سب اپنے اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہماری اولاد پڑھ جائے اور جلدی سے کام سے لگ جائے اور جلدی سے بڑی آسامی اس کو مل جائے اس کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ذہنیت ہے، اس ذہنیت نے قوموں کے

چراغ گل کردیئے ہیں، جہاں یہ ذہنیت طاری ہوئی وہاں کوئی سر پٹک کر رہ جائے، کوئی بڑے سے بڑا مصلح اپنی پوری زندگی صرف کردے کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ ذہنیت ہمارے ملک میں پیدا ہو رہی ہے اور موجود ہے کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں رہا، بس اپنا مفاد دیکھنا، اپنی خوشحالی کی، اپنے گھر کی، کاروبار کی، ترقی اور کامیابی کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں، ساری دقت اس وجہ سے پیش آرہی ہے کہ ذہن اجتماعی اور ملی نہیں ہے بلکہ ذہن انفرادی ہے، ذہن بالکل شخصی ہے......

ایک تو اس کی اصلاح ہونی چاہئے کہ ملت کے مسائل اور دین کے تقاضوں کا درد آپ اپنے دل میں پیدا کریں، اگر یہ نہیں ہے تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے، نہ کوئی انجمن کچھ کر سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ کچھ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مصنف اور واعظ اور مقرر کچھ کر سکتا ہے۔ خدا کرے آپ اتنی بات سے آگے کی بات سمجھ گئے ہوں۔

(ماخوذ از روداد چمن)

باب ۸

فرائض وذمہ داریاں

ہم، آپ، سب قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن مجید کو خدا کا معجزہ، رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ لیکن سب یہ حقیقت نہیں جانتے (اور اس حقیقت کے نہ جاننے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اس سے کہ علم کے درجے ہوتے ہیں) کہ قرآن مجید مجموعی اور کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔ یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت مستقل ایک معجزہ ہے اور اس کا اعجاز مختلف زمانوں میں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ نہیں، ہزاروں مرتبہ پڑھا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید آج ہی نازل ہوا ہے۔

اور یہ بات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیش آئی کہ آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو لوگوں میں ایک مایوسی (دوڑ گئی اور لوگوں کے قدم اکھڑے نہیں لیکن ہل گئے کہ اب کیا ہوگا اور اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دین کا مستقبل کیا ہے، یہ دین باقی رہے گا یا نہیں۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے یہ آیت صحابہ کرامؓ کے سامنے پڑھی کہ وہ کہتے تھے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی اور وہ یقین نہیں کرتے تھے کہ سارے دنیا کے مسلمان ہوئے بغیر کیسے رسول ﷺ دنیا سے تشریف لے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب یہ آیت پڑھی "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئاً. تو اچھے اور ممتاز صحابی کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے، یہ اسی موقعہ کیلئے تھی۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ.

(سورہ الانفال: ۷۳)

وزن واعتبار کے دو پیمانے

میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید روزانہ پڑھا جاتا ہے اور حسب توفیق بار بار اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے متعجب ہوتا ہے تو اس کا یہ تعجب ہمیشہ قائم نہیں رہتا، وہ زائل بھی ہو جاتا ہے لیکن میں اپنا حال آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں (اور اسی سے میں نے اپنی بات کہنے کا مضمون اخذ کیا ہے)

دنیا میں وزن واعتبار کے دو پیمانے ہیں، ایک قامت، دوسرے قیمت، لیکن اللہ تعالیٰ نے قامت پر قیمت کو ترجیح عطا فرمائی ہے۔ میں جب بھی سورہ انفال کی آخری یہ آیت:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ. اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ. (سورہ الانفال: ۷۳)

اور جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

پڑھتا ہوں تو دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہوں کہ یہ بات آخر کس سے کہی جارہی ہے؟ اس مٹھی بھر انسانی گروہ سے، اس چھوٹی سی جماعت کی تشکیل کچھ انصار سے (جو اپنے وطن میں تھے) اور کچھ مہاجرین سے (جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے) ہوئی تھی اور جن کی بڑی سے بڑی تعداد شمار کرنے کے بعد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں نکلی۔

خدا تعالیٰ ان کو اخوت و بھائی چارہ کی دعوت دے رہا ہے، مہاجرین کا انصار سے اور انصار کا مہاجرین سے ربط پیدا فرما رہا ہے، اور سچی اخوت کی روح ان میں بیدار فرما کر یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ ایک نئی اکائی بن جائیں، ایک ایسی اکائی جس کی بنیاد ایمان ویقین، کلمۂ لا الٰہ إلا اللہ کے اتحاد، انسانیت کے لئے ہمدردی ودل سوزی، اصول وعقائد پر پختگی پر قائم ہو۔

خدا تعالیٰ اس مختصر جماعت سے ارشاد فرما رہا ہے، کہ اگر تم نے اس کام میں کوتاہی کی، اس اخوت کے قیام میں تساہلی سے کام لیا، اور اس نئی اکائی کی تشکیل میں جس سے دنیا ناواقف ہے، اور تاریخ نے جس کو سیکڑوں سال سے بھلا دیا ہے، غفلت دکھائی، اگر تم نے اس اخوت میں کمزوری کا مظاہرہ کیا جو ایک عظیم وبلند پیغام سے مربوط ہے، اور اس اتحاد کو ناپائیدار بنایا جو سچی اور مخلصانہ اخوت پر قائم ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو روئے زمین پر فتنہ بپا ہو جائے گا اور زبردست فساد مچے گا۔

ذرا سوچئے کہ اس مختصر سی تعداد کی جو یثرب میں رہتی تھی (جس کو بعد میں مدینۃ الرسول ﷺ کے نام سے یاد کیا گیا) کیا حقیقت تھی؟ اس کی افرادی قوت کتنی تھی؟ سیاسی میزان میں اس کا کیا وزن تھا؟ بین الاقوامی اسٹیج پر اس کی کیا حیثیت تھی؟ سماجی، اقتصادی حتیٰ کہ علمی دنیا میں وہ کتنا وزن رکھتی تھی، تین مرتبہ ان کی مردم شماری کی گئی (جیسا کہ بخاری شریف میں اس کا تذکرہ آتا ہے) آخری بار مردم شماری میں ان کی تعداد ایک ہزار پانچ سو نکلی۔(۱)

امت اسلامیہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

ذرا غور فرمایئے کہ یہ بات کس سے کہی جارہی ہے؟ کیا ان رومیوں سے کہی جارہی ہے جو آدھی دنیا کے مالک تھے۔ اور سب سے بڑی حکومت اور اس کے سایہ میں پروان چڑھنے والی تہذیب اور تمدن اور سب سے بڑی جنگی، بین الاقوامی اور سیاسی قوت کے مالک تھے؟

کیا یہ ان ایرانیوں سے کہا جارہا تھا جنہوں نے رومن امپائر کے ساتھ آباد دُنیا کو مشترک طور پر تقسیم کر کے اس پر قبضہ جما رکھا تھا؟

یقیناً یہ رومی اور ایرانی ظاہری طور پر اس وقت انسانیت کی قسمت کے مالک بنے

---

(۱) صحیح بخاری، جلد ۱، صفحہ ۴۳۰ باب کتابۃ الامام الناس کتاب الجہاد، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انفال غزوۂ بدر کے زمانے میں نازل ہوئی، اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم رہی ہوگی جو اس آخری مسلم شماری کے نتیجہ میں نکلی۔

بیٹھے تھے، زندگی کی کشتی وہی چلا رہے تھے، تہذیب وتمدن کی باگ ڈور انھیں کی ہاتھ میں تھی، وسائل، ذرائع اور اسباب معیشت اور دنیا کے حالات پر (اگر یہ کہنا غلط نہ ہو) انھیں مکمل تصرف حاصل تھا۔

کیا ان سے کہا جارہا ہے؟

اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ. اگر یہ نہ کرو گے تو زمین میں (بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

ذرا اندازہ لگائیے اس لفظ "فتنة فی الارض" کی ہیبت کا، اس کے حجم کا، اس کے وزن اور وسعت کا، آیت میں صرف فساد نہیں کہا گیا، بلکہ "فساد کبیر" کہا گیا۔ یہ بات اس چھوٹی سی محدود جماعت سے کہی جارہی ہے جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور جن کے کاندھوں پر اسلام کے پیغام کا بوجھ رکھا گیا، اس چھوٹی سی افرادی قوت سے کہا جارہا ہے کہ اگر تم نے اسلامی و ایمانی اور انسانی اور عادلانہ اخوت قائم کرنے میں کوتاہی دکھائی اور اگر تم نے آپس میں اتحاد کے قیام میں غفلت کا مظاہرہ کیا اور اس اتحاد کو، ایمان، اخلاص، ایثار و قربانی اور فنائیت پر قائم نہیں کیا تو زمین میں فتنہ بپا ہو جائے گا اور زبردست فساد پھیل جائے گا۔

امت مسلمہ کا اس وقت کیا وزن تھا، جب وہ صرف سیکڑوں کی تعداد میں تھی، ہزاروں کی تعداد میں تھی، اس وقت ان سے یہ کہا جارہا ہے ان کو یہ وزن دیا جارہا ہے اور یہ قیمت اور دنیا کے نقشہ میں یہ حیثیت عطا کی جارہی ہے!

اس اعلان سے یہ صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ امت مسلمہ کی حیثیت اور وزن "قدر و قیمت" ہے نہ کہ "قد و قامت" اس کی حیثیت اور اس کا مقام اپنے ایمان،

عقائد، مکارم اخلاق، بیدار ضمیر اور جسم میں سرایت کئے ہوئے شعور و وجدان اور عقل و تدبر پر اثر ڈالنے والی اس بیتاب و بے چین روح سے ہے جو اس کو عطا کی گئی۔

امت اسلامیہ کی قیمت و اہمیت ان خصوصیات و صفات کی بنیاد پر ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نوازا ہے اس کے ہاں تعداد اور ساز و سامان کی کثرت کا اعتبار نہیں اور نہ اس کی مکانی مسافت کے طول و عرض کا جس پر اس کی حکومت کا سکہ چلتا ہے اور نہ اس زمانی مسافت کے طول و امتداد کا جس پر اس نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔

میں مسلمانوں کی اس جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو، اس پیمانہ سے ناپتا ہوں، میں اس کو اسلام کی اس خوردبین سے دیکھتا ہوں جو خدا کی عطا کردہ ہے۔

(کاروان زندگی حصہ سوم صفحہ ۹۹ تا ۱۰۳)

اہلِ فکر و قائدین کا مقام اور ذمہ داری

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.
(سورہ آل عمران: ۲۰۰)

اے ایمان والو صبر کرو، ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور مورچوں پر جمے رہو اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تاکہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو۔

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت و تلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام و ملل کی زندگی اور قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لئے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعل راہ ہو اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے

تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف وہراس کے عالم میں صبر وہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت۔

حفاظت دین وملت کا مورچہ

پھر فرمایا "وَرَابِطُوْا" (اور مورچوں پر جمے رہو) اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ مورچے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فوجی اور زمینی مورچہ، دوسرے معنوی مورچہ، فوجی وزمینی مورچہ بھی بہت اہم ہے اور زندہ وغیور قومیں اس پر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگادیتی ہیں، مگر یہ مورچہ زندگی میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، قوموں کی زندگی میں میدان جنگ کی شکست یا کسی مورچے سے پسپائی ان کی قسمت پر مہر نہیں لگادیتی، دنیا میں قومیں شکست بھی کھاتی رہی ہیں اور فتح بھی حاصل کرتی رہی ہیں، اپنے مورچوں سے ہٹتی بھی رہی ہیں اور ان کو واپس بھی لیتی رہی ہیں، عہد نبویؐ، دورِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام کے ہر عہد میں یہ نشیب وفراز اور یہ سرد وگرم پیش آتے رہے ہیں اور جو قوم اس نشیب وفراز سے نہیں گزرتی اور شکست کی تلخی سے اس کے کام ودہن کبھی آشنا نہیں ہوتے، وہ صرف فتح کی لذت وحلاوت سے آشنا ہوتی ہے، اس قوم کی صلاحیت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے قوموں کی تربیت کے لئے یہ دونوں تجربے ضروری ہیں اور خدا نے اپنے محبوب پیغمبر اور اس کے برگزیدہ اصحاب کو ان دونوں راستوں سے گزارا ہے۔

لیکن معنوی مورچوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ کسی معنوی مورچہ پر

شکست و پسپائی بعض اوقات صدیوں و ہزاروں برس کا فیصلہ کردیتی ہے اور بعض اوقات اس سے کسی قوم وملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے، آج ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو یہی معنوی مورچہ درپیش ہے، ملت کی جداگانہ شخصیت کا مورچہ، اسلام کی مستقل تہذیب کا مورچہ، اسلام کے عائلی قانون (پرسنل لا) کا مسئلہ، زبان و کلچر کا مسئلہ، آئندہ نسلوں کی تعلیم کا مورچہ، ان مورچوں کی حفاظت "خواص" ہی کر سکتے ہیں، اس کے لئے جس علم، جس فہم، جس احساس، جس دور بینی، اور حقیقت شناسی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے جن وسائل وذرائع کی ضرورت ہے، وہ اسی طبقہ کے پاس ہیں، ان کی بروقت فرض شناسی اور مستعدی، ان کی بے چینی اور دردمندی مدتوں کے لیے اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے، اور ملت کو اس خطرے سے محفوظ بنا سکتی ہے اور ان کی ذرا سی غفلت و سستی ملت کے قافلہ کو سالوں اور صدیوں کے حساب سے منزل سے دور کر سکتی ہے، انھوں نے اگر اپنے ذاتی مقاصد و مفادات کو ملت کے مفاد پر اور اپنی ذات کو پیش آنے والے دور از کار خطرات کو ملت کے حقیقی خطرات پر ترجیح دی تو ان مورچوں پر شکست یقینی ہے[1]

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

---

(۱) خواص۔ ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں، ص ۱۸ تا ۲۰

مسلمانوں کے دو فرائض

گردوپیش کے واقعات سے سبق لینا چاہئے

ہم مسلمانوں کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ہم واقعات وحالات سے فائدہ اٹھایا کریں، اور ان سے صحیح نتیجہ نکالیں، اسباب اور اسباب کے نتائج میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تعلق پیدا کیا ہے، جیسے دواؤں میں خاصیت ہے، درخت کی پتیوں میں خاصیت ہے، یہاں تک کہ گھاس پھوس میں خاصیت ہے، اعمال، اخلاق، طرز عمل اور زندگی کے طور طریق میں اس سے بھی زیادہ طاقت و خاصیتیں ہیں، اس لئے کہ دوائیں، غذائیں، نباتات، حجریات تو انسان کی زندگی کی حفاظت اور انسان کو امراض کی تکلیف سے بچانے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، زندگی تو اصل چیز ہے، جو واقعات ہمارے گردوپیش گزرتے ہیں ان سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ اور قرآن مجید میں اس کی نہ صرف ہدایت کی گئی ہے، بلکہ سبق نہ لینے پر ناراضگی کا اظہار اور اس بے حسی کی مذمت کی گئی ہے۔

سورہ یوسفؑ کے آخر میں آتا ہے:

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ. (سورہ یوسف: ۱۰۵)

اور آسمان وزمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گذرتے ہیں اور ان سے آنکھیں بند کرکے چلے جاتے ہیں۔

یعنی کتنی نشانیاں ہیں اس زمین و آسمان میں کہ اس کے پاس سے یہ لوگ منہ پھیر کر گذر جاتے ہیں اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں، ان سے کوئی سبق نہیں لیتے، اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں سورہ یونسؑ میں کہا گیا:

وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ. (سورہ یونسؑ: ۱۰۱)

جو ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے نشانیاں اور ڈراوے کچھ کام نہیں آتے۔

ایک جگہ فرمایا گیا:

سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ. اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْد. (سورہ حٰم السجدہ: ۵۲)

ہم عنقریب ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔

پہلا فرض

مسلمانوں کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی اور جس ملک میں بھی ہوں وہاں وہ اولاً اپنے ہم وطنوں کو اللہ کی اس نعمت (دین حق) میں شریک کرنے کی کوشش کریں جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے اور ان کو اس کی فکر رہے، یہ فکر سب سے زیادہ پیغمبروں کو رہا کرتی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار رسولﷺ کو تسکین دی:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. اے پیغمبر، شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔ (سورہ الشعراء: ۳)

اس کے بعد درجہ بدرجہ جن لوگوں کو ان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے ان کے اندر یہ فکر زیادہ ہوتی ہے، تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہیں وہاں ہدایت کو عام کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا ہے، ان کو جو ہدایت دی ہے، ان کو جو روشنی عطا فرمائی ہے، اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

دوسرا فرض

دوسرا فرض جو از روئے دین، انسانیت اور عقل سلیم، ہم پر عائد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنا تعارف کرائیں کہ ہم کس دین کے ماننے والے ہیں، کن اصولوں کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور ہماری زندگی کن چیزوں کی پابند ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اخلاق سے لوگوں کو مانوس اور قریب کریں، لوگوں کو اس دین کے مطالعے پر آمادہ کریں، جس دین کے ہم پابند ہیں، اس دین کے بارے میں ان میں تجسس (CURIOSITY) پیدا ہو، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، یہ کس دین کو مانتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، یہ ہر ایک کے خیر خواہ ہیں، دولت ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک کچھ اور حقائق ہیں کچھ اور (VALUES) ہیں، کچھ اور (IDEAL) ہیں، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، جن کو دولت کی بڑی سے بڑی مقدار خرید نہیں سکتی، ان کو اپنے اصول سے ہٹا نہیں سکتی، ان کو ظلم پر آمادہ نہیں

کر سکتی، کیا ان کے سامنے کوئی اور عالم ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے؟ ذہن پر چوٹ لگانے والی بعض چیزیں ہوتی ہیں جو بعض اوقات آدمی کی زندگی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔(۱)

(۱) تلخیص از فسادات اور ہندوستانی مسلمان، ص ۳ تا ص ۷

ہے حقیقت جسکے دین کی احتسابِ کائنات

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْ بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ. (سورۂ ہود:)

"تو جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں سے ایسے سمجھدار لوگ نہ ہوئے کہ جو ملک میں فساد پھیلانے سے منع کرتے۔ بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے۔"

یہ آیت ایک دور نہیں بلکہ گذشتہ دوروں کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور تصویر کشی کرتی ہے۔ اس آیت میں جو تڑپ اور جو ایک خاص تاثیر ہے اور اس میں جو بجلیاں کوند رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ پورے طور پر ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید اس امت کے داعیانہ و قائدانہ مقام، اصلاح کی ذمہ داری اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مسئولیت کی یاد گذشتہ اقوام کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے شعور و احساس کو بیدار کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے:

ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس سے پہلے جو نسلیں اور جو دور گذرے ہیں ان میں وہ لوگ ہوتے جن کا ضمیر آخری طور پر مردہ نہیں ہوا تھا اور جن کے دلوں پر انسانیت کی کچھ

چوٹ تھی، انھوں نے کیوں نہیں ہاتھ پاؤں مارے؟ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ" وہ لوگ کیوں نہیں کھڑے ہوگئے۔ اس عالمگیر فساد کے مقابلہ میں جس کا لاوا پھوٹ رہا تھا، کیا اتنی بڑی انسانی آبادی میں ایسے چند انسان بھی نہیں تھے جن کے اندر کچھ رہا سہا انسانیت کا درد ہو۔ اور حالات سے صحیح نتیجہ نکالنے کی صلاحیت اور خطرات کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنے اور انسانی تہذیب و ثقافت کے بچے کھچے سرمایہ کی حفاظت کا جذبہ باقی ہو، وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے، کچھ ڈراتے، روتے اور خوشامد کرتے، کچھ لوگوں کا ہاتھ پکڑتے، کچھ میدان میں آجاتے...... یہ سب کچھ اس قرآنی آیت کی سلوٹوں میں کہہ دیا گیا ہے اور جو لوگ عربی زبان سے کچھ ذوق رکھتے ہیں وہ حقیقی لطف لے سکتے ہیں کہ کس انداز سے اس کو کہا گیا ہے۔

قرآن مجید نے "اولو بقية" کا جو لفظ استعمال کیا ہے (عربی زبان سے شدید ہونے کے باوجود) اس لفظ کا پوری طرح ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، وہ لوگ جن کے اندر ابھی فکر اور احساس کی شمع پورے طور پر بجھی نہیں ہے اور جن کے ضمیر نے ابھی آخری ہچکی نہیں لی ہے۔ جن کے اندر ابھی کچھ حقیقت شناس موجود تھے اور پیغمبروں کی محنتوں کا اثر ابھی باقی تھا اور جنھوں نے قوموں کا انجام دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اعمال کیا نتیجہ پیدا کرتے ہیں اور اخلاق کا بگاڑ کیا مصیبتیں لاتا ہے اور جب یہ سیلاب آتا ہے تو کس طرح ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ غریب کا جھونپڑا ہے یا کسی امیر کا ایوان! کسی مجرم کا گھر ہے یا عشرت کدہ یا کسی یتیم و بیوہ کے سر چھپانے کا ٹھکانا ہے، جب سیلاب آتا ہے تو سب کو بہالے جاتا ہے۔ اسی

طرح آگ لگتی تو کوئی تمیز نہیں کرتی اور پھر اس کی لپٹ میں اچھے اچھے لوگ آجاتے ہیں۔ سوادِ اعظم (یعنی آبادی کا بڑا حصہ) جسے کہتے ہیں اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر معدودے چند آدمی ہوتے ہیں جو اس سیلاب کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

میں جب بھی یہ آیت پڑھتا ہوں "فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْ بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلاً مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ"...... تو دل پر چوٹ لگتی ہے......

قرآن مجید نے "يَنْهَوْنَ عَنِ التَّرْكِ" نہیں کہا اور نہ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْعَصِيَّةِ" بلکہ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ چند آدمی ہوتے ہیں جو ہتھیلیوں پر سر رکھ کے آجاتے ہیں، اور زمانہ کی کلائی موڑ دیتے ہیں۔

دعوت و عزیمت کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اخلاقی بگاڑ کو دور کرنے کیلئے ستر اور اسی فیصدی لوگ میدان میں آئے ہیں۔ آپ کسی دور کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب فساد پھیل گیا اس وقت اللہ کے کچھ بندے جن کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ میدان میں آئے ہیں پھر ان کے ساتھ اور لوگ شامل ہوگئے اور کارواں بنتا گیا اور انھوں نے پھر ایک طاقت بنالی اور اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت تو بہت وسیع و عمیق اور آخری چیز ہے۔ لیکن ان کے جانشین وہی "اولو بقية......" ہیں!

یہ لوگ ہر دور میں فساد کے مقابلہ کے لئے میدان میں آئے ہیں اور جس شکل

میں بھی یہ فساد آیا ہے یہ لوگ اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں اگر دولت پرستی کا بت ہوتا ہے تو وہ ان کو پاش پاش کرتے ہیں۔ اور اگر نفس پرستی کا بت ہوتا ہے تو اس کو توڑنے کے لئے میدان میں آجاتے ہیں۔(۱)

(۱) از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جون ۱۹۸۰ء
مشترک از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۶ء

اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (سورہ الحج:۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔"

یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع، معنی خیز اور فکر انگیز ہیں اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے، ان کے قدم کہیں جمائیں گے تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عیش و عشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں، ان کا تمدن ایک حسین گلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں ہن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر ہما کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے دستر خوانوں پر الوانِ نعمت چنے ہوئے

ہوں گے۔ نہیں، بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشور کشائی، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا یہ حال ہوگا کہ:

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوةَ" اگر ہم ان کو زمین میں "تمکین" واقتدار عطا کریں گے تو نماز کو برپا کریں گے، میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ "صلوٰۃ" نہیں ہے بلکہ "اقاموا الصلوٰۃ" ہے، یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے۔ اس کا انتظام واہتمام کریں، اس کے لئے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے، "اقاموا الصلوٰۃ" کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔

"وَآتوا الزكوٰة" زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، زکوٰۃ کو عام کریں گے، "وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْ عَنِ الْمُنْكَرِ" اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ "معروف ومنکر" کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں "امر و نہی" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف "امر ونھی" کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ "امر ونھی" کے ہیں۔

اس آیت میں بھی بعض دوسری آیتوں کی طرح "امروا" اور "نھوا" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت و دعوت، ترغیب و فہمائش کے الفاظ سے مختلف ہیں۔ "امرونہی" (حکم و ممانعت) کا منصب ادا کرنے والے کیلئے اس کی کسی قدر طاقت و بالاتری حاصل ہو اور وہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت و نقصان کا خوف ہو، اس لئے بھی ایسی جماعت یا امت کو جو اس فرض کو انجام دینے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ سیاسی اقتدار اور قوت کی ضرورت ہے۔

اس لئے کہ "امر و نہی" طاقت چاہتے ہیں۔ "امر و نہی" وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ "امر و نہی" میں ایک استعلاء ہے۔ "امر و نہی" میں درخواست کے معنی نہیں "امر و نہی" حکم دینا اور روکنا، اس کے لئے آدمی کے اندر قدرت چاہئے۔ ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے۔ ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ "امر" کر سکے اور "نہی" کر سکے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیشہ یہی نہ کہے کہ "اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا......" ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں" "ہم تبلیغ کرتے ہیں" اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن کا جو معیار و میزان ہے اس میں الفاظ "امرونھی" کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ قوت و طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں۔ اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے،

لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، جس کے نتیجہ میں "اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" اور "اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ" اور "نَھَوْ عَنِ الْمُنْکَرِ" کے الفاظ آئے ہیں۔

پس ضروری بات یہ ہے کہ ایسے لوگ برسر اقتدار آئیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہو اور تقویٰ ہو، ان کی سب سے بڑی فکر آخرت کی فکر ہو۔ اور ان کی صفت یہ ہو:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوْا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ.

وہ (بندے جن کی تربیت ایسی ہو چکی ہو کہ) اگر ہم ان کو زمین میں تمکین اور غلبہ دیں (یعنی وہی اس دنیا کے والی اور حاکم بنا دیئے جائیں) تو وہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکیوں کے احکام جاری کریں اور برائیوں سے لوگوں کو روک دیں۔

یعنی یہ "اقامت صلوٰۃ ایتاءِ زکوٰۃ" اور "امر بالمعروف، نہی عن المنکر" جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے راستے سے حکومتِ الٰہی تک نہیں پہنچا ہے، بلکہ حکومتِ الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے، پھر ان کو رائج کرنا ہے۔(۱)

---

(۱) ا۔ نبی خاتم و دین کامل، ص ۹ ۲۔ حدیث پاکستان، ص ۴۵
۳۔ تحفۂ پاکستان، ص ۴۶-۴۷ ۴۔ تحفۂ کشمیر ص ۴۹
۵۔ الفرقان اشاعت خاص ۲/۱۳۷ھ سے مشترک ماخوذ ہے۔

غیر اسلامی شعائر ورسوم کی نقل وتقلید سے احتراز کی ضرورت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوْا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (البقرة:)

آیت کا سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "اے ایمان والو "رَاعِنَا" نہ کہو "اُنْظُرْنَا" کہو اور (دھیان کے ساتھ) سنو، اور کافروں کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے"۔

ہمیں معلوم ہونا چاہئے، اور جس کو معلوم ہو اس کو حافظہ میں تازہ کر لینا چاہئے کہ یہ آیت کس موقعہ پر نازل ہوئی اور ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے، اس میں ہمارے لئے کیا پیغام ہے؟

"راعنا" کا مفہوم

"راعنا" عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے جس کے معنی ہیں،، ذرا ہمارا خیال کیجئے،، ذرا اسی (سننے والوں کی) رعایت کیجئے، اور "انظرنا" بھی عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے، جس کا

مفہوم ہے کہ ذرا سا ہمارا انتظار کیجئے، ذرا دیکھ لیجئے کہ ہم نے سنا یا نہیں۔ دونوں عربی کے لفظ ہیں، دونوں فصیح ہیں، لیکن قصہ کیا ہے کہ ایک سے اللہ تعالی منع فرماتا ہے، اور اس کتاب میں جو قیامت تک پڑھی جانے والی ہے، اس ممانعت کو جگہ دی جاتی ہے، وہ دور بھی ختم ہوا، قرآن شریف بہت سے ایسے ملکوں میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے، جہاں عربی زبان نہ بولی جاتی ہے، نہ سمجھی جاتی ہے، پھر اسکو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے اور اس کو قیامت تک اور ہر ملک میں پڑھی جانے والی، اور ہر زبان میں ترجمہ کی جانے والی کتاب میں کیوں شامل کیا گیا ؟ یہ سوچنے کی بات ہے، اس لفظ کا قصور کیا ہے کہ اس سے منع کیا جاتا ہے، اور اسی کے ہم معنی لفظ کی تعلیم دی جاتی ہے کہ بجائے اس لفظ کے یہ لفظ کہو۔

قصہ کیا ہے

قصہ یہ ہے کہ جن جماعتوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی جاتی ہے، اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہیں، وہ اپنے دل کا بخار باتوں باتوں میں، چٹکی لینے میں، طنزیہ اور ذو معنی الفاظ بولنے میں نکال لیتی اور اپنا دل خوش کر لیتی ہیں، (ہماری اردو میں بھی ایسے الفاظ ہیں جو معصوم اور دیکھنے میں باوقار ہیں، مگر مذموم معنی میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "آپ بڑے استاد ہیں" فلاں ذات شریف ہیں" میں چونکہ لکھنؤ میں رہتا ہوں، وہاں اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے) یہودیوں کا طریقہ تھا کہ جب دربار نبویؐ میں آتے تھے، اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوتا، تو کہتے تھے "رَاعِنَا" (ذرا ہماری رعایت کیجئے) وہ اس لفظ کو ذرا دبا کر کہتے تو "رَاعِيْنَا"

بن جاتا جس کے معنی ہوتے ہیں، ہمارا چرواہا، جو صاف ذہن ودل کے لوگ ہیں، ان کا ذہن بھی ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ اس میں چٹکی لی گئی، یہودیوں کی نظر میں اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کی اولاد کے علاوہ سب دوسرے درجہ کے انسان اور جمادات و حیوانات کی سطح کے لوگ ہیں، غیر یہودی کے لئے ان کے یہاں (Gentile) کا لفظ ابھی تک موجود ہے، جس کے معنی ہیں، "غیر یہود یا صابی" وہ سمجھتے تھے کہ امیّین کے ساتھ جس طرح کا معاملہ کیا جائے، جائز ہے، جھوٹ بولا جائے تو جھوٹ نہیں، ان کی کوئی چیز دبالی جائے تو چوری نہیں، ان کو دکھ دیا جائے تو گناہ نہیں "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ" (ہم سے امیین کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا) صحابہ کرامؓ کا ذہن تو اس طرف نہیں گیا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ علیم وخبیر ہے، وہ لحن القول کو بھی سمجھتا ہے، یعنی جو باتیں چباکر اور ذرا اخفاء واشباع کے ساتھ کہی جاتی ہیں، ان کو بھی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ عربی زبان بہت وسیع ہے، بجائے "راعنا" کے "اُنْظُرْنَا" کہا کرو، کہ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ احتیاط کی تعلیم دیتا ہے

خیال فرمایئے کہ جب ایک لفظ کے بارے میں اللہ تعالیٰ احتیاط کی تعلیم دیتا ہے، جو ہزاروں برس سے بولا جارہا تھا، اور ابھی تک عربی زبان ولغت میں موجود ہے تو غیر مسلموں اور جاہلی اقوام کے شعائر ورسوم کے اختیار کرنے، اور ان کی نقالی اور ریس کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غیرت کیوں جوش میں نہ آئے گی، ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں نے (جب مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوگئی یا چھوٹ گئی، اپنے معاشرہ (سماج) کا

اپنے مذہب سے (جس کو وہ دھرم کہتے ہیں) رابطہ قائم رکھنے کے لئے) اس طرح کے جشن، رونق کی چیزیں، اور اجتماع کے مواقع ایجاد کئے، اس لئے کہ اس کے بغیر ان کے دھرم سے ان کے سماج کا ربط قائم نہیں رہ سکتا تھا، وہاں مسئلہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عبودیت یا بندگی کا نہیں تھا، اب کیسے معلوم ہو کہ یہ ہندو ہیں، اور ان کا بھی ایک دھرم ہے، اس کے لئے انھوں نے تہوار، جلوس، جلسے نکالے، رام لیلا، دسہرا، ہولی، دیوالی، بنگال میں درگا پوجا کا تہوار، دکن میں گن پتی کا جلوس...... سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔

اسلامی تہواروں کی خصوصیت

اس کے مقابلہ میں اسلام کی روح، اس کا طریق فکر، اور اس کا شعار کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک دن ایک یہودی عالم حضرت عمرؓ کے پاس آتا ہے، اور کہتا ہے "**یا امیر المومنین اٰیة تقرؤنها فی کتابکم لو علینا معشر الیهود نزلت لا تخذنا ذلك الیوم عیدًا**"(۱) امیر المومنین ایک آیت ہے، جو آپ اپنی کتاب میں (بے تکلف) پڑھتے ہیں، کہیں اگر ہم یہودی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کا ایک جشن اور تہوار مناتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کون سی آیت؟ یہودی عالم نے کہا "**اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ**......! الخ" یہودی عالم کو معلوم تھا کہ یہودی شریعت اور مذہب کی تاریخ میں اس قسم کا کوئی اعلان نہیں، کہ نبوت فلاں اسرائیلی نبی پر ختم ہو گئی، یہ واقعہ ہے کہ اسلام

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر

کے علاوہ کسی آسمانی دین میں یہ اعلان موجود نہیں کہ اب دین مکمل ہو گیا، اس خلا کو وہ مذاہب اور ملتیں خود محسوس کرتی تھیں، اس لئے کہ روز کوئی نہ کوئی نبوت کا دعویدار کھڑا ہو جاتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں نبی ہوں، یہودی اور عیسائی مورخین و فضلاء اپنے مضامین میں سر پکڑ کر روتے اور فریاد کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ روز ایک مدعی نبوت کھڑا ہوتا ہے، اور یہودی اور عیسائی معاشرہ میں ایک انتشار اور افتراق پیدا ہو جاتا، اور ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس نے کہا کہ اتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے، جس سے انتشار اور روز روز کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، لیکن تعجب ہے کہ جس آیت کے ذریعہ آپ کو یہ انعام ملا، اور اس کا اعلان ہوا، آپ اس کا جشن نہیں مناتے؟

حضرت عمرؓ نے اس کا سیدھا سا جواب دیا، جو دین کا رمز شناس، اور درسگاہ نبوت کا اعلیٰ تربیت یافتہ ہی دے سکتا ہے، فرمایا کہ "ہمیں معلوم ہے کہ یہ آیت کب اور کہاں نازل ہوئی، یہ عرفات میں نویں ذی الحجہ کو نازل ہوئی" حضرت عمرؓ نے اتنا ہی کہا، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ پہلے سے ایک تاریخی اور یادگار دن ہے، جس میں مسلمان جمع ہوتے اور عبادت کرتے ہیں، دوسرے یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ وہ کس دن نازل ہوئی، لیکن ہم اس دن کو اس کا تہوار نہیں بنائیں گے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے دو ہی عیدیں مانی ہیں، اور امت کو عطا کی ہیں، ایک عید الفطر ایک عید الاضحیٰ، آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں غیر مسلموں کے تہواروں کے مقابلہ میں دو تہوار دیئے ہیں، ایک عید الفطر کا، ایک عید الاضحیٰ کا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

اسلام میں ان دونوں کے علاوہ کوئی مستند اور مشروع تہوار نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ غیر مسلموں کے تہوار کھل کھیلنے، دھوم مچانے، اور رنگ رلیاں منانے کے لئے ہیں، جن میں آدمی خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اپنے کو بھی، اور بعض اوقات تہذیب و اخلاق کو بھی، اس کے خلاف اسلامی تہواروں (عیدین) کی شان یہ ہے کہ چاشت کی نماز، فرض وواجب تو کیا، سنت مؤکدہ بھی نہیں تھی، لیکن ان دونوں میں اسی چاشت کے وقت میں ایک نئی نماز (دوگانۂ عید) کا اضافہ کیا گیا، اور اس کو سنت مؤکدہ قرار دیا گیا، ہر نماز میں دو تکبیریں، ایک تکبیر تحریمہ اور ایک تکبیر رکوع ہوتی ہے، دوگانۂ عید میں ان دو تکبیروں کے علاوہ تین تکبیریں اور بڑھادی گئیں، یہ اچھا تہوار ہوا، نماز بھی بڑھادی، اور نماز میں تکبیروں کی تعداد بھی بڑھادی، اور ایک خطبہ کا بھی اضافہ ہوا، یہ ہے اسلامی تہواروں کی خصوصیت۔

علماء کا فرض اور مدارس دینیہ کی ذمہ داری

علماء کا فرض ہے کہ اس بات کی چوکسی کریں کہ مسلمان "راعنا" تو نہیں کر رہے ہیں، راعنا کہنے سے "راعنا" کرنا اور بھی بُرا ہے، مسلمانوں کی یہ ذہنیت تو نہیں ہو گئی کہ صاحب فلاں قوم، فلاں فرقہ، فلاں چیز کا جلوس نکالتا ہے، ہم اس کے مقابلہ میں فلاں چیز کا جلوس نکالیں، یہ طرز عمل "راعنا" کہنے سے بھی بدتر ہے، اس لئے کہ "راعنا" تو ایک لفظ تھا، جو ہوا میں اڑ کر رہ جاتا تھا، لیکن جو چیز غیر مسلموں کی نقل میں کی جائے گی وہ عملی "راعنا" ہے، اور اس کا اثر عقائد و اعمال، اور تمدن و معاشرت پر پڑے گا۔

علماء کا فرض ہے کہ جس وقت بھی کوئی ایسی بدعت، کوئی منکر، اور غیر مسلموں کی تقلید کی دعوت سامنے آئے تو صاف کہہ دیں کہ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اسلام کی روح اور تعلیمات کے منافی ہے، آج درگاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ زیادہ تر غیر مسلموں کی نقل ہے، ان اعمال و رسوم و بدعات کی تاریخ موجود ہے، جن سے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کب اور کہاں سے شروع ہوئیں، اور ان کے محرکات کیا تھے؟ دین کی روح عبادت ہے، دین کی روح انابت الی اللہ ہے، دین کی روح توحید ہے، دین کی روح سادگی ہے، دین کی روح وہ ہے جس سے کرنے والے کو بھی فائدہ پہونچے، دوسروں کو بھی، عید الاضحیٰ میں نماز تو نماز قربانی بھی رکھ دی کہ محلّہ اور گاؤں میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو گوشت کو بھی ترستے ہیں، مہینوں گذر جاتے ہیں، ان کو گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا، آج پیٹ بھر کر گوشت کھالیں گے، اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت بھی ادا ہو جائے گی۔

خاص طور پر علماء کا فرض ہے کہ اس پر کڑی نظر رکھیں کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی "راعنا" دبے پاؤں تو نہیں چلا آرہا ہے؟ جہاں آئے وہیں اس کو روک دیں، آپ نے امت کو وصیت کرتے ہوئے صاف طور پر فرمایا "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمُهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذَا" (میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرو جو ہدایت یافتہ تھے، اس کو مضبوط ہاتھوں سے تھامو اور دانتوں سے دباؤ) ہمارے مدارس کا فائدہ اور اصلی غرض و غایت یہی ہے کہ

وہ دین کے چوکیدار، راتوں کو پہرہ دینے والے پیدا کریں، اگر وہ بھی "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کا مصداق بن جائیں، اور ہر شرعی اور غیر شرعی کام میں عوام کا ساتھ دینے لگیں، بلکہ قیادت کرنے لگیں تو پھر بقول شاعر۔ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

علماء میں بھی ایسا دینی جلال، اور توحید و سنت کے بارے میں غیرت اور حمیت ہونی چاہئے، اور ہمارے مدارس عربیہ و دینیہ یہی عنصر اور جنس پیدا کرنے کے لئے قائم ہوئے تھے، اور ان کو اپنی یہ خصوصیت ہمیشہ برقرار رکھنی چاہئے۔!(۱)

---

(۱) تحفۂ دکن، ص ۵۰ تا ۵۶ تلخیص

علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ. (المائدہ۔۸)

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

خدائی فوجدار

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ" (یعنی تم اللہ کے لئے حق کے علم بردار بن جاؤ)۔

ہماری زبان اور محاورہ میں "خدائی فوجدار" ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن "قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ" کا مفہوم تقریباً "خدائی فوجدار" ہی کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قَوّٰمِيْنَ) سے خدائی فوجدار ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر قائمین للہ ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی، کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے، آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، آپ ہر جگہ پہونچ رہے ہیں۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں

امتیازی شان ہونی چاہئے، ان کو "شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" حق و صداقت کا گواہ و علم بردار ہونا چاہئے، اگر امت اسلامیہ کا فرض اقوام عالم کا احتساب ہے تو علمائے اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا ہے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے، کہاں سے اس نے خط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

علمائے دین کو قبلہ نما ہونا چاہئے

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات، اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں، اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں، اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روزمرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا ہوں، دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہونچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن علاقوں سے گذری، لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بار بار رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سی جماداتی چیز، جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے) برابر اپنا رخ بدلتا رہا ہے، ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا، اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی، اس سے مجھے غیرت بھی آئی، اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروانہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے، اس نے اپنا مقصد وجود

تبدیل نہیں کیا، اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا، اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں "قبلہ نما" ہونا چاہئے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہئے، کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ۔ ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں۔ ع

زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبالؔ کی (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو۔

حدیث کم نظراں ہے تو بازمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں۔

گفتند جہانِ ما آیا بتومی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

علماء کی شان یہی ہونی چاہئے، امت مسلمہ امتوں میں، اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے، وہ جہاں کہیں ہوں اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کریں، جس امت کو ایک معیّن قبلہ دیا گیا ہے، اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمھارے دلوں کا قبلہ، تمھارا قبلۂ حاجات، تمھاری فکر اور سعی و جہد کا محور ایک ہی ہونا چاہئے، نمازوں میں خانۂ کعبہ، اور اعمال و مساعی و مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود و مقصود حقیقی ہے) رضا۔

عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہئے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کرے گا، وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شرعیہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مداہنت اور چیز، حکمت اور مداہنت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" لیکن مداہنت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے: "وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ" (وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔ القلم: ۹) اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" یہ "اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" کا تکملہ، "صَدَعْ بِالْأَمْرِ" کا محل متعین کر دیتا ہے، جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" پر عمل کا حکم ہے، نرمی اور وسعت کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید و سنت کے بارے میں، منصوصات شرعیہ، اور قطعیات دینیہ کے بارے میں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کا حکم ہے، اگر "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" مطلق آتا تو اس میں بھی کچھ گنجائش تھی، لیکن "وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" نے بالکل تفسیر کر دی کہ اس کا موقعہ و محل کیا ہے، علمائے حقانی کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوچ اور صاف بات کہیں، لیکن حکمت کے ساتھ کہیں، بقول غالبؔ ایسا نہ ہو۔ ع

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بُری طرح

بھلی بات بھلے طریقہ پر کہی جائے، کوئی فتنہ شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی، نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج و حکمت سے کام لیں، لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو، اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کو ہلاکت کا شوق ہے، وہ شوق سے ہلاکت میں پڑے، لیکن وہ شریعت، اور شریعت کے حاملین کو الزام نہیں دے سکتا۔

امت مسلمہ کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی

تاریخ کا اگر عمیق و وسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہو گئی ہو، مقامی طور پر تو ضلالتیں رہی ہیں، لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش، یا کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی، اور خود حدیث میں آیا ہے "لا تجتمع أمتی علی ضلالة" اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہو گئی، اور عیسائیت بالکل عہد طفلی اور آغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی، جس پر وہ صدیوں سے چلتی چلی آرہی ہے، اسی لئے قرآن مجید نصاریٰ کو "ضَالِّین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے، کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے۔

لیکن الحمد للہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے، اس وقت تک توحید و شرک کا فرق، سنت و بدعت کا فرق، اسلام اور جاہلیت کا فرق، غیر مسلمین کی معاشرت و تمدن اور اسلامی معاشرت و تمدن کا فرق بالکل واضح ہے، کوئی ملک کسی وجہ سے کسی خاص

زمانہ میں کسی خارجی یا داخلی سبب کی بناء پر کسی سازش کا شکار ہو جائے، یا کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے یہ الگ بات ہے، علمائے حق اس صورت حال سے بھی نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آرا رہتے ہیں، اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہتی ہے (۱)۔

(۱) تحفۂ دکن صفحہ ۳۹ تا صفحہ ۴۸۔

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا. فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ. وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ. وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ. ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ.

(سورۂ فاطر۔ ۳۲)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ خدا کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں، یہی بڑا فضل ہے۔

کوئی چیز خلاء میں نہیں رہ سکتی

دین ہو، آسمانی تعلیمات ہوں، صحیح دعوت یا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ہوں، ان میں سے کوئی چیز خلاء میں نہیں رہ سکتی، اگر اس تعلیم و دعوت کے ساتھ انسانی زندگیاں، ان کے حاملین اور زندہ اور عملی پیکر نہ ہوں تو ان کا تسلسل قائم نہیں رہتا، ادیان سماوی کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے، اور اخلاقی تعلیمات کی تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتی ہے، اگر ایسا ممکن ہوتا اور سنت الٰہی اور فطرت انسانی اس کی اجازت دیتی تو پھر اتنا کافی تھا کہ آسمان سے صحیفے آجاتے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیئے جاتے اور اعلان کر دیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے صحیفے اور آسمانی کتابیں آگئی ہیں، وہ فلاں جگہ محفوظ ہیں، جس کا دل چاہے جائے لے آئے، اور عمل کرے، لیکن پہلے اللہ

تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کی بعثت ہوتی ہے، ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اور اس کا پہلا نمونہ وہ خود ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے آنحضرت ﷺ کی سیرت وحیات طیبہ اور اخلاق وشمائل کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا "کان خُلقه القران" (رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھنا ہو تو قرآن مجید پڑھ لو اور دیکھ لو) اور آنحضرتؐ کے ساتھ تو اللہ کا خصوصی معاملہ اور مزید انعام یہ تھا کہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے الفاظ میں) آپ کی بعثت "بعثت مقرونہ" (دوہری بعثت) تھی، یعنی آپ انسانوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اور آپ کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے اور ان کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک پوری امت کی بعثت عمل میں آئی تھی، اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ تنہا امت مسلمہ کے لئے بعثت یا اس کے ہم معنی اور مرادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، فرمایا گیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرہ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران۔ ۱۱۰)

مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔

اس سے زیادہ صاف الفاظ حدیث میں آئے ہیں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا "انما بعثتم میسّرین ولم تبعثوا معسّرین" (تم آسانی پیدا کرنے کے لئے پیدا اور مقرر کئے گئے ہو، مشکلات پیدا کرنے کے لئے نہیں۔)

صحابہ کرامؓ نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ جب رستم سپہ سالار افواج ایران نے حضرت ربعی ابن عامر سے جو مسلمانوں کے نمائندہ و سفیر بن کر آئے تھے پوچھا کہ "تم کیسے آئے؟" (ماالذی جاء بکم؟) تو اس کے جواب میں انھوں نے زبانِ نبوت ہی کے الفاظ استعمال کیے، انھوں نے کہا "الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة الله وحده" (اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ حکم الٰہی سے اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں) اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ کوئی دین خلا میں نہیں رہ سکتا، دین سے پہلے نبی کی شرط ہے، پھر نبی کے ساتھ امت کی شرط ہے، اس کے اصحاب و تربیت یافتہ نفوس کی شرط ہے، جس کا بہترین نمونہ آپ کو سیرت نبوی میں ملتا ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہئے۔

توریث کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا

میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "توریث" یعنی نائبین انبیاء اور حاملین کتاب کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس طرح وارثین انبیاء، اس امانت کے حاملوں اور دین کے نمائندوں کی بڑی ذمہ داری ہے، اس دین کے بارے میں بھی، اپنے ماحول و معاشرے اور اپنے ملک کے بارے میں بھی اور پوری انسانیت کے بارے میں بھی، جس کی قسمت دین صحیح اور آسمانی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين. (۱)	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل و وارث ہوں گے، جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف اہل باطل کے غلط انتساب و دعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

وراثین کتاب، نائبین انبیاء اور عام فہم الفاظ میں "علمائے دین" کی یہ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنا نازک معاملہ ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر ادراک ہو تو جن لوگوں کو اللہ نے یہ شرف عطا فرمایا ہے، اور ان کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، راتوں کی نیند اڑ جائے اور کھانے پینے کی لذت ختم ہو جائے اور ان کا سکون ہمیشہ کے لئے جاتا رہے۔

دراصل حاملین و شارحین دین ہی کی سیرت و اخلاق پر عوام کی دین سے وابستگی، اس سے عقیدت، اس پر اعتماد اور صحیح عقائد و مسلک کے بقاء کا انحصار ہے، ان کی ذراسی غلطی کیا اثر پیدا کر سکتی ہے، اس رابطہ کو کتنا کمزور کر سکتی ہے، جو امت اور دین کے درمیان قائم ہے، ان کی اخلاقی کمزوری، جماعت کا اخلاقی تنزل، کردار کی پستی، دنیا طلبی، دولت پرستی، قوت واقتدار کی تقدیس، خواہشات نفس اور ذاتی مفادات کے سامنے سپر اندازی، تفرقہ اندازی اور انتشار پسندی پورے معاشرے پر کیا اثر ڈالتی ہے، اور اس عہد و ملک کی پوری نسل کو کس طرح متزلزل و متاثر کر دیتی ہے، اگر اس کا صحیح ادراک ہو تو ہمارے مدارس کے بام و در ہی نہیں مساجد کے محراب و منبر بھی کانپنے لگیں، مشہور حدیث صحیح سے بڑھ کر کوئی اس حقیقت کی عکاسی و مصوری نہیں کر سکتا، فرمایا گیا:-

---

(۱) مشکوۃ، ص ۳۸ فصل ثانی، روایت از بیہقی

ألا ان في الجسد مضغة اذاصلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسدالجسد كله ألا وهي القلب.

یادر کھو جسم انسانی میں ایک مضغہ گوشت ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورے جسم کا نظام درست رہے گا اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جائے، خبر دار رہو وہ مضغہ گوشت دل ہے۔

علماء و خواص کی حیثیت ملت و معاشرے میں بالکل وہی ہے جو قلب کی جسمِ انسانی میں ہے، اور اُن کے فساد و اختلال اور ان کے صلاح و اعتدال کا وہی اثر پوری ملت و معاشرے پر پڑتا ہے، جو قلب کے صلاح و فساد کا پورے جسم انسانی پر پڑتا ہے۔

پوری صاحبِ علم جماعت کی ذمہ داری ہے

یہ ذمہ داری کسی ایک جماعت یا کسی مخصوص ادارے کی نہیں ہے، یہ پوری صاحب علم جماعت کی ذمہ داری ہے، وارثین کتاب کے اخلاق پر جب انحطاط آئے گا، جب ان کے اندر دنیا پرستی آجائے گی، جب ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمزور پڑ جائے گا، جب وہ ان حدود سے بھی تجاوز کرنے لگیں جن حدود سے عوام کو بھی آگے نہیں بڑھنا چاہئے، تو پھر پورے معاشرے اور پورے ماحول میں فساد ہی نہیں بلکہ تعفن اور سڑاہند پیدا ہو جائے گی، دین کا مستقبل وابستہ ہے اہل دین واہل علم سے اور کسی ملک اور اس ملک کی آبادی کا اخلاقی، انسانی اور دینی مستقبل وابستہ ہے دین کے شارحین اور دین کے نمائندوں سے، اب دین کے نمائندوں میں کوئی کمزوری پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت عوام کے دین کے ساتھ تعلق کو کمزور ہونے سے بچا نہیں سکتی، نہ کوئی حکمت، نہ کوئی ذہانت، نہ کوئی خطابت، نہ کوئی سیاست، یہاں تک کہ اگر کوئی اسلامی حکومت بھی یہ بات طے کرلے کہ اس معاشرے اور اس ماحول میں فساد

پیدا نہ ہونے پائے اور اس کا رشتہ دین سے کمزور نہ ہونے پائے تو وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بالکل ایسی ہے کہ جہاز کی رفتار کو کنٹرول کرنے والی اور جہاز کا رخ متعین کرنے والی ایک چھوٹی سی مشین یا ایک معمولی سا پرزہ ہوتا ہے، اگر بال برابر بھی اس کی سوئی اپنی جگہ سے کھسک جائے تو جہاز سیکڑوں میل کے حساب سے اپنی منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے، علماء کی جماعت در حقیقت ملت و انسانیت کے لئے "قطب نما" ہے، جس سے قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے، اس لئے اس کا صحیح اور سچا رہنا اور اپنا کام کرتے رہنا ضروری ہے، اگر علماء کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہے، اگر ان کے اندر اخلاص و اخلاق پایا جاتا ہے، وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مستعد اور سرگرم ہیں، اور ان اعلیٰ صفات سے متصف ہیں، جو کسی درجہ میں نائبین انبیاء اور وارثین کتاب میں پائی جانی چاہئیں، تو کم سے کم اس ملک میں دین کا مستقبل محفوظ ہے، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر دنیا کی کوئی تدبیر اس ملک میں دین کو بچا نہیں سکتی(۱)۔

---

(۱) حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری، ص ۴ تا ۱۰

ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا. اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔

(سورۃ الاعراف۔۸۵)

اصلاح کے بعد خرابی نہ پھیلاؤ

خدا کے پیغمبر شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا (اور حقیقت میں انھوں نے سارے پیغمبروں اور پیغام ربانی کی ترجمانی کی) دیکھو میری قوم کے لوگو! اللہ کی زمین میں اصلاح کے بعد خرابی اور فساد نہ پھیلاؤ، ان کے یہ الفاظ کتنے سادہ لیکن کتنے معنی خیز کتنے عمیق، اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ عام طور پر کہا جاتا ہے، بھائیو! فساد نہ مچاؤ، انتشار انگیزی نہ کرو، بدنظمی نہ پھیلاؤ، لیکن حضرت شعیبؑ نے فرمایا: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا"۔

جب خدا کی زمین، اس کے کسی ملک میں معاشرہ اور تمدن، اور حیات انسانی کی چول بٹھانے، اس کو اپنی جگہ پر لانے، انسانوں کا رشتہ اپنے مالک سے استوار کرنے، بنی نوع انسان کے درمیان تعلقات کو درست کرنے، دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کو تسلیم اور قبول کرنے، انسانی جان و مال کے احترام اور خوش معاملگی کا درس

دیا گیا ہو، اور اللہ کے بندوں نے بڑی تعداد میں، اور بعض اوقات پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم نے کسی خطۂ ارضی میں اس کو قبول کر لیا ہو، تو خدارا اس کے بعد ان کوششوں پر پانی نہ پھیرو، اس نخلِ اصلاح کو خون پسینہ سے سینچا گیا، اس کی خاطر اپنے خاندانوں، اور عزت و ناموس کی بازی لگادی گئی، دنیا کے تمام مفادات سے آنکھیں بند کر لی گئیں، ایک ہی حقیقت کو یاد کیا گیا کہ زمین پر آدمیوں کو آدمیوں کی طرح اور خدا کے بندوں کی طرح رہنا سکھایا جائے، جس طرح کہ تسبیح کے دانوں کو تسبیح میں، یا ہار کے موتیوں کو ہار میں گوندھ دیا جاتا ہے، اسی طرح نسلِ انسانی کے افراد کو اخوتِ انسانی کے دھاگے میں گوندھ دیا گیا ہے "کُلُّکم من ادم، وادم من تراب" (۱) (اے انسانو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے) خدا کے لئے اس دھاگہ کو نہ توڑو، ورنہ یہ دانے بکھر جائیں گے۔

حضرت شعیبؑ کے اس مقولہ میں بڑا درد، اور دل کی تڑپ نظر آتی ہے، خدا کے پیغمبروں نے صدیوں کے عمل میں انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا، اور انسان بن کر رہنا سکھایا، انھوں نے کہا کہ تمھاری یہ تعریف نہیں کہ مچھلیوں کی طرح پانی میں پیرو، چڑیوں کی طرح ہوا میں اڑو، شیر کی طرح ڈکارو، اور بھیڑیے کی طرح پھاڑو، تمھاری تعریف یہ ہے کہ خدا کے بندوں کی طرح خدا کی زمین پر چلو، زمین خدا کی، تم خدا کے، پھر سرکشی کہاں سے آئی؟ انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ صَلَاحِهَا" (زمین کے درست ہو جانے کے بعد اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو) "اصلاح" لفظ متعدی ہے، اصلاح کے لئے ایک مصلح چاہئے، دعوت چاہئے،

جدو جہد چاہئے، توفیقِ الٰہی چاہئے، اس لفظ میں یہ سب چیزیں آگئیں، نبوت کی تاریخ آگئی، جب خدا کے پیغمبروں، اور انسانیت کے چارہ سازوں نے اپنی مبارک کوششوں سے اس خطۂ ارضی کو جنت کا نمونہ بنادیا، یہاں انسان، انسان پر جان دینے کے لئے تیار ہوگئے، رہزن پاسبان، اور درندے چوپان بن گئے، ایثار و قربانی کے ایسے نمونے دنیا کے سامنے آئے کہ اگر تاریخ کی معتبر شہادت، اور شہرت و تواتر نہ ہو تو ان کا یقین کرنا ممکن نہیں تھا(۱)۔

خدا کی نگاہ میں بڑا جرم

خدا کی نگاہ میں بڑا جرم، اور خدا کے پیغمبروں اور مصلحین کی نگاہ میں بڑا ظلم ہے کہ کسی معاشرہ کو جس کے ہر فرد کی قسمت دوسرے فرد سے وابستہ ہے، اپنے ذاتی مفاد اور کوتاہ نظری کی بناء پر زیر و زبر کر دیا جائے، اگر کوئی خرابی کسی معاشرہ (سوسائٹی) یا ملک میں پیدا ہو، اور آدمی سمجھے کہ ہماری بلا سے، ہمارا کیا بگڑتا ہے، فلاں محلّہ میں، فلاں برادری میں، شہر کے فلاں حصہ میں، ملک کی ایک ریاست میں اگر آدمی آدمی کو مار رہا ہے، لوگوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں، یکّا دُکّا مسافر کو چھرا گھونپا جا رہا ہے، تو کیا حرج ہے، ہمارے محدود حلقہ میں تو کوئی بات نہیں، اس صورت حال اور اس طرز فکر کا جو نتیجہ ہوگا، اس کی مثال مجھے اصلاحی ادب ہی میں نہیں، ادبیات انسانی میں اس سے

(۱) مثلاً عہد خلافت راشدہ میں ایک جنگ کے موقعہ پر ایک زخمی مسلمان کا جو جاں کنی میں مبتلا تھا، اور اس کا بھائی اس کو پانی کی چھاگل پیش کر رہا تھا، دوسرے زخمی مسلمان کی طرف اشارہ کرنا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ، اور ہاتھ منہ دھوؤ، اس کا تیسرے کی طرف اشارہ کرنا، اور اس سلسلہ کا اسی طرح جاری رہنا، یہاں تک کہ باری باری سب نے جان دے دی، اور پانی اسی طرح رکھا رہا۔ (کتاب تاریخ و مغازی)

بہتر نہیں ملی، جو ایک صحیح حدیث نبوی میں دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک کشتی پر مسافر سوار ہیں، اس میں دو طبقے ہیں، ایک بالائی، ایک زیریں، (یہ بھی اعجاز نبوی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس وقت کشتی رانی کے فن نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس میں فرسٹ کلاس، اور ڈک کلاس ہوں، اور اگر یہ ترقی ہو چکی ہوتی، تو کم سے کم جزیرۃ العرب جس میں دریا نہ ہونے کے برابر ہیں، اور حجاز کا خطہ اس سے اور بھی نا آشنا تھا) کچھ مسافر اوپر کے طبقہ میں ہیں، جن کو ہم (بالا نشین) کہہ سکتے ہیں، کچھ حصہ زیریں کے لوگ ہیں، جو عام طور پر غریب غرباء ہوتے ہیں، میٹھے پانی کا انتظام اوپر کیا گیا ہے، اَپر کلاس والوں کی رعایت بھی ذرا زیادہ کی جاتی ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ پانی لینے کے لئے اوپر جائیں، وہاں سے پانی لیکر آتے ہیں، پانی کی فطرت ہے کہ اچھلتا ہے، پھر کشتی خود ایک متحرک چیز ہے، ڈانواں ڈول ہوتی ہے، لوگوں کی ہزار احتیاطوں کے باوجود پانی چھلکتا ہے، پانی پہچانتا نہیں کہ یہ فلاں امیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، یہ فلاں نواب صاحب کے کپڑے پھیلے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ ہوا، دو مرتبہ ہو، چار مرتبہ ہو، آخر میں اَپر کلاس کے ان مسافروں سے برداشت نہیں ہو سکا، اور انھوں نے کہا صاحب! یہ تماشہ ہم نہیں دیکھ سکتے، پانی یہ لے جائیں اور پریشان ہم ہوں؟ ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، اپنا انتظام کرو، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر تو گذارا نہیں، اب اگر ہم اوپر سے نہیں لا سکتے تو ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں، بیٹھے ہی بیٹھے اپنے برتنوں میں پانی بھر لیا کریں گے، اب ہمیں منت کشِ غیر نہیں ہونا پڑے گا، اور کسی کی ناز برداری نہیں کرنی پڑے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ان بالا نشینوں کی عقل پر پتھر نہیں پڑے ہیں، اور ان کی شامت نہیں آئی ہے تو وہ

خوشامد کریں گے، ہاتھ پکڑیں گے اور کہیں گے کہ نہیں بھائی، تم اوپر ہی سے پانی لے جاؤ، لیکن خدا کے لئے یہ غضب نہ کرو کہ نیچے ہی نیچے سوراخ کرلو، اس لئے کہ کشتی ڈوبے گی تو پھر سب کو لے کر ڈوبے گی، نہ اَپر کلاس والے بچیں گے نہ لُور کلاس والے۔

ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

ہم کو آپ کو سب کو بظاہر اسی ملک میں زندگی گذارنی ہے، لیکن یہ تمدن انسانی یا معاشرۂ انسانی کی کشتی ہے، اور ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اگر ہم نے خود غرضی سے کام لیا، اور اپنے اپنے گھر میں میٹھے پانی کا انتظام سوچ لیا، تو پھر خیریت نہیں، وہ میٹھا پانی کیا ہے؟ یہ کہ ہماری غرض پوری ہو جائے، ہمارا کام نکل جائے، پھر ہمیں دوسرے سے مطلب نہیں، یہ کشتی میں سوراخ کرنے ہی کے مرادف ہے، آج ہمارے ملک کی کشتی میں کتنے سوراخ کئے جارہے ہیں، ہر شخص اپنی محدود غرض کو دیکھتا ہے، اس نے دوسروں سے اپنی آنکھیں بند کررکھی ہیں، اور اس حقیقت کو بھلادیا ہے، کہ اس کا اجتماعیت پر کیا اثر پڑتا ہے، آج ہندوستان ہی کا نہیں، ساری دنیا کا روگ یہی ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کھڑے ہوں، اور ملک کو تباہ ہونے سے بچائیں، یہ تنہا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے ساتھ بیسیوں الجھنیں، اور سیاسی مصلحتیں لگی ہوئی ہیں، قرآن کی روشنی میں یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ دین کے سچے داعیوں، انسانیت کے بہی خواہوں، اور ملک و معاشرہ کے مخلص

معماروں کی محنتوں پر پانی نہ پھیرنے دیجئے "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" کا پیغام دیتے رہئے، خدا کے یہاں آپ سے سوال ہوگا کہ تمھارے ہوتے ہوئے یہ ملک کیسے تباہ ہوا، تمھیں ایسا کردار اور نمونہ پیش کرنا چاہئے تھا کہ لوگ سمجھتے کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عہدہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عزت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، خدا کا خوف اصل چیز ہے، پھر محبت اور ہمدردیٔ خلائق۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ یہ نمونہ دکھا کر محبوبیت کا مقام حاصل کرلیں گے، اور آپ کو اس ملک کی قیادت کا مقام تفویض ہوگا(۱)۔

---

(۱) تحفۂ دکن، ص ۲۴ تا ص ۳۲

نزولِ قرآن کا مقصد
اور
حاملین قرآن کی ذمہ داریاں

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.﴾

(سورہ جمعہ: ۲)

اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز خواہ وہ حفظ ہو یا تجوید، تفسیر ہو، یا قرآن مجید کی تلاوت، بڑی معزز اور مکرم چیز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ساتھ ہی آپ کے منصب نبوت کے فرائض، اور اس کی ذمہ داری کے سلسلے میں فرمایا:۔

''وہ پاک ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں ایسا پیغمبر مبعوث فرمایا جو ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی تربیت فرماتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے''۔

منصب نبوت اور اس کا کام

رسول ﷺ کے منصب نبوت کے چار شعبے ہیں، جو گویا فرائض چہار گانہ ہیں۔

تلاوت آیات

تلاوت آیات پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کے شعبوں میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا ہے۔

تزکیہ نفس

دوسرا شعبہ یزکیھم، نفوس کی تربیت کرنا، مہذب بنانا، اخلاق رذیلہ نکالنا اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنا اور وہ وصف پیدا کرنا جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

"اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی، ایسے لوگ راہ راست پر ہیں"۔ (سورہ الحجرات: ۷)

نزول قرآن کا اہم ترین مقصد

قرآن مجید کے نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں،

کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے کہ لوگ اس کو پڑھ سکیں اور اس کو سنا سکیں، اس کو یاد کریں اور پڑھتے رہیں، بلکہ نزول قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، قلب اور نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی۔ صحابہ کرامؓ آپ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے، ان کے نفوس کیسے مصفی تھے، ان کی کیسی تربیت ہو چکی تھی کہ کفر و شرک کی نفرت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی، اور ایمان کی محبت اور ایثار کا مادہ ان کے اندر پیوست ہو چکا تھا عبادت کا ذوق ان پر غالب آچکا تھا، خدمت خلق کا جذبہ ان کے اندر نمایاں تھا، ان کے اندر نفسیات کا کانٹا نکل چکا تھا، جب دنیا ان کے اندر سے بالکل ناپید ہو چکی تھی، جب جاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا، صحابہ کرامؓ میں سے ایک ایک رسول اللہ ﷺ کے منصب تزکیہ کا زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ضرار بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں کہتے ہیں کہ میں شرک کی حالت میں اس نیت سے نکلا کہ وہ کام کروں جو قریش نہیں کر سکتے، یعنی معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی پر دست درازی کروں، موقعہ اچھا تھا آپ تنہا طواف کر رہے تھے، میں نے بھی طواف کرنا شروع کر دیا اور اس فکر میں رہا کہ ذرا کچھ موقع ہو کہ آپ کا اور میرا سامنا ہو جائے تو میں اپنا کام کروں، آپؐ نے مجھ کو دیکھ کر بلایا، میں حاضر ہوا آپؐ ہنسے اور آپؐ نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھا، خدا کی قسم آپؐ نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا کہ گویا سینہ کے اندر کی ساری آلائش نکل گئی، اس کے بعد وہاں سے گھر چلا آیا، ایک عورت جس کے یہاں جلسہ ہوا کرتا تھا اور محفل گرم ہوا کرتی تھی اور اس میں داستان آرائی و قصہ گوئی ہوتی تھی، میں رند مشرب تھا، اس عورت نے مجھے

دیکھا تو آواز دی، میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب میں مسلمان ہو گیا ہوں" ایسی فوری تبدیلی کے واقعات بھی بہت ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر تین دور گذرے ہیں، ایک دور مجھ پر ایسا گذرا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپؐ سے بڑھ کر مبغوض نہ تھی معاذ اللہ اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں اپنی عاقبت خراب کر لیتا، اللہ نے فضل فرمایا، موقعہ ہی نہیں ملا، اس کے بعد دوسرا دور مجھ پر ایسا گزرا کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر محبوب نہیں تھی، خدا کی قسم میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، اگر مجھ سے کوئی حضور اکرم ﷺ کا حلیہ پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا اس لئے کہ میری نظر آپ کے چہرہ مبارک پر جمتی ہی نہیں تھی اور مجھ میں آپؐ کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی، جب میں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور بیعت کی تو میں اپنا ہاتھ نکالتا ہی نہیں تھا، آپؐ نے فرمایا میرا ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! فرمائیے کہ میرے گزشتہ گناہوں کا کیا ہوگا؟ میں تو بہت سیاہ کار انسان ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے ما قبل کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، وحشیؓ جنہوں نے حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب، اللہ کے شیر کو خود شہید کیا تھا اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ آپ کو معلوم ہے، حضور ﷺ کے سامنے جب وہ آئے اور انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا تو آپ نے ان کی بیعت قبول کی، انہوں نے کلمہ پڑھا اور ایمان لائے، آپؐ نے فرمایا وحشی! اگر تم میرے سامنے بار بار نہ آؤ تو اچھا ہوگا، اس لئے کہ مجھے اپنے چچا یاد آجاتے ہیں۔ یہ قدرتی بات

بھی ہے اور بہت لطیف جذبہ، احساس اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت، لیکن انہوں نے جو کلمہ پڑھا اور آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے، اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیا، ایسی روحانیت پیدا کر دی جس پر آج بڑے بڑے اولیاء اللہ رشک کر رہے ہیں، یہی وحشی ہیں جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا، میں جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوں کہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کی بھی نگاہ انتخاب کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ایک ایسی ہستی سے اسلام اور مسلمانوں کو محروم کیا تھا جو اسلام کے لئے تقویت کا باعث تھی اور رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھی تو اس کی تلافی اور کفارہ کے لئے انہوں نے ایسی ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کے نزدیک مبغوض تھی، ایک وہ شخص تھا جو نبوت کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا، پھر ایک شخص تھا جو اس نبوت کے مقابلے میں سینہ تان کر آیا تھا اور منصب نبوت کا گویا حریف اور رقیب تھا۔ انھوں نے کفارہ کے لئے جو بہترین انتخاب ہو سکتا تھا انتخاب کیا، یقیناً حضور ﷺ کی روح مبارک ان سے خوش ہوئی ہوگی، یہ سب ان کی ایمانی قوت کا نتیجہ ہے، یہ تو فوری انقلاب کی چند مثالیں ہیں، باقی صحابہ کرامؓ کے اندر جو تبدیلی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوئی، اس سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے، اخلاقی پستی سے، اعمال کی پستی سے، عقائد کی تاریکی سے اور جاہلیت سے، روحانیت اور ایمان و اخلاق اور تربیت و علم کے بلند مقام تک پہنچ گئے۔

تعلیم کتاب

تیسرا شعبہ۔ کتاب و حکمت، یعنی کتاب کی تعلیم دینا، پہلے قاری تلاوت

کرتا ہے، پھر اس تزکیہ کا عمل کرتا ہے، اس میں قران مجید کی تفسیر اس کے حقائق کا بیان اس کے علوم کا اظہار اور مقاصد قرآن کی تشریح وتفصیل سب شامل ہے، یہ ہے **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** "ان کو سکھاتے ہیں کتاب اور حکمت"۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں، اس کے حاملین اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔

مَنْ يرِدِ اللهُ بِهِ خَيْراً يفقهُ فِي الدِّين.

"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے"۔

یہ در حقیقت حامل قرآن کے فرائض چہار گانہ اور حامل قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے کمالات اور اس کی سیرت ہے، اس کے بعد صحابہ کرام میں جو علماء تھے اور جن کے علم کی خود رسول اللہ ﷺ نے تعریف کی اور جن حضرات کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا۔ مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ آپؐ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیت بیان کی ہے کہ قرآن مجید سے ان کو خاص مناسبت تھی، حضرت زیدؓ بن ثابت کاتب وحی تھے، قرآن مجید کا بہت بڑا علم رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن مجید پڑھنے کی تعریف آپؐ نے خود فرمائی تھی، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق آپ نے دعا فرمائی:

"اللهم علمه الكتاب وفقهه فى الدين"

"اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما اور دین کی سمجھ دے"۔

یہ حضرات ان چاروں صفات کے جامع یعنی قرآن مجید کے قاری بھی تھے اور معلم الکتاب بھی تھے اور معلم حکمت بھی اور مزکی بھی تھے۔

پھر تابعین کا دور آیا اس دور میں بھی کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان چاروں چیزوں کے جامع تھے، مثال کے طور پر حضرت حسن بصریؒ کا نام لے سکتا ہوں کہ وہ ان چاروں شعبوں کے جامع تھے، اسی طرح سعید بن جبیر اور محمد بن سیرین اور حضرت سعید بن مسیبؒ، یہ وہ فضلائے تابعین تھے جو ان چاروں کمالات کے مظہر اور ان چاروں شعبوں کے جامع تھے، تبع تابعین میں بھی اسی طرح کی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئیں جو ان چاروں چیزوں کی جامع تھیں۔ جیسے ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء اور صوفیاء، تابعین جیسے حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت معروف کرخیؒ اور امام بن حنبلؒ اسی طرح سے جنید بغدادیؒ، یہ سب حضرات ان چاروں چیزوں کے جامع تھے۔

پھر انحطاط کا دوسرا دور شروع ہوا، شعبوں کی تقسیم ہونے لگی، نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں مختلف گروہ بن گئے اور ایک ایک شعبہ سنبھال لیا، بعض نے تلاوت آیات کو اپنا شعار بنالیا، انھوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تجوید اور مخارج کی تصحیح کی، اور اتقان کے ساتھ پڑھنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا، اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے کہ بہت بڑا فرض کفایہ ادا کیا اور قرآن مجید کے لطف اور طریقۂ ادا کو محفوظ کردیا جس طرح اس کے حروف کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور حضرت عثمان غنیؓ نے اس کی نقلیں کرا کے عالم اسلام میں بھیجی تھیں۔

بعض حضرات نے تعلیم کتاب وحکمت کو اپنا شعار بنایا۔ وہ علماء ظاہر کی جماعت ہے جنہوں نے قرآن وحدیث کے رموز کو بیان کیا، ان کے مضامین کی اشاعت کی اور ان کے مشکلات کی تشریح کی۔

تربیت و تزکیہ

بعض حضرات نے تزکیہ اپنے ذمہ لیا وہ حضرات صوفیائے کرام ہیں جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ان کے نفوس کی اصلاح و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب و اخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنادیا! ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثال کے طور پر سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ۔

تجدید سلوک

پھر ان کے بعد جنہوں نے فن سلوک کا کام کیا، اپنے زمانے کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبیعتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی کی تجدید کی، ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی، ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا اور اپنے زمانے کے مطابق ان کو بنایا اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔

حامل قرآن کی ذمہ داریاں

اصل میں حامل قرآن کا کام صرف تلاوت، اس کو پڑھ کر سنادینا، صحیح طور پر یاد

کر لینا اور اس کو صحت کے ساتھ ادا کر دینا اور کسی مجلس میں، کسی جلسہ میں قرآن مجید پڑھ دینا نہیں ہے، بلکہ حامل قرآن کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

''اس شخص کو عذاب دیا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا علم دیا وہ رات کو سویا رہا یہاں تک کہ صبح کی نماز قضا ہو گئی''۔

قرآن مجید کی بڑی ذمہ داری ہے، اس کو یاد کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی، اس پر عمل کرنے کی، یہی وجہ تھی کہ جب جنگ یمامہ پیش آئی، جو اسلام کی شدید ترین جنگوں میں ایک جنگ ہے، جس میں زور کا رن پڑا اور گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے، بس ایک موت کا بازار گرم تھا اور کسی طرح فیصلہ نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں ایک صحابی نے للکارا اور کہا اے حاملین قرآن اور وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن ہے آج قرآن پر عمل کر کے دکھاؤ اور قرآن پر قربان ہو جاؤ، اس لئے کہ اگر یہ ارتداد کا فتنہ نہ ختم ہوا تو قرآن مجید کا باقی رہنا مشکل ہے، چنانچہ جو حفاظ تھے وہ آگے بڑھے اور فیصلہ کر لیا، بے جگری کے ساتھ لڑے اور پروانوں کی طرح نثار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ. (سورہ عبس)

معلوم ہوا کہ حاملین قرآن کی یہ تصویر ''کرام بررۃ'' ہونا چاہئے، حاملین قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کی صف ہے بلکہ معلوم ہوا کہ جو قرآن مجید کو اٹھانے اور سینے میں رکھنے کا حوصلہ کرے، اس کو ایسا بننا چاہئے۔

''لَايَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اس قرآن مجید کو مطہر ہی

چھوڑیں۔ صحابہ کرامؓ سے جو لوگ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے اور جن میں قرآن مجید کا علم ہوتا تھا، وہ ممتاز اور اپنے اخلاق و تقویٰ اور عبادت میں دوسرے سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے حضور ﷺ جب میدان احد میں شہداء کی لاشوں کو دفن کرنے لگے تو قرآن مجید جس کو زیادہ یاد ہوتا اس کو پہلی صف میں رکھتے جاتے اور فرمایا کرتے:

یؤمکم من أقرأکم. "امامت وہ کرے جو زیادہ پڑھا ہوا ہو"

تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خالی حافظ ہو، جس کو قرآن مجید کا علم زیادہ ہو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفاظ کی بڑی ذمہ داری ہے۔

قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے

میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے، سر الٰہی ہے، علم الٰہی ہے، علم اعظم ہے، لوگ اسم اعظم کے پیچھے پڑتے ہیں، آپ کے سینہ میں علم اعظم ہے، اسی علم اعظم میں اسم اعظم بھی ہے، آپ تو حامل علم اعظم حامل اسم اعظم ہیں، رسول ﷺ نے قرآن کریم کی فضیلت میں فرمایا، ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی، اور میں نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:- خیر کم من تعلم القرآن وعلمه۔

دیکھ لیجئے قرآن مجید کے کیسے کیسے فضائل ہیں اگر حافظ تیس پارے پڑھے اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینہ میں پڑھے اور مسجد میں رمضان کی راتوں میں

پڑھے اور اس کے بعد سو دو سو پانچ سو روپیہ معاوضہ لے۔ حیرت کی بات ہے کیسے ایک انسان اس پر تیار ہو سکتا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے ایک روز بہت جوش میں آکر کہنے لگے خدا کی قسم اگر کوئی پورا ایک ملک پیش کرے اور کہے کہ پوری سلطنت لے لو اور ایک مرتبہ اللہ کہنے کا ثواب مجھے دے دو، واللہ میں راضی نہ ہوں گا اور ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے، اور اس عالم میں سب سے بڑی قیمتی چیز جس کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے وہ قرآن مجید ہے اور جو سب سے بڑی دولت اس آسمان کے نیچے ہے وہ قرآن مجید ہے، اس لئے کہ یہ اللہ کی نسبت ہے، اللہ کا کلام ہے، اس کو کلام قدیم کہتے ہیں یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ متکلم ہے اور یہ اس کا کلام ہے، اس سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اپنی قدر خود کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو آپ کے قدم زمین پر نہ پڑیں، کسی امیر کی کسی دولت کی وقعت آپ کے دل میں نہیں ہو سکتی، اگر ہوتی تو ہزار بار استغفار کرتے ارے میرے دل میں، میرے سینے میں اللہ کا پورا کلام ہے اور میں اس تاجر کو اس وزیر کو معزز سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے تھے کہ میرا دشمن میرا کیا بگاڑیں گے، میری جنت تو میرے سینہ میں ہے، وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے میں تو اپنی جنت لئے پھر رہا ہوں اللہ کا کلام، اللہ کا علم میرے سینہ میں ہے، میرا باغ تو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے کیا قید کریں گے، میں تو بالکل آزاد ہوں، جہاں بھی رہوں گا آزاد رہوں گا۔

روحانیت پیدا کرنے کے لئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے

کیوں ایک شخص کے اندر اتنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اتنی ترقی کرتا ہے اور ایک شخص وہ ترقی نہیں کرتا، فرق صرف عظمت اور اکتساب کا ہے، کلام اپنی جگہ عظیم ہے، لیکن اس کی عظمت کا استحضار بھی ضروری ہے، شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مثالوں کے بادشاہ تھے، عجیب عجیب مثالیں دیتے تھے اور اس کی مثال دینے لگے کہنے لگے کسی چیز کا ہونا اور چیز ہے اور اس کا علم حضوری اور چیز ہے، نواب محبوب علی خاں جو شاہ دکن تھے موجودہ نظام کے والد ان کی یہ عادت تھی کہ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے، تو ایک دن یونہی بھیس بدل کر شہر میں گشت کر رہے تھے، ایک تانگہ میں بیٹھ گئے، ان کے ساتھ دوسرے صاحب بھی تانگے میں بیٹھے چلے جا رہے تھے، دونوں بات کرنے لگے کہو بھائی! آج کل کیا خبر ہے؟ دوسرے صاحب یہ جان نہ سکے کہ یہ کون صاحب ہیں، انہوں نے کہا کہ آج کل گلی کوچہ محبوب علی خاں (جو ہمارے نواب صاحب ہیں) کے منھ پر ہر شخص تھوک رہا ہے اور انکو برا بھلا کہہ رہا ہے اور ایک قصہ جو اس زمانہ میں مشہور تھا وہ ذکر کر کے اس نے کہا آج کل یہ مشہور ہو رہا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں اور جو منھ میں آیا کہنا شروع کیا، محبوب علی خاں وہیں بیٹھے رہے، اس کے بعد انہوں نے بیڑی نکالی اور کہا دیا سلائی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں ہے، رات کا اندھیرا تھا اس نے جو ماچس جلائی تو پہچان لیا کہ

یہی محبوب علی خاں ہیں، بس اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رعشہ پیدا ہو گیا انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں۔

بزرگان دین چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں انہوں نے کہا محبوب علی خاں تو وہی تھے جو آکر بیٹھے، اس وقت محبوب علی خاں صاحب تھے جب پوچھا تب بھی محبوب علی خاں تھے جب اس نے کہا تب بھی محبوب علی خاں تھے اور اس وقت جب ماچس جلائی اور منہ دیکھا تو محبوب علی خاں بدل گئے تو اس پر ہیبت کیوں طاری ہوئی، وجود پہلے سے تھا علم اب حاصل ہوا، حالت ہی بدل گئی تو وجود قرآن تو وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا، جو آپ نے بچپن میں پڑھا، آپ نے جوانی میں پڑھا، جو آپ بڑھاپے میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے، جو آپ تہجد میں پڑھتے ہیں جو آپ تلاوت کرتے ہیں، وہی قرآن مجید ہے، اس میں ایک نقطہ کا اضافہ نہیں، لیکن جو آپ کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کس اللہ کا کلام جس کی صفت یہ ہے اور کون سا کلام جس کی یہ شان ہے اب آپ کی کیفیت اور یہ کیفیت ہو گئی۔

"اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا پھٹ جاتا"۔(الحشر)

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے، ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی اس سے ان لوگوں کی جلد جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں کانپ اٹھتی ہے۔ پھر ان کی جلد اور ان کے قلب اللہ کے ذکر کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں پیدا کرنا ہیں، ایک کلام اور صاحب کلام کی عظمت

دوسرے ثواب کی نیت اور ثواب کا یقین مل رہا ہے، بس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص اعلیٰ مقام ولایت تک پہونچ جاتا ہے۔

قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے

بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ سلوک کا آخری درجہ قرآن ہے، اور نوافل میں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے، جب سالک تمام مقامات طے کرلیتا ہے، جو ذکر سے طے ہوتے ہیں، اس کے بعد جو آخری درجہ قربِ الٰہی کا وہ کلامِ الٰہی کی کثرتِ تلاوت سے حاصل ہوتا ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے ہیں کہ جو قرب قرأت قرآن کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس قرب کو کوئی نہیں پہونچ سکتا، اور یہ قرب استحضار سے، عظمت سے اور ثواب کے یقین سے حاصل ہوتا ہے، پڑھتے جائیے اور یقین کرتے جائیے کہ ثواب مل رہا ہے، ہر حرف ہر سطر پر دس دس نیکیاں مل رہی ہیں، اس کا شوق آپ کے دل میں زیادہ ہونا چاہئے، جتنا زیادہ پڑھیں گے اتنی زیادہ نیکیاں ملیں گی، بس بھائیوں اگر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں تو قرآن مجید کی تلاوت میں روح پیدا ہو جائے۔

قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے

اور اگر اس کو پیشہ بنائیں تو اس سے بہت اچھا ہے کہ دنیا کو آدمی کا ذریعہ بنائے کسب معاش کا، قیامت کے دن وہ لوگ جو حلال روزی حاصل کرتے ہیں اور جائز طریقوں سے کاروبار کرتے تھے، ان دیندار قاریوں، حافظوں اور عالموں سے بدرجہا

آگے ہوں گے، جنہوں نے دین کو ذریعہ بنالیا تھا اپنا پیٹ بھرنے کا اور دنیا کمانے کا، تاجروں میں بکثرت اولیاء اللہ نکلیں گے، جو سمجھتے تھے ہم دنیادار ہیں صرف بچوں کے لئے پالنے اور اپنے پیٹ کے لئے ایک دھندہ کیا ہے اور اس میں ذکر کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، ڈرتے رہتے تھے، استغفار کرتے رہتے تھے، وہ کئی عالموں اور حافظوں سے بڑھ کر نکلیں گے جنہوں نے قرآن مجید کو اور علم حدیث کو صرف دُنیا کمانے کا ذریعہ بنایا۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے صحبت اور محنت ضروری ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو یہ دولت عطا فرمائی ہے، تو اس میں روح بھی، خشیت بھی اور تقویٰ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور یہ بات بغیر صحبت کے اور بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی، قرآن مجید کے یاد کرنے میں، جان ڈالنے میں اور موزونیت پیدا کرنے کے لئے بھی آپ کو محنت کرنی چاہئے، اگر آپ نے قرآن مجید کو یاد کرنے میں دو برس لگائے تو سچی بات یہ کہ اس میں چار برس لگایئے، اس لئے کہ وہ تو الفاظ ہیں جس کو کافر و مومن سب پڑھ سکتے ہیں اور بے شک کافر کو یاد ہونا مشکل ہے، لیکن یاد ہوتا ہے، اب بھی مصر و شام میں کتنے غیر مسلم ایسے ہیں جن کو قرآن مجید یاد ہے، المنجد، کا مصنف جو عیسائی تھا وہ حافظ تھا، تو معانی قرآن، علوم قرآن اور قرآن مجید کو دل میں راسخ کرنے کے لئے، اپنے اخلاق کو صحیح کرنے کے لئے آپ کو وقت لگانے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سفر میں قرآن مجید میں جو بات حاصل ہوتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے وہ گھر پر نہیں آتی تو حضرت بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو مخاطب کیا کہ دیکھو مولانا کیا کہہ رہے ہیں، یہی سچی بات ہے۔

میدان جہاد میں جن لوگوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور خدمت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور محنت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا ان کی سمجھ تو ہمارے یہاں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو قرآن مجید کی تعظیم کرنے کی، اس پر عمل کرنے کی اور اس کا لطف لینے کی اور اس سے قرب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین۔(۱)

---

(۱) (بانگ درا لکھنؤ مارچ ۱۹۹۹ء)

باب ۹

نبیٔ رحمت اور مقدس مقامات

"نظام عالم نہ حکومتوں سے مربوط ہے نہ تنظیمات سے، نہ فوجی طاقت سے...... نہ اخلاقی فلسفوں اور تہذیبوں اور علمی مرکزوں سے مربوط ہے۔ نظام عالم (جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہونچ سکتیں) بیت اللہ شریف سے اور اس دعوت سے مربوط ہے جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا...... جس کے داعی اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور جس کے مجدد وخاتم اور مکمل ومحافظ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور جن کی نمائندگی بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کرتی ہے۔"

(حضرت مولانا علی میاں ندوی مدظلہ العالی)

سب سے زیادہ پیارا لفظ

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."-الانبیاء-۱۰۷

اس آسمان کے شامیانے کے نیچے، زمین کے فرش پر، آفتاب کو قندیل بنا کر، چاند کو شمع بنا کر ایک سوال کیا جائے کہ بتاؤ سب سے زیادہ پیارا لفظ کون سا ہے تو میں سمجھتا ہوں اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سب کی طرف سے جواب ہوگا کہ "رحم"۔

ایک چیز جس کا دنیا میں کوئی شاکی نہیں، کوئی اس کا فریادی نہیں، کوئی اس پر تنقید کرنے والا نہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا مارا ہوا ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا زخمی ہوں۔

وہ ہے صرف رحم دل، وہ ہے صرف رحم۔

رحم کا ہر ایک محتاج ہے

کون ہے دُنیا میں جو آج بتادے، مخالفوں میں بتادے، ہمنواؤں میں بتادے، فاتحوں اور مفتوحوں میں بتادے، جاہلوں اور عالموں میں بتادے، غبی اور ذہین انسانوں میں بتادے، پسماندہ اور ترقی یافتہ قوموں میں بتادے؟ کہ اس کو رحم کی ضرورت نہیں، اس کو رحم سے انکار ہے، اس کو رحمت نہیں چاہئے؟ ایسا وقت آتا ہے کہ آدمی کو طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی، علم کی

ضرورت نہیں رہتی، لیکن کوئی ایسا وقت نہیں کہ جس میں آدمی کو رحم کی ضرورت نہ ہو، رحمت کی ضرورت نہ ہو، رحم کا ہر ایک محتاج، ہر ایک قدر دان۔

کس چیز کی کمی ہے مولیٰ تیری گلی میں......

اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں، کیا اللہ تعالیٰ نہیں کہہ سکتا تھا کہ "آپ کو ہم نے دنیا کا فاتح بنا کر بھیجا۔" ایسا فاتح جس کے غلاموں نے دنیا کا سب سے بڑا امپائر قائم کیا، انھوں نے مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں اپنی کامیابی کے پرچم لہرا دیئے، ان کی حکومت کا جھنڈا چاہے نہ لہراتا ہو، سکہ چاہے نہ چلتا ہو لیکن غلامانِ محمدؐ کے محبت کے قلمرو میں ساری دنیا شامل تھی۔"

"جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتحِ زمانہ"

جو تہذیب انھوں نے پھیلائی، جو علوم انھوں نے پیدا کیے، علم کے جو دریا بہائے، محبت کے جو چشمے رواں کیے، اس کے بعد آپؐ کو انسانیت کا سب سے بڑا فاتح، سب سے بڑا معلمِ اخلاق، سب سے بڑا معلم کہنا بالکل صحیح ہے، اگر خدا یہ کہتا ہے کہ اے محمد ﷺ ہم نے آپ کو دنیا کا مصلح اور معلم بنا کر بھیجا تو دنیا کے گوشے سے یہ آواز نہیں اٹھتی کہ "ہمیں اس میں شک ہے" ساری دنیا کے علماء فضلاء، فلاسفہ، مفکرین، مؤرخین، ناقدین سر جھکا کر کہتے کہ آمنا و صدقنا، بے شک آپ دنیا کے سب سے بڑے معلم اور سب سے بڑے مصلح ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرما سکتا تھا "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا مُعَلِّماً لِّلْعٰلَمِيْنَ" ہم نے آپ کو سارے جہانوں کا معلم اور مصلح بنا کر بھیجا، اس طریقہ سے اور بہت سی صفات ہو سکتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی صفات اور اس سے جو کام لینا ہے اس کی حقیقت جس لفظ میں سمیٹ کر آ سکتی ہے وہ استعمال فرماتا ہے۔ "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

صفت رحمت، اللہ تعالیٰ کی محبوب صفت ہے، سورہ فاتحہ کا آغاز بھی اس نے اپنی اسی

صفت سے کیا ہے، بسم اللہ میں بھی یہی صفت غالب ہے، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اِلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ..................

...... قرآن مجید میں ہے "رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ" (میری رحمت سب پر حاوی ہے) دنیا کے رسول ﷺ کے دامن سے جو کچھ ملا، جو انعام ملا، جو تحفہ ملا، جو زندگی ملی، اس کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا، "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ."

سب سے اہم، سب سے بنیادی، سب سے عزیز، سب سے محبوب، سب سے زیادہ فراوانی کے ساتھ جو چیز ہر برادری، ہر طبقہ، ہر ملک، ہر قوم کو پوری فیاضی سے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ملی وہ ہے "رحمت" آپ کے ذریعہ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے، ساری نسل انسانی ہری ہو گئی ۔

رہے اس سے محروم، آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

مردوں پر آپؐ نے احسان کیا، عورتوں پر آپ نے احسان کیا، غلاموں پر آپ نے احسان کیا، غریبوں پر آپ نے احسان کیا، جانوروں پر تک آپ نے احسان کیا، اگر ان احسانات کا ذکر کروں تو پوری رات گذر جائے، قرآن مجید اور سیرت کی کتابوں کا آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کی شفقت واحسان سے ہر طبقہ زیر بار ہے۔

اس سے بڑھکر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب

جس نے ظلم کرنے سے روکا، مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دینے کا حکم دیا، جس نے سچے تاجر کو پیغمبروں کے قرب کی شہادت دی، جس نے یتیم کی پرورش کرنے والے کی فضیلت بیان کی، جس نے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی ہدایت فرمائی، جس نے غلاموں کو آقا کا ہمسر بنایا، جس نے رنگ ونسل کے امتیاز کو ختم کیا، جس نے قیدیوں کے

ساتھ رحم کا معاملہ فرمایا، وہی ہے رحمتِ عالمؐ، اس کا پرتو زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کو نظر آئے گا، فوجیوں کو ہدایت کی کہ زخمیوں کا کام تمام نہ کرنا، عابدوں زاہدوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، عورتوں اور بچوں کو ایذا نہ پہونچانا، پھلدار درختوں اور ہرے بھرے کھیتوں کو نہ اجاڑنا، کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہونچانا۔

وہ تو سراپا رحمت ہے، اس وقت کی دنیا اور موجودہ نسل انسانی آپ کو خدا کا پیغمبر مانے یا نہ مانے، لیکن سب کے سب آپ کے احسان کے سائے تلے ہیں، سب آپ کے احسانات کے مقروض ہیں، چھٹی صدی مسیحی میں پوری نسلِ انسانی اپنی افادیت کھو چکی تھی، انسانوں سے آباد ملک، جانوروں کے جنگل بن گئے تھے، بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی تھی، طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا، عام انسان غلامی کے لئے اور شہنشاہ اور امراء عیش و عشرت کے لئے زندہ تھے، آپ "تاریخ زوالِ روما" پڑھئے، آپ "تاریخ اخلاق یورپ" پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ ظلم وسفاکی اور عیش و عشرت کے کیا نقشے تھے، امیروں کی دعوت میں رات کے وقت غریبوں کے جسموں سے چراغاں ہوتا تھا، انسانوں کے جسم کی مشعلیں جلتی تھیں، چند امیر لذتِ کام ودہن میں مصروف رہتے تو چند غریب انسان جل جل کر، تڑپ تڑپ کر وہیں دم توڑتے، ہماری اس دنیا میں ظلم کی کیسی کیسی داستانیں، کیسے کیسے واقعات ہوئے، کوئی سکندرؔ اور سیزر بن کر دنیا کو تہہ تیغ کر رہا تھا، کوئی نیروؔ کے روپ میں روم کو آگ لگا رہا تھا، ہوس ملک گیری میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کبڈّی کھیلی جا رہی تھی، دنیا نے خدا کے دربار میں نالش کر دی تھی کہ ہمیں ختم کر دیا جائے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ ہماری اب ضرورت نہیں، ہم وحشی بن گئے ہیں، خدا کو سب بھلائے ہوئے تھے، انسان انسان کا معبود بن گیا تھا، ساری دنیا میں فساد عام تھا، بڑی بات یہ تھی کہ برائیوں کو ہنر سمجھا جا رہا تھا، جیسا کہ ہمارے عزیز مولوی اسحاق جلیسؔ صاحب نے کہا، برائیاں تو ہر زمانے میں رہی ہیں، لیکن یہ دور ایسا تھا کہ برائیوں

سے لڑنے والا، ان سے پنجہ آزمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا، بے شک شاعری تھی، ذہانت تھی، ایران میں بڑے بڑے پہلوان تھے، لیکن برائی کی کلائی موڑنے والا کوئی نہیں تھا، ہر شخص پر مایوسی طاری تھی، یہ دنیا کسی کی بات ماننے والی نہیں تھی، یہ آسانی سے برائی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی، بادشاہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے، فلسفی کسی کو وقعت نہ دیتے، شاعر کسی کا نام نہ لیتے، سب سہمے ہوئے تھے، ڈرے ہوئے تھے، ایسے ٹھٹھرے ہوئے تھے گویا برف اور سخت سردی پڑ رہی ہو کہ رحمتِ الٰہی کو جوش آیا ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ

وہ نبیٔ رحمت تشریف لائے جن کو قرآن مجید نے کہا:

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

رحمۃ للعالمین ﷺ

"وَمَا أَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

مگر نہ آیا کوئی رحمت عالم بنکر

میں نے آپ کے سامنے سورہ انبیاء کی ایک آیت پڑھی ہے، اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ (ﷺ) "ہم نے آپ کو سارے جہاں اور سارے جہان والوں کے لئے محض رحمت بنا کر بھیجا ہے" یہ خدا کی طرف سے ایک حیرت انگیز (اور اگر رحمت کی روح اور مفہوم کے منافی نہ ہوتا تو میں کہتا کہ) ایک تہلکہ خیز اعلان ہے، یہ اعلان اس صحیفہ میں کیا گیا ہے، جس کے لئے تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ وہ دنیا کے ہر حصہ میں (اور اپنے نزول کے بعد) تاریخ انسانی کے ہر دور میں پڑھا جائے گا، اس کے پڑھنے والے بھی لاکھوں کروڑوں انسان ہوں گے، اس پر غور کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے، اس کے اسرار اور رموز بیان کرنے والے، اس کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کی تحقیق کرنے والے، اس کو تنقید اور شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے والے، اور اس کو علم و تحقیق کی ترازو میں تولنے، اور اس کو واقعات کی کسوٹی پر کسنے والے انسانوں کا سلسلہ بھی قیامت تک ختم نہیں ہوگا، ایک شخص ایک بیان جاری کرتا ہے، کئی مضمون نگار کسی اخبار یا

رسالہ میں (جس کی زندگی عام طور پر مختصر اور پڑھنے والوں کا حلقہ اکثر محدود ہوتا ہے) کوئی مضمون لکھتا ہے، تو...... اسکو اس اندیشہ سے کئی کئی بار غور کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ترازو میں تول تول کر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی اس کی تردید نہ کردے، اور اس کی صداقت کو چیلنج نہ کردے، کتابوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے کہ ان کی عمریں عام طور پر اخبارات ورسائل سے زیادہ طویل ہوتی ہیں، اور بعض اوقات سالہاسال تک وہ لوگوں کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور کوئی کوئی کتاب صدیوں تک بھی زندہ رہتی ہے اس میں کسی بات کو درج یا کسی چیز کا دعویٰ کرتے ہوئے مصنف کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوتا ہے، وہ لکھنے کیلئے قلم اٹھاتا ہے تو اس کو پہلے کسوٹی پر کستا ہے، اور دیکھتا ہے کہ اس دعویٰ یا اعلان کا پڑھنے اور سننے والوں پر کیا ردِ عمل ہوگا، اس کے بعد غور کیجئے کہ خدائے عالم الغیوب ایک ایسی کتاب میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جس کے متعلق وہ خود ہی کہتا ہے کہ:-

لَايَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَامِنْ خَلْفِهِ، تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْد. (حم سجدہ: ۴۲)

اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

اور جس کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ. (الحجر: ۹)

بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

اس اعلان کی وسعت و عظمت اس کے زمانی و مکانی رقبہ کا طول و عرض دونوں ایسی غیر معمولی باتیں ہیں جن سے سرسری طور پر گزرا نہیں جاسکتا۔

زمانی رقبہ سے مرادیہ ہے کہ بعثت محمدی سے لیکر قیامت تک جتنی نسلیں دنیا میں آئیں گی اور تاریخ کے جتنے دور گزریں گے یہ اعلان ان سب پر حاوی ہے اور یہ آیت اس پورے زمانی رقبہ کو جو ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے۔ گھیرتی (Cover) کرتی ہے۔

مکانی رقبہ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو جزیرۃ العرب کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یا مشرق کے لئے یا کسی براعظم مثلاً ایشیا کے لئے پیام رحمت بنایا ہے، اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ یہ رحمت ساری دنیا پر محیط ہے گویا اردو کے شاعر حالیؔ کی زبان میں ؎

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

واقعہ یہ ہے کہ اس اعلان کی وسعت، عمومیت، عظمت اور لامحدودیت کے سامنے دنیا کے سارے مؤرخین، فلاسفہ، مفکرین، مصنفین بلکہ پورے فکر انسانی کو انگشت بدنداں، حیرت زدہ اور ششدر ہو کر کھڑا ہو جانا چاہئے، اور ایک بار سب کام چھوڑ کر اس واقعہ کی تصدیق اور اس اعلان کی صداقت کی تحقیق میں مصروف ہو جانا چاہئے، مذاہب ہی کی تاریخ میں نہیں، تمدنوں اور فلسفوں ہی کی تاریخ میں نہیں، اصلاحی اور انقلابی تحریکوں اور کوششوں ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی اور پورے انسانی لٹریچر میں ایسا پر از اعتماد، ایسا واضح اور بے لاگ، ایسا عمومی و عالمگیر اعلان، کسی شخصیت یا کسی مذہب و دعوت کے متعلق نہیں ملتا، مذاہب عالم کی تاریخیں، انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں اور تعلیمات کا جو ریکارڈ دنیا میں محفوظ ہے وہ بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

"رحمت" ہماری روزمرہ زندگی کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے

کسی چیز کی اہمیت و عظمت اور قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے عام طور پر دو پیمانے

ہوتے ہیں ایک اس کی تعداد اور مقدار جس کو ہم جدید علمی اصطلاح میں "کمیت" یا QUANTITY کے لفظ سے ادا کرتے ہیں، اور ایک کسی شئ کا جوہر یا صفت ہے جس کو اصطلاحاً "کیفیت" (QUALITY) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ قرآنی اعلان جو محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا گیا ہے ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، یعنی آپ کی بعثت و نبوت، آپ کے وجود گرامی، اور آپ کی تعلیمات سے انسانیت کو جو فیض پہنچا۔ اس کو حیات نو کا جو پیغام ملا اور اس کی بیماریوں کا جو مداوا، اس کے مصائب کا جو خاتمہ ہوا اس پر رحمتوں اور برکتوں کا جو دروازہ کھلا وہ اپنی وسعت و کثرت اپنی مقدار و کمیت (QUANTITY) کے اعتبار سے بھی اور اپنی نوعیت وافادیت، اپنے جوہر و کیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے بھی بے نظیر و بے مثال ہے۔ "رحمت" ہماری روزمرہ زندگی کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے کسی انسان کو فائدہ یا راحت حاصل ہو، اس کے انواع واقسام اور اس کے مراتب و درجات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگر کوئی کسی کو پانی پلا دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے، اگر کوئی کسی کو راستہ بتا دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے، اگر گرمی میں کوئی کسی کو پنکھا جھل دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے۔ ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی ہے، باپ اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے اور اس کے لئے زندگی کا ضروری سامان مہیا کرتا ہے، وہ اس سے بھی بڑی ایک "رحمت" ہے، استاذ طالب علم کو پڑھاتا ہے، اس کو علم کی نعمت بخشتا ہے، یہ بھی ایک بڑی قابل قدر "رحمت" ہے، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا سب "رحمت" کے مظاہر ہیں اور سب کا اعتراف ضروری اور شکریہ واجب ہے۔

رحمت کا مظہر

لیکن "رحمت" کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ کسی جاں بلب مریض کی جان بچالی جائے۔ ایک بچہ دم توڑ رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب آخری ہچکی لے گا، ماں رو رہی

ہے کہ میرا لال دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہو سکتا، باپ مار امار اپھر رہا ہے، اور سر پھوڑ رہا ہے، سب بے بس معلوم ہوتے ہیں کہ اچانک ایک طبیب حاذق فرشتۂ رحمت بن کر پہنچتا ہے اور کہتا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں! وہ دوا کا ایک قطرہ بچہ کے حلق میں ٹپکاتا ہے، وہ آنکھیں کھول دیتا ہے سب اس کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ کہیں گے اور وہ ساری رحمتیں جن کا میں نے نام لیا۔ اس "رحمت" کے سامنے مات ہو جائیں گی، اس لئے کہ یہ اس مریض ہی پر نہیں، بلکہ اس کے چھوٹے سے کنبہ اور اس سے محبت کرنے والوں پر بھی احسان عظیم ہے کہ اس کی جان بچائی گئی، کوئی نابینا چلا آرہا ہے راستہ میں کوئی خندق یا کوئی کنواں پڑ گیا قریب ہے کہ اس کا اگلا قدم اسی خندق یا کنویں میں ہو، اللہ کا ایک بندہ عین وقت پر پہنچتا ہے اور وہ اس کی کمر پکڑ لیتا ہے اور اس کو اس خندق میں گرنے سے بچا لیتا ہے تو وہ اس کے حق میں فرشتہ کہلائے گا۔ ایک نوجوان جو اپنے باپ کی آنکھ کا تارا اور اپنے کنبہ کا سہارا ہے دریا میں ڈوبنے لگا وہ غوطے کھا رہا ہے کوئی گھڑی ہے کہ وہ تہ نشین ہو جائے، ایسے میں کوئی اللہ کا بندہ اپنی جان پر کھیل کر کود پڑتا ہے اور اس کی جان بچا لیتا ہے، اس کے ماں باپ اور بھائی فرطِ مسرت اور احسان مندی کے جذبہ سے اس سے لپٹ جاتے ہیں اور ساری عمر اس کا احسان نہیں بھولتے۔

لیکن "رحمت" کا آخری مظہر یہ ہے کہ پوری انسانیت کو ہلاکت سے بچایا جائے، پھر ہلاکت ہلاکت اور خطرہ خطرہ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے، ایک عارضی ہلاکت اور تھوڑی دیر کا خطرہ ہے، ایک ابدی ہلاکت اور دائمی خطرہ ہے، خدا کے پیغمبر انسانوں کیساتھ "رحمت" کا جو معاملہ کرتے ہیں وہ ان رحمتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ زندگی کا موج سمندر، یہ زندگی کا طوفانی دریا، جو انسانوں اور افراد ہی کو نہیں، قوموں اور ملکوں کو غرق کر چکا ہے، تہذیبوں اور تمدنوں کو لقمۂ اجل بنا چکا ہے جس کی موجیں نہنگوں کی طرح منہ پھیلا کر بڑھتی اور بپھرے

ہوئے شیر کی طرح انسانوں پر حملہ کرتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کہ اس بے رحم دریا سے کس طرح پار اترا جائے اور انسانی قافلہ کو ساحل مراد بلکہ ساحل نجات پر پہنچایا جائے، نوع انسانی کا سب سے بڑا محسن اور اس کا نجات دہندہ وہ قرار پائے گا جو انسانی کشتی کو جو ڈانواڈول ہو رہی ہے، جس کے سوار موجود ہیں لیکن ملاح مفقود، ساحل تک پہنچا دے۔ نوع انسانی ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کو علم و فن کا تحفہ دیتے ہیں وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جنھوں نے اس کی زندگی کو پُر راحت بنایا اور اس کی زندگی کی مشکلات کو ختم یا کم کیا۔ وہ کسی کے احسان کی ناقدری نہیں کرتی، لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو دشمنوں سے بچایا جائے جو اس کی جان کے دشمن ہیں اور اس کی کشتی پار لگائی جائے............

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا اس حالت میں خدا نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ارشاد ہوا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ. اور (اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔(۱) (سورہ انبیاء:)

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
مگر نہ آیا کوئی رحمت عالم بن کر

---

(۱) محسن عالم ﷺ ص ۵ تا ص ۲۳ باختصار ماخوذ ہے۔

مخلوق کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کی غیر معمولی شفقت

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْم فَاِنْ تَوَلَّوْ فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم. (التوبہ: ۱۲۸)

"(اے لوگو!) تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں۔ (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔"

رحمت بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور رحم بھی عربی کا لفظ ہے لیکن اردو میں رحم کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے، رحمت اور رحم کے معنی ہیں ترس کھانا، دوسرے کی مدد کرنا اور دوسرے کی تکلیف کو محسوس کرنا، اس کی تکلیف سے انسان کو تکلیف ہونا اور اس کی تکلیف کو دور کرنے کی خواہش اور کوشش کرنا۔ یہ معنی ہیں رحم اور رحمت کے۔ یہ اچھے انسان کی فطرت ہے۔ اگرچہ یہ اللہ کی صفت ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صفت درجہ بدرجہ انسانوں کو عطا فرمائی

ہے اس کا سب سے بڑا حصہ اس نے اپنے پیغمبر رسول پاک رحمۃ للعالمین ﷺ کو عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ.

اے ایمان والو تمہارے پاس ایک ایسا پیغمبر آیا ہے جس بات سے تم کو تکلیف ہو اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے، تمھاری اس کو بڑی فکر ہے۔ ایمان والوں کے ساتھ بہت ہی مہربان بہت ہی شفقت والے۔

اگر تمھارے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ جس سے تم مشکل میں پڑو دشواری میں پڑو وہ اس کو شاق ہے وہ اس کو پسند نہیں حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ تمھاری اس کو بڑی فکر ہے، اس کو تمھارا بڑا دھیان ہے۔ ایمان والوں کے ساتھ بہت ہی مہربان بہت ہی شفقت والے۔

ہم کو اور آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر کسی اور کی شفقت نہیں، ماں کی مامتا دنیا میں ضرب المثل ہے، اگر کوئی عورت، اگر کوئی انسانی ہستی اگر دنیا کی کوئی بھی مخلوق ماں کی محبت سے بڑھ کر دعویٰ کرے تو سب اس کو جھوٹا کہتے ہیں، جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس پر اعتماد نہیں کرتے، اور اس کو بناوٹ، نفاق اور جھوٹا دعویٰ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بچے کی محبت ماں کے دل میں ڈال دی ہے۔ جب سے یہ نظام عالم قائم ہے، یہ محبت رہی ہے۔ اس نظام عالم میں جسمانی پرورش کا نظام ایک خاص اسٹیج پر چل رہا ہے۔ جس طریقے سے ہمارا یہ جسمانی نظام چل رہا ہے اسی طرح سے روحانی اخلاقی تربیت کا نظام پیغمبروں سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی محبت اور شفقت عطا فرمائی ہے کہ اس محبت اور شفقت کے سامنے ماں باپ کی محبت سچ پوچھیے تو گرد ہے، ماند ہے، ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ پیغمبروں کے دل میں اپنی امت کی کس درجہ محبت اور شفقت ہوتی ہے۔ وہ کس طرح سے ان کے دل کی تکلیف کو

محسوس کرتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں، ان کے تلوے میں کانٹا چبھتا ہے، انگلی میں ان کے جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگتی ہے تو اس کی خلش وہ سارے جسم میں محسوس کرتے ہیں۔ اپنے امتی کے ساتھ ان کا کیسا تعلق ہوتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میں نے جو آپ کے سامنے آیت پڑھی آپ کو مسلمانوں کی حیثیت سے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم دیا ہے سیرت کا، آنحضرتؐ کے حالات سے ہم کو تھوڑی واقفیت ہے تو ہم اس کی لفظ بہ لفظ نہیں، حرف بہ حرف نہیں بلکہ نقطہ بہ نقطہ تصدیق کریں گے۔ لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ. فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

(ایسا پیغمبر آیا ہے جو تمھیں میں سے ہے اور اگر وہ ہم میں سے نہیں ہوتا تو اس کو ہمارے درد و دکھ کا احساس نہ ہوتا، ہماری مشکلات کو وہ نہ جانتا، اسے جانتا بھی تو اس مشکل میں شریک نہ ہوتا۔ انسان کا درد انسان محسوس کرتا ہے، بھائی کی تکلیف بھائی محسوس کرتا ہے۔ ایک گاؤں کے رہنے والے، ایک دوسرے کے دکھ درد کو جانتے ہیں، ایک گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، ریاست، صوبہ، ملک تو بڑی چیز ہیں اور دنیا تو بعد میں بنتی ہے ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوگ بھی بسا اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے جو تم میں سے ہے، تمھاری جنس میں سے ہے۔ یعنی جس چیز سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو وہ اس کو شاق گزرتی ہے وہ اس کو برداشت نہیں ہوتی۔ وہ اس کو کھل جاتی ہے۔ اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ جس سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو، تمھاری شفقت، تمھارے درد سے، تمھاری بے چینی سے وہ بے چین ہوتا ہے۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اس کو تمھاری بڑی فکر ہے، تمھاری دُھن اس کو لگی ہوئی ہے کہ تم اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ۔ اللہ کی رحمت تم پر رہے، مغفرت رہے، اس کی تھوڑی سی غفلت سے تمھارا

دامن کہیں خالی نہ ہو جائے۔ کفر کا کلمہ تمہارے حلق سے اترنے نہ پائے۔ انسان جہنم کے حلقے میں شامل نہ ہونے پائے۔ شیطان کے حلقے میں جانے نہ پائے اور خدا کے دین کی خدمت چھوٹنے نہ پائے بس جو بھی انسان ہے وہ انھیں میں آجائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جھولی میں آجائے۔

ایمان والوں کے ساتھ نہایت شفقت کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ آنحضرتؐ کی اپنی امت کے ساتھ جو تعلق تھا، فکر تھی جو درد تھا اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کس درجے کی تھی، بس یوں سمجھئے کہ جیسے ایک ماں کی ایک اولاد ہو، ماں کا ایک چھوٹا بچہ ہو، اکلوتا اور ساری زندگی کا سہارا اور سارے گھر کا چراغ، اس ماں کو جیسے اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے اس کی ترقی سے خوشی ہوتی ہے، اس کی تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے تو سمجھئے ایسا ہی تعلق ایک پیغمبر کو اپنی امت کے ساتھ ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپ کا تعلق تھا، یہاں تک وہ لوگ جو مکہ کے رہنے والے تھے ان میں سے بعض آپ کے عزیز تھے اور بعض ان میں سے اہل شہر تھے، مگر بدر میں قیدیوں کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو نماز میں بھی آپ بے چین رہے۔ نماز سے آپ کو جو عشق تھا، نماز میں جو مزہ ملتا تھا اور جو طمانیت ہوتی تھی خدا کی طرف توجہ ہوتی تھی اس کا اندازہ ہم آپ کر ہی نہیں سکتے۔

آپ فرماتے ہیں **قرۃ عینی فی الصلوٰۃ** میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ آپ بلالؓ سے فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ!

بلالؓ آپ کے موذن تھے، دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں، وہاں کیسی باتیں ہوں گی، اچھی باتوں کے سوا وہاں اور کیا ہو سکتا تھا، اسلام کی تبلیغ کی باتیں، اسلام کو پھیلانے کی تدبیریں، کوششیں اور علم قرآن وحدیث، لیکن آپ کے نزدیک نماز کا جو مقام تھا، نماز سے جو تعلق تھا، آپ نماز کیلئے بے چین ہو کر بلالؓ سے کہتے۔ اے بلالؓ! اذان کہہ کر ہم کو آرام دو، بہت انتظار کیا، اب انتظار نہیں ہوتا، بلالؓ خدا کے لئے اذان دو تاکہ ہم کو سکون حاصل ہو، تاکہ ہم

کو آرام ملے، بس نماز سے آپ کا یہ تعلق تھا اور امت کے ساتھ آپ کا جو تعلق تھا۔ آپؐ کہتے ہیں کہ میں کبھی کبھی نماز میں ہوتا اور پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی، دل تو چاہتا کہ نماز لمبی کروں، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں، اپنے خدا کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ لمبے لمبے سجدے کروں۔ خوب اس سے باتیں کروں، خوب اس سے دعائیں کروں، اس کا نام لوں، اچھی طرح سے اس کو پکاروں، راضی کروں اور مناؤں، لیکن اس بچے کی آواز کان میں آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں بھی نماز میں ہوگی۔ اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتی تھیں، اور وہ زمانہ فتنہ وفساد کا زمانہ نہیں تھا۔ خیر القرون کا زمانہ تھا، اس لئے عورتوں کو اجازت تھی کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ، اپنے باپ کے ساتھ، اپنی اولاد کے ساتھ وہ بھی اللہ کے گھر آئیں اور نماز پڑھیں، آپ فرماتے ہیں کہ نماز میں ہوتا ہوں اور میرا اس وقت ارادہ ہوتا ہے کہ اپنے خدا سے دل کھول کر مانگوں گا، دل کھول کر دعائیں مانگوں گا، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں گا، اتنے میں کان میں ایک بچے کی آواز آتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس کی ماں نماز میں ہو اور اس کا دل بے چین رہے گا، اس کا دل نماز میں نہ لگے گا، وہ اپنے بچے کو جلد لینا چاہے گی، اس وقت میں نماز مختصر کر دیتا ہوں، بھائیو اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہو سکتا ہے، ہم کو نماز سے اس قسم کا تعلق کہاں ہے، جن لوگوں کو نماز سے تعلق ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی قربانی ہے۔ یہ ہمارے رسول پاکؐ کی کتنی بڑی قربانی تھی، وہ نماز میں دنیا و آخرت سے بے خبر ہو جاتے تھے، آپؐ کو نماز میں بالکل یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے، آپ اپنے خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر رونے، مانگنے اور گڑگڑانے میں مصروف رہتے، اس میں آپ ایک بچے کی آواز سے نماز کو مختصر کر دیتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، آپ کا امت کے ساتھ یہ حال تھا، آپ نے فرمایا۔ اے مسلمانو! میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے

کہ جیسے ایک شخص نے الاؤروشن کیا، بہت ہی تیز آگ جلائی، جیسے کہ جنگلوں میں آگ ہوتی ہے، لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر تاپتے ہیں برسات کی راتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا آگ کے پاس کیا ہوتا ہے، پروانے آکر گرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں آکر جمع ہوجاتے ہیں ایک بتی روشن کردیجئے بس کافی ہے، روشنی پھیلتے ہی خدا جانے کون ان کو خبر کردیتا ہے، وہ آتے ہیں امنڈ آتے ہیں، بادلوں کی طرح امنڈ آتے ہیں وہ سب کے سب آگ میں آکر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تمھاری مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی نے الاؤروشن کیا اور پتنگے آکر اس پر گرنے لگے اسی طرح سے تم جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو، اے انسانو! تم جہنم کی آگ میں، دوزخ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمھاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو آگ سے ہٹاتا ہوں، یہ آپ کی اپنی امت کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، امت کے ساتھ آپ کو الفت تھی، ایسی الفت کہ اللہ تعالیٰ کو قرآن مجید میں کہنا پڑا۔ سورہ کہف میں آیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلىٰ آثَارِهِمْ، اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفاً.

کیا تم جان دے دو گے ان انسانوں کے پیچھے، کیا تم اپنا گلا گھونٹ لو گے انکے اسلام نہ لانے پر، ایمان نہ لانے پر؟

آپ کو یہ فکر تھی کہ آپ کی امت میں سے کوئی بھی جہنم نہ جانے پائے، سب جنت کے مستحق ہوجائیں۔(۱)

---

(۱) ا۔ تحفہ بھٹکل ص ۲۶ تا ص ۳۳،

۲۔ شفاخانے رحمت کا مظاہرہ ص ۷-۹ سے مشترک طور پر اخذ و تلخیص ہے۔

بلد امین (مکہ) کی خصوصیات

اور شعار و دعوت

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِناً وَّاجْنُبْنِی وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَام. (سورہ ابراہیم: ۳۵)

اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کیلئے) امن کی جگہ بنادے، اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کا دائمی پیغام، نشان اور شعار، اور اس کی دعوت چار اجزاء پر مشتمل ہے۔

۱۔ توحید خالص کی دعوت جو "وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَام" (الیٰ قولہ تعالیٰ "وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ.)" سے عیاں ہے۔ شرک و بت پرستی کے اس عالمگیر دور ظلمت میں جس میں توحید کی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، صدیوں کے بعد یہ پہلی انقلاب انگیز، دلرزہ خیز صدا تھی جو اس مقام اور بانی بیت الحرام کی زبان مبارک سے بلند ہوئی۔

۲۔ دوسرے عبادت دائمی اور اقامت صلوٰۃ کی وہ لافانی وصیت جو حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر ساکنانِ حرم اور اپنی اولاد کو دی۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ. رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ. (سورہ ابراہیم۔ ۳۷)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت (وادب) والے گھر کے پاس لا بسائی ہے، اے پروردگار تاکہ یہ نماز پڑھیں۔

خود اس مقام کا انتخاب جو زراعت وتجارت اور تمدن وترقی کے بنیادی ولابدی اسباب سے خالی ہے، "بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" اس شعور وعزم کو تازہ کرنے والا ہے کہ دنیا کے سرسبز وشاداب اور متمدن وترقی یافتہ شہروں اور تجارت وزراعت کے مرکزوں کو چھوڑ کر (جہاں سے حضرت ابرہیمؑ کا اس سفر ہدایت میں گذرنا ہوا تھا) اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا گیا اور اس کی بیت اللہ کی تعمیر اور آل ابراہیمؑ (معنوی وجسمانی دونوں طور پر) کی سکونت وقیام کے لئے کیوں ترجیح دی گئی؟

۳۔ تیسرے اسباب کے بجائے خالقِ اسباب اور رب الارباب پر توکل کی تلقین وہدایت ہے جو ان کی اس دعا سے مفہوم ہوتی ہے۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ. (سورہ ابراہیم۔ ۳۷)

تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو میووں سے روزی دے تاکہ (تیرا) شکر کریں۔

اور جو انھوں نے خود آتش نمرود میں مومنانہ ومتوکلانہ طریقہ پر داخل ہو جانے کے عمل سے ثابت کردیا کہ آگ، عناصر اربعہ اور فطری وتکوینی طاقتیں مامور ہیں آمر نہیں، ان کو خود اپنا خاصہ ظاہر کرنے اور اپنا عمل کرنے کا اختیار نہیں، چنانچہ وہ آگ ان کے حق میں بردو سلام بن گئی۔

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ. (سورہ الانبیاء-۶۹)

ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی بن جا۔

اہل مکہ اور ساکنان حرم کو ان تینوں خصوصیتوں کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا اور اپنا

دائمی شعار بنانا ضروری اور مطلوب ہے، اس لئے کہ اس شہر کو البلد الأمین کہا گیا ہے۔ اس کی خصوصیات اس کا مزاج اور اس کی فطرت زمانہ کے ہزاروں انقلابات، حکومتوں کے عروج وزوال، تمدن وترقی کے تنوعات واختلافات کے ساتھ یہی رہنی چاہئے اور اس پر انقلاب زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑنا چاہئے، پھر میں نے تاریخ کی روشنی میں اور محققین ومستشرقین کے حوالوں سے بتایا، نیز حدیث کی سند سے بھی جس میں کہا گیا ہے کہ اس شہر وملک میں بت پرستی لانے والا عمرو بن لحّی تھا، جو عرب کے باہر سے بت پرستی لے کر آیا اور اس نے اس کو رواج دیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا چل رہا ہے۔ (۱) محققین اور فضلائے مغرب کی بھی تحقیق یہی ہے کہ مکہ اور طائف کے مشہور بت ہُبل، لات، مناۃ، وعزیٰ اردن کے شہر بترا (PETRA) اور عراق واردن سے درآمد (IMPORT) کئے گئے، (۱) یہ اس سرزمین بلد امین کی چیز نہیں تھی، اور فتح مکہ میں بیت اللہ اور حرم کے ان بتوں سے خالی کردیئے جانے اور مکہ وطائف کو بتوں سے پاک کردیئے جانے کے بعد پھر یہ سرزمین اساس ابراہیمیؑ پر آگئی، اور حدیث میں بشارت دی گئی ہے کہ آئندہ بھی یہ سرزمین عرب کھلی ہوئی بت پرستی سے محفوظ اور پاک رہے گی۔ ''الا ان الشیطان قد أیس ان یعبد فی بلدکم ہذا ابداً'' اس سرزمین کے بلد امین ہونے کی صفت اور دعوت ابراہیمی کے علمبردار اور داعی ومبلغ ہونے کی خصوصیت ہمیشہ باقی رکھنی چاہئے کہ یہی اس سرزمین کا شرف اور یہاں کے رہنے والوں کا امتیاز اور فخر ہے۔

---

(۱) بخاری۔ مسلم۔ احمد

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ''نبی رحمت'' کا عنوان ''مکہ میں بت پرستی اور اس کا اصل سرچشمہ اور تاریخ'' ص ۷۹ تا ص ۸۰۔

(۳) سنن ابن ماجہ ابواب المناسک

مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کی حرمت

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. (سورہ حج: ۲۵)

اور جو کوئی بھی (حرم کے اندر) کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے عذاب دردناک چکھائیں گے۔

یہ آیت قرآن مجید کا مستقل معجزہ اور خدا کے علم محیط وازلی کی ایک نشانی ہے، چھٹی، ساتویں صدی عیسوی تک متمدن دنیا بالخصوص جزیرۃ العرب کو صرف ایک ہی خطرہ اور ایک ہی طرح کے حملہ کا تجربہ تھا اور وہ میدانی جنگ کا خطرہ اور کھلے ہوئے فوجی حملہ کا تجربہ تھا۔ اس کا ایک نمونہ اسی مقدس سرزمین نے ابرہہ کی لشکر کشی اور اصحاب فیل کی فوجی پیش قدمی کی صورت میں دیکھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے بری طرح سے پسپا اور ناکام بنادیا اور اس کے بارے میں ایک پوری سورۃ (سورۃ الفیل) نازل فرمائی لیکن اس بلد امین بیت اللہ اور مرکز عالم کے خلاف گہری سازشوں، معنوی تحریفات اور ملحدانہ منصوبہ بندیوں کا کوئی تجربہ تھا لیکن اس علیم وخبیر خدا نے جس نے یہ آخری کتاب نازل کی اس کی طرف سے بھی آگاہی دے دی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور اس سے بھی خبردار رہنا چاہئے، اور اس کی سزا اور انجام بھی بتادیا کہ "نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ."

اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی تعریف میں "قِيَاماً لِّلنَّاسِ" فرمایا ہے جو ایک بہت عمیق اور وسیع المعنیٰ لفظ ہے۔ اس کی وسعت ومعنویت کی تشریح وترجمانی مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ مستقبل انسانیت اور امن عالم کے بہت سے انتظامات اور اس کی ضمانتیں اس بیت عتیق سے وابستہ ہیں اور جب تک یہ اس عظمت و حرمت اور تحفظ و تقدس کے ساتھ قائم ہے، انسانیت کے روحانی و معنوی مفادات محفوظ ہیں۔(۱) جو اس تقدس و تحفظ پر دست اندازی کرے گا اور اس مرکز توحید و عبادت و حفاظت انسانیت کو اپنے سیاسی اغراض اور اپنے اقتدار اور قیادت کی بازی گاہ اور میدان بنائے گا۔اس کو اللہ تعالیٰ خائب خاسر بنادے گا۔

یہیں سے (پرانے محاوروں کے مطابق)(ایک پر تاب تیر کے فاصلہ پر) سردار قریش اور جد رسول عبد المطلب نے حملہ آور ابرہہ سے کہا تھا کہ "ان للبیت رباً یحمیه" (اس گھر کا بھی ایک مالک و پاسبان ہے جو اس کی حفاظت کریگا) یہ اس وقت بھی ایک حقیقت اور امر واقعہ تھا جس کا ظہور ہوا، اس وقت بھی ہے اور قیامت تک بھی رہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ کا احترام اور مدینہ طیبہ سے عقیدت و محبت اسلامی شعور، ایمان اور اسلام سے وابستگی کا ایک نشان اور اس کی ترقی و نقص کو معلوم کرنے کے لئے مقیاس الحرارت (BAROMETER) کا کام دیتا ہے، جب تک ان دونوں مقامات سے مسلمانوں کا والہانہ تعلق اور قلبی و جذباتی لگاؤ ہے اور وہ ان دونوں محبوب و محترم مقامات پر کسی کی غلط نگاہ پڑنے کے روادار نہیں، اس وقت تک ان کا رشتہ اسلام سے مستحکم اور ان کا دین محفوظ ہے۔

اقبال نے اسی جذبہ سے سرشار ہو کر کہا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ‏ ‏ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

---

(۱) اس موقعہ پر بے اختیار فارسی کا وہ شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم عربی میں سمجھانا مشکل اور نازک تھا لیکن باذوق قارئین کے لئے اس کا نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است ‏ ‏ عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

وادی غیر ذی ذرع کا مقام اور پیغام

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ.
(سورۃ ابراہیم۔ ۳۷)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں، تیرے غیرت (وادب) والے گھر کے پاس لا بسائی ہے اے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں۔

وادی کی اصل فطرت

آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا "رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ" تو انہوں نے اس وادی مکہ اور حجاز کے مقام کا قیامت تک کے لئے تعین کردیا، اصلاً اس وادی کی فطرت "وَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" ہونے کی ہے، اس لئے اگر اس میں کبھی سرسبزی وخوش حالی، باغات اور کھیتیاں، مرغزار وسبزہ، پانی کی بہتات، دولت کی فراوانی اور تجارت کی گرم بازاری دیکھنے میں آئے تو یہ اوپری چیز ہوگی، یہ اندر کی چیز نہیں ہوگی، یہ اس کے لئے ایک غیر فطری مصنوعی اور عارضی عمل ہے، اس وادی کے اصل مزاج کا پہچاننے والا حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے، اور کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ انھوں نے الہام ربّانی اور ہدایت آسمانی سے اپنی اولاد کو یہاں لاکر چھوڑا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ میں نے اپنی اولاد کو

"وَادِیْ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" میں بسایا ہے، یہاں اپنا خاندان چھوڑ کر جا رہا ہوں، گویا قیامت تک کے لئے اس وادی کا مزاج اس وادی کا مقام اور اس وادی کی فطرت کو متعین کر دیا، اب یہاں اگر رزق اور معاش کی برکتیں زمین سے ابلیں اور آسمان سے برسیں، جب بھی اس وادی کا مزاج وہی رہے گا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیان کیا اور جس کے ساتھ انھوں نے اس کا رشتہ اور ربط قائم کیا۔

غور فرمایئے "اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" سے "رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ" کا ربط کیا ہے؟ فرماتے تو یہ ہیں کہ میں نے اپنی اولاد کو اس وادی غیر ذی زرع میں آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں۔ نماز پڑھیں آپ نے لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ کہا، یہ نماز کے قائم کرنے والے ہوں، یہ نماز کے داعی بنیں۔ یہ نماز کے قیام کے روئے زمین پر ذمہ دار ہوں، اگر وہ اپنی اولاد کو نینوا کی سر زمین یا دجلہ و فرات کی وادی میں چھوڑتے (جہاں کے وہ رہنے والے تھے) یا مصر میں جس سے گزر کر آئے تھے یا شام میں جہاں پھر مسجد اقصیٰ بنی اور آپ ہی کی اولاد نے بنائی کیا وہاں لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ کا ظہور و تحقق نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ سب جانتے ہیں کہ وہاں نمازیں پڑھی جا رہی ہیں خدا کے فضل و کرم سے مسلمان موجود ہیں، جگہ کے انتخاب اور اس کی تعریف اور نماز کے قیام و اہتمام کے درمیان جو ربط ہے وہ یہی ہے کہ یہ جب نظر اٹھا کر دیکھیں گے تو انھیں جلے ہوئے پہاڑ نظر آئیں گے۔ انھیں خشک زمین نظر آئے گی ان کو کہیں بہتا ہوا دریا، چلتی ہوئی نہر نظر آئے گی تو ان کی فطرت صحیحہ اور ان کا ذہن سلیم ان کی رہبری کرے گا کہ ہمارے جد امجد ہمارے مورث اعلیٰ کے اس زمین کا انتخاب کرنے کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ اگر ان کو ہم سے معاشی مسئلہ حل کروانا ہوتا ہم کو خوش حالی عطا کرنی اور آسودگی کی زندگی بسر کروانی ہوتی تو پھر کسی سرسبز و متمدن زمین کا انتخاب کیا ہوتا یہاں ٹھہرانے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے ہم سے ان کو کوئی اور کام لینا مقصود ہے اور اس کام کو اس سر زمین سے زیادہ مناسبت ہے۔

اس سرزمین کا پیغام

ان آیات قرآنی کی روشنی میں یہاں کے رہنے والوں کے ذہن میں (چاہے وہ باہر سے آئے ہوں یا یہیں کے رہنے والے ہوں) وادی غیر ذی زرع اور اقامت صلوٰۃ کے درمیان جو رشتہ اور رابطہ ہے، ہمیشہ مستحضر اور تازہ رہنا چاہئے، اس سرزمین کا اصل پیغام ہے "دنیا میں خدا کی عبادت کی دعوت دینا" اس کے خدائے واحد کا اقرار کروانا، اور اسی کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اور اسی کی عبادت کو زندگی کا مقصود سمجھنا، اور اسی کو راضی رکھنے کی کوشش کرنا، اور سارے معاشی اور دنیاوی نظام کو اسی کے احکام کا تابع بنانا، اور لوگوں کو بتانا کہ وہ اس نظام کے باغی نہ ہوں، بلکہ اس نظام کے فرماں بردار ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ آپ سمجھیں کہ یہاں کا پیغام اور یہاں کی سوغات کچھ اور ہے، یہاں کے ذرّہ ذرّہ سے کوئی اور صدا آرہی ہے، یہاں کی ہوا کا ہر جھونکا ایک دوسری زندگی کا پیغام دیتا ہے ایسی زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے، جس میں مادیّت روحانیت کے تابع ہو، معاش معاد کے تابع ہو، جہاں اعمال عقائد کے تابع ہوں، اقتصادیات اخلاق کے تابع ہوں، اور جہاں ہر محبّت خدا کے تابع ہو (۱)۔

---

(۱) حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں اور اہل وطن کے حقوق۔ صفحہ ۱۱ تا ۱۴ سے ماخوذ!

نظام عالم مربوط ہے بیت اللہ شریف سے

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِلنَّاسِ. (سورۃ المائدۃ۔ ۹۷)

اللہ نے کعبہ مکان محترم کو (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ، اور انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے۔

اس حقیقت پر ابھی تک کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے کہ نظام عالم کعبۃ اللہ اور اس کی دعوت و مقام سے وابستہ ہے، اس کو ہماری ظاہری نگاہیں نہیں دیکھ رہی ہیں، لیکن اہل بصیرت سمجھتے ہیں کہ جس طرح پہاڑوں کا وجود ملک اور زمین میں ایک استقرار و توازن پیدا کرتا ہے، اسی طریقہ سے اس سے ایک بالاتر نظام ہے، اور وہ نظام وابستہ ہے بیت اللہ سے، جب تک بیت اللہ قائم ہے، اور اس کا وہ پیغام زندہ ہے، اس وقت تک گویا نظام عالم قائم ہے۔

اس سرزمین کا اصل پیغام، اس سرزمین کا اصل تحفہ اور اس سرزمین کی اصل نعمت وہ چیز ہے جو ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جس کے بغیر نہ معاش کا نظام درست ہو سکتا ہے، نہ معاد کا، یہ تو سب جانتے ہیں کہ معاد کا نظام تو درست ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ معاش کا نظام بھی درست نہیں ہو سکتا، اور جو ملک محض معاشی مسئلہ پر قائم ہیں، اور ان کے افراد کا آپس کا تعلق معاشی ہے وہ ایک غیر فطری نظام کے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں، جس کے ساتھ نہ اللہ کی مدد ہے نہ اللہ کی رحمت ہے، جتنے مسائل بھی اس وقت ان ملکوں

میں اور ان ملکوں کے اثر سے دوسرے ملکوں میں پیدا ہو رہے ہیں وہ سب اسی کا نتیجہ ہیں کہ وہاں معاش معاد کے ساتھ مربوط نہیں ہے، اور زندگی کا وہ صحیح مقصد وہاں نہیں پایا جاتا جو خالق انسان نے انسان کیلئے متعین کیا ہے، وہ مقصد وہی ہے جس کا آیت ذیل میں تذکرہ ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنَ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوْالْقُوَّةِ الْمَتِيْن. (سورہ الذریات ۵۶-۵۸)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں، میں ان سے طالب رزق نہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ مجھے (کھانا) کھلائیں، خدا ہی تو رزق دینے والا ہے زور آور اور مضبوط ہے۔

یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے اس لئے وہاں معاد کا معاملہ تو الگ رہا معاش بھی خطرہ میں ہے، وہاں وہ معاشی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کا کوئی حل نہیں، وہاں ایک فرد دوسرے فرد کے مفاد سے، ایک جماعت کی ترقی دوسری جماعت کی ترقی سے، ایک حکومت کا نظام دوسری حکومت کے نظام سے ٹکرا رہا ہے، معاش معاش سے ٹکرا رہی ہے، بلکہ اس ملک کی معاش دوسرے ملکوں کی معاش کو خراب کرنے یا استحصال پر آمادہ کرتی ہے اس ملک کی معاشی ترقی کا انحصار بھی دسرے ملکوں کی معاشی ابتری اور بد نظمی پر موقوف ہے، اس لئے نہ صرف اس ملک میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں بلکہ اس ملک کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور وہ معاش ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ لاینحل ہے جس کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ان کے بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سرگرداں و پریشان ہیں مگر راستہ نظر نہیں آتا۔

لیکن اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا جو گھر (کعبۃ اللہ) ہے اسکے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ".

میں (اس کے باوجود کہ عربی اردو دونوں سے واقف ہوں اور دونوں کا ذوق رکھتا ہوں۔) اس

بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قیماً للناس" کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا۔ میں نے جو اردو کے تراجم دیکھے ہیں، میں اس سے بھی مطمئن نہیں ہوں کہ "قیماً للناس" کا اردو میں صحیح ترجمہ ہوا ہے لیکن میں اس کا مفہوم ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دارومدار بنایا ہے۔

یہ نظام عالم نہ حکومتوں سے مربوط ہے نہ تنظیمات سے نہ فوجی طاقت سے نہ اخلاقی فلسفوں اور تہذیبوں اور علمی مرکزوں سے مربوط ہے۔ نظام عالم جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہونچ سکتی بیت اللہ شریف سے اور اس دعوت سے مربوط ہے جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت یہی دعاء مانگی تھی:-

"اے اللہ! میں نے تیرے گھر کو اس لئے بنایا ہے کہ تیری توحید کی منادی کی جائے۔"!

تو نظام عالم مربوط ہے، حرمین شریفین سے اور ان کی دعوت سے، وہ صحیح اعتقاد، صالح سیرت واخلاق، انسانیت کے رشتے، اخوت ومحبت، انسانیت کے احترام، انسانی جان ومال کا تحفظ اور ہر چیز میں خدا کو حاضر وناظر سمجھنے سے اصل میں نظام عالم قائم ہے۔ نظام عالم سائنس پر قائم نہیں ہے۔ ٹکنالوجی پر قائم نہیں ہے۔ سائنس وٹکنالوجی نے بتایا کہ وہ نظام عالم کے لئے خطرہ ہیں۔ آج ایک منٹ میں پورا نظام عالم فنا ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نظام عالم قائم ہے ارادۂ الٰہی پر، نظام الٰہی قائم ہے ان اصولوں اور تعلیمات پر جن کو پیغمبر لے کر آئے، اور اس سب کا مرکز وہ دعوت، وہ مقاصد، وہ تعلیم، وہ مرکزیت ہے جس کے داعی اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور جس کے مجدد وخاتم اور مکمل ومحافظ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور جن کی نمائندگی بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ" اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو بیت اللہ الحرام بنایا، عزت کی جگہ بنائی، "قیاماً للناس" لوگوں کی زندگی کا دارومدار، اس کے اندر

لوگوں کی معشیت، دُنیا اور نسل انسانی کو برقرار رکھنے کا راز ہے۔

اس آیت سے ہندوستانی مسلمانوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہاں دینی حیثیت سے یہی ملت اسلامیہ بیت اللہ کی نمائندگی کرتی ہے، اگر یہ ملک خدانخواستہ مال کی بڑھی ہوئی محبت، انسانی کشی، مردم آزاری، اور روزمرہ کے فسادات، خود غرضی اور بے ضمیری اور انسانیت کی قدر و قیمت نہ جاننے کی وجہ سے تباہ ہوا تو ہمارا امن ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک، اس لئے کہ ہم انھیں نبی کی امت ہیں جن کو "رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ" کا لقب دیا گیا ہے۔ "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ" اور کہا گیا ہے کہ "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (سورہ انفال ۳۳) (اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے)۔

اس امت کی موجودگی میں بھی جو نبی رحمت سے نسبت رکھتی ہے اور ان کی تعلیمات کی حامل اور ان کی ساختہ پرداختہ ہے، کسی ملک کو تباہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسکی ذمہ داری ہے یہ حقیقتیں زندہ رہیں، وہ ملک کے محافظ بنیں اور اس کو اجتماعی خودکشی اور خود سوزی سے بچائیں۔ (۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص۔ از ۱۔ کاروانِ زندگی حصہ سوم ص ۱۹۰ تا ص ۱۹۲

۲۔ حرمین شریفین کی ذمہ داریاں ص ۸ تا ص ۱۰

۳۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ردسمبر ۱۹۸۶ء

باب ۱۰

مادی افکار و نظریات

”......میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ:
وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع یا آئینہ ہے،
جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں،
قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں......
اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات و عروج کے انجام بھی
اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں......“

(علی میاں ندوی)

مادی نظریات اور ان کی کوتاہ نظری

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعاً .... وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. (الکہف: ۳۲تا۳۹)

دو باغ والے کا قصہ

قرآن مجید دو باغ والے کا قصہ بیان کرتا ہے...... یہ وہ قصہ ہے جس سے ہم کو روزمرہ کی زندگی میں پہلے قصہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اگر اصحاب کہف کا قصہ صدیوں اور برسوں میں پیش آتا ہے تو یہ قصہ تقریباً ہر جگہ اور ہر وقت ہمارے سامنے آتا ہے اور بار بار دہرایا جاتا ہے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہر اعتبار سے خوش نصیب واقبال مند تھا، آسائش وخوشحالی کے سارے سامان اس کے لئے مہیا تھے، اس کے پاس انگور جیسے لطیف ومرغوب پھل کے دو باغ تھے ان کے چاروں طرف کھجور کے دلنواز درخت تھے، جنھوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، یہ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے لئے سعادت ومسرت کی

آخری منزل تھی اور متوسط طبقہ اور درمیانی معیار زندگی ہی اکثر دنیاوی معاملات میں معیار و پیمانہ ہے۔

لیکن اس دولت مند اور خوشحال شخص کی سعادت و کامیابی کا سارا انحصار محض ان باغات کے وجود تک محدود نہ تھا، بلکہ سارے اسباب و وسائل اس کے لئے مسخر تھے، اور یہ دونوں باغ اپنی بہترین پیداوار دے رہے تھے:۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئاً وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهْراً. (سورہ کہف۔ ۳۳)

پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے، پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی، ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک نہر جاری کر دی تھی۔

غرض اس طرح سعادت و کامرانی کی پوری تکمیل ہو چکی تھی اور آرام و راحت کے سارے اسباب نہ صرف موجود بلکہ ارزاں و فرواں تھے۔

مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے

اس موقع پر اس شخص کے اندر وہ مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے جو ہمیشہ اہل حکومت جاگیرداروں، قومی لیڈروں، صنعت کاروں، کارخانہ داروں اور فوجی طاقت رکھنے والوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کے اندر وہ شدید مادی رجحان پیدا ہوتا ہے جو ایمان، معرفت صحیحہ، اور تربیت کا پابند نہیں، وہ اپنی ساری خوشحالی اور خوش بختی کو اپنے علم و لیاقت اور اپنی ذہانت و محنت کی طرف منسوب کرتا ہے جس طرح اس سے پہلے قارون نے کیا تھا اور کہا تھا:۔

اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ. (سورہ قصص۔۷۸)

یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔

وہ اپنے اس دوست پر فخر کرتا ہے، جس کو یہ مرادیں حاصل نہ تھیں، اور بڑی صراحت بلکہ ناروا جسارت سے کہتا ہے:

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالاً وَّ اَعَزُّ نَفَراً (سورہ کہف۔۳۴)

دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے۔

وہ اپنے اقتدار و قوت کے چشمہ میں اور دولت و خوشحالی کے اس مرکز میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ نہ اس کو اپنی خبر ہوتی ہے نہ اپنے رب کی، نہ غیبی اسباب اور ارادۂ الٰہی کی جو سات آسمان سے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اور انسان اور اس کی ملکیت بلکہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اپنے نفس پر علمی و عملی، اخلاقی اور عقلی ہر لحاظ سے ظلم کرتا ہے، یہ کور چشم مادی ذہنیت اس کی زبان سے اعلان کرواتی ہے کہ اب نہ اس کو زوال ہے، نہ اس کے باغات کو، وہ حشر و نشر کا انکار کرتا ہے، اور بڑے پھوہڑپن اور غایت درجہ حماقت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی و خوشحالی ابدی ولافانی ہے، اور دنیا و آخرت (اگر آخرت ہو) کسی جگہ ختم ہونے والی نہیں:۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ اَبَداً وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً. (سورہ کہف ۳۵۔۳۶)

پھر (وہ) یہ باتیں کرتے ہوئے اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا، اس نے کہا میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے، مجھے توقع نہیں کہ (قیامت کی) گھڑی برپا ہو۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا شمار ان معدودے چند خوش نصیب وکامران افراد انسانی میں ہے، جن سے اقبال کبھی منہ نہیں موڑتا اور قسمت کبھی بے وفائی نہیں کرتی اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ سعادت اور عزت کے بام پر نظر آتے ہیں:-

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَيْراً مِّنْهَا مُنْقَلَباً. (سورہ کہف۔۳۶)

اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کھٹکا ہے؟) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا۔

اس طرح کے لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان، عمل صالح، اور محنت وکاوش کی کیا ضرورت ہے، یہ ان کی فطری اور وہبی سعادت ہے، جو ہر وقت ان کو شاد کام وبامراد رکھ سکتی ہے۔

ایمانی طرز فکر

اس کے دوست کی چشم بصیرت اللہ تعالی نے حق وایمان کے لئے کھولدی تھی، اس کو معرفت الٰہی اور اس کے صفات وافعال کے علم کی لازوال دولت حاصل تھی، وہ جانتا تھا کہ صرف وہی اس کائنات میں تصرف کرنے والا ہے، اور اسباب کا خالق ہے، اور جب چاہے حالات کو پلٹ سکتا ہے، اس نے اس کی بات پر اعتراض کیا اور اس کے اس مادہ پرستانہ طرز فکر کی کھل کر مخالفت کی، اس کو اصل وحقیقت اور آغاز سے آگاہ کیا، یہ وہ سخت اور سنگین حقیقت ہے جس کو یہ ظاہر پرست اور اپنے کو خوش نصیب سمجھنے والے ہمیشہ فراموش کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے تذکرے سے دور بھاگتے ہیں:-

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلاً.

(سورہ کہف۔ ۳۷)

یہ سن کر اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمھیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا۔"

متکبر و مغرور اشخاص کے لئے اس بات کا سننا کتنا شاق و ناگوار ہے، اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں، اس نے کہا کہ وہ اس کے بالکل دوسرے رخ پر ہے، اور دوسرے رجحان کا حامل ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان:۔

لٰكِنَّا هُوَاللّٰهُ رَبِّىْ وَلَا اُشْرِكُ بِرَبِّىْ اَحَداً.

(سورہ کہف۔ ۳۸)

لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

پھر اس نے اس کو وہ بنیادی اور اصولی حقیقت یاد دلائی جسکے گرد پوری سورہ کہف گردش کر رہی ہے اور اس جگہ انگلی رکھی جو اس طرح کے لوگوں کی کمزوری یا دکھتی رگ ہوتی ہے، اس نے کہا کہ دیکھنے کی چیز اسباب ظاہری نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے جس کے ہاتھ میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے اور یہ سامان راحت اور اسباب عیش جن پر وہ خوش اور نازاں ہے نہ اسباب کی کارگزاری ہے اور نہ خود اس کی دست کاری یا عقل و ذہانت کی کارفرمائی، وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا نتیجہ ہے جس نے ہر چیز کو بہترین طریقہ پر بنایا ہے وہ بڑی حکمت کے اور نرمی کیساتھ اس کو خدا کی قدرت کے اعتراف اور اس کی نعمت کے شکر کیطرف متوجہ کرتا ہے:۔

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

(سورہ کہف: ۳۹)

اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

اس باغ والے کے قصہ سے مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کہ میرے سامنے اس دور حاضر کی (جو اپنی مادی ترقی کے نقطہ عروج تک پہونچ گیا ہے) تصویر ان آیتوں میں پیش کی گئی ہے۔

کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ آتَتْ اُکُلَھَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْہُ شَیْئاً وَّفَجَّرْنَا خِلَالَھُمَا نَھراً. وَکَانَ لَہٗ ثَمَرٌ، فَقَالَ لِصَاحِبِہٖ وَھُوَ یُحَاوِرُہٗ اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَراً.

(سورہ کہف: ۳۳-۳۴)

دونوں باغ کثرت سے پھل لاتے اور اس کی پیداوار میں کسی طرح کمی نہ ہوتی اور دونوں میں ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی اور اس طرح اس شخص کو ان کی پیداوار ملتی رہتی تھی تو ایک دن جبکہ وہ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کہنے لگا کہ میں تم سے مال و دولت میں بھی زیادہ ہوں اور جتھے اور جماعت کے لحاظ سے بھی عزت والا ہوں۔

امریکہ کی تصویر اس سے بہتر کیا کھینچی جا سکتی ہے؟ (جنتین) آپ شمالی و جنوبی امریکہ کو لے لیجئے یا مشرق و مغرب کو لے لیجئے، "جنتین من اعناب" یہاں کس چیز کی کمی ہے، یہاں کون سا میوہ نایاب ہے؟ یہاں کس چیز کا فقدان ہے؟ یہاں خدا کی دی ہوئی ساری نعمتیں موجود، لیکن یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ اس چیز کی کمی جس کی طرف ایک صاحب ایمان، صاحب بصیرت دوست نے متوجہ کیا۔

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ. (سورہ کہف: ۳۹)

اور بھلا جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کیوں نہ کہا؟

صرف ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کی یہاں کمی ہے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو مٹی کو سونا بنادے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو مادیت کو اعلیٰ درجہ کی عبادت بنادے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو نفس انسانی کے سرکش گھوڑے کو اس طرح رام کرتی ہے کہ وہ مطیع و فرمانبردار مرکب اور منزل مقصود تک لے جانے والی ایک مبارک سواری ہوتی ہے، ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کلید ہے جس قفل پر آپ رکھ دیں یہ اس کو کھول دے گا، اس مغربی دنیا میں اس مادی دنیا میں جس چیز کی کمی ہے وہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کی کمی ہے، سننے میں تو چند لفظ ہیں، اور اپنی زندگی میں بار بار استعمال کرتے ہیں، ماشاء اللہ آپ کب تشریف لائے، ماشاء اللہ آپ نے یہ سوٹ کب بنوایا، ماشاء اللہ آپ کے لڑکے نے کب گریجویشن کیا، ماشاء اللہ آپ نے یہ موٹر کب خریدی، ماشاء اللہ آپ نے یہ مکان کب بنوایا۔

"ماشاء اللہ" کے اندر بلاغت کے جو دریا بہہ رہے ہیں اور جو ساری دنیا کو حاوی ہے اور اس کے اندر مادیت کو، غرور کو، اور اپنی طرف نسبت کرنے والی طاقت کو یعنی انسان کو جو دھوکا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ وہی کررہا ہے، اس کو دبانے اور مغلوب کرنے کی جو عجیب و غریب طاقت ہے اس کا ہم کو اور آپ کو احساس نہیں رہا، اس لئے ہم اس کو موقع بے موقع استعمال کرتے ہیں، اور اتنے مواقع پر پڑھتے ہیں کہ اس کی عظمت اور اعجاز کا احساس نہیں رہا، ماشاء اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہورہا ہے خدا کے ارادہ اور قدرت سے ہورہا ہے، اس میں انسان کا کوئی کمال نہیں ہے، اس میں انسان کی کوئی تعریف نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. (سورہ فاتحہ:۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے

میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اور

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئاً اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ. (سورہ یٰسین: ۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرمادیتا ہے، ہوجا، تو وہ ہوجاتی ہے۔

میں جو بات کہی گئی ہے اور "رفع السمٰوت 'الخ" میں جو فضیلت بیان کی گئی ہے وہ ماشاءاللہ لا قوۃ الا باللہ میں سمٹ کر آگئی ہے کہ اللہ جو چاہے گا وہی ہوگا اور لا قوۃ الا باللہ، اللہ کے سوا کسی میں کچھ طاقت نہیں ہے۔

اگر آج مجھ سے کوئی پوچھے کہ امریکہ میں سب کچھ موجود ہے، خدا نے اپنے خزانوں سے اس کو مالا مال کردیا ہے "اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَہ" کا مصداق "یَأْتِیْھَا رِزْقُھَا مِنْ کُلِّ مَکَانٍ" کی تصویر۔ موسلا دھار بارش کی طرح برستے تھے، امریکہ کا حال یہی ہے لیکن اگر پوچھا جائے کہ امریکہ دنیا کو امن وسکون کا پیغام کیوں نہیں دے رہا ہے، آج امریکہ دنیا کو ہدایت کا پیغام کیوں نہیں دے رہا ہے؟ وہ مادی تعاون کرتا ہے، معاشی احسانات کرتا لیکن...... امریکہ کا کوئی مخلص دوست نہیں۔

امریکہ صحیح آسمانی مذہب سے محروم ہے

امریکہ میں سب کچھ ہے لیکن وہ کتاب الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نعمت سے محروم ہے۔ یہ سمجھنا کہ یہ کارخانہ خدا چلا رہا ہے اور ہم نے یہ جو کچھ کیا ہے خدا نے کیا ہے اور ہم کو یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق صرف کرنا چاہئے اور ہم کو یہ سب

کچھ اس کی بندگی میں صرف کرنا چاہئے، اور ہم خدا کے غلام ہیں، اسی سے وہ یکسر نا آشنا ہے، ملک میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو اسی چیز کی کمی ہے۔

"جنتین من اعناب" تو ہیں لیکن "ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" نہیں لیکن جنت ارضی کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی "مثل الرجلین" میں سے احد الرجلین جو ہے وہ خالص مادہ پرست ہے، باغی ہے، خدا کا ناشکرا ہے، مادیت پرست اور خود پرست ہے اور دوسرا انسان مومن ہے وہ کمزور ہے، اس کے پاس "جنتین من اعناب" نہیں ہے وہ باغات سے محروم ہے، لیکن وہ مومن ہے خدا نے اس کو ایمان کی دولت دی ہے۔

"کلتا الجنتین آتت اکلھا" دونوں باغوں نے کوئی کمی نہیں کی، جیسے کوئی چیز ابل پڑی ہے، دونوں باغ اس طرح ابل پڑے جیسے چشمے ابلتے ہیں، ان کے اندر کی طاقتیں اور شادابی ابل پڑی، انھوں نے کوئی کمی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

اب دوسرے بھائی کی باری آتی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس میں صرف اس کی ضرورت ہے کہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کا اضافہ کر لیا جائے "لَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ الخ" جب تم نے اپنے باغ میں قدم رکھا تھا تو کہتے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ، یہ سب خدا کا فضل، اس کی دین اس کی رحمت وقدرت کا کرشمہ ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

"ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" دراصل سارے قصہ کی جان ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور آپ کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے والے

کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنا سارا معاملہ اور ساری طاقت و صلاحیت کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے اور مستقبل کے ہر ارادہ اور نیت کو اس کے سپرد اور اس کی مشیت کے ساتھ مشروط اور وابستہ رکھے:-

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَداً. اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّىْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَداً.

(سورہ کہف۔ ۲۳-۲۴)

اور کوئی بات ہو مگر کبھی ایسا نہ کہو "میں کل اسے ضرور کر کے رہوں گا" الا یہ کہ سمجھ لو، ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر لو، تم کہو "امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔"

اور ہر موقع پر دل سے ماشاء اللہ اور انشاء اللہ کہتا ہو۔

جو شخص ہر فضل و کمال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہو اور ہر نیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہو اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہو وہ اسباب ظاہری، مادیت اور مادہ پرستوں کے سامنے اپنا سر کیسے جھکا سکتا ہے، اور نفس اور نفسانی ارادہ کے ہاتھ میں اپنی زمام کار کیسے دے سکتا ہے؟

"**ماشاء اللہ**" اور "**انشاء اللہ**" بظاہر بڑے ہلکے پھلکے لفظ ہیں اور اکثر ان کا استعمال بغیر سوچے سمجھے کیا جاتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی احساس و شعور نہیں ہوتا لیکن درحقیقت یہ دونوں بڑے وزنی، بڑے گہرے اور معانی و حقائق سے لبریز بول ہیں، اور اندھی مادیت، نفس، اور ارادۂ انسانی پر بھروسہ و اعتماد پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔(۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از

۱۔ معرکۂ ایمان و مادیت، ص ۷۳ تا ص ۷۹

۲۔ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، ص ۵۵ تا ۶۰

جدید ترین اسالیب و آلات تسلی و تفریح

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ. وَّيَتَّخِذَهَا هُزُواً. اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (سورہ لقمان۔٦)

اور کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خریدتا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے (دوسروں کو) گمراہ کرے اور اس راہ کی ہنسی اڑائے، ایسے ہی لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

لہو لعب اور تمتع و تفریح کے ساز و سامان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق کھیل مقابلوں اور مظاہروں سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی اور محویت وانہماک سے ہے۔(۱) دوسری قسم لطف و تفریح کی گفتگو ہے جس میں پڑ کر لوگ فرائض وواجبات اور ذکر اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں، اس میں کہانی قصے اور فحش روایات آتے ہیں، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں لہو لعب، کہانی قصے دونوں کو یکجا کر دیا ہے

---

(۱) افسوس ہے کہ کرکٹ اور فٹ بال میچوں اور ٹورنامنٹ سے سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور ان پر گرانقدر و ہوش ربا رقمیں صرف ہوتی ہیں، تماشہ دیکھنے والوں کا ہجوم ناقابل قیاس ہے، وقت اور مال کا یہ زیاں ہر طرح افسوسناک ہے، معلوم نہیں کتنے آدمیوں کی نمازیں قضا ہوتی ہوں گی، ان ممالک کے علماء اور ذمہ داروں کے سوچنے اور توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اور اس کو "لہو الحدیث" سے تعبیر فرمایا ہے۔

قرآن کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ آیت آج کے جدید ترین اسالیب و آلات، تسلی و تفریح پر بھی منطبق ہوتی ہے، خصوصاً ویڈیو و ٹیلی ویژن پر تو پوری طرح منطبق ہوتی ہے، اس لئے یہ بیک وقت لہو بھی ہے، اور حدیث بھی، تطبیق کی تکمیل آیت کریمہ کے اگلے لفظ سے مزید ہو جاتی ہے کہ فرمایا:-

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ" (اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو بیہودہ حکایتیں خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو بے سمجھے خدا کے راستہ سے گمراہ کریں۔

اب دیکھئے کہ اس کے حصول کے لئے رقم خرچ کرنے اور بازار سے خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صرف نام لینا رہ گیا ویڈیو اور ٹی وی کا، قرآن تو عربی زبان میں ہے، اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا، عقل کی بات نہیں تھی، لیکن قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے جو کتاب نکلی، اگر میں مسجد میں بیٹھ کر کہوں کہ اس میں ٹی وی اور ویڈیو کا ذکر ہے تو میں غلط نہیں کہوں گا، اس لئے کہ قرآن میں کہا گیا "مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْث" جو لوگ عربی کی بلاغت سے واقف ہیں اور اس کی زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اہل زبان کی طرح، اور محض اللہ کا شکر و انعام ہے کہ ہمیں اسی حجاز و یمن کا فیض پہونچا ہے کہ ہم اس قابل ہوئے، ہمارے استاد عرب تھے (۱) ہم نے ساری عربی عربوں سے پڑھی الحمد للہ! تو ہم "لہو

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (مستقل مضمون ملاحظہ ہو "پرانے چراغ اول")

الحدیث" کا لطف لے رہے ہیں۔ ہمارا عربی کا ذوق "لہوالحدیث" کے دائرے کی وسعت کو دیکھ رہا ہے، میں اس لفظ کا ترجمہ نہیں کر سکتا حالانکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں لہوالحدیث کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے معنی ہیں باتوں کا کھیل، اب بتایئے ریڈیو اور ویڈیو وغیرہ میں کیا ہے، اگر یہ ہوتا کہ بہت سے لوگ ہیں جو کھیل کو پسند کرتے ہیں کھیل خریدتے ہیں تو اس میں ویڈیو اور ٹی وی نہ آتا مگر باتوں کا کھیل کہا گیا یہ وہ ہے جو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قرن اول، قرن ثانی، قرن ثالث، قرن رابع، اور پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں یہاں تک کہ میں کہوں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ذہن بھی یہاں تک نہیں گیا ہوگا، (یعنی ویڈیو اور ٹی وی کی طرف) یہ قرآن کا معجزہ ہے "حدیث" کا "لہو" باتوں کا کھیل، اور وہ کیا ہے؟ یہ ویڈیو کا پروگرام، ٹی وی کی بولتی تصویریں، یہ ویڈیو، یہ رکارڈ جو سنے جاتے ہیں سب "لہوالحدیث" ہیں۔

آج سے چودہ سو برس پہلے جب یہ سب چیزیں ایجاد ہونا تو درکنار، کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس وقت اللہ کی کتاب نے کہہ دیا، بہت سے لوگ ہیں جو "لہوالحدیث" خریدتے ہیں۔(۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص ۱۔ کاروان زندگی حصہ چہارم، ص ۴۱-۴۰
۲۔ قرآن کا مطالبہ مکمل اطاعت و کامل سپردگی، ص ۲۶-۲۷

مغربی فکر وادب کی بے راہ روی کا
بنیادی فرق

قرآن مجید کی دو آیتیں اس وقت مجھے یاد آرہی ہیں جن میں مغرب کی صاف تصویر نظر آتی ہے اور ان میں مغربی ذہن کی نقاب کشائی کی گئی ہے، عربی داں حضرات، ادبی ذوق رکھنے والے اور قرآن کی زبان وبیان سے مناسبت رکھنے والے ان آیتوں اور ان الفاظ کے آفاق واعماق تک پہونچنے کی کوشش کریں گے، میں ان کا صحیح اور مکمل ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، ان دو آیتوں میں ایک سورہ نمل کی یہ آیت ہے:-

بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ.

بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت کے بارہ میں بلکہ یہ لوگ اس سے شک میں مبتلا ہیں بلکہ یہ اس سے اندھے ہو رہے ہیں۔

(سورہ نمل۔٦٦)

میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، منزل قرآن اور صاحب قرآن سے تو معذرت کی جرات نہیں کر سکتا، لیکن قران کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں "بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ" کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ان کا

علم پنکچر ہو گیا، آخرت کے بارہ میں اور مجھے مغرب کی صورتحال اور اس کے علمی واختراعاتی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں اس کے لئے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم خاصا چل رہا تھا، اطمینان سے سفر طے کر کے آیا تھا، جس نے عقلیات پر، طبیعات پر، ریاضیات پر اور مابعد الطبیعات تک میں اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات وصفات تک پہونچا اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہونچا تو "ادَارَكَ عِلْمُهُمْ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی اس آیت کے بعد کے الفاظ میں مغرب کی مختلف ذہنی کیفیات یا مختلف طبقات کی تصویر نظر آتی ہے کہ "بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا" وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں "بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ" بلکہ وہ اس کے معاملہ میں بالکل بے بصیرت ہیں۔

دوسری آیت جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "النبوات" کی گویا اساس بنایا ہے یہ ہے:-

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَاوِيْلُهٗ. (یونس۔۳۹)	بلکہ انھوں نے جھٹلادیا ان چیزوں کو جن کا ان کے علم نے احاطہ نہیں کیا۔

مغرب کی یہ خام خیالی ہے کہ جو مشہود نہیں، وہ موجود نہیں، موجودات کو مشہودات میں محدود کرنا یہ علم انسانی اور عقل انسانی کی شدید کمزوری ہے، جسے مغرب نے علمی رنگ دے دیا ہے اور یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے بلکہ انسانیت کے حق میں زیادتی ہے اور فیض الٰہی سے محروم علم اور نبوت میں یہی فرق ہے، جس کو حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے بہت ہی سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے:

اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰنِ. (الانعام۔۸۱)

تم مجھ سے کٹ حجتی اور بحث کر رہے ہو خدا کے بارہ میں؟ جبکہ وہ مجھے ہدایت سے نواز چکا، جب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اس راستہ پر لگا چکا تو اس میں شک یا کلام کی گنجائش کہاں؟

کوہ صفا کی تقریر کا حاصل بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر تھے اور لوگ نیچے وادی میں، آپ نے کہا اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج بیٹھی ہے اور وہ کسی آن حملہ کر سکتی ہے تو کیا آپ لوگ میری تصدیق کریں گے؟ عرب فلسفہ و تمدن میں مغرب سے پیچھے تھے، لیکن عقل سلیم میں ان سے بہت فائق ثابت ہوئے، انھوں نے دیکھا کہ بات ایک ایسا شخص کہہ رہا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے، آگے بھی دیکھ سکتا ہے اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ پھر وہ کبھی غلط بات بھی نہیں کہتا، انھوں نے صفائی کے ساتھ کہہ دیا ہم ضرور تصدیق کریں گے! وہ عرب اپنی سلامت فہم سے وہاں پہونچ گئے، جہاں یونان و روم نہیں پہونچ سکے اور جہاں مغرب آج تک نہیں پہونچ سکا۔ انھوں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ محض اس بنیاد پر جھٹلانے کا کوئی جواز نہیں کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی افکار و نظریات اور اسلامی حقائق و عقائد کے درمیان جب بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے، اسکے بغیر وہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا جس سے ہم اصل حقیقت تک پہونچ سکیں۔"(۱)

---

(۱) ماخوذ از کاروان زندگی حصہ سوم، ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۵

شیطانی ترغیبات

اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا (سورہ مریم)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔"اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ "تم نے دیکھا نہیں کہ تم نے شیطان کو بھیجا کافروں پر۔"تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" اور ان کو وہ ابھار ابھار کر اچھالتے ہیں۔

یہ "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" دو لفظ ہیں، "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" از ، یؤز، ازًا، سے، لیکن ان کے مظاہر، ان کی شکلیں، اور ان کے درجات اور ان کے وسائل اتنے کثیر ہیں کہ جو شمار میں نہیں آسکتے، یہ شیاطین کثرت سے اپنے ماننے والوں کو ابھارتے ہیں، کیا کیا لالچیں دیتے ہیں، کیا کیا رشوتیں دیتے ہیں، کیا کیا ان کے اندر محرکات اور کس کس طرح سے پیدا کرتے ہیں، کس طرح ان کے لئے ان کو آسان بناتے ہیں، کس طرح ان کی ترغیب دیتے ہیں؟

یہ سب ان دو لفظوں میں آگیا ہے، "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" (ان کو ابھارتے ہیں اچھال کر)یعنی کبھی ان کے کان میں کچھ منتر پھونکتے ہیں۔ کبھی ان کے سامنے کوئی نقشہ لاتے ہیں، کبھی ان کو کوئی امید دلاتے ہیں، کبھی ان کے سامنے کچھ ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، جن سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں اور ہمیں یہ گناہ کرنا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تشریعی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کافروں پر

شیاطین کو بھیجتا ہے، تو ان کافرین کے لئے جواز پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اپنا انتظام TEST بتاتا ہے، اس کی اطلاع دیتا ہے کہ شیاطین کو امتحاناً اس کا موقع دیا جاتا، کہ وہ اپنے ماننے والوں کے پاس، ہمارے منکروں کے پاس جائیں اور ان کو مختلف ترکیبوں سے گناہوں پر ابھاریں۔

اس کی شکلیں اگر لٹریچر کا مطالعہ کریں اور آج کل ٹی وی (T.V) اور ریڈیو وغیرہ دیکھیں، ناولوں کو پڑھیں، سنیما کا کبھی آپ کو اتفاق ہوا ہو، یا آپ نے سنا ہو، اسی طریقہ سے مالی ترغیبات، جنسی ترغیبات، سیاسی ترغیبات اور اقتدار کی لالچیں اور اپنے مقصد تک پہونچنے کے راستے، اور ان کو جن کو "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ" اللہ فرماتا ہے (شیطان نے آراستہ کر دیا) یہ سب "تَؤُزُّهُمْ اَزًّا" میں آجاتا ہے۔

یعنی اس وقت جو کچھ دنیا میں، امریکہ میں، یورپ میں، مشرقی ممالک میں، اسلامی ممالک میں، جو گناہوں کی ترغیبات، اور خدا کی نافرمانیوں کے جو راستے ہیں، اور جو لوگوں کے سامنے مقاصد آتے ہیں، مطمع نظر آتے ہیں، اور پھر ان کے لئے وہاں تک پہنچنے کے راستے دکھائی دیتے ہیں یا وہ راستے نکالتے ہیں، یہ سب "تَؤُزُّهُمْ اَزًّا" میں آتا ہے۔

اس طرح شیاطین کا ایک جال بچھا ہوا ہے کہ جو ترغیبات کے ذریعہ امیدیں دلا کر، اور سبز باغ دکھا کر، اور مثالیں اور نمونے پیش کر کے اور اندر سے اس کے لئے جذبات اور تقاضے پیدا کر کے اور ان کے سامنے لا کر جو اس کی ترغیب دیتے ہیں، قرآن مجید میں اس طرح آیا کہ ان کے جو رفقاء ہیں ان کے سامنے وہ ان کو مزین کر کے دکھاتے ہیں، ان کو ابھارتے ہیں گناہوں پر۔ اور جس طریقہ سے کہ نیکیوں کے انصار اور حامی ہوتے ہیں، ترغیبات ہوتے ہیں، آسمانی کتابوں کے ذریعہ، حدیث

وسیرت کے ذریعہ اور روحانیت کے راستے سے اور اللہ تعالیٰ کے مخلص ومقبول بندوں کی زبان سے، جن کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں کہ سیدنا عبدالقادرؒ، امام حسن بصری کے مواعظ میں دیکھیں گے، ان کے اثرات کو کہ لاشیں نکلتی تھیں ان کے مواعظ کے جلسوں سے، اور بیسوں اور سیکڑوں کی تعداد میں عیسائی اور یہودی اسلام لاتے تھے،اور جرائم پیشہ لوگ جن کو "شتارین" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، عربی تاریخ اور رعربی لٹریچر میں، وہ جرائم پیشہ لوگ اور حیلہ باز اور چوری کرنے والے عیار لوگ توبہ کرتے تھے، اسی طرح ہندوستان میں اس وقت جو اذانین ہو رہی ہیں، اس ملک میں آج جو اسلام موجود ہے، یہ سب خواجہ معین الدین چشتی کا فیض ہے، تو جس طریقے سے ان کے یہاں اثرات دیکھتے ہیں۔

ایسے ہی برے اثرات آپ دیکھ لیں شیطانی حلقوں میں، کہ ان پر شیطان کا تسلط ہے، شیطان کا قابو چل گیا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی کے دو بلیغ لفظوں میں سب کچھ کہدیا "تؤزھم ازا" ان کو وہ ابھارتے ہیں، اچھال کر، جیسے گیند اچھالی جاتی ہے، جس میں بچوں کو اٹھا اٹھا کر اونچا کیا جاتا ہے، جیسے کسی گری پڑی چیز کو آپ لوگوں کو اٹھا کر دیتے ہیں، تو وہ اصل میں ان کی فطرت تو ہے پستی یعنی وہ چیزیں اپنی حقیقت کے لحاظ سے اور نتیجے کے لحاظ سے، اپنی ساکھ اور اپنے مادے کے لحاظ سے وہ پست ہیں، لیکن وہ ان کو اونچا کر کے دکھاتے ہیں، تاکہ وہ آمادہ ہوں۔ تو اس "تؤزھم ازا" میں سب آجاتا ہے، یوں اس کا ترجمہ تقریباً محال ہے پورے طور پر کسی زبان میں، عربی میں بھی اس کو ادا کرنا مشکل ہے۔ (۱)

---

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ کیسٹ سے نقل کر کے قلمبند کی گئی۔

کامیابی کا مادی نقطۂ نظر

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا. وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثاً وَّرِئْيًا.

(سورہ مریم: ۷۳-۷۴)

"اور جب ہماری آیتیں ان کو واضح طریقہ پر سنائی جاتی ہیں تو کافر (بول اٹھتے ہیں) ان لوگوں سے کہتے ہیں جو ایمان لائے کہ دونوں گروہوں سے کس کو زیادہ اچھی جگہ (حاصل) ہے اور کس کے پاس زیادہ سامان اور کون دیکھنے میں (اس وقت) زیادہ اچھا ہے۔"

ان آیات میں بڑی عبرت بھی ہے اور بشارت و تسکین کا سامان بھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

"جب ہماری آیتیں ان کو کھلی کھلی واضح طریقہ پر سنائی جاتی ہیں "قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْ" اس وقت کافر بول اٹھتے ہیں، ان لوگوں سے کہتے ہیں، ان کو خطاب کرتے ہیں "لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا" جو ایمان لائے "اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا" ذرا انصاف کرو، دیکھو تو ہم اور تم دو گروہ ہیں ان دونوں گروہوں میں سے کون اس وقت زیادہ آرام سے ہے۔ کس کو زیادہ اچھی جگہ حاصل ہے۔ اور کس کا اچھا منظر ہے۔

"اَحْسَنُ نَدِیًّا" کس کے پاس زیادہ سامان اور اس وقت کون دیکھنے میں زیادہ اچھا ہے۔

یہ ہم کیسے مان لیں، یہاں تو ہم آرام کر رہے ہیں، ہم عیش کر رہے ہیں، مزے لوٹ رہے ہیں، ہم عزت کے ساتھ ہیں، ہم کوٹھیوں پر رہے ہیں اور تم جھونپڑیوں میں رہ رہے ہو۔ (وہاں مسلمانوں اور کفار کا فرق تھا، بہت سے مسلمانوں اور کفاروں کے درمیان) تو یہ اب کیسے الٹ جائے گا وہاں (آخرت میں) جاکر؟ کہ تم جنت کے محلات میں رہو گے۔ اور ہم کو کہتے ہو کہ ہم جہنم میں جائیں گے اس کی کیا دلیل ہے؟

یعنی یہ انسان نے (مادی اعتبار سے) قیاس کیا ہے، وہ قصہ جو "صاحب الجنتین" کا سورہ کہف میں آیا ہے۔ اس میں دو طریقہ پر جس کو اللہ نے دو باغ دیئے تھے اور وہاں نہریں جاری کر دی تھیں اور باغ پھل دے رہے تھے، اور انگور کی کیاریاں اور کیا کیا سب ...... اس نے کہا کہ یہاں جو میرا حال ہے وہی حال مرا وہاں بھی ہوگا۔ بڑی صراحت کے ساتھ کہدیا گیا "وَلَئِنْ رُدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا" (میں جب لوٹایا جاؤں گا اپنے رب کی طرف تو میں اس سے بہتر پاؤں گا۔ انسان کے اندر یہ غلط قیاس کی ایک مشترک چیز ہے کہ جب ایک دور گزرتا ہے اچھا، آرام کا، عزت کا، یا حکمرانی کا، اقتدار کا، تو آدمی اس پر قیاس کرتا ہے کہ پھر یا تو یہی باقی رہے گا یا اگر کوئی تبدیلی آئی تو اس سے بہتر چیز ہمیں ملے گی۔ تو اس میں "صاحب الجنتین" نے جو بات کہی اللہ تعالیٰ یہاں نقل کر رہا ہے۔ "ای الفریقین خیر مقاما واحسن ندیا" ذرا نظر اٹھا کر دیکھو! تم کہاں کی باتیں کرتے ہو، خیالی باتیں کرتے ہو؟ دوسری دنیا کے عیش اس وقت کس کو حاصل ہیں؟ کون کوٹھیوں پر رہ رہا ہے؟ کون مزے کر رہا ہے اور کس کا ڈنکا بج رہا ہے؟

تمہارا حال یہ ہے کہ تم کو کھانے کو بھی پورے طور پر نہیں ملتا، کبھی فاقہ ہوتا ہے، کبھی کھانے کو ملتا ہے پہننے کے لئے پورا کپڑا اور تمہارے پاس رہنے کے واسطے مکان اور ٹھکانے کی جگہ نہیں ہے۔ تو کیسے مان لیں، یہ الٹ جائے گا سارا معاملہ ؟ اور مرنے کے بعد سب کچھ تم کو مل جائے گا اور ہم محروم رہ جائیں گے ؟

یہ انسان کی ایک کمزوری ہے کہ وہ ایک اچھی حالت پر دوسری حالت کو قیاس کرتا ہے اور وہ یہ فرق نہیں سمجھتا کہ پیمانہ بدل جائے گا تو پھر کیا ضروری یہاں کا پیمانہ کچھ ہے وہاں کا پیمانہ کچھ! یہاں کا پیمانہ ہے وراثت، یہاں کا پیمانہ ہے مفت میں دولت مل جانا، یہاں کا پیمانہ ہے محنت اور کوشش، یہاں کا پیمانہ ہے ان فنون کو جاننا، ان طریقوں کو جاننا جن سے دولت ملتی ہے کہ ان کی ٹکنالوجی اور امتحانات اور ڈگریاں یہ پیمانہ ہے یہاں کا، کچھ عالم اسباب میں یہ سبب ہے راحت کا۔

آخرت کا پیمانہ دوسرا ہے

لیکن اس عالم میں پیمانہ دوسرا ہے۔ اس (آخرت) کا پیمانہ ہے عقائد، اس کا پیمانہ ہے نیک اعمال، اور اس زندگی میں کیا کام کئے تھے، وہاں پیمانہ ہے اللہ کی رضا، عدم رضا تو جب پیمانے بدل گئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کی حالت کو دوسرے ملک کی حالت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے پیمانہ کچھ ہیں، امریکہ کے پیمانہ کچھ اور ہیں۔ وہاں مثلاً دولت حاصل کرنے کے طریقہ اور یہاں اور، اور وہاں جن لوگوں کو دولت حاصل ہوتی ہے ان کی حیثیت، ان کا ماضی، ان کا سرمایہ، ان کا امتیاز کچھ اور ہے اور ہمارے یہاں کچھ اور ہے، ہمارے یہاں ایسا ہوتا ہے کہ مفت میں ایک کروڑ پتی کا لڑکا

لکھ پتی کا لڑکا، لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے یا یہ کہ کسی کو دفینہ مل گیا، یا کسی پر کوئی مہربان ہے، اس کو دیدیا۔ لیکن ان ملکوں میں محنت ہے، لیاقت ہے، امتیاز ہے، تفوق ہے۔

تو جب ہم ایک ملک کے پیمانہ کو، ایک ملک کی حالت کو دوسرے ملک کی حالت پر قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ پیمانے مختلف ہیں، تو ایک عالم کو دوسرے عالم پر، ایک عالم کی حالت کو دوسرے کی حالت پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں؟ کہ وہاں تو پیمانے بالکل ہی مختلف ہیں اور یہاں کے پیمانے اگر مٹھی بھر کے ہیں یا بالشت بھر کے ہیں تو وہاں (آخرت) کے پیمانے تو میلوں تو کیا زمین و آسمان کے پیمانے ہیں۔ وہاں پیمانہ ہے ایمان و کفر، وہاں پیمانہ ہے اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا، راضی ہونا اور ناراض ہونا، وہاں کا پیمانہ ہے نبی کی اتباع کرنا، یا نافرمانی کرنا، وہاں کا پیمانہ حدود پر چلنا یا حدود شکنی کرنا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تو سطحی نظر کے لوگ ہیں جب ان کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں "اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَاماً وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا" ذرا دیکھو تو نظر اٹھا کر، جائزہ لو کہ کون یہاں آرام کر رہا ہے۔ کون یہاں عزت کے ساتھ ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا تو اللہ فرماتا ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا کوئی جواز نہیں۔ اس لئے کہ یہاں تو اللہ نے محنت دی ہے، "کھاؤ، کماؤ محنت کرو" جو زیادہ محنت کرے گا وہ زیادہ اچھا مکان بنالے گا۔ زیادہ آرام کے ساتھ رہے گا۔ جو زیادہ یہاں کے علوم و فنون میں قابلیت پیدا کرے گا، جو رائج الوقت ہیں، وہ زیادہ امتیازات کے ساتھ رہے گا۔

لیکن وہاں تو اس کی بالکل کوئی قیمت نہیں۔ "اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" (الکہف) یہاں پر جو لوگ کام کر رہے

ہیں وہ سمجھتے ہیں "اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے "ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا" ان کی سب کوشش دنیا کے میدان اور دنیا کے دائرہ میں صرف ہو رہی ہیں۔ اور آخرت میں کچھ کام نہیں آئیں گی۔

پچھلی تاریخ پر نظر ڈالو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اور ان کو سمجھانے کے لئے دوسری مثال دیتا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا" کہ دیکھ لیجئے کون یہاں زیادہ بہتر جگہ پر، عزت کی جگہ پر رہ رہا ہے اور کون زیادہ نظر میں بہتر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اچھا ذرا آخرت تو دور ہے۔ اس کو وہاں جاکر دیکھو گے، پچھلی تاریخ پر نظر ڈالو، ابھی کل کی بات ہے۔

"کَمَا اَھْلَکْنَا قَبْلَھُمْ مِنْ قَرْنٍ" کتنی ہم نے ایسی نسلوں کو، ایسی قوموں کو اور ایسی بستیوں کو تباہ کر دیا" ھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا" جو اپنے اثاث وسامان، یہاں "اثاث" کا ترجمہ فرنیچر بھی کیا جاسکتا ہے تو اس فرنیچر میں اور سامان آرائش میں اور دیکھنے میں کہیں بہتر تھے۔

اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب چیزوں کے باوجود ان کو ہلاک کر سکتا ہے اور کچھ کام نہیں آئیں وہ چیزیں تو پھر اس عالم کے ختم ہونے کے بعد اس نئے عالم کے شروع ہونے کے بعد کیا کام آئیں گی؟ اگر کام آئیں تو ان ہی کے کام آئیں۔ "وَھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا" وہ سامان میں۔ اب دیکھئے وہ زمانہ زیادہ سامان کا نہیں تھا لیکن قرآن مجید ابدی کتاب ہے آج "اثاث" کی بڑی اہمیت ہے، پہلے اثاث کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔

تمہارے پاس یہ ہے کہ نہیں؟ تمہارے یہاں ایر کنڈیشن ہے کہ نہیں، تمہارے یہاں کرسیاں کتنی ہیں، میزیں کتنی ہیں؟ یعنی تمہارا ڈرائنگ روم کیسا ہے؟ ڈرائنگ روم دیکھنے میں سجا ہوا ہے کہ نہیں؟ اس سے آدمی کے مرتبہ کا اندازہ کیا جاتا ہے اور اس کو درجہ دیا جاتا ہے اور ڈرائنگ روم کیسا ہے، ڈرائننگ ہال کیسا ہے اور تمہارے یہاں باتھ روم اٹیچڈ ہے یا نہیں؟ کوئی مہمان آئے گا کہاں ٹھہرے گا؟ یہ سب چیزیں آج کل چل رہی ہیں۔

اثاث کی قدر و قیمت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا" (جو بہتر تھے اثاث میں) جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا ہمارا اندازہ ہے قیاس ہے کہ اس کے سننے والے جو عرب کے بادیہ نشین تھے، عرب کے محدود اثاث زندگی میں رہتے تھے وہ "اثاث" کی اہمیت اور "اثاث" کی قدر و قیمت اتنی نہیں سمجھ سکے ہوں گے۔ جتنی آج ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہم میں سامان آسائش کے لحاظ سے کون بہتر ہے، تو عربوں کے ذہن میں یہ آیا ہوگا کہ بھگونہ تھا کہ نہیں تھا، چولہا تھا کہ نہیں تھا، وہ برتن کچھ مکمل تھے کہ نہیں تھے، کہ ان سے کھانا پکا لیا جائے، یہی ان کی زندگی تھی، بادیہ کے رہنے والے، اونٹ کا دودھ پینے والے اور اونٹ کا دودھ مل جائے اور روٹی ہوئی نہ ہوئی اور کھجور کے ساتھ گذارا کر لیا کرتے، تو یہ ان کے کھانے پینے کا حال تھا، اور گھروں کا حال۔ غرض کہ تمدن بہت ابتدائی حالت میں تھا۔

"اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا" "اثاث" جس کا ابھی ہم نے ترجمہ فرنیچر کیا ہے وہ اس

کے لحاظ سے بھی بالکل اس عہد میں اس کی وسعت اور اس کی اہمیت اور س کا مفہوم سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا کہ یہ بتاؤ! ان میں کون اپنے سامانِ آرائش و سامان آسائش کے لحاظ سے بہتر تھا، کون دیکھنے میں بہتر تھا؟ کہ دیکھ کر آدمی مرعوب ہو جائے کہ ......اوہ ...... اتنا سامان؟ تو کیا ہوا؟ ''وَاَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ'' ہم نے ان بستیوں کو ایسے ہلاک کر دیا جیسے کبھی کوئی چیز کام نہیں آئی۔ اس وقت ان کو خاک میں ملا دیا۔ اور بالکل جھاڑو پھیر دی۔ (ان کے سامان کے لحاظ سے جھاڑو پھیرنے کو اب بھی مناسبت ہے) تو اس سامان پر ہم نے جھاڑو پھیر دی۔ بہت سی جھاڑوؤں پر ایسی جھاڑو پھیر دی کہ بہت سی جھاڑوئیں تھیں ان سب پر ہم نے ایک اپنی جھاڑو پھیر دی لمبی جھاڑو، سب گیا۔ (۱)

قرآن مجید کی نظر میں اس زندگی کی جس کی ابدیت پر یہ مادہ پرست ایمان لائے ہیں اور جس کو منفعت پرستوں اور لذت پرستوں نے اپنا مرکز اور معبود بنالیا ہے صرف اتنی ہی حقیقت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ وہ ان پیمانوں اور پیمائشوں کو غلط اور بے بنیاد قرار دے کر (جن پر تنگ نظر ظاہر پرستوں اور اسباب کے گرفتاروں نے پورا اعتماد کر رکھا ہے اور اس سے بڑی توقعات اور آرزوئیں قائم کر لی ہیں) ایمانی پیمانوں کو قابل ترجیح اور معیار صحیح قرار دیتا ہے۔ (۲)

---

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ کیسٹ سے نقل کر کے قلمبند کی گئی۔

(۲) معرکہ ایمان و مادیت، ص ۸۵

اہل ایمان میں فواحش ومنکرات کا رواج

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَۃِ وَاللہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (سورۃ النور)

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے، انکو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔ اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ آیت ایک معجزہ ہے۔ جس وقت یہ آیت ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا نازل ہوئی تھی، مدینہ طیبہ کے محدود معاشرے میں ایک خاص واقعہ پیش آیا تھا۔ اس واقعہ کا لوگ اپنی مجلسوں میں چرچا کرنے لگے۔ مجلسیں کتنی بڑی تھیں، وہ واقعہ کتنا بڑا تھا، کن افراد سے اس کا تعلق تھا، یہ ساری چیزیں ایسی تھیں کہ قرآن مجید کی اس آیت کی وسعت اس سے زیادہ تھی۔ وہ قرنوں سے بڑھ کر اور تاریخی اور جغرافیائی فاصلوں سے آگے بڑھ کر کچھ اور چاہتی تھی۔ آج ہم اس آیت کی تفسیر دیکھ رہے ہیں۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ" جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فواحش اور منکرات کی محبت کا رواج ہو، اس کا تصور آج صحافت، ٹیلی ویژن، ریڈیو کے اس دور میں ناولوں کے اس دور میں، پکچر اور فلم کی ترقی کے اس دور میں اور لٹریچر اور فلسفوں کے اس دور میں اس کی جیسی تفسیر نہیں، بلکہ

تصویر دیکھی جاسکتی ہے، کسی اور زمانہ میں مشکل ہے۔ مدینہ کے اس ماحول میں لوگوں نے ایمان بالغیب سے کام لیا ہوگا اور انھوں نے اس کا انطباق کیا ہوگا۔ کسی مخصوص واقعہ پر، لیکن آج دنیا کی ساری طاقتیں جس طرح ان تشیع الفاحشۃ پر لگی ہوئی ہیں اس کا اس سے پہلے کیا اندازہ ہوسکتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں تخریبی طاقتیں جس طرح اخلاقی انارکی اور بغاوت پھیلا رہی ہیں ان کے پاس وہ وسائل ہیں جو رات کو دن اور دن کو رات ثابت کرسکتے ہیں، نور کو ظلمت اور ظلمت کو نور بنا سکتے ہیں۔

دنیا کی سیاسی، اقتصادی، اجتماعی تنظیمات سب کا حال یہی ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس کی حکومتوں کو دیکھئے، اسی کے ساتھ مشرقی حکومتوں کو بھی دیکھئے کہ وہ فاسق الخیال فاسد المقصد، جن کے مقاصد تخریبی، جن کی زندگی فاسد، جن کے اخلاق خراب، جن کے افکار وخیالات فاسد، ان سبھوں نے ایک اجتماعی نظام بنالیا ہے اور وہ اجتماعی نظام قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کر رہا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ اس گروہ کا جادو چل رہا ہے جس کے ہاتھ میں ابلاغ کے ذرائع ہیں جن کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:-

”اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ“(۱)

---

(۱) ماخوذ از حدیث پاکستان، ص ۵۰-۵۲

باب ۱۱

قانونِ مکافات

”قرآن مجید میں:-

عمل اور جزائے عمل کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات پورا پورا موجود ہے۔اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے:-

مسلمانو! نہ تم پر کچھ منحصر ہے اور نہ اہل کتاب پر (جن کو بڑے بڑے دعوے ہیں)

ہمارا قانون الٰہی یہ ہے:-

”مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِہٖ“ جو کوئی برائی کرے گا اس کو بدلہ ملے گا، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غداری کا اور بے وفائی کا، اختلاف کا، بے عملی کا، دولت پرستی کا، اقتدار پرستی کا، سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ، ایک جزا ہے، جس میں کوئی رعایت اور استثناء نہیں......

یہ مضمون قرآن مجید میں:-

کہیں صراحتاً اور کہیں کنایۃً بیان کیا گیا ہے، اس میں قوموں کے، سلطنتوں کے، بڑے بڑے جباروں کے تذکرے بھی ہیں، اور کمزوروں کا ذکر بھی ہے۔“

(حضرت مولانا مد ظلہ العالی)

بقائے انفع کا بے لاگ قانون

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

"جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔" (سورہ رعد:)

اللہ تعالیٰ کا جو نظام اس کائنات میں جاری وساری ہے جو ہمیں قرآن مجید کے مطالعہ سے اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ بقائے انفع کا قانون ہے۔ یوں تو اس وقت دنیا نے جس قانون کو تسلیم کیا وہ بقائے اصلح کا قانون ہے۔ SURVIVAL OF THE FITTEST ہے لیکن حقیقت میں قرآن مجید سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ ہے "بقائے انفع" کا قانون...... صاف صاف قرآن مجید میں ہے، سورہ رعد کی آیت ہے:-

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔

جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں، جس چیز میں کوئی پیام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم

خدمت انجام نہیں دے رہی ہے، جس پر انسان کی بقاء اور نشو اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے۔ اس کو قرآن مجید نے "زبد" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے۔ اور معانی سے لبریز ہے "زبد" پھین کو کہتے ہیں، یعنی دریا کا جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا، جس کے اندر ثبات واستقامت کی کوئی صلاحیت نہیں، وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے، دریا کے جوش کا ایک خارجی ظہور ہے۔ اس کے اندر استقرار نہیں، کوئی صلاحیت نہیں، بس ایک پھولی ہوئی سی چیز ہے۔ جس کے اندر ہوا ابھر گئی ہے، یا کہیے کہ نیچے کا جو میل کچیل تھا وہ اوپر آگیا ہے۔ اس کے اندر انسانوں کو فائدہ پہونچانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ اوپر بہہ جائے گا، یا کنارہ جا کر کسی چیز سے اٹک جائے گا اور باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا کہ "زبد" زیادہ دنوں تک باقی رہے، اس لئے کہ یہ عالم اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ اس میں "زبد" کی سمائی ہو، اگر دریاؤں کا جھاگ اور پانی کا پھین اس طرح باقی رہنے لگے تو جن کو باقی رہنا چاہئے ان کے لئے مشکل ہو جائے۔

"وَاَمَّامَا یَنْفَعُ النَّاسُ" لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے "فیمکث فی الارض" وہ ٹھہر جاتی ہے۔

بہت سے قومیں دنیا میں ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں، لیکن بہت سی قومیں ایسی ہیں جو بار بار شکست کھانے کے بعد بھی باقی ہیں۔ مسلمانوں نے تاتاریوں سے شکست

کھائی تھی، لیکن چونکہ ان کے اندر "وما ینفع الناس" کا مادہ تھا، وہ ایک پیام رکھتے تھے، وہ ایک زندہ دعوت رکھتے تھے، اس لئے تاتاریوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ وہ تاتاریوں کے سامنے جھکے، لیکن تاتاریوں کی تلواروں کو، دلوں کو اور دماغوں کو ان کی نافعیت کے سامنے اور ان کے پیام کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس لئے کہ زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ "نفع" کی زبان ہے۔ وہ زندگی کے استحقاق کی زبان ہے۔

یہ ہے خدا کا بنایا ہوا وہ ابدی قانون جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔

اگر آپ" وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" کے مصداق ہوں گے۔ زندگی کا استحقاق ثابت کر دیں گے اور اپنے اندر نافعیت پیدا کر لیں گے یعنی اپنے جوہر کا ثبوت دیدیں گے اور یہ ثابت کر دیں گے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے جو آپ کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ تو کوئی بے رحم اور بے درد ہاتھ، کوئی ظالم ہاتھ اور کوئی انقلاب و تغیر آپ کے نقش کو مٹا نہیں سکتا۔ اور سچی بات یہ ہے آپ کے لئے انقلاب نہیں ہے۔ آپ کیلئے کوئی تغیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنی نافعیت ثابت کر دی۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے لئے خاص طور پر ضمانت ہے جو دین کے ذریعہ دین کے راستہ میں اپنی نافعیت ثابت کر دے۔

جب ہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ”اللهم ان تهلك هذه العصابة لن تعبد“ اے اللہ تیری عبادت کا انحصار ان پر ہے، تیری توحید کا انحصار ان پر ہے، آپ بھی ثابت کر دیجئے کہ اگر مسلمان نہ رہیں تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی یا زندگی ناقص ہو جائے گی۔ اور کم سے کم اس میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا جس کا کوئی اور پر نہیں کر سکتا۔(۱)

(۱) پاجا سراغ زندگی تلخیص ص ۱۵۹ تا ص ۱۷۴

خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ کا فیصلہ

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَه، وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْد.

"وہی ہے جو ہمیشہ برساتا ہے لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد، اور اپنی رحمت
پھیلا دیتا ہے وہی قابل تعریف ولی ہے۔" (سورہ شوریٰ: ۲۸)

اس آیت نے میری بڑی رہنمائی کی ہے اور قرآن مجید اسی طرح ہمیشہ رہنمائی اور مشکل کشائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَه، وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْد.

اللہ وہ ہے جو بارش کو نازل کرتا ہے، حقیقت میں "غیث" کا ترجمہ "بارش" پورا ترجمہ نہیں ہے۔ "غیث" اس چیز کو کہتے ہیں جو عین وقت پر مدد کر دے، عین وقت پر مشکل کشائی کرے، فریاد رسی کرے، دست گیری کرے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح کسی جاں بلب مریض کے حلق میں آب حیات کے کچھ قطرے ٹپکا دیئے جائیں اس کو کوئی داروئے حیات مہیا کر دیا جائے، اسی طرح سے تپتی ہوئی، سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ آب حیات کے قطرے برسایا کرتا ہے۔

"وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا" وہ فریاد رسی کرتا ہے اور زندگی

کاسامان مہیا کرتا ہے انسانوں کے لئے، اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں آسمان سے لگیں ہوتی ہیں وہ بڑے ارمان وحسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسا کر سوکھی کھیتی کو ہرا کر دے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَه، وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ. اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے اور اپنی رحمت کی ہوائیں چلاتا ہے اور وہ ''الولی الحمید'' ہے۔

یہاں، پر جن صفات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بھی بڑی معنی خیز ہیں۔ اللہ کے سب نام اچھے ''وَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی'' اللہ کی سب صفات اعلیٰ و برتر ہیں۔ ''وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی'' لیکن یہاں ''الولی الحمید'' کی صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون سے اور انسانیت کی چارہ سازی اور سچائی سے اس کا خاص تعلق ہے۔

یہ انسانیت کس کی ہے؟ اللہ کی ہے! وہی اس کا والی ووارث ہے، کوئی اپنی کھیتی کو سوکھا نہیں دیکھ سکتا، کوئی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی لگائی ہوئی کھیتی سوکھ جائے وہ ''الولی'' ہے، وہ اس کا مالک بھی ہے اور پیدا کرنے والا بھی۔ ''الحمید'' ہے۔ وہ حمد کا مستحق ہے، جس کی شان حمید کی ہے، جس کی صفت حمید کی ہے، اس کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دے۔(۱)

---

(۱) پاجا سراغ زندگی ص ۱۸۰-۱۸۱

نیکی پر دس گنا- برائی پر اتنا ہی

''مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ." (الانعام:۱۶۰)

''جو کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے دس گنا (اجر) ہے۔ اور جو کوئی گناہ لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی۔"

یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:-

''مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا." جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا، ''وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا'' اور جو کوئی گناہ لے کر آئے گا، برائی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا۔ ''وھم لا یظلمون'' اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی۔

تمام دنیا کا قانون یہ ہے کہ اگر نیک کام کیا ہے اتنا ہی انعام ملے، اسی کے بقدر، اس کے اس اچھے کام کی جسامت، اس کا رقبہ اور اس کا وزن دیکھ کر اس کو انعام دیا جاتا ہے اور اگر کوئی قصور کرے، غلطی کرے اس کا بدلہ دیا جاتا ہے اور جزا و سزا دونوں ہی میں مماثلت ہوتی ہے جو بھی قانون ایک کے لئے ہے وہی دوسرے کے لئے اختیار کیا

جاتا ہے۔ اور اس وقت دنیا میں جتنے بھی دستاویز ہیں، جتنے بھی قوانین ہیں، نظام چل رہے ہیں اس دنیا میں اسی پر عمل ہوتا ہے سوائے اس کے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی استثنا ہو۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان کیا ہے کہ نیکی پر تو ہم دس گنا دیں گے اور برائی پر برائی کے بقدر دیں گے۔ ''مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.'' یہ محض اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور انسان کی کمزوری کا، اس کے ضعیف البنیان، اس کے قصور وار اور اسکے خطاکار ہونے کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اگر یہاں بھی یہ قانون ہوتا کہ برائی پر بھی دس گنا وبال ہوتا، تاوان ہوتا تو انسان کہیں کا نہ رہ جاتا۔ اس لئے کہ برائی زیادہ ہوتی ہے۔ انسان سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنایا کہ نیکی پر تو دس گنا اور غلطی پر اتنا ہی۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے۔

''وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ'' اور ان کیساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی یہ نہیں کہ اگر برائی کی تو اللہ ناراض ہو کہ بالکل برباد کر کے رکھ دے۔ اس لئے کہ وہ تو خالق اور وہ محسن ہے، مزکی ہے۔ اپنی بنائی ہوئی چیز سے جب قصور ہوتا ہے تو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ اپنے پڑھائے ہوئے شاگرد سے، اپنے پروردہ لختِ چشم سے جس پر اس نے احسان کیا ہے اور اپنے ملازم سے غلطی ہو جائے تو آقا کو زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس لئے فرمایا ''وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ'' ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی۔

اس پر عمل نہیں کیا جائے گا کہ ہم نے نیست سے ہست بنایا، معدوم سے موجود

کیا، اس کو قوت عطا کی، زندگی عطا کی، جسم ودماغ اور دل عطا کیا اور ہم نے کوئی کمی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کو پیس کر رکھ دینا چاہیے، مٹا کر رکھ دینا چاہئے۔ تاکہ پھر انسان نافرمانی نہ کرے۔ اس کو یہ بھی حق تھا لیکن وہ فرماتا ہے:۔

"وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ"

(ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی)(۱)

(۱) مسجد دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں درس قرآن کے سلسلہ کی ایک تقریر جس کو مولانا سید بلال عبدالحئی ندوی نے کیسٹ سے نقل کر کے ہمیں عنایت کی۔ (مرتب)

کامیابی کی ضمانت خواہشات نہیں حقائق ہیں

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتَابِ. مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِهٖ.

(نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے، جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض سزا دیا جائے گا؟(سورہ النساء: ۱۲۳)

خواہشات اور حقائق میں فرق

دنیا میں دو چیزیں ہمیشہ سے رہی ہیں اور وہ ہیں انسانی نفسیات اور فطرت انسانی کا خاصہ ہیں۔ ایک تو ہیں خواہشات اور ایک ہیں حقائق۔ سنت اللہ بھی یہی ہے اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اس دنیا میں اقوام و ملل کی قسمتوں، ان کی تقدیر اور جرأت کے آگے یہ بھی کہتا ہوں کہ مذاہب اور ان کی عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ واقعات و حقائق کے ساتھ ہے خواہشات کے ساتھ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ملیں گی۔

"لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتَابِ. مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِهٖ" اس آیت میں دونوں چیزوں کی پوری نمائندگی ہے۔ جہاں تک خواہشات کا تعلق ہے

اخلاقی و عقلی حیثیت سے یہاں تک کہ دینی و روحانی حیثیت سے کیسی ہی عزیز اور قابل احترام ہوں لیکن فیصلہ خواہشات پر نہیں ہے۔لیس بامانیکم اور یہ بھی قرآن کی حکمت ہے کہ والامانی اھل الکتاب سے پہلے لیس بامانیکم فرمایا تاکہ یہ خیال نہ ہو جہاں تک مذاہب باطلہ کا تعلق ہے ان کی خواہشات پر کیا فیصلہ ہوگا۔ ان کی کیا قیمت ہے۔ تو پہلے کہا اور یہ قرآن مجید کا امتیاز ہے کہ تمہاری اور آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مخاطب کون ہے؟ مخاطب بعد کی آنے والی نسلیں تو بعد میں ہیں۔ ثانوی درجہ میں ہیں۔ مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں۔ اصحاب بیعت رضوانؓ اصحاب بدر ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ ہیں۔ ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔ "لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ" تمہاری خواہشات پر بھی فیصلہ نہیں ہے۔ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ" ہمارے یہاں اٹل کا قانون یہ ہے کہ "من یعمل سوء یجز به" یعنی عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ اس کو عمومی دائرے میں لیں۔ تو "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَ بِهِ" کا تعلق صرف عالم آخرت ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس تکوینی دنیا اور عالم آخرت دونوں سے ہے۔ ہمارے یہاں قانون یہ ہے کہ جو عمل کرے گا اس کی جزا ظاہر ہوگی۔

بقائے انفع

دنیا میں ہمیشہ سے بلکہ آخری دور میں خاص کر یورپ میں ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر یہ اصول تسلیم کیا گیا اور جس کو Survival of the Fittest کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔

"بقاء اصلح" جو زیاد صالح ہو گا وہ باقی رہے گا۔ اس کی بنیادیں مذہبی کتابوں اور مذہبی انسانوں کے بیانات میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے بھی آگے کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ جو نفسیات قرآنی اور نفسیات دینی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرا قانون ہے وہ بقائے انفع کا۔ "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَّاَمَّامَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد ۱۷) اس میں ایک حکمت ہے جو قابل غور ہے۔ "بقائے اصلح" کا فیصلہ بڑا مشکل ہے۔ "اصلح" اصل میں اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اشیائے صالحہ میں اصلح کا فیصلہ اشیائے فاسدہ میں صالح کا فیصلہ نہیں ہے۔ بقائے اصلح کے معنی یہ ہیں کہ جو صالح چیزیں ہیں ان میں اصلح کون سا ہے۔ اشیائے صالحہ جن کو زندگی کا حق ہے جو کشمکش حیات میں پوری اتر سکتی ہیں وہ چیزیں وہ نہیں ہیں بلکہ ان اشیائے صالحہ میں اصلح کون سا ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کون سی عدالت کرے گی۔ لیکن فطرت انسانی شروع سے ایسی ہے کہ نافع کا فیصلہ تو جلد کر لیتی ہے۔

نافع کا فیصلہ

نافع کا فیصلہ ہر دور میں یعنی علم و ترقی کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اور علم و ترقی کی پستی اور ابتدائی حالت میں بھی۔ نافع کا فیصلہ فطرت انسانی کی وہ صلاحیت ہے وہ ملکہ ہے جو ہمیشہ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (چونکہ یہ کتاب کتاب انسانیت ہے پوری نوع انسانی کو یہ صحیفہ دیا گیا ہے یہ ہر دور کا ہے، اور عقلی و علمی، روحانی و عملی جتنی سطحیں ہو سکتی ہیں ان سب پر حاوی ہیں) اس لئے قرآن مجید نے اس کو

بقائے اصلح پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ بقائے انفع کا اصول بتایا ہے۔

ہم میں کا ایک بچہ بھی یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ اس کے لئے زیادہ مفید ہے اس سے اس کو زیادہ آرام ملے گا۔ والدین کے حق میں اس کا یہی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو انفع سمجھتا ہے۔ اپنے عزیز واقارب کو وہ انفع سمجھتا ہے۔ جو زیادہ پڑھے لکھے تجربہ کار اور عقلمند ہوتے ہیں ان کے متعلق بھی بچہ اگر وہ فاتر الاستعداد نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں وہ بھی یہ اندازہ کرلیتا ہے کہ یہ میرے لئے زیادہ مفید ہے۔ تو بقائے انفع ایک ایسا اصول ہے جو نوع انسانی اور تاریخ انسانی کے ہر دور اور نوع انسانی کی ہر نسل میں وہ کام دیتا ہے۔ تو قرآن مجید نے یہ کہہ دیا "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" میں نے یہ تمہید اس لئے بیان کی کہ خواہشات اور حقائق یہ دو چیزیں ہیں اور اس میں قومی، ملی، حکومتی، انفرادی اور عوام کی جمہوری سطح پر بڑی غلطی ہے کہ خواہشات کو خواہشات سے بہ نسبت حقائق کے زیادہ وابستگی رہی ہے۔

حقائق کو صحیح طور پر محسوس نہ کرنا اور ان حقائق کا تقاضہ پورا نہ کرنا یہ ایسی غلطی ہے کہ اس میں بڑی بڑی طاقتور حکومتیں رومن ایمپائر اور پرشین ایمپائر اور پھر اخیر میں خلافت اندلس کی مستحکم وسیع اور طویل المیعاد سلطنت اور اسی طریقے سے خلافت عباسیہ اور پھر خوارزم شاہ کی وہ شہنشاہی کہ جو ساری اسلامی سلطنتوں کو اس نے اپنے اندر ضم کرلیا تھا۔ اگر ہم ان کی تاریخ پڑھیں گے اور ان کے زوال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حقائق سے نظرپوشی نظر آئے گی۔(۱)

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۶ء

نیک بندوں کے حق میں محبت کی فضا ہوتی ہے

"اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا."

(سورہ مریم:)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کئے "رحمٰن" ان کے لئے ایک محبت پیدا کردے گا" یہاں "رحمٰن" کا لفظ آیا ہے یعنی ایسی محبت جس میں رحمت بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے حق میں ایسی محبت کی فضا پیدا کردے گا۔ اور کس انداز سے؟ مفسرین نے تو اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا، لیکن صحیح تفسیر اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت دلوں میں پیدا فرمادے گا۔ چنانچہ حدیث قدسی میں صحیح حدیث ہے غالباً صحیحین کی کہ "جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو فرشتہ جبریلؑ سے کہتا ہے کہ "مجھے فلاں بندے سے محبت ہے، تم بھی اس سے محبت کرو" وہ دوسرے فرشتوں سے کہتے ہیں پھر اوپر کے آسمان والے دوسرے آسمان والوں کو، یہاں تک کہ اس کی محبت دریا کی مچھلیوں تک اور سوراخوں کی چیونٹیوں تک سرایت کرجاتی ہے۔"

اور یہ آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل سے دکھایا کہ اللہ

تعالیٰ کے محبوب و مقبول بندوں کی محبت کہاں کہاں تک پہونچ جاتی ہے اور ایسی ہوتی ہے کہ قلوب مسخر ہو جاتے ہیں اور یہ ایسی خبر متواتر اور ایک ایسی حقیقت ہے۔ تاریخی حقیقت بھی ہے اور مشاہدہ بھی کہ اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ہم نے چند بزرگوں کو دیکھا ہے۔ ہندوستان میں اور کچھ بزرگوں کو دیکھا ممالک عربیہ میں، کہ جیسے ایک انتظام ہے کہ کوئی جا کر دلوں میں ان کی محبت ڈال دے۔ اور ان کو پلادے، یعنی گویا کوئی چیز ہے، کوئی پیالہ ہے، جو جا کر سب کو پلایا جاتا ہے، ان کو خود خبر نہیں ہوتی، اور نہ اس کا کوئی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اس کا نہ کوئی منتظم ہوتا ہے۔ آپ ہی آپ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل جیسے آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے، تبدیلی ہوتی ہے یا لطافت ہوتی ہے آب و ہوا کی، یا چمن کی خوشبو ہوتی ہے، پھول کی خوشبو ہوتی ہے، اس طرح وہ خوشبو پہنچ جاتی ہے، اب جس درجہ کا آدمی ہے اتنے ہی بڑے حلقہ میں وہ خوشبو پہنچ جاتی ہے۔

ہم نے چند بزرگوں کو دیکھا، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کہ تقسیم سے پہلے پاکستان میں ان کے پاس بڑے بڑے لوگ لاہور کے آتے اور سر جھکا کر بیٹھے ہوتے تھے اور حضرت تقریر کرتے تھے، ایک مرتبہ تقریر کی کہ "اے لاہوریو! احمد علی اتنے دنوں سے لاہور میں ہے کہ ایمانیوں کو دیکھنے کو ترستا ہے، تمہارے یہاں سب کچھ ہے لیکن ایمان والے بہت کم ہیں۔ اور اس میں کوئی راستہ میں بیٹھا ہے اور ہم دیکھتے تھے کہ چوٹی کے لوگ آتے تھے، معلوم ہوتا جیسے کسی نے جا کر گھول کر پلا دیا ہو۔

ہندوستان میں ہم نے اپنے حضرت شیخ و مرشد مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کو

دیکھا پورے علاقہ میں کیا یہاں (ہندوستان) سے لے کر پاکستان تک جہاں سے کہ جب وہ حجاز گئے تو ہم نے دیکھا کہ پورے حجاز میں احترام اور ایک محبت کی فضا تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کو دیکھا بغیر کسی تشہیر کے، اور حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اور پھر آخری دور میں حضرت تھانویؒ کو دیکھا، ان کی زیارت کی، وہاں بھی دیکھا کہ لوگ چلے آرہے ہیں بڑے سے بڑا عالم چلا آرہا ہے، دروازہ بند ہے، ابھی سب باہر ہیں تخت بچھا ہوا ہے، بہت سے کھڑے ہیں، بہت سے بیٹھے ہیں، اس انتظار میں کہ دروازہ کھلے اور ہم جائیں، مجھے یاد ہے کہ بڑے سے بڑے عالم اور بڑے سے بڑے معزز لوگ بھی وہاں ہوتے تھے، سب سر جھکائے ادب سے بیٹھے ہیں کہ حضرت کی زبان سے کوئی لفظ نکلے۔

اب یہ سب کیا چیز ہے؟ "سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کیلئے "رحمٰن" نے ان کے لئے یعنی ان کے لئے دلوں میں جو محبت پیدا ہوگی اس میں خود رحمت کا شائبہ ہوگا، رحمت ملی ہوئی گی۔

اور ایک محبت ایسی ہوتی ہے جو رحمت کے بغیر ہوتی ہے۔ (نازک لفظوں والی چیز ہے اس کو بیان کرنا بھی مشکل ہے) ایک محبت ہے، محبت تو ہے لیکن اس میں رحمت نہیں۔ آدمی اپنی محبت کا اظہار کر دینا چاہتا ہے۔ چاہے اس کو تکلیف پہونچے، اب بہت سی مرتبہ دیکھا کہ محبت کے اظہار میں، محبت کا معاملہ کرنے میں آدمیوں کو جسمانی تکلیف پہونچ گئی، نہیں، بلکہ ہم اپنی محبت کا اظہار کریں کہ اس کو دبائیں گے، ہم ان کو چمٹائیں گے، ان کو لٹائیں گے، ہم یہ کریں گے، ہم ان کو گھسیٹ کر اپنے گھر

لے جائیں گے، کھلائیں گے، دعوت ضرور کریں گے، چاہے ان کا پرہیز ہو۔

یہ وہ محبت ہے جس کے ساتھ رحمت شامل ہے۔ "سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" ان اللہ کے بندوں کے حق میں جو محبت پیدا کی جاتی ہے اس میں رحمت بھی شامل کردی جاتی ہے۔ تاکہ یہ کام کریں تاکہ یہ ابھی رہیں تاکہ ان سے فائدہ پہونچے اور یہ آرام پائیں۔

اب ایک ایک لفظ جو قرآن مجید کا ہے اپنے پیچھے ایک عالم رکھتا ہے، کتب خانہ رکھتا ہے، کسی تفسیر میں ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ نہ کسی زبان میں "ودا" یہ نکرہ ہے۔ ایک خاص طرح کی محبت یعنی اس کی بھی قسمیں ہوں گی کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور ان کے درجات بھی ایسے ہوں گے۔ ۱۰۰ نمبر کے، ۹۰ نمبر کے، ۸۰ نمبر کے، ۷۰ نمبر کے ہوں گے۔ "ودا" کسی قسم کی محبت اللہ پیدا فرمادے گا۔

محبت کی بھی ایسی شکلیں ہیں کہ ایک تو معالج کی محبت ہوتی ہے، ایک ماں باپ کی محبت ہوتی ہے، ایک استاذ کی محبت ہوتی ہے، ایک دوست کی محبت ہوتی ہے، یہ سب جس کے ساتھ جو مناسب سمجھے گا وہ محبت پیدا کرے گا۔(۱)

---

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ۔ کیسٹ سے نقل کرکے قلمبند کی گئی۔

انسانی سعی و کوشش کے آثار و مظاہر

وَاَنَّ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی. وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی. ثُمَّ یُجْزٰهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰی.

(النجم: ۳۹-۴۰-۴۱)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

حیات آفریں پیغام

یہ آیات صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتیں بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کے لئے ان آیات میں حیاتِ نو کا پیغام ہے۔ اور خاص طور پر ہماری تعلیم گاہوں کیلئے، اصلاحی مراکز کیلئے اور خاص ان مرکزوں کیلئے جہاں پر نوجوان ہوں امت کے، اور ملت کے بچے و فرزند ہوں، جن کی اٹھتی ہوئی عمر ہے اور چلتی ہوئی کشتی ہے۔ تو ان کیلئے اس آیت میں پورا دستور العمل ہے اور ایک چراغ راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی ہے جس کی وہ کوشش کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور خاص طریقہ ادائے قرآنی کے ساتھ فرمایا گیا، ''وان سعیہ سوف یریٰ'' (اور اس کی کوشش ایک مرتبہ نظر آکر رہے گی) یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ یہاں ''سوف'' کا لفظ استعمال ہوا، جو عام طور پر مستقبل بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جلدی تمھیں نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا ''سوف یریٰ'' وہ نظر آئے گا، جو کچھ دنیا میں دیکھ رہے ہیں، سلطنتوں کا قیام، تہذیبوں کا عروج، علوم وفنون کی اشاعت، باکمال لوگوں کا پیدا ہونا، سب انسانی سعی وجہد کے ظہور کے نتائج ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہ سار

یہ شاعر کی بات نہیں، یہ اصل میں قرآن کی ترجمانی ہے۔

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا

اس طرح امت کے تشخص کی حفاظت کی ذمہ داری خود ملت کا فرض ہے، قرآن مجید نے صرف فرد کو مخاطب کر کے نہیں فرمایا۔ ہر فرد اور ہر ملت کے لئے قانون خداوندی یہی ہے کہ

وَاَنْ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

(سورہ النجم: ۳۹)

انسان کو اپنی زندگی اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اس کی سعی آئے گی، اور سعی کے نتائج آئیں گے، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:

"وَاَنَّ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (انسان کو وہی ملیگا جس کی اس نے کوشش کی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرمارہاہے، وہ جب کہہ رہاہے کہ کوشش شرط ہے اور انسان کی کوشش ہی کا نتیجہ نکلے تو پھر دوسرا انسان کیا کہہ سکتاہے، نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس چیز کی اس نے کوشش کی ہے "وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی" اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا، اس کی کوشش کا نتیجہ دکھائی دے گا، آنکھوں کو دکھائی دے گا کہ جو کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا، پھر اس کے بعد بڑی بشارت سناتا ہے "ثُمَّ یُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰی" اسم تفضیل کا صیغہ ہے اتنا آپ جانتے ہوں گے؟ پھر اس کو بدلہ دیا جائے گا بھرپور بدلہ، زیادہ سے زیادہ بدلہ، ایک تو انسان کی کوشش ضائع نہیں ہوگی۔ کوشش کا نتیجہ نکلے گا پھر انسان کی کوشش کا نتیجہ اس کی توقع سے، اس کے استحقاق سے، اس کی محنت کی مقدار سے بھی بڑھ کر نکل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بشارت سناتا ہے کہ ہوگا ایسا اور ساری تاریخ بتاتی ہے علم کی تاریخ بتاتی ہے، دعوت واصلاح کی تاریخ بتاتی ہے کاموں سے اشتراک کی تاریخ بتاتی ہے تحقیقات وتصنیفات کی تاریخ بتاتی ہے، اصلاحی کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوشش کا نتیجہ بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات کوشش سے زیادہ نکلا، کوشش کا جو پیمانہ تھا اس کا جو سائز تھا اس سے بہت

بڑھ کر نتیجہ نکلا، وہ نتیجہ کوشش کے سائز سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر بشارت کیا ہو سکتی ہے؟ آپ اگر پکڑ لیں اس بات کو اور دل پر لکھ لیں کہ ہم کوشش کریں گے تو کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا امید ہے کہ کوشش کی حیثیت سے بڑھ کر نکلے گا، توقع سے بڑھ کر، قیاس سے بڑھ کر نکلے گا اور اس کے لئے نہ کسی بہت بڑی جگہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑی دانش گاہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑے اونچے خاندان کی ضرورت ہے، نہ بہت اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی ضرورت ہے، نہ بہت وسیع کتب خانہ کی ضرورت ہے اس کے لئے کوشش کی ضرورت ہے۔ نیت کی ضرورت ہے، سنجیدگی اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

محنت اور حسن نیت واخلاق یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں تو پھر وہ ضائع نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے جو کہ عالم الغیب اور قادر مطلق ہے، دیکھئے ایک تو عالم الغیب ہونا یہی ایک بڑی بات ہے لیکن وہ قادر مطلق بھی ہے، عالم الغیب بھی ہے، مخبر صادق بھی ہے اور رب العالمین بھی ہے۔ وہ جب فرماتا ہے، اعلان کرتا اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے "وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی" اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا تو پھر دنیا میں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، کچھ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں اور تاریخ کے تمام ددوروں کے لئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، اور اس کے اثرات ونتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ یُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔ پھر اس کو اس کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

چراغ زندگی اور دستور العمل

قرآن مجید کی اس آیت میں پورا پیغام ہے۔ زندگی کا پورا پیغام اس کے اندر ہے، زندگی ہر طرح گزارنی چاہئے، زندگی کے لئے کیا سامان پیدا کرنا چاہئے، زندگی دینی زندگی ہو، علمی زندگی ہو، دعوتی زندگی ہو، اصلاحی زندگی ہو، ان سب کے لئے ہر طرح تیاری کرنی چاہئے اور اس تیاری کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کو فائدہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کون سی کوشش کا کیا فائدہ ہے؟ فلاں دوا کا کیا خاصہ ہے؟ فلاں بیج کا کیا مادہ ہے؟ اور فلاں میدان کا کیا تقاضہ ہے؟ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ذہن میں القاء فرمائی اور دل میں ڈالی جس میں پوری زندگی کا نظام آگیا ہے اور پورا قانون آگیا ہے۔ اور آپ اس آیت کو سمجھ لیں اس کو اپنا دستور العمل اور اپنا رہنما بنالیں اور اس آیت کی صداقت پر آپ ایمان لے ائیں اور یقین کرلیں اور دل میں اس کو اتارلیں، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے دنیا کے تمام حکما اور بڑے بڑے ذہین لوگ بھی کوئی بات کہتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ایسا ہوگا اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو اس کا پورا سو فیصدی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زندگی کا تجربہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور کیسے کیسے فائدے فلاں فلاں چیز کے بتائے گئے تھے ان میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ فرمادے کہ اس کا یہ خاصہ ہے۔ یہ کروگے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو پھر اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، پھر ایسی کیا بات ہے کہ کہی جائے کہ اس کو آپ اپنا دستور العمل بنالیں اس کو اپنا چراغ

زندگی بنالیں اور اس کی روشنی میں آپ چلیں۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے۔ اقبالؔ نے انسان کے لئے کہا تھا؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے(۱)

(۱) ۱۔ تحفہ دین ودانش ص ۴۳

۲۔ پندرہویں صدی ہجری تاریخ کے آئینہ میں ص ۱۰۰۸

۳۔ تعمیر حیات ۲۵؍ مارچ ۱۹۹۴ء – ۱۰؍ دسمبر ۱۹۹۳ء – ۲۵؍ جنوری ۱۹۹۸ء سے مشترک ماخوذ ہے۔

علم کا بھی ایک قانون ہے

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا. وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا. وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (البقرہ:)

صحیح راہ کی ضرورت

جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ و تفسیر انھوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جو لوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک عرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا، شریعت میں نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی کہ جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہوں، حج کے ارکان میں مشغول ہوں اور اس دوران اگر ضرورت ہو گھر آنے کی، کوئی بات کہنے کی تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں، تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے من ظھورھا پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب و احترام ہے۔ اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا" یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" گھروں میں، گھروں کے دروازوں سے آؤ۔

یہی قاعدہ ہے اور یہی عقل سلیم اور ذوق سلیم کی بات ہے، اور قانون قدرت ہے کہ جس چیز کا جو مدخل ہے اس سے آدمی آئے، قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لئے کتاب ہدایت ہے، ہر طبقہ کیلئے، ہر مشغلہ، ہر میدان اور مرحلہ کے لئے وہ ایک دستور العمل اور ایک ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے، قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم ہیں "وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" یہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اس میں پوری زندگی کی حکمت بتادی گئی، یہ صرف گھر کا معاملہ نہیں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہئے، اگر کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے، کوئی صنعت سیکھنا چاہے، لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے اور تدریج کے ساتھ درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے، لوہاروں کی ایک وردی ہے اور سقاؤوں کی ایک وردی ہے، سپاہیوں کی ایک وردی ہے اور ڈاکٹروں کی ایک وردی ہے تو وردی بعض اوقات ضروری ہوتی ہے ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا، اس کو پیشہ نہیں آئے گا، فن نہیں آئے گا۔ تو جب یہ معمولی چیزوں کا حال ہے اگر کوئی کہتا ہے کہ فضول باتیں ہیں ہمیں لوہاری کا فن سیکھنا ہے یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے لیکن وردی کا جھگڑا اہم مول نہیں لیتے یہ پہنو وہ نہ پہنو اور صاحب لیفٹ

رائٹ Right, Left فضول بات ہے، ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے، ہم دوسرا طرز ایجاد کریں وہ یوں ہی رہ جائے گا۔ اچھا سپاہی بن نہیں سکتا، ایسے ہی لوہار نہیں بن سکتا نجار (کارپنٹر) نہیں بن سکتا اس کے لئے بھی "وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" کی ضرورت ہے جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

یہ "وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" ساری زندگی دین ودنیا سب پر حاوی ہے کہ اللہ نے اور فطرت انسانی نے، فطرت سلیم نے سالوں سال کے تجربے سے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جو اس کے مداخل اور مخارج ہیں اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو ان کا کوئی احترام نہ کرے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے، ا، ب، ت، کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف، ب، ت، پڑھے ہم براہ راست پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین ہو کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا جو، ا، ب، ت، نہیں پہچانتا یا A.B.C.D. نہیں پہچانتا وہ کبھی ایک سیکنڈ نہیں بول سکتا آپ کسی وقت بھی تجربہ کر کے دیکھئے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو پڑھا ہوا نہ ہو خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجئے اردو کی دیجئے یا انگریزی کی دیجئے یا عربی کی دیجئے یا یہیں کی کنٹر زبان کی دے دیجئے اور کہئے کہ رات بھر نہیں آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا۔ یہ کتاب ہے اور آپ ہیں، ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں تالہ لگا دیتے ہیں کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہونچاتے ہیں اور وہاں پہلے سے موجود اور زندگی کی سب ضروریات ہیں ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہئے اور یہ صفحہ حل کر دیجئے اس صفحہ کو آپ پڑھ دیجئے اور اس نے

حروف تہجی نہیں پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہوگا جیسے وہ داخل ہوا تھا اس لئے کہ "وَأْتُوْالْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" پر اس نے عمل نہیں کیا، حروف تہجی بڑے حقیر ہیں کیا حقیقت ہے، ا، ب، ت، بچوں کو پڑھایا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ بھی محتاج تھے کہ حروف تہجی پڑھیں پھر احیاء علوم الدین اور تفسیر رازی تک پہونچیں وہ احیاء علوم اور تفسیر رازی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے اگر انھوں نے حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے، ایسے ہی ہر فن، ہر علم کا، ہر شعبہ کا ایک قانون ہے اس قانون پر چلنا ہوگا۔ یہ ہمارا علم اول تو مجرد علم ہے، مجرد علم کا حال بھی یہی ہے کہ بہت سی چیزیں تو اس میں مشترک ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا استاذ سے پڑھنا محنت کرنا، استاذ کا احترام کرنا۔

علم دین کا امتیاز

کچھ چیزیں تو مشترک ہیں لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے ایک ایسی لکیر آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ کیا مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو، اخلاص ہو، دعا ہو خدا سے کہ اے اللہ ہم سے تو جو محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے اصل تو دینے والا ہے علم کا۔

حضرت امام شافعیؒ کا شعر یاد کیجئے:

شکوت إلی وکیع سوء حفظی　　فأوصا نی الی ترك المعاصی

بان العلم نور من الـه　　ونور الله لا یعطی لعاصی

میں نے اپنے استاد وکیع سے شکایت کی میرا حافظہ کمزور ہے انھوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو بہت گناہوں سے دور رہو اس لئے کہ علم جو اللہ کا نور ہے اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔ یہاں سے سرحد الگ ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا علم جو ہے جس علم کے طالب علم ہیں۔ یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاذ، کیا کتابوں کا ادب، کیا پرانی دقیانوسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے حافظہ دیا ہے محنت صحت ہماری اچھی ہے، ہم سب کر کے دکھادیں گے، نہیں ایسا نہیں بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ان کا ڈنکا بج گیا، مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے انھوں نے غلط لائن اختیار کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے ان کی ذہانت اور معقولات میں ان کی دسترس مسلم تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال بھی ان کو مانتے تھے لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہئے تھا، جو علوم وسنت کا اجرا ان سے ہونا چاہئے تھا اور جو اشاعت ہونی چاہئے تھی جو ان لوگوں میں بیٹھ کر خشیت پیدا ہونی چاہئے تھی وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنی تو ہمارے ساتھ تھے تو ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے یہ بڑے نمایاں تھے ان سے کیا فیض پہنچا، ذہانت کے باجود؟ ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے ارے مولوی الیاس تو جب دیکھو نفلیں پڑھتے تھے، پڑھنے کے زمانے میں نفلیں پڑھتے تھے مولوی الیاس صاحب نے کیا کر دکھلایا، دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امریکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی تو بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کر کے

"وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ جن کو اپنی ذہانت پر ناز ہے اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر وہ نہیں پہنچ سکتے، ان کے پڑھنے پڑھانے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے۔ علم کے ساتھ سنتوں کا اجرا ہو بدعات کا محو ہو، معصیتوں سے نفرت پیدا ہو، طاعت میں رغبت پیدا ہو، نور آئے یہ بات پیدا نہیں ہوگی۔ یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے ایک صاحب تھے بہت بڑے علامہ، شام کے علامہ بیطار، کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ اپنے استاد کے پاس نہیں جاسکے بڑی سخت سردی تھی، سردی شام میں ہوتی ہے برف پڑتی ہے کہنے لگے ہم مجبور ہو گئے، دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے کیوں نہیں آئے، ہم نے کہا سردی بہت تھی اوپر سے ایک گھڑا پانی اور ڈال دیا کہنے لگے کہ یہ سردی ہے، کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی اور پھر جانے لگے اب وہ علامہ بیطار بن گئے، انھوں نے خود سنایایا ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا، تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی لیتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد استاد ہی نہیں ہوتا تھا ایک طرح کا پیر ہوتا تھا اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے، کیا خشوع وخضوع ہے، سنتوں کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے، مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کون سا رکھتا ہے، نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے یہ باتیں سیکھتے تھے استادوں سے اور اب یہ باتیں کم ہوگئیں۔

بس وہی بات ہے کہ "وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم کیا ہے وہی قواعد وضوابط پر چلنا، احترام کرنا، نظام کے ساتھ رہنا

مطالعہ دیکھنا محنت کرنا۔

بس چند باتیں ہیں لمبا قصہ نہیں ہے، اگر ان پر عمل کیا جائے تو آج بھی اللہ کا قانون یہی ہے جو سیکڑوں، ہزاروں برس پہلے تھا۔(۱)

(۱) تحفۂ بھٹکل تلخیص از ص ۵۷ تا ص ۶۰

خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. (سورہ یٰسین:۳۸)

اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں فرماتا ہے کہ:

"آفتاب اپنے مستقر کی طرف (اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے طلوع اور غروب کی جو جگہ متعین کی ہے) بے اختیارانہ بڑھتا اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے، اور یہ اس مالک کا مقدر کیا ہوا اور بنایا ہوا نظام وحساب اور اس کا قانون ہے، جو "العزیز" بھی ہے، "العلیم" بھی غالب بھی ہے اور علم والا بھی، نظام بنانے والا اور حساب مقرر کرنے والا بھی"۔

اگر کوئی صرف غالب ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا نظام وحساب حکمت پر مبنی ہو، اور وہ محض اپنی قوت سے کام لیتا ہے، لیکن اس کی ساری کاروائی اور کارفرمائی ضروری نہیں کہ حکمت پر مبنی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ حکم دینے والا علیم ہو، لیکن غالب نہ ہو، تو سارا کام پورا ہونا مشکل ہے۔

آفتاب دین ودعوت کے نظامِ شمس کا انضباط

اس آیت مبارکہ (جس میں نظام شمس کا ذکر کیا گیا ہے، کہ آفتاب اللہ تعالی کے ارادے سے ایک خاص جگہ سے چلتا ہے اور ایک خاص جگہ پہونچتا ہے اور وہ اپنا پورا سفر اللہ کی قدرت اواس کے علم کے مطابق طے کرتا ہے) روشنی میں آفتاب رسالت، آفتاب دین حق، آفتاب دین ودعوت کے نظام شمس کے انضباط اوراپنے مقاصد کی تکمیل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے، ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں اتفاقات کوئی چیز نہیں ہیں، وہ سب اللہ کے منشا اور اس کے حکم کے مطابق اوراس کی حکمت کے عین موافق گردش کرتے ہیں، اوراس کے تابع ہو کر ان کا نظام چلتا ہے۔

آپ اس نظام نیابت کو دیکھیں جو "خلافت راشدہ" کے لقب سے مشہور ہے کہ آنحضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے سفر کرنے کے بعد جو شخصیتیں مسند خلافت پر آئیں اور پھر جس ترتیب کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرائض خلافت ادا کرنے کا جو موقعہ ان کو عطا فرمایا یہ بالکل "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" کا مظہر ہے۔ اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ترتیب اور ایسے نظام کے ساتھ چلایا کہ وہ اس کی رحمت واسعہ، اسکی حکمتِ بالغہ اور اسکی قوتِ قاہرہ کی ایک مثال ہے۔

پہلی ضرورت دین کی حفاظت کا کام

مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے (میں ریڑھ کی ہڈی نہیں کہوں گا اس کیلئے یہ روح کا درجہ رکھتی ہے) وہ اس دین کی

حفاظت کا کام ہے۔ اس کا لانے والا، اس کا حامل اول اس کو جس طرح لایا ہے اور اس میں جس چیز کا جو مقام ہے اور جس چیز کا جو درجہ اور اس کی جو ترتیب ہے اس کے مطابق اس کا جانشین اس کو قائم رکھے اور اس میں ذرا بھی تبدیلی کا روادار نہ ہو، یہ سب سے ضروری اور اہم کام ہوتا ہے۔ مذاہب کی تقدیر کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ پیغمبر کے بعد (اس دین کے اولین لانے والے کے بعد) کون اس کی جگہ لیتا ہے کہ دین اپنی اصلی حالت اور صحیح ترتیب پر اور اس کی تعلیمات اپنی اہمیت کے مطابق اپنے مقام پر قائم وباقی رہیں؟

ایمان کامل کے بعد، معرفت الٰہی کے بعد اور توحید خالص کے بعد دنیا میں جو بہترین اوصاف ہو سکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ کسی مذہب کے بقاء کے لئے (میں ارتقاء نہیں کہتا ارتقاء تو بعد کی چیز ہے) جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے جذبہ حفاظت اور نبی کی تعلیمات کے بارے میں شدید غیرت...... دوسری صفات بعد کی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر ان سب کا مقام ہے لیکن پہلی شرط جس پر دین کی بقاء کا انحصار ہے وہ یہ کہ نبی کا جانشین اس کا نائب اس کی جگہ پر امت کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے والا جو کچھ بھی ہو اپنی جگہ پر لیکن دین کے معاملہ میں حد درجہ غیور ہو۔ اس سے بڑھ کر ذکی الحس، اس سے بڑھ کر خوددار وحساس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

سارے مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ یہ مذاہب اس وجہ سے تحریف کا شکار ہوئے اور انھوں نے بہت جلد اپنی شکل بدل دی اور ایک دوسرے راستہ پر پڑ گئے کہ ان مذاہب کو اپنے لانے والوں کے بعد (لاکھوں درود وسلام ہوں

ان پر) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا جانشین، محافظ وامین اور وفادار وغیور جانشین نہیں ملا۔ حضرت ابو بکر صدیق کس درجہ کے آدمی تھے؟ ان کی صفات، کمالات، فضیلت، ان کا عدل و تقوی، خدا کے ساتھ ان کا تعلق اور ان کا زہد وایثار یہ سب سیرت اور حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لیکن ان کی سب سے بڑی اور غالب صفت جس کی پہلے مرحلہ میں سب سے بڑھ کر ضرورت تھی، وہ ان کی دین کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی غیرت، ذکاوت حس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ اور منشائے رسول کی تکمیل کا غیر متزلزل عزم وفیصلہ تھا۔ یہ ان کا وصف خاص اور انکی سیرت کی کلیدی صفت ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آج دین پر عمل ہورہا ہے، فرائض اور شرعی احکام زندہ ہیں۔ دین تحریف اور امت کلی طور پر ضلالت سے جو محفوظ ہے یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اسی حفاظت دین کے جذبہ کا نتیجہ اور ظہور ہے اور ان کی خلافت اولی کا رہین منت ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ دین کے بارے میں ایسی غیرت رکھتے تھے جو غیرت عزت و آبرو کے بارے میں ہوتی ہے۔ اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف اور ان کا اصلی جوہر تھا۔ جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کے اس وصف کو ان کا وہ جملہ بتاتا ہے جس کو تاریخ نے انھیں کے لفظوں میں نقل کیا ہے۔ یہ جملہ خود بول رہا ہے کہ وہ کس دل سے نکلا ہے اور کس ایمان ویقین کے ساتھ نکلا ہے۔ وہ جملہ ہے "أينقص الدين وانا حي" (میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہوسکتی ہے؟ میری

آنکھوں کے سامنے اللہ کے دین میں ایک حرف کیا ایک نقطہ کی بھی کمی ہو سکتی ہے؟

یہ ہے وہ چیز جس کی مذاہب وادیان کو سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے اور یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔

دوسری ضرورت حاملین دین کا مزاج نہ بدلنے پائے

اب دوسرے نمبر پر ضرورت تھی کہ دین تو محفوظ رہ گیا لیکن حاملین دین بھی محفوظ رہیں اور جو داعیانِ اول ہیں اور اس کے نمونہ اکمل ہیں اور جو اس کے عملی پیکر اور اس کا مظہر کامل ہیں ان کا مزاج بدلنے نہ پائے۔

اس وقت روم اور شام اور ایران فتح ہو رہے ہیں، مصر و شام کی دولت امنڈ امنڈ کر آ رہی ہے اور بارش کی طرح برس رہی ہے جن کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا وہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں آ رہی ہیں۔ اب خطرہ یہ تھا کہ امت تمدن کے اس سیلاب میں بہ نہ جائے۔

اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر ایسی ہستی کو سامنے لایا جو اس وصف میں سب سے زیادہ ممتاز تھی۔ کہا نہیں بالکل نہیں...... میرے سامنے عربوں کا، امت اسلامیہ کا مزاج نہیں بدل سکتا، یہ تمدن کا شکار نہیں ہو سکتے، عیش و عشرت میں نہیں پڑ سکتے، انھوں نے عربوں کو بڑی تاکید سے سادگی، جفاکشی، شہسواری، زہد و قناعت اور اپنی قدیم نسلی سپاہیانہ و متقشفانہ خصوصیات قائم رکھنے کی ہدایت و تلقین کی۔

اسلامی فتوحات اور باکمال افراد کی ضرورت

تیسرے نمبر پر کس چیز کی ضرورت تھی؟ فتنہ ارتداد ختم ہو چکا، تحریف کا دروازہ بند ہو چکا، انسانی مساوات اور عدل کا نظام قائم ہو چکا تھا، اب ضرورت تھی کہ یہ اسلامی مملکت قائم رہے گی تو خیر کا دروازہ کھلا رہے گا، کیسی کیسی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوں گی، کیسے کیسے باکمال افراد پیدا ہوں گے۔ کیسے کیسے عالم ربانی پیدا ہوں گے، کیسے کیسے آئمہ و مجتہدین پیدا ہوں گے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ جیسے، کیسے کیسے محدث پیدا ہوں گے، امام بخاری اور امام مسلمؒ جیسے، کیسے کیسے قانون ساز پیدا ہوں گے، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ جیسے، کیسے کیسے فاتح پیدا ہوں گے، عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے۔

چنانچہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، کیونکہ انھیں کے خاندان کے لوگ زیادہ تر ملکوں کے فاتح اور حاکم و منتظم تھے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اہل کاران سلطنت کا خونی رشتہ بھی ہوتا ہے، نسبتی و وطنی رشتہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس چیز کو اپنی چیز سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم محض ملازم ہیں اور جوابدہ ہیں تو اس وقت اس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، اب یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ آئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسی فتوحات ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ آپ کے زمانہ میں قبرص، افریقہ کا ایک بڑا حصہ، آذربائیجان، اصطخر، سابور، شیراز، اصفہان، طبرستان، سجستان اور نیشاپور فتح ہوئے۔

سیاسی اقدار کی ضرورت

اسلام کی طرف سے اب بالکل اطمینان ہو چکا تھا، سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اب کوئی خطرہ باقی نہ تھا۔ اب ضرورت تھی کہ مسلمان اتنے دنوں تک حکومت کر چکے تھے اور تمدن کا اثر پڑنا لازمی تھا اور سیاسی طرز فکر کا آنا بھی ضرری تھا کہ آدمی سیاسی اقدار کے ذریعہ سوچے اور فیصلہ کرے کہ اس وقت یہ کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا نامناسب، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے اور دین کا مطالبہ یہ ہے۔

اب ضرورت تھی کہ خلیفہ رابع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لایا جائے جن کا اصل وصف اور اصل امتیاز یہ تھا کہ سیاسی اصولوں اور سیاسی منافع اور مفادات پر خالص دینی اصولوں کو ترجیح دی جائے اور اس کی ذرا پرواہ نہ کی جائے کہ خلافت ہاتھ میں رہے گی یا نکل جائے گی، نہیں یہ چیز یہاں کے لئے مناسب نہیں اس کو بدل دینا چاہئے۔ یہ کام یہاں نہیں ہونا چاہئے۔

آپ کے عہد خلافت کی ایک یہ خصوصیت وافادیت تھی کہ آپ نے اس کا نمونہ پیش کیا کہ اندرونی فتنوں، ہم مذہبوں کی مخالفت وانتشار کے دور میں کسی طرح اصول پر قائم رہا جاتا ہے اور سیاست دین پر غالب نہیں ہونے پائی، امام ابو حنیفہؒ نے خوب فرمایا کہ اگر حضرت علیؓ کا دور نہ ہوتا تو ہمیں خیر القرون کی کوئی مثال اور نمونہ نہ ملتا، کہ فتنوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

یہ تھا وہ جوہر جس کی چوتھے نمبر پر ضرورت تھی...... اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ

نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور دیکھئے یہی ہے تقدیر الٰہی اور "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" سے میں اسی کی طرف اشارہ کررہا ہوں۔ آپ روز سورج کو مشرق سے نکلتے اور مغرب میں ڈوبتے دیکھتے ہیں۔ یہی تنہا اللہ کے قہار ہونے اور حکیم وغالب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آفتاب رسالت کے اللہ تعالیٰ کے جو منازل مقرر کئے اور جن منازل سے اس کو گذارا۔ اور جس طرح کے اس کے دین کو تکمیل تک پہونچایا اور اس طرح جس کے جانشین مہیا کئے اور اپنے نبی کو جو خلفاء دیئے یہ بھی "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" کا مظہر ہے۔(۱)

---

(۱) ماخوذ باختصار از "خلفائے اربعہ کی تربیت خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی ص۶ تا ۲۹

باب ۱۲

عبرت وموعظت

"قرآن مجید:-

...... قوموں...... تاریخی ادوار...... مختلف مراحل حیات

اور مختلف زندگیوں کے انواع واقسام کا..................

ایک بولتا ہوا مرقع ......اور چمکتا ہوا صاف وشفاف آئینہ ہے،

جس کا جی چاہے:-

فرد ہو یا قوم......جماعت ہو یا انجمن

......خاندان ہو یا قبیلہ......

اس میں اپنی صورت دیکھ لے،

اور اپنے متعلق خود فیصلہ کرلے کہ......

ہمارے ساتھ:-

کیا معاملہ ہونے والا ہے،

اللہ تعالیٰ سے کسی کا رشتہ نہیں......!

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ)

”جاہلیت“ اور ”اسلام“ کا فرق

”جاہلیت“ اور ”اسلام“ کا ذکر قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں کیا ہے اور عظیم الشان فرق بتایا ہے جو ان دونوں میں پایا جاتا ہے۔ فرمایا ہے:-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (آل عمران۔ ۱۰۴)

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہونچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

أَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ.

(الانعام)

بھلا جو (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کردی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔

حقیقت میں جاہلیت اور اسلام کی اس سے زیادہ بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، اور دونوں کے فرق و خصائص کو اس سے زیادہ وضاحت اور بلاغت کے ساتھ

بیان نہیں کیا جاسکتا۔

جاہلیت اور اسلام کی پوری تاریخ انھیں دونوں آیتوں کی تفسیر اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

"جاہلیت" کیا ہے "کُنْتُمْ اَعْدَاءً" اور "کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" کا مظہر!

اور اسلام کیا ہے "اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" کی تفسیر اور "أَنْقَذَکُمْ مِنْهَا" کی تصویر!

عہد جاہلیت میں ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ انسان کی صحیح تعریف اس سے زیادہ صحیح اور اس سے زیادہ بلیغ نہیں کی جاسکتی، جو قرآن نے "أَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً" سے کی ہے، اسلامی انقلاب بلکہ مجموعہ، انقلابات اور سلسلہ انقلابات کی اگر تصویر کھینچنا ہو تو اس کے لئے "فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" سے زیادہ بلیغ لفظ نہیں مل سکتے۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کر کے بتاتا ہے) اور دو اور دو چار اس طریقہ سے سمجھایا ہے، بھلا وہ جو مردہ تھا "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" ہم نے اس کو زندہ کیا، اور اتنا ہی نہیں "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے "کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے کہ جو اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، نکلنے کا اس کو کوئی راستہ ہی نہیں ملتا (۲)

---

(۱) مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی ص ۱۲۲

(۲) تحفہ دین و دانش ص ۶۵-۶۶

جاہلی طور طریقوں سے بچنے کی تاکید

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (سورہ المائدہ. ۵۰)

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے یہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔

"حُکم" کے معنی

سورۂ مائدہ کی آیت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں۔ میں "حکم" کے متعلق عرض کردوں، عربی زبان سے ایک خصوصی تعلق رکھنے والے انسان کی حیثیت سے اور عربی ذخیرہ کی چھان بین کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بھی! "حکم" کا لفظ قرآن مجید میں بڑا وسیع اور بلیغ ہے، "حکم" کے معنی صرف قانونی فیصلہ کے نہیں "ترجیح" و "اختیار" کے بھی ہیں، کسی چیز کو ترجیح دینا اور کسی چیز کو اختیار کرنا یہ بھی "حکم" میں شامل ہے، "حکم" کا لفظ ان سب معانی پر حاوی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

کیا جاہلیت کے فیصلہ کو، کیا جاہلیت کے انتخاب کو، کیا جاہلیت کے رجحان کو، کیا جاہلیت کے اصول کو وہ ترجیح دیتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں "وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" اللہ تعالیٰ سے بہتر حکم دینے والا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں کون ہے؟

جاہلیت کا مفہوم

سارا مسئلہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کا ہے اور اب میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں، ہمارے بہت سے پڑھے لکھے بھائی بھی "اسلام" و "جاہلیت" کے فرق کو بھول چکے ہیں، چونکہ جاہلیت ان کے نزدیک ختم ہو چکی ہے۔ زیادہ تر "جاہلیت عربیہ" ان کے ذہن میں ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت اور اسلام کی کوئی کشمکش اب نہیں ہے اور اسلام و جاہلیت کے فرق کو سوچنا اور اس کا جائزہ لینا گویا ایک طرح سے تضیع اوقات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت میں جو بھی کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس فرق کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان ہے۔

جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بت پرستی کا دور، دختر کشی کا دور، شراب نوشی کا دور، اور رہزنی کا دور، ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے ہے لیکن معاشرت، طرز معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار واصول اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں، حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے، اگر جاہلیت کا

ترجمہ اردو میں کیا جائے تو اس کا جو ترجمہ حاوی ہے اور ان سب چیزوں کو اپنے ضمن میں لے لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، قوم کا وہ دور جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو، میں اس کا ایک دوسرا ترجمہ کرتا ہوں "من مانی زندگی"! جاہلیت کیا ہے؟ من مانی زندگی گذارنا، یہ روح ہے جاہلیت کی، جاہلیت کی اسپرٹ ہے، جو چیز اسلام کی مخالف و متوازی ہے اور آسمان سے اللہ کے نازل کیے ہوئے ادیان سے اور صحف سماوی سے اور تعلیمات ربانی سے بے نیاز ہے، وہ یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت آسمانی کی روشنی سے جو دور محروم ہو وہ جاہلیت ہے اور اس میں پھر کیا ہوتا ہے، زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، من مانی زندگی، یعنی جو دل میں آئے جو ہماری سوسائٹی، ہمارا ماحول چاہتا ہے اور جو معیار اس وقت مقرر ہو چکے ہیں اور "حیثیت عرفی" کے اظہار کے جو اصول مقرر ہو گئے ہیں ہم تو اس پر چلیں گے، یہ ہے من مانی زندگی! اور اس کو قرآن و حدیث کی اصطلاح میں "جاہلیت" کہا گیا ہے۔

جو جاہلیت کا نعرہ لگائے

دیکھئے اگر آپ احادیث کا جائزہ لیں تو آپ کو کئی جگہ ایسا معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے ایسی چیز پر بھی جس کا تعلق عقیدہ سے نہیں تھا، جاہلیت کا اطلاق فرمایا، ایک صحابی ہیں (جن کا نام نہیں لوں گا) ان کا معاملہ اپنے ملازم کے ساتھ کوئی مساویانہ نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "انك امرؤ فيك جاهلية" تم ایک ایسے

آدمی ہو، تمہارے اندر جاہلیت کی بو ہے، اب عقائد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، خادم کے ساتھ ایسا معاملہ رکھنا کہ یہ مالک ہے اور وہ مملوک ہے، اس کو جاہلیت کہا اور پھر اس سے بڑھ کر "من تعزیٰ علیکم بعزاء الجاھلیة" جو تمھارے سامنے جاہلیت کی دعوت دی، عصبیت جاہلیت کی طرف بلائے ور جاہلیت کا نعرہ لگائے، اس کے ساتھ سخت کلامی کرو، سخت سے سخت بات اس کے سامنے کہو "ولا تکنوا" اور کنایہ واشارہ سے بھی کام نہ لو۔ اس کو جاہلیت کیوں کہا؟

فرمایا:.........."من تعزی علیکم بعزاء الجاھلیة" اس کے معنی اگر آپ کسی عالم سے پوچھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں جو تمہارے سامنے جاہلیت (خلاف اسلام) کا نعرہ لگائے، اس کے کسی فعل یا رواج کی تحسین کرے، تم سخت لفظ استعمال کرو اور ذرا بھی رعایت، اشارہ اور کنایہ سے کام نہ لو، کون کہہ رہا ہے وہ رحمۃ للعالمین فرما رہے ہیں، اور جو سراپا رافت ورحمت ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں، مثال نہیں مل سکتی۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ جاہلیت کو، جاہلی زندگی کو، جاہلیت کے معیاروں کو، جاہلی دعوتوں کو کس نظر سے خدا نے بھی دیکھا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی دیکھا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور اعظم ترین پیغمبر کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی اس میں ہزاروں عیب تھے، بت پرستی، ظلم وڈاکہ زنی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا وغیرہ۔ اسی طریقہ سے پچاس قسم کے عیب ان کے اندر تھے، اس سے مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے کہ اس دور کا نام "جاہلیت" رکھا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس زمانہ کی مذمت کرنے کے لئے اور س زمانہ کے عیب

کو ظاہر کرنے کیلئے اور اس جیسے زمانہ سے ڈرانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عربی جیسی فصیح زبان میں اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا۔ یہ کہا ہو تا کہ بت پرستی کا زمانہ، یہ کہا ہو تا کہ کشت وخوں کا زمانہ، یا یہ کہا ہو تا کہ ظلم وزیادتی کا زمانہ یا خانہ جنگی کا زمانہ، لیکن قرآن شریف میں اس عہد کا نام "جاہلیت" آیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلىٰ — دیکھو عورتو! تم اس طرح اور بے پردہ نہ پھرو جس طرح جاہلیت اولی میں ہوا کرتا تھا۔

(۲) اِذْجَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ. — جبکہ لوگوں نے اپنے دل میں جھوٹی غیرت اور خواہ مخواہ کی خودداری پیدا کی جو جاہلیت اولیٰ کی تھی۔

(۳) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ. — تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں۔

اسلام کی صحت کی دلیل جاہلیت اور اس کے متعلقات سے نفرت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں "جاہلیت" کا لفظ استعمال کیا ہے، ہم قرآن شریف پڑھتے ہیں، گذر جاتے ہیں ہمیں خیال نہیں آتا، الفاظ کا انتخاب یہ بڑی اہم چیز ہوتی ہے، جس کو مصنف وادیب، محققین اور بڑے وسیع النظر لوگ اور اعلیٰ درجہ کے زبان داں جانتے ہیں کہ کسی چیز کے لئے کسی لفظ کا اگر انتخاب کیا جاتا ہے تو اگر وہ آدمی حقیقت شناس ہے، نبض شناس ہے اور زبان پر اس کو پوری قدرت ہے تو وہ ایسا لفظ انتخاب

کرتا جو اس کی پوری تصویر کھینچ دے۔ اور اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی حقارت پیدا ہو تو ایسا لفظ لاتا ہے کہ اس سے حقارت پیدا ہو جائے، اگر تعریف کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ لاتا ہے جس سے اس کی عظمت پیدا ہو، عزت پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ زبانوں کا، الفاظ کا خالق ہے، معانی و حقائق کا خالق ہے اور ادیبوں، شاعروں اور بڑے بڑے اہل کمال کا خالق ہے، وہ اس عیب کو کسی اور لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھئے یہ ہم کو سبق دیا گیا ہے کہ ہمیشہ جاہلیت سے ڈریں، کہ وہ جو زمانہ باقی رہنے کے قابل نہیں تھا، خدا جانے کس وقت اس پر اللہ کا عذاب آجاتا، اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم و کرم فرمایا، انسانیت پر رحم فرمایا کہ عرب کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے محبوب، سب سے بڑے پیغمبر کو پیدا کیا۔ لیکن اس زمانہ کا جب ذکر آتا ہے اور قرآن شریف میں اس کی صفت آتی ہے تو جاہلیت کے لفظ سے آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بڑے جلال سے ارشاد فرمایا "اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" یہ اسلام کے قانون کو نہیں مانتے اور شریعت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتے تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں۔

یہاں پر دیکھئے اس غصہ کا اظہار کرنے کیلئے کتنا سخت لفظ آنا چاہئے تھا، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگاہ میں اور قرآن کریم کی زبان میں "جہالت" اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کو "جاہلیت" کہا گیا۔

اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ (کفر) "جاہلیت" اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے، اس

کی طرف واپسی اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو، اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر (زمانہ جاہلیت) کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔

"اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" کیا جاہلیت کے رسم ورواج کو چاہتے ہیں کیا جاہلیت کے ترجیح وانتخاب کو چاہتے ہیں؟ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حکم کے معنی صرف فیصلہ کے نہیں، بلکہ ترجیح واختیار کے بھی آتے ہیں، یعنی آدمی کسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو قوت محرکہ ہوتی ہے جو اسکی دلیل ہوتی ہے وہ بھی اسکے اندر شامل ہوتی ہے، کیا جاہلیت کا فیصلہ قبول کریں گے، جاہلیت نے جس چیز کو ترجیح دی ہے، اختیار کیا ہے اس کو اختیار کریں گے اس پر چلیں گے؟ یہ جائز نہیں۔(۱)

قرآن مجید

"مجموعی حیثیت بھی وہ معجزہ ہے اور انفرادی حیثیت سے بھی،
یعنی ایک ایک آیت بھی اس کا الگ معجزہ ہے بلکہ اگر میں
(عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے)
یہ کہوں کہ اس کا ایک یک لفظ بھی مستقل معجزہ ہے
تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے!"

---

(۱) ۱۔ کل مسلمان اور مکمل اسلام تلخیص از ص ۷ تا ص ۲۷ ۲۔ مدارس ومکاتب کا قیام سب سے ضروری چیز (غیر مطبوعہ تقریر) ص ۴-۶ ۳۔ اسلام کے قلعے ص ۳۶-۳۷ مشترک اخذ وتلخیص

امت مسلمہ کو قرآنی انتباہ

لَاتَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ، وَمَالَکُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ.

"(اے مسلمانوں!) ان ظالموں کی طرف مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ جلاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمھارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو، پھر حمایت تو تمہاری ذرا بھی نہ ہو۔" (سورہ ہود:)

تمہارا دل مائل ہونے نہ پائے

ہم میں اکثر عربی جانتے ہیں لیکن بعض دفعہ زبان کا جاننا بلکہ اس سے بھی زیادہ زبان جاننے کا احساس وشعور اور دعویٰ حجاب بن جاتا ہے، مفہوم صحیح تک رسائی سے۔

اس آیت کا جو زور ہے اس کی وجہ سے ہمیں کہنا پڑا کہ ہماری عربی فہمی حجاب بن سکتی ہے، آیت کے ہر لفظ کے معنی ہمیں معلوم ہیں لیکن آیت کی جو روح ہے اس کا جو اعجاز ہے اور لفظ کی جو قوت ہے اس کا سمجھنا آسان نہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تمہارا دل مائل نہ ہونے پائے، تمہارے اندر قلبی

رجحان نہ ہونے پائے ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا ہے، جن کی زندگی سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی ہے اور جو خدا سے بُعد اختیار کئے ہوئے ہیں فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آگ کی لپٹ تم تک بھی پہونچ جائے گی آگ تم کو بھی چھولے گی وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. اور پھر اللہ کی ولایت سے محروم کردیئے جاؤ گے اور کوئی تمہاری مدد بھی نہیں کر سکے گا۔

ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں، احکام شرعی میں اور دین کی زبان میں دو ہی چیزیں ہیں مثلاً یہ کفر ہے یہ ایمان ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، لیکن ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جن کو بعض دفعہ حرام اور کفر کہنا مشکل ہوگا لیکن وہ چیزیں دو خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، ایک وہ جو اللہ کو پسند ہیں اور دوسری وہ جو اللہ کو ناپسند ہیں، یہ اصول قرآن مجید کے مطالعہ سے، کتاب وسنت کے علم سے، مزاج نبوی کے جاننے سے، صحابہ کرامؓ کے طرز فکر سے اور سوچنے سمجھنے کے پیمانہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ علاوہ کفر وایمان کے، علاوہ حلال وحرام کے اور علاوہ جائز وناجائز کے بھی کچھ چیزیں ہیں اور وہ کیا ہیں؟ وہ ہیں رہنے سہنے کا طریقہ، صورت اور شکل، شعار اور پہچان اور دنیا میں تجمل وزینت کے اسباب کے اقسام۔

مطالبہ کیا ہے؟

جس وقت حضورؐ کی بعثت ہوئی اور اسلام آیا تو مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ دعوتِ ایمانی اختیار کرو، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے قائل ہو، شرک سے توبہ کرو اور

کفر سے بچو، بلکہ ایک پوری تہذیب بھی دی گئی، ایک پورا طرز زندگی بھی ملا، اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ یہ وضع اختیار کرو، اس پر اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی ورحمت کی نگاہ پڑتی ہے اور ان سے بچو کہ یہ راندۂ درگاہ اور مغضوب علیہم قوموں کا شعار ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے تخریب کا کام لیا اور جن پر اللہ کا عتاب ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی یہ تعلیم دی ہے کہ تم بھی ان کو قابل نفرت سمجھو۔

یہ بہت بڑا دین کا ایک نکتہ میں بیان کر رہا ہوں جس پر بہت سے اچھے لوگوں کی نظر نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں فرض وواجب تو نہیں ہیں، اس سے کفر وفسق تو لازم نہیں آتا، آپ جب کسی ذمہ دار اور مفتی صاحب سے پوچھیں گے اور ان کو فتویٰ دینا اور حکم شرعی بیان کرنا ہو تو یہی کہے گا کہ یہ نہ کفر ہے نہ شرک، لیکن اس کے بعد پھر وہ چیز ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معتوب قوموں، اور نعمت اسلام کا انکار اور ناقدری کرنے والی قوم اور اپنی جگہ پر مستقل رہنے والی قوم اور نفس پرست ودنیا پرست، دولت پرست، اقتدار پرست اور خواہشات نفس کی پیروی کرنے والوں کا شعار ہیں، اور اس میں ان کی وضع وصورت بھی نظر آتی ہے، کہ جو دولت ایمان سے محروم ہیں اور بعثت نبوی کے وقت بھی محروم رہیں اور برابر ان کا سلسلہ جاری ہے یا ان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں، انھوں نے وہ قدیم راستہ اختیار کیا ان سب کی وضع وصورت میں داخل ہے۔

ایک مسلمان جو دینی مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے اور صرف احکام ظاہری کا پابند نہیں بلکہ واقعی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حضورؐ کی دعاؤں کا مستحق بننا چاہتا ہے اور اس کو یہ

خیال ہے کہ اللہ کے رسول کو ہمیں اپنی صورت دکھانی ہوگی، یا اس کو خیال ہے کہ قبر میں فرشتے آئیں گے، سوال وجواب کریں گے یا پھر میدانِ حشر کا کوئی تصور اس کے سامنے ہے اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اتنا سمجھتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کے تاثرات کا، جذبات کا، پسندیدگی وناپسندیدگی کے اظہار کا پورا ذخیرہ موجود ہے، اس میں اور آنکھوں سے دیکھ لینے میں کوئی فرق نہیں، جہاں تک تعلق ہے حجت اور قطعیت کا تو کتاب وسنت کے مطالعہ سے احادیث اور سیرت نبوی کے ذخیرہ سے جو باتیں بدرجہ یقین ہم تک پہونچ گئی ہیں ان میں اور مشاہدہ میں کوئی فرق نہیں اور ہونا بھی یہی چاہئے، ایمان کی کمزوری ہے کہ اس میں فرق سمجھے، تو ایسے شخص سے مطالبہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کی، مذہبی اقدام کی، اسلام سے نفرت کرنے والوں، اسلام کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے والوں اور اسلام کی تہذیب ومعاشرت کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے والوں کی تہذیب اور شکل وصورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔

اور میں اس کو محض جزوی مسئلہ، محض نفلی چیز اور محض کمالی چیز نہیں سمجھتا کہ اللہ جس کو توفیق دے یہ بھی کرے۔ یہ بھی کر لے، نہیں میرے نزدیک نماز، روزہ اور حج وزکوۃ (ارکان اربعہ) کا مقام اپنی جگہ پر ہے، عقائد کا مقام اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ غیر مسلموں کی وضع وہیئت، غیر مسلموں کی تمدن وتہذیب اور اقدار ومعیار (جن کو عربی میں القیم والمثل) اور انگریزی میں IDEAL AND VALUES کہتے ہیں) ان سے بھی مسلمانوں کے دل میں نفرت ہونی چاہئے، بُعد ہونا چاہئے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

آیت کا مفہوم

یہ اس آیت کا مفہوم ہے "وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ"
اگر ان کی طرف میلان ہو جائے، مثلاً آپ ان کو احترام اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگیں، آپ کسی انگریز کو کسی امریکن کو، کسی یورپین کو (جبکہ وہ پورا مجسمہ ہو اپنی تہذیب کا اور جبکہ وہ کسی انٹرویو کے لئے نکل رہا ہو، یا آفس کو جا رہا ہو) آپ نے اگر اس کی طرف اس طرح نظر اٹھائی کہ بھائی ترقی یافتہ آدمی تو یہ ہے، متمدن آدمی تو یہ ہے، معاشرت تو یہ ہے، دیکھئے صبح کو دیر میں اٹھتے ہیں اس کے بعد داڑھی بناتے ہیں، نہاتے ہیں، اس کے بعد نئی پوشاک پہنتے ہیں، پھر ناشتہ کرتے ہیں اور پھر آفس جاتے ہیں، یونیورسٹی جاتے ہیں، یہ ہے انضباط، یہ ہے باقاعدگی، یہ ہے ڈسپلن، یہ ہے زندگی گزارنے کا نمونہ۔ آپ یاد رکھئے اگر آپ کے دل میں یہ خیالات آگئے تو اس وقت اگر کوئی دیکھنے والی آنکھ ہو، کوئی صاحب کشف ہو، تو وہ دیکھے گا کہ آپ کے ایمان میں خلل پڑ گیا۔

ہم سے یہ مطالبہ ہے، صاف سن لیجئے اور خاص طور پر طالبان علوم نبوت سے یہ مطالبہ ہے، کہ صرف یہی نہیں کہ وہ نمازوں کی پابندی کریں، اور صرف فعل حرام اور منہیات سے اجتناب کریں بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے اس دین پر اور اس تمدن و تہذیب پر فخر کریں جو اللہ کا رسول ﷺ لایا اور صحابہ کرامؓ نے کر کے دکھایا۔(۱)

---

(۱) ماخوذ باختصار از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ر دسمبر ۱۹۸۸ء

نعمت اسلام پر شکر اور قوم موسیٰؑ کی تقلید سے اجتناب

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ.

"اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی سخت ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے یہاں شکر کی بڑی قدر دانی اور اس کا بڑا مقام ہے۔ حق تعالیٰ شکر پر بے انتہا دولتوں سے نوازتے ہیں۔ اللہ کی ذات بے نیاز ہے۔ اس کی مبارک صفات میں سے ایک صفت اور اسم "شکور" بھی ہے کہ شکر پر اللہ کے یہاں سے نعمتوں کی زیادتی ہوتی۔ اور ناشکری پر سلبِ نعمت کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب بھی سخت ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب دوسری قوموں کی کوئی بات دیکھتا ہے جس میں بڑی رونق ہوتی ہے، دھوم دھام ہوتی ہے، جی لگنے کا اور دلچسپی کا سامان ہوتا ہے تو شیطان ایسے موقع پر حملہ کرتا ہے، اور مسلمانوں کے اندر لالچ پیدا کر دیتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ایسی کوئی چیز ہوتی، دنیا کی کتنی قومیں ہیں جو عقیدہ توحید اور اسلام کی

نعمت سے محروم ہیں۔ وہ میلے ٹھیلے کرتی ہیں کوئی درخت کو پوجتا ہے، کوئی بتوں کے اوپر چڑھاوا چڑھاتا ہے، کھانے پکتے ہیں، جشن ہوتے ہیں، دلچسپی اور دل لگی کا سامان ہوتا ہے۔ بعض قومیں اس موقع پر پھسل گئیں اور شیطان کے حملہ کا شکار ہو گئیں۔ اور انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا (بعض نے زبان حال سے اور بعض نے اپنی زبان قال سے) کہ کاش ہمارے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی!

دنیا کی بیسوں قوموں نے خدا کے سوا بت بنائے، کسی نے قومیت کو بت بنالیا، کسی نے ملک کو بت بنالیا ہے، کسی نے زبان کو بت بنالیا ہے، کسے نے اپنے آباواجداد کی کہانیوں اور تاریخ کو بت بنالیا ہے اور کسی نے رنگ و نسل کو بت بنالیا ہے، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو ان تمام بتوں سے محفوظ رکھا، ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم ہمیشہ اسلام پر فخر کریں اور اسلام کے سوا کسی چیز کو لالچ اور رشک کی نظر سے نہ دیکھیں کہ کاش ہم کو بھی یہ چیز ملتی!

قومِ موسیٰؑ کا عبرت انگیز واقعہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا ایک عبرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے جس میں ہم مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ نبی اسرائیل کو اپنی صحیح معرفت عطا فرمائی اور توحید کی اس دولت سے نوازا جس سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ ان کے اندر ایمان پیدا کیا، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی پرستش اور بندگی کے لائق نہیں اور اس کے سوا دنیا میں کسی کی حکومت نہیں۔ لیکن وہ ایسے ناقدردان اور

نادان تھے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ ان (بنی اسرائیل) کو لے جارہے تھے "فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰی اَصْنَامٍ لَّھُمْ" (وہ ایسے لوگوں کے پاس سے ہو کر گزرے کہ جو اپنے بتوں کے سامنے جھکے ہوئے تھے) انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جو ایک میلہ لگائے ہوئے ہیں، بازار لگا ہوا ہے، دوکانیں سجی ہوئی ہیں، اور ہر طبقہ کے لوگ موجود ہیں، کچھ وہاں بت اور خود ساختہ معبود ہیں، وہاں عبادت بھی ہو رہی ہے اور تفریح بھی ہو رہی ہے۔ ایک جشن ہے، ایک رونق ہے، اس رونق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے "منھ میں پانی" بھر آیا، انھوں نے بے اختیار کہا: یا موسیٰ (اجْعَلْ لَّنَا اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ آلِھَةٌ) اے موسیٰ (یہ کتنی رونق کی چیز ہے) ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی خدا تجویز کر دیجئے۔ جیسا کہ ان کے پاس ہے، جو آنکھوں سے نظر آتا ہو۔ اور اس کے قدموں میں گر سکیں، ہمارے دلوں کو اس سے کچھ تفریح حاصل ہو، اور جسمانی طور پر جسم کو مزا اور لطف آئے "اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ آلِھَةٌ" ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کر دیجئے جیسے مشرکین کے کئی معبود ہیں۔

اپنے وقت کے موحد اعظم موسیٰ علیہ السلام کا جلال اپنے پورے عروج پر آگیا، بولے: اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ" تم پرلے درجہ کے نالائق اور پرلے درجہ کے ناقدرے اور پرلے درجہ کے جاہل اور احسان فراموش ہو، اتنے دنوں تک تمھیں سبق پڑھایا اور تم کو اس گندگی سے نکالا، تمہارے لئے اللہ کے یہاں سے من وسلوی اتری، اور تم یہ کہتے ہو کہ ہمارے لئے ایسا جشن اور میلہ لائیے، تمہاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، تمھیں نظر نہیں آتا؟ "اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْهِ وَبَاطِلٌ مَّا کَانُوْا

یَعْمَلُوْنَ" یہ لوگ جس شغل میں پھنسے ہوئے ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو یہ کام کرتے ہیں سب بیہودہ ہیں" تمھیں معلوم ہے کیا ہونے والا ہے، یہ سب ملیا میٹ ہو جائے گا، یہ تھوڑی دیر کی تفریح ہے، ہم تمھیں خدا کے دروازے، آستانہ پر لائے، تمہاری تربیت کی اور تمھارا حال یہ ہے کہ ایک منظر تم نے دیکھا، ایک رونق تم نے دیکھی، سب بھول گئے، اتنے دنوں تک جو سبق پڑھا تھا وہ یکسر فراموش کر گئے۔

غیرتِ نبوی کیسے اس کو برداشت کر سکتی تھی؟

حضرت موسیٰ کو جلال آ گیا، آنا ہی چاہئے تھا اس لئے کہ وہ پیغمبر بھی ہیں، کہا "اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ. اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّاهُمْ فِيْهِ" ارے یہ جو ہے ان سب پر جھاڑو پھر جانے والی ہے۔ یہاں "متبر" کا جو لفظ ہے کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس میں جو تشدید ہے اور اس میں جو زور پیدا ہوا ہے، غصہ سا معلوم ہو رہا ہے، وہ "ان هولاء هالك" ان هؤلاء فاسد" ان هؤلاء فان" میں نہیں ہو سکتا "ان هؤلاء متبر" کوئی چیز نہیں، ارے اس پر جھاڑو پھر جانے والی ہے، جھاڑو کا لفظ ہم قصداً لائے کہ اس میں بھی ثقیل حروف ہیں اور کسی حد تک وہ صوتی طور پر بھی (کہیں صوتی طور پر بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلال اور جو تاثر ہے وہ ظاہر کرے یعنی حرفی بناوٹ کافی نہیں ہوتی بلکہ صوت کی بھی اس میں ضرورت ہوتی ہے) اگر "متبر" کے علاوہ کوئی لفظ کہتے ہلکا پھلکا، تو یہ بات پیدا نہ ہوتی بلکہ غصے سے ارے تمھیں اس کی تمنا ہے؟ "اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّاهُمْ فِيْهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔

اس کے بعد انھوں نے ذرا سمجھا کر کہا: "اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهاً وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ

عَلَى العٰلَمِيْنَ" اللہ کے بندو! خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ خدا تمھیں عقل اور سمجھ دے "اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهاً" کیا میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ "وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى العٰلَمِيْنَ" حالانکہ اس نے تمھیں تمام دنیا پر (اسی عقیدہ توحید کی بنا پر) فضیلت بخشی ہے! اور تم یہ کہتے ہو کہ اس فضیلت دینے والے، احسان کرنے والے خدا کو چھوڑ کر جس نے فرعون کی غلامی سے تم کو نجات دی، میں کوئی عاجز اور بے اختیار خدا تمہارے سامنے لے آؤں؟

یہ بڑی عبرت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے یہ مثال اس لئے دی کہ ہم اس سے عبرت لیں اور اسلامی معاشرہ کو ایسا بنادیں کہ مزاجاً، طبعاً اور قدرۃً اس کو گناہوں سے نفرت ہو اور اس کو ہر ایسی دعوت سے وحشت ہو جس سے کہ آسمانی تعلیمات اور دینی احکام اور دین پر عمل اور شریعت اسلامی مغلوب ہوتی ہو۔ اور بالکل بے لگام بے مہار زندگی کی دعوت دی جائے تو وہ آپے میں نہ رہے اور اس کو نفرت وحقارت سے بلکہ غیظ وغضب کے ساتھ ٹھکرادے۔

اس لئے ہم مسلمانوں کو اسلام پر فخر کرنا چاہئے، اور اسلام کو سب سے بڑی دولت سمجھنا چاہئے، اسلام کی نسبت کو، اسلام کی دعوت کو، اسلام کی چیزوں کو سب سے بڑھ کر سمجھنا چاہئے۔ (۱)

---

(۱) ۱۔ تحفہ مشرق ص ۱۶ ۲۷۔ ۲۔ تعمیر حیات ۲۵ / جولائی ۱۹۸۶ء

۳۔ اسلام مکمل دین ص ۳۵ - ۳۷۔ ۴۔ تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

قومِ سبا کے قصہ سے سبق

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرىً ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْر سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّاماً آمِنِيْنَ. فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْر.

(سورہ سبا: ۱۸-۱۹)

"اور ہم نے ان (قوم سبا) کی اور (شام کی) ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی، (ایک دوسرے کے متصل) دیہات بنائے تھے، جو سامنے نظر آتے تھے اور ان میں آمد ورفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا، کہ رات دن بے خوف وخطر چلتے رہو، تو انھوں نے دعا کی کہ اے پروردگار ہمارے سفروں میں دوری پیدا کردے اور اس سے انھوں نے اپنے حق میں ظلم کیا، تو ہم نے (انھیں نابود کر کے) ان کے افسانے بنا دیئے، اور انھیں بالکل منتشر کر دیا، اس میں ہر صابر و شاکر کے لئے نشانیاں ہیں۔"

قرآن مجید میں اللہ نے پچھلی امتوں کے قصے، گذری ہوئی تہذیبوں کی حکایات، اور مٹی ہوئی سوسائٹیوں کے واقعات بطور عبرت و نصیحت بیان کئے ہیں تاکہ ہم ان سے درس عبرت لیں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مثالیں بیان کی ہیں۔ مختلف

نمونے پیش کئے ہیں اس لئے کہ ان میں عبرت کا سامان اور سبق ہے۔

ایک جغرافیائی اور تاریخی نسب نامہ

مذکورہ بالا قرآنی آیات میں ان کا ایک جغرافیائی اور تاریخی نسب نامہ ہے، اس میں پوری انسانی سوسائٹی کے لئے، ہر اسلامی و غیر اسلامی ملک کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ ان آیات نے ہمارے سامنے ایک زندہ جاوید عالمی حقیقت بیان کی ہے۔ اور ایسی نفسیاتی انسانی حقیقت پیش کی ہے جو ہم سے غور و فکر اور مطالعہ کی طالب ہے۔

وہ یہ کہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ راحت و آرام، سکون و اطمینان کے تسلسل اور ایک ہی قسم کی چیزوں سے (خواہ وہ کتنی ہی لذت بخش اور راحت رساں ہو) اکتا جاتا ہے، اور تبدیلی چاہتا ہے، چاہے یہ تبدیلی اس کے برخلاف اور سخت آزمائشوں میں مبتلا کر دینے والی ہو، اسی کو قرآن مجید نے "بطر" کے بلیغ لفظ سے ادا کیا ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا. (سورہ قصص: ۵۸)

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہی تھیں۔

ہمارے سامنے قوم سبا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، یہ ایسا پائیدار واقعہ ہے جو انسانی طبیعت کے پہلوؤں میں ایک ایسے دقیق و عمیق پہلو کو نمایاں کرتا ہے جس کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ قوموں کے واقعات اور قصے عبرت آموزی اور نصیحت پذیری کے لئے بیان کئے ہیں۔ فرمایا: "لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ" ان کے قصے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ (یوسف: ۱۱۱)

اور "فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ" ان سے یہ قصے بیان کرو تاکہ وہ فکر

کریں۔(اعراف:۱۷۶)

قرآن مجید انسانی تہذیب و معاشرت کی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، وہ گذشتہ قوموں کے واقعات، تمدن و معاشرت کی کیفیات، اور تہذیب و ثقافت کے قصے عبرت کے لئے ذکر کرتا ہے، جن میں کچھ عجیب مماثلت پائی جاتی ہے، جن پر ماہرین نفسیات اور انسانی تاریخ کے ارباب فن و اہل کمال کو غور کرنا چاہیے، اسی طرح قائدین ملت، اور اصحاب تحقیق کے لئے لائق توجہ ہے کہ حکمت الٰہی ہمارے سامنے زندگی سے بھرپور ایک سورہ پیش کرتی ہے، جس کے خدوخال بالکل واضح، اور جس سے قوم سبا کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قوم فراخی معشیت، فارغ البالی اور خوشحالی کے کس درجہ میں داخل ہو گئی تھی، جس کی انسان تمنا کرتا رہتا ہے، فاتحین جس کی راہ میں جہاد کرتے پھرتے ہیں، اور بانیان سلطنت جس کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ.

(سورہ سبا: ۱۵-۱۶)

اہل سبا کے لئے ان کے مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی، (یعنی) دو باغ، ایک داہنی طرف اور ایک بائیں طرف، اپنے پروردگار کا رزق کھاؤ اور شکر کرو، (یہاں تمہارے لئے رہنے کو یہ) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار، تو انھوں نے (شکر گزاری سے) منھ پھیر لیا، پس ہم نے ان پر زور کا سیلاب چھوڑ دیا۔ اور انھیں دو باغوں کے بدلے دو ایسے باغ دیئے جن کے میوے بد مزہ تھے اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا، اور تھوڑی سی بیریاں۔

قرآن مجید انسان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور مرض کی جگہ متعین کر دیتا ہے، اس مصیبت سے کیوں وہ دوچار ہوئے، یہ سعادت و کامرانی کیوں اللہ نے ان سے سلب کر لی، یہ عیش و عشرت کے سامان جو بادشاہوں کے لئے قابل رشک تھے کیوں ختم کر دیئے گئے، جس طرح استاد اپنے معمولی شاگرد کا ہاتھ پکڑ کر حروف تہجی پر رکھتا ہے، اسی طرح قرآن قاری کا ہاتھ رکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:-

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرُ، سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا آمِنِيْنَ. (سبا: ۱۸)

اور ہم نے ان کی اور (شام کی) ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی (ایک دوسرے متصل) دیہات بنائے تھے جو سامنے نظر آ رہے تھے اور ان میں آمد و رفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا کہ رات دن بے خوف و خطر چلتے رہو۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ قوم سبا کے مکانات بہت پر فضا مقام پر تھے، اس کی ہوا نہایت لطیف و سبک تھی، کسی آفت و بیماری کا وہاں گزر نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اجنبی آتا اور اس کے کپڑوں میں کھٹمل و مچھر بھی آجاتے تو فوراً یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے، اسی طرح کوئی بھی موذی جانور نہ رہنے پاتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ملک شام کے درمیان دیہات بنائے تھے، جو سامنے نظر آتے تھے، سب ایک دوسرے سے متصل تھے اور آمد و رفت کا اندازہ مقرر تھا، وہاں کے مسافروں کو نہ زاد و راحلہ کی پریشانی ہوتی تھی نہ سنسان جگہ شب گزاری کی زحمت، اور نہ دشمن کا خوف و خطر، جہاں قیام کرتے، پھل و پانی سے خاطر ہوتی، ایک گاؤں میں اگر قیلولہ کرتے تو دوسرے میں شب گزاری، (کیونکہ آمد و رفت کا اندازہ اسی طرح ضرورت کے مطابق تھا)

یہ قوم سبا کی کہانی ہے

یہ قوم سبا کی کہانی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تھا، سفر نہایت آسان اور پر راحت بنادیا تھا، فاصلے قریب کر دیئے تھے، لیکن انھوں نے اس نعمت کی ناشکری کی، یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس بیش بہا نعمت کی قدر کیجاتی، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے زبان تر رہتی، سراپا شکر وسپاس ہو جاتے، لیکن مانگا اس کے برعکس: قرآن کہتا ہے:-

"فَقَالُوْا رَبَّنَابَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا" پھر وہ کہنے لگے اے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے۔ یہ کوئی سفر ہے کہ ہم کھاتے پیتے، مزے اڑاتے، بات کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں؟ ہم یہ نہیں چاہتے ہم تو تھکا دینے والے سفر چاہتے ہیں، ہم وحشت ناک صحراء، لمبے چوڑے مکان چاہتے ہیں، ہم تقشّف چاہتے ہیں، ہم خطرہ مول لینا چاہتے ہیں۔

نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ نے ان سے وہ سب نعمتیں سلب کر لیں اور ان کو ملکوں میں تتر بتر کر دیا اور ان کو تاریخ کا افسانہ بنادیا۔

"فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ" پھر ہم نے افسانہ بنادیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا۔

بسا اوقات انسان اس واقعہ کو معمولی سمجھنے لگتا ہے، اس شک میں پڑ جاتا ہے کہ کیسے انسانی فطرت ایسی مسخ ہو گئی تھی، قوم سبا جیسی تمدن و معاشرت اور آسائش زندگی سے لبریز قوم کی فطرت اتنا اس میں فساد و بگاڑ آ گیا تھا، ایسا انحراف ان میں پیدا ہو گیا تھا، بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، لیکن قرآن نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور

قرآن مجید اللہ ورسول کی وہ کتاب ہے جس پر ہوا وہوس کا پر تو بھی نہیں پڑا۔ جو کچھ ہے وحی الٰہی ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔

قرآن مجید نے قوم سبا کا قصہ بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ خبیر ودانا اور حکیم وعلیم ہے، وہ جانتا ہے کہ اس وقت سر پھری قومیں موجود ہیں۔ جو اسی طریق کار کو اپنا رہی ہیں اور اسی راہ پر چل رہی ہیں، فقر وفاقہ کی خواہاں ہیں، خطرات وپریشانیوں کی متمنی ہیں، سختی اور تقشّف کی آرزو مند ہیں، یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ ان نعمتوں کی فراوانی سے اکتا گئی ہیں۔ اور گمراہ کن پروپیگنڈوں، سیاسی واجتماعی اور خارجی عوامل کے اثر سے وہ تنگی اور فقر وفاقہ کی زندگی کی طرف آنا چاہتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے اس واقعہ کو ریکارڈ رکھا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ اس سے خالی ہے۔ اس لئے قرآن مجید کا راستہ تاریخ کے مقابلہ میں کچھ اور ہی ہے۔ تاریخ ان قصوں کا ریکارڈ رکھتی ہے جن کا تعلق سرکار دربار سے ہو، وزرائے سلطنت اور ایوانِ حکومت سے ہو اور جنگوں سے ہو، انسانیت کی فلاح وبہبود کے واقعات اور ایسی حکایات جن سے عبرت ہو، سبق اور نصیحت ہو، وہ تاریخ کے موضوع سے خارج ہیں۔

قرآن کا معاملہ اس کے برعکس ہے قوموں کا نشیب وفراز، حکومتوں کا ردوبدل اور فتوحات کی کثرت اس کا موضوع نہیں، قرآن بشری امراض یعنی فطرت انسانی کمزوریوں سے بحث کرتا ہے، جس میں عبرت ہو، ہر جگہ، ہر دور اور ہر زمانہ میں انسان کے لئے جس میں سبق ہو۔(۱)

---

(۱) ا۔ کاروان زندگی حصہ سوم ص ۱۴۱۔ ۱۴۳ ۲۔ نفحات الایمان بین صنعاء عمان (عربی سے ترجمہ مربی محترم مولانا سید عبداللہ محمد الحسنی صاحب ندوی۔ (غیر مطبوعہ)

حیات بعدالموت کی وسعت

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا، قَالَ اَنّٰی یُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا، فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَه، قَالَ كَمْ لَبِثْتَ، قَالَ لَبِثْتُ یَوْماً اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ، قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ، وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْماً، فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهُ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.
(البقرہ:۲۵۹)

کیا تو نے اس شخص کو نہ دیکھا جس کا گذر ایک شہر پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گر پڑا تھا، اس نے کہا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا، پھر اٹھایا (اور اس سے) کہا کہ تو کتنی دیر یہاں رہا اس نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کم رہا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا، اب اپنا کھانا اور پینا دیکھ (جواب تک) سڑا نہیں ہے، اور اپنے گدھے کو دیکھ اور ہم نے تم کو لوگوں کے لئے نمونہ بنانا چاہا، اور ہڈیوں کو دیکھ کہ ہم ان کو کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر جب اس پر یہ حال ظاہر ہوا تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن حکیم میں اپنے محدود و ناقص غور و فکر اور ناکافی تحقیق و مطالعہ کی روشنی اور تلاوت قرآن کرنے والے ہر مسلمان کو قرآن فہمی کی جو توفیق ملتی ہے اس کے پیش

نظر میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیات اپنے اندر اس سے کہیں زیادہ گہری معنویت، وسیع مفاہیم و مطالب اور دور رس امکانات و مضمرات رکھتی ہیں، جتنی کہ مفسرین کرام اپنے اپنے زمانوں میں ان کو پیش کر سکے ہیں۔ اور جتنا کہ اہل علم نے اپنے حالات اور تحقیقات کی روشنی میں سمجھا ہے۔

میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں اور اس کے معانی اور اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ ایک معین واقعہ بتایا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھائی کہ کھانا جو چند گھنٹے ہی کھلی فضا میں رہنے پر خراب اور بگڑ جاتا ہے، سو سال رکھا رہا، اور خراب نہیں ہوا، میرے خیال میں یہاں صرف جسمانی ومادی زندگی کی واپسی ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں معنوی وروحانی زندگی، باطنی نشاۃ ثانیہ اور اس تاریخی کردار کی واپسی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جسے کسی امت و معاشرہ یا قوم و ملک نے انجام دیا ہے اور اس پیغام کی تازہ کاری اور حیات آفرینی کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے۔ جس کی یہ امت حامل تھی، اسی طرح اس میں اس پختہ ایمان و عقیدہ کے احیاء کا امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے جو کبھی اس امت کی رگ وپے میں گرم لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اور جو پھر سرد پڑ گیا، اور اس فتح و ظفر کی بازگشت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جو کبھی اس مسلمان ملک و قوم کو حاصل تھی۔ تو گویا اس واقعہ کے اندر ایک گہرا اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین و پیغام کو بھی کبھی کبھی سو سال تک مردہ ہو جانے کے بعد اور اس قوم کے اس کے ساتھ ربط و تعلق اور حمیت و حمایت کے طویل عرصہ تک کمزور ہو جانے کے بعد

دوبارہ دونوں کو حیات و تازگی دے سکتا ہے اور دیتا ہے، جب کھانا ایسی معمولی چیز کو سو سال تک بغیر بگڑے قائم رکھ سکتا ہے تو اپنے دین کو سو سال کی ناسازگار حالات رکھنے والی مدت گذرنے پر صحیح اور ترو تازہ رکھ سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت کریمہ ان سب پہلوؤں پر مشتمل ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے اور اس کے لئے خدانخواستہ یہ دائمی فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ غیر اسلامی زندگی گذار تا رہے گا۔ (اشارہ استنبول و ترکی کی طرف ہے کہ اسی ملک میں خطاب فرمارہے ہیں) اور ہمیشہ جاہلیت کی پستی میں پڑا رہے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ اشارہ ولطیفہ غیبی کے طور پر فرماتے ہیں "اُنْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّه" کہ "اپنے کھانے پینے کے سامان کو دیکھو کہ وہ خراب نہیں ہوا" اور جب ایک زمانہ گذرنے کے باوجود کھانا اور پانی خراب نہیں ہو سکتے تو وہ آسمانی وربانی، ابدی و آفاقی پیغامات کس طرح خراب اور ازکار رفتہ ہو سکتے ہیں جن پر حیاتِ انسانی کا دارومدار، انسانیت کا انحصار ہے اور جن سے اس کا وقار و اعتبار قائم ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ الرَّحِيْم.
(بقرہ: ۱۴۳)

اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردیں، واقعی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت ہی شفیق مہربان ہیں۔

ہمارے دلوں میں امید و آرزو کو زندہ کرتی ہے

یہ آیت شریفہ ہمارے دلوں میں امید و آرزو کو زندہ کرتی ہے اور ہمارا اعتماد بحال کرتی ہے اور ہمارے سرد جذبات، ناکام امیدوں اور تمناؤں کو از سرِ نو پیدا کرتی ہے۔ اور قیاس آرائیوں اور بدشگونیوں کو دور کرتی ہے۔ کیونکہ جب اللہ کی قدرت سے خورد و نوش کا سامان عرصہ دراز تک خراب نہیں ہو سکتا اور یہ عمارت و محلات شاہی گردش و لیل و نہار کے برخلاف عرصے تک قائم رہ سکتے ہیں۔ تو یہ قوم اسلام کے ساتھ کیوں نہیں قائم رہ سکتی؟ جو ان تعمیرات و محلات اور ان تمدنی مظاہر و مآثر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طاقتور و بااثر، انسانیت کے لئے نافع و مفید اور صالح و صحیح، انسانی زندگی کے لئے ضروری و ناگزیر ہے۔

میرے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت ہم کو یہ بشارت سناتی ہے کہ وہ قوم اور ملک (جس نے مغرب کی چھاتی پر صدیوں کو دو دلی ہے اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا) پھر زندہ و تابندہ ہو جائے گا۔

"تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ." (آل عمران: ۲۷)۔ (۱)

---

(۱) ا۔ کاروان زندگی حصہ چہارم ص ۱۶۷-۱۶۹

۲۔ تعمیر حیات ۱۰/ ۱۹۸۶ء سے مشترک ماخوذ ہے۔

آئندہ نسلوں اور پسماندگان کے صحیح العقیدہ مسلمان رہنے کی ضمانت

اور

جیتے جی اس کا اطمینان ویقین ضروری ہے

"اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَاءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰھاً وَّاحِداً وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ."

"بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے، جب انھوں نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انھوں نے کہا کہ آپ معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔" (البقرہ: ۱۳۳)

ایک پیغمبر کے انتقال کے وقت کا واقعہ

قرآن مجید کی یہ آیت جو پہلے ہی پارے کی آیت ہے اور اس کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے ترجمے میں موجود ہے، خدا کے فضل سے، اللہ تعالیٰ مترجمین کو جزائے

خیر دے وہ ان ترجموں کے ذریعے سے پڑھتے ہیں اور جو براہِ راست عربی زبان سے واقف ہیں وہ خود ان کو پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ لیکن بہت کم غور کرنے کی نوبت آئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس اہتمام کے ساتھ اگر یہ لفظ غیر شایان شان اور بے ادبی کے نہ ہوں تو میں کہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو بیان کرنے کو کیوں ترجیح عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ جس کی شان یہ ہے کہ جو چیز بھی اس سے نسبت رکھتی ہے وہ ضروری ہے، معنوی ہے، مناسب حال ہے، مناسب وقت ہے اور فطرت کا تقاضا ہے، اس میں اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے اور بہت سے خطروں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص غور نہ کرے تو کہے گا کہ ایک پیغمبر کے انتقال کے وقت کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے، اس کی قانونی، علمی، تاریخی، تہذیبی اور معنوی طور پر کیا اہمیت ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ جس چیز کا انتخاب فرمائے اور اپنے اس کلام میں جس کو قیامت تک باقی رہنا ہے اور دنیا کے تمام کلمہ گو انسانوں کو ہی نہیں بلکہ جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ باتوفیق انسان کو پڑھنا ہے، بار بار پڑھنا ہے تو اللہ تعالیٰ انہی چیزوں کا ذکر فرمائے گا جن میں غور کرنے کا مواد ہے، غور کرنے کا سامان ہے اور جن میں ہزاروں عبرتیں اور حکمتیں ہیں، دنیا میں سبھی دنیا سے جاتے ہیں سب جانیوالے ہیں، جن کی جتنی بھی زندگی ہے بہر حال اسے اس دنیا کو الوداع کہنا ہے، پیغمبروں کے لئے بھی یہی ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ: حضورؐ کا نام لیکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمدؐ کون ہیں؟ اللہ کے رسول ہیں قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ آپ سے

پہلے جو پیغمبر تھے وہ دنیا سے چلے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو بھی ایک مرتبہ دنیا کو الوداع کہنا ہے۔ اور رخصت ہونا ہے اور اس مقام قرب میں جانا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقدر اور مختص فرمادیا ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر کے انتقال کا ایک واقعہ اس کو قیامت تک کے لئے کیوں دوام اور عمومیت بخشی جارہی ہے اور اس کو قابل توجہ قرار دیا گیا ہے، یہ سوچنے کی بات ہے مگر بہت سی چیزیں جو بہت آسان معلوم ہوتی ہیں اور ان میں کوئی ایسی عقدہ کشائی نہیں ہوتی تو ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، ہم میں سے اکثر لوگوں کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ہم نے غور نہیں کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کو کیوں بیان فرمارہا ہے۔

وصیت نامہ

مسلمانوں کو خطاب کر کے قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو خطاب کر کے (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ) "اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ الْمَوْتُ" کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا۔ یہ قرآن مجید کا طریقہ بیان اور خاص اسلوب ہے جب کسی چیز کو مستحضر کرنا اور اسے آنکھوں کے سامنے لانا چاہتا ہے تا کہ وہ مشاہدہ بن جائے تو اس طرح خطاب فرماتا ہے کہ تم اس وقت تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا، ان کا دمِ واپسیں تھا۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ. جبکہ انھوں نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ تم مجھے یہ بتادو کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروں گے۔

اب یہیں سے آپ سوچئے کہ معاملہ ہے حضرت یعقوبؑ کا اور یعقوبؑ کون ہیں؟ یعقوبؑ ابن اسحاقؑ ابن ابراہیمؑ نبی کے بیٹے اور نبی کے بھتیجے حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے ہیں۔ یعقوب ابن اسحاقؑ ابن ابراہیمؑ اور ان کے والد نبی ہیں، ان کے چچا نبی ہیں، ان کے دادا نبی ہیں اور وہ کیسے نبی ہیں۔ ابراہیم خلیل اللہ جن کو اللہ اپنا دوست کہتا ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کے پوتے ہیں۔ اسماعیلؑ جو سید الانبیاء سید المرسلین رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہیں ان کے بھتیجے ہیں اور خود پیغمبر ہیں اور خود پیغمبر کے باپ بھی ہیں اور پیغمبر کی اولاد بھی ہیں، یوسفؑ خدا کے پیغمبر ہیں ان کے صاحبزادے ہیں، کیا ماحول ہے اس گھر کا۔ اس کا آپ ذرا خیال کیجئے کسی عالم کے، کسی شیخ وقت، کسی مصلح یہاں تک کہ کسی واعظ کے، کسی پڑھے لکھے مسلمان کے متعلق بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے انتقال کے وقت یہ بات پوچھے گا۔ اللہ تعالیٰ کا نام ان کو سکھلایا گیا ہے، کلمہ پڑھتے ہیں، اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، سب کے نام مسلمان کے سے ہیں اور پھر اس میں جو لوگ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں یا اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے، گھروں کے ماحول پر دینی فضا چھائی ہوئی ہے، وہ مسجدوں میں جاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ماں باپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اپنے گھر میں اللہ اور رسول ہی کا ذکر سنتے ہیں تو ان سے اس کے پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پوچھنے کی باتیں بہت ہیں اور سب جانتے ہیں اگر دنیا میں وصیت ناموں ہی کو جمع کیا جائے تو ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار ہو جائے، تاریخ اور ادبیات اور انسانی ضروریات اور انسانی تقاضوں کا ایک بہت بڑا مرقع سامنے آجائے یہ کام اگر کسی کو

فرصت ہو تو یہ کر سکتا ہے کہ کتابوں میں موقر طبقہ کے لوگوں کی جو وصیتیں درج ہیں ان کو جمع کر دے۔ علماء مشائخ و مصلحین اور داعیوں، والیان ریاست اور اہل حکومت کی وصیتوں کو یکجا جمع کرے تو انسانی احساسات اور انسانی عقل و دانائی کا اور اپنی اولاد سے، ورثاء سے تعلق کا ایک ایسا نقشہ سامنے آجائے کہ اس سے نفسیات انسانی کے بڑے عجائبات کے انکشافات سامنے آجائیں اور معلوم ہو کہ انسان میں قدر مشترک کتنا ہے، ان کی وصیت اکثر نہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں نے کی۔ یہی دیکھے گا بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ دیکھو سب سے زیادہ جو کان میں پڑی ہے اور کتابوں میں دیکھی ہوئی ہے کہ جانے والے باپ نے، صبر کرنیوالے باپ نے جو دنیا سے رخصت ہونے والا ہے اور پابہ رکاب ہے اس نے اپنے بچوں کو جمع کیا۔ سب شریف زادے، سب اچھے خاندان کے لوگ اور ان میں کئی پڑھے لکھے اور ان میں کئی تربیت یافتہ، ان سے عام طور پر ہم نے جو کتابوں میں دیکھا وہ یہ کہ ان سے کہدو کہ بیٹو لڑنا نہیں، اتحاد کے اور شرافت کے ساتھ رہنا یا یہ ملتا ہے کہ دیکھو بیٹو، فلاں جگہ میں نے رقم دبا رکھی تمہارے لئے، ابھی تک بتایا نہیں تھا، فلاں جگہ تم کھودنا تم کو وہاں خزانہ ملے گا۔ وہاں دفینہ ہے یا یہ کہا کہ دیکھو ہمارا اتنا قرض دوسروں پر آتا ہے لکھ لو اس کو، فلاں فلاں آدمیوں کے ذمہ ہماری اتنی اتنی رقم ہے اس کو وصول کر لینا اور یہ دستاویز ہے، ان کا اقرار نامہ یہ دکھانا یا بہت زیادہ اگر احتیاط اور تقویٰ ہوا ہو تو یہ کہا کہ دیکھو بیٹو۔ میرے بچو اور میری آنکھوں کے تارو! اور پیارو! مجھ پر تمہارے باپ پر اتنے لوگوں کا مطالبہ ہے، قرض ہے، اور اس کو بھولنا نہیں، جن کو بہت خدا کا ڈر ہے متقی

لوگ ہیں وہ یہ کہتے ہیں، یہ کس طرح کی وصیت ہے سوچئے آپ ذرا سا اپنے ذہن کو حاضر کر کے اور اس وقت کو سامنے لا کر۔ یہ ہیں کون جن سے بات ہو رہی ہے؟ یہ نبی زادے ہیں، ولی زادے نہیں! ولی زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں، بزرگ زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں، عالم زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ تو اس پر ہمارا ایمان ہونا چاہئے اگر ہمارا ایمان اس پر نہیں تو ہمارا ایمان ناقص ہے۔ کہ پیغمبر زادے ہیں ان سے بڑھ کر اس وقت نوع انسانی میں کسی کو نہیں کہا جاسکتا ہے اور پوری روئے زمین پر ان سے بڑھ کر قابل احترام، قابل محبت اور قابل اعتماد کوئی اور انسانی مجموعہ نہیں ہو سکتا۔ نبی کے بیٹے کے بھتیجے، نبی کی پوتے سب کے سب ہیں۔

اور انھوں نے اپنے گھروں میں دیکھا کیا ہے۔ اپنے گھروں میں دیکھا ہے کہ نمازیں ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ کا نام لیا جارہا ہے، ذکر ہو رہا ہے، دعاؤں میں رویا جارہا ہے، اپنی ماؤں کو دیکھا انھوں نے کہ بڑے گڑ گڑا کر اپنے لئے، ان کے لئے دعائیں کررہی ہیں اور ان گھروں میں خدا کے نام کے سوا کوئی نام نہیں لیا گیا۔ سنا ہی نہیں انھوں نے کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے اور اس کائنات پر اثر رکھتا ہے اور وہ نفع وضرر کا مالک ہے اور اس سے کچھ مانگا جاسکتا ہے، کچھ اس سے امیدیں کی جاسکتی ہیں توحید کے سوا کوئی عقیدہ، نماز روزہ کے سوا کوئی عبادت اور اللہ کے خوف و محبت کے سوا انھوں نے کوئی دعوت سنی ہی نہیں! لیکن کیا بات ہے۔

عشق است وہزار بدگمانی

سارا معاملہ اہمیت کے احساس کا ہے

جب یقین ہوتا ہے، آدمی کو اہمیت ہوتی ہے کسی چیز کی تو وہ پھر معقولات اور عقلی چیزوں اور مفروضات اور قیاسات پر عمل نہیں کرتا، یہی فرق ہے اگر آدمی بیمار ہے واقعی بیمار ہے تو وہ ساری احتیاطیں اٹھ جاتی ہیں، کتنا ہی وہ غیور ہو اور کتنا ہی وہ خوددار ہو، کتنا ہی وہ ضابط ہو، کتنا ہی صابر اور متحمل ہو، وہ کہہ دیتا ہے، اپنے لڑکوں سے اپنے عزیزوں سے کہ ہمیں یہ تکلیف ہے، ڈاکٹر کو بلالو، حکیم کو دکھاؤ، اسی طریقے سے اگر کوئی بھوکا ہوتا ہے واقعی اگر بھوک ہے تو پھر وہاں پر غیرت نہیں چلتی کہ ہم کس منہ سے کہیں کہ کھانا لاؤ، کھانے کا وقت ہو گیا ہے، بڑے بڑے امیر زادے امیر اور نواب زادے اور والیان ریاست اور حکماء اور جوان سب چیزوں سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی ایسے موقع پر اپنی بھوک کا احساس ظاہر کر دیتے ہیں تو سارا معاملہ اہمیت کے احساس کا ہے تو بتایئے کہ حضرت یعقوبؑ نے کیوں اپنے لڑکوں کو جمع کیا اور کیا ان سے پوچھا؟

آخری وقت اور تھوڑا ہی وقت ہے۔ بات کرنے کا۔ اس کو اس دنیا سے جانے والے خود بھی سمجھتے ہیں اور وہ خدا کا پیغمبر جو مُلْهَمْ مِنَ اللهِ ہوتا ہے، جس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس کو کیوں نہ اس احساس ہوگا کہ بس اب چند ہی منٹ کے بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، ان بیٹوں، پوتوں کو بلا کر ان سے بات کرنے کی، بات کیا ہو سکتی تھی؟ تو ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے اور یہ ہم نے دیکھا کہ کتابوں میں وصیت ناموں میں جانے والے کے گفتگو کے ریکارڈ اگر ہوں تو ریکارڈ، ورنہ جن لوگوں نے

دیکھا ہے جن کو اتفاق ہوا ہے سب جانتے ہیں کہ یہی کہا گیا ہے کہ دیکھو بھائی مل جل کر رہنا، صلح و آشتی کے سلیقے اور تہذیب کے ساتھ رہنا، اپنی ماں کا حق جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں خیال رکھنا، عزیزوں کا خیال رکھنا، صلہ رحمی کا خیال رکھنا ہے۔

ہزاروں برس سینکڑوں برس سے یہ دور چل رہا ہے کہ ایسے موقع پر ان باتوں کا اطمینان حاصل کیا جاتا ہے لیکن کیا بات ہے، بات یہی ہے کہ جو دل سے لگی ہوتی ہے جس کی اہمیت ہوتی ہے اور جس کو آدمی فیصلہ کن سمجھتا ہے، جس کو سمجھتا ہے کہ یہ چیز دائمی سعادت یا دائمی شقاوت کا سبب ہے، اس کی طرف پہلے توجہ کرتا ہے، سارا معاملہ کسی چیز کے انتخاب میں اہمیت کے احساس کا ہے۔

اپنے بچوں کے دین و ایمان کی حفاظت، دین و ایمان کی معرفت اور پھر اس کی حفاظت اور پھر اس پر غیرت اور پھر اس پر زندگی گذارنے اور اس پر دنیا سے رخصت ہونے کے کام کو۔ سب سے زیادہ اہمیت دیں اس کے لئے اس سے بہتر واقعہ نہیں ہو سکتا جو میں نے آپ کو سنایا۔ یعقوبؑ نے اپنے بچوں کو ان کے پوتے بھی ہوں گے اس لئے کہ بڑی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہوگا اور اس زمانے میں بھی لمبی عمریں ہوتی تھیں، گھر بھرا ہوگا اس میں بیٹے، پوتے، نواسے بھانجے اور بھتیجے ان سب کو شامل سمجھئے عربی کا لفظ لِبَنِيْهِ جو ہے ان سب پر مشتمل ہے۔ تو "اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ" کیا اے قرآن کے پڑھنے والو! کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور موت سامنے آکر کھڑی ہو گئی، گویا بالکل دم واپسیں تھا۔ (اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ؟) انھوں نے اپنے بچوں سے کہا کہ بیٹو! میرے

جگر کے ٹکڑو! لخت ہائے جگر! نور نظر! یہ بتادو ایک بات میں سننا چاہتا ہوں، ایک بات کا اطمینان لیکر دنیا سے جانا چاہتا ہوں، کوئی بات قرآن میں اس کے علاوہ کہی نہیں گئی اور ان کی تاریخ میں اور سیرت میں بھی نہیں ملے گی اور صحف سماوی میں بھی نہیں ملے گی کہ انھوں نے اس وقت جب بالکل یہ سمجھئے کہ چند سانسوں کا معاملہ تھا، کتنی سانسیں اور باقی ہیں "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" کہ تم میرے بعد عبادت کس کی کرو گے؟ سر کس کے سامنے جھکاؤ گے۔

میں آپ سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ گویا بالکل دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں کہ دنیا میں یہ بات کوئی شخص بھی کہیں کہے گا اور یعقوب نے یہ بات کہی، تو قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا تو اس میں بڑی حکمتیں ہیں اس کے جواب میں پہلے انھوں نے یہ کہا ہوگا لیکن غیرت توحید نے اور نبوت کے شرف اور اعزاز نے اس کی وجہ سے اس کا محل نہیں تھا کہ کوئی بیچ میں بات اور آتی، اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کا جواب نقل کردیا یعنی خدا کی خود سے جو توحید کی وحدانیت ہے اس نے گوارہ نہیں کیا کہ ان کے سوال ان کے جواب کے درمیان کوئی اور بات آجائے مگر میں قیاساً کہتا ہوں کہ بالکل ممکن ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہوگا کہ ابا جان دادا جان نانا جان! یہ بھی پوچھنے کی بات ہے، آپ نے ہمیں سکھایا کیا تھا اور ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کیا اور اس کے گھر میں ہوتا کیا ہے اور ہم کس کی اولاد ہیں۔ ہماری رگوں میں کس کا خون ہے۔ ارے ہم سے آپ پوچھ رہے ہیں یہ تو کہیں کافر قبیلے سے پوچھا جائے اور ہم کون ہیں، ہم آپ کے پروردہ آپ ہی کے جگر کے ٹکڑے آپ ہی کے جسموں کے ٹکڑے ہیں اور

ہمارے متعلق تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت توحید نے اتنا فصل بھی گوارہ نہ کیا کہ ان سوال وجواب کے درمیان فوراً نقل کردیا "نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ.(۱)

یہی ہر مسلمان کی شان ہونی چاہئے

انھوں نے کہا کہ ابا جان! دادا جان! نانا جان، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یہ بھی کوئی ڈرانے کی بات ہے، ہماری رگوں میں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، کا خون ہے، آپ نے ہمیں شرک سے نفرت دلائی، کفر سے نفرت دلائی، ہم مرجانا گوارہ کریں گے، لیکن کفروشرک میں مبتلا ہونا پسند نہیں کریں گے، آپ اطمینان سے دنیا سے جائیے۔ "نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ" ہم آپ کے معبود کی پرستش کریں گے، آپ کے بزرگوں، آپ کے پرکھوں، آپ کے باپ، چچا، دادا کے معبود (اللہ) کی ہم پرستش کریں گے۔ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ." ہم سب اس کے فرماں بردار ہیں، تب ان کو اطمینان ہوا۔

یہی ہر مسلمان کی شان ہونی چاہئے، اپنے متعلق بھی ہمیشہ ڈرتا رہے، اپنے ایمان کی خیر مناتا رہے، اسی لئے دعا کرتا رہے کہ ہمارا ایمان سلامت رہے، ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو، اور اپنی اولاد کے متعلق بھی اطمینان حاصل کرلے یہ ہماری زندگی میں بھی اور ہمارے بعد بھی اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے آستانہ پر سر نہیں جھکائے گی، یہ اطمینان، یہ گارنٹی (GUARANTEE) سب سے زیادہ ضروری ہے، یہ گارنٹی آدمی کو

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر اگست ۱۹۹۴ء

حاصل کر لینی چاہئے، ایمان کے ساتھ کفر اور کفر کی چیزوں سے نفرت بھی ضروری ہے۔"فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" اللہ تعالیٰ اس کو مقدم رکھتا ہے کہ جو سرکش شیطان کا انکار کرے گا اور اسکو ٹھکرادے گا، (REJECT) کردے گا اور اللہ پر ایمان لائے گا، تو اس نے اللہ کے کڑے کو مضبوط پکڑلیا تو "فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْت" بھی ضروری ہے اور "لاالٰہ الا اللہ" میں نفی پہلے ہے، اثبات بعد میں ہے، نہیں ہے کوئی معبود، نہیں ہے، وہ جو پورے طور پر محبوب بنایا جائے، مقصود بنایا جائے، مطلوب بنایا جائے، معبود بنایا جائے "الا اللہ" پہلے نفی ہے، پھر اثبات ہے، ایسے ہی نفی واثبات پر ہم کو بھی قائم رہنا چاہئے۔(۱)

یہ ہے مسلمانوں کے ذہنوں کو ڈھالنے والا سانچہ، ایمان کی قیمت پہچاننے کا امتحان ومعیار، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر کر کے اس کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا کہ ہر نسل کا مسلمان بلکہ ہر نسل کا انسان پڑھے اور اس سے سبق لے، اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کر کے تاریخ نہیں سنائی ہے، قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے، تاریخ ہے لیکن وہ تاریخ کیلئے نہیں، یہاں پر ہمیں بتایا کہ اس طرح مسلمان کے ذہن کو کام کرنا چاہئے۔(۲)

(۱) تحفہ مشرق ص۴۸تا ص۵۰۔(۲) آئندہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت ص۲۱۔۲۲

نہ خدا ہی ملا......نہ وصالِ صنم

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُاللهَ عَلٰى حَرْفٍ. فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَأَنَّ بِهٖ. وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَالدُّنْيَا وَالاٰخِرَةِ. ذٰلِكَ هُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ.

(سورۃ الحج۔۱۱)

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے) ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اسکے سبب مطمئن ہو جائیں، اور اگر کوئی آفت پڑے تو منھ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں) انھوں نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے۔

یہ قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ آیت کیا ہے؟ ایک مستقل معجزہ، یہ فرد کی بھی تصویر ہے اور جماعتوں کی بھی، قوموں اور ملتوں کی بھی، عربی میں ''من'' کا اطلاق فرد اور جماعت سب پر ہوتا ہے، لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں، جو خدا کی بندگی کرتے ہیں بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر...... ''بندگی کرتے ہیں'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خالی نماز پڑھتے ہیں، اور عبادت کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اور اسلامی احکام کی پابندی عین سرحدی لکیر پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، جو اسلام و جاہلیت اور کفر و ایمان کے

درمیان کھینچی گئی ہے، "علی حرف" کی بلاغت ملاحظہ ہو، اس صورت حال کی اگر کیمرے سے بھی تصویر لی جائے اور بڑے سے بڑا مصور اور نقاش بھی اس کی تصویر کشی کرے تو ایسی بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا، ان کی دوربینی اور احتیاط کی پوری تصویر اس چھوٹے سے جملے میں آگئی، وہ ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں، جہاں سے ان کے لئے دوسرے محاذ پر منتقل ہو جانا، ایک منطقہ سے دوسرے منطقہ پر پہونچ جانا ہر وقت ممکن رہے اور اس میں ذرا بھی دیر نہ لگے، وہ جما کر پاؤں بھی نہیں رکھتے کہ اٹھانے میں کچھ دیر لگے۔ وہ پھول کی طرح پاؤں رکھتے ہیں کہ ہوا کے ایک جھونکے میں اور حالات میں ادنیٰ سی تبدیلی واقع ہونے پر وہ دوسری جگہ کھڑے نظر آئیں، ان کا ہاتھ زمانے کی نبض پر رہتا ہے، اور ان کی دوربین نگاہیں حکومت، سوسائٹی اور وقت کے اقتدار کے چشم وابرو کے اشارے کو دیکھتی رہتی ہیں، ان کا دماغ سود و زیاں اور نفع و نقصان کے موازنے سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہوتا۔

اگر زمانہ ان کے موقف و مسلک اور ان کے مقام و محل کے مطابق ہوتا ہے تو ان سے بڑھ کر اپنے مسلک کا پرجوش وکیل اور اس کی خدمت میں منہمک کوئی نظر نہیں آتا اور وہ پورے سکون قلب اور اعتماد نفس کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

"فَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهِ"

اور اگر حالات ذرا بھی ناسازگار ہوتے ہیں، اور وہ حکومت کے، سوسائٹی اور عوام کے تیور بدلے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ فوراً اپنا مسلک تبدیل کر دیتے ہیں، اور اپنے مسلک کی "تہمت" سے بھی بچتے ہیں۔ ان کو اپنی وضع قطع، اپنے عقائد و خیالات اپنی

تہذیب و معاشرت اور اپنی زبان و کلچر بلکہ اپنی قومیت کو بھی تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

اس ابن الوقت گروہ کو دیکھ کر یہ آیت جس طرح سمجھ میں آتی ہے اور اس کی بلاغت و اعجاز جس طرح نمایاں ہوتا ہے، وہ بڑی سی بڑی تفسیر سے اس طرح نمایاں نہیں ہوتا، خطرے اور شبہہ سے بچنے کے لئے اس ابن الوقت گروہ کے انتظامات اور اس کی احتیاط دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، جب شعائر اسلامی کے اظہار سے کوئی مادی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا وہ دولت و وجاہت کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے، یا حکومت و اقتدار اس کے بغیر نہیں مل سکتا تو شعائر اسلامی کا ان سے زیادہ اظہار کرنے والا کوئی نہیں، اور اگر ان کے اظہار میں ادنیٰ درجہ کا خطرہ متصور ہوتا ہے، یا اس کی وجہ سے کم سے کم ادنیٰ درجہ کی قربانی دینی پڑتی ہے، تو پھر ان شعائر اسلامی کو بلکہ بنیادی عقائد تک کو وہ سلام کرتے ہیں، اور ان سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ لیتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللهِ فَإِذَا أُوْذِيَ فِي اللهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللهِ. وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ أَوَلَيْسَ اللهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ. (سورہ عنکبوت۔۱۱)	اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے، جب ان کو خدا کے راستے میں کوئی ایذا پہونچتی ہے تو لوگوں کی ایذا کو یوں سمجھتے ہیں، جیسے خدا کا عذاب، اور اگر تمھارے پروردگار کی طرف سے مدد پہونچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمھارے ساتھ تھے، کیا جو اہل عالم کے سینے میں ہے، خدا اس سے واقف نہیں؟

اگر وہ نسبت سرخروئی اور سرفرازی کا باعث ہوتی ہے، تو اپنی قدیم تاریخ، اپنے

اسلاف اور اپنے دور ماضی کو یاد دلاتے ہیں، اور کہیں نہ کہیں سے وہ اپنا تعلق نکال لیتے ہیں۔ "وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ" لیکن اللہ تعالیٰ کو حقیقت حال معلوم ہے۔ "اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ". ع

اس طور پر ان زمانہ سازوں کا انجام برا ہوتا ہے، اور کسی گروہ میں ان کی وقعت نہیں ہوتی اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ". شاعر نے شاید اسی موقعہ کے لئے کہا ہے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

جب حالات سازگار ہوں اور ہوا موافق چل رہی ہو، جب کسی مسلک پر قائم رہنے پر انعام ملتا ہو اور پھول برسائے جاتے ہوں، جب کسی قوم و جماعت کا ستارۂ اقبال بلند ہو اور اس کا بخت یاور، جب کسی جماعت میں شرکت باعث اعزاز ہو اور سرمایۂ افتخار، تو اس وقت اس مسلک پر قائم رہنا اور اس عقیدے کا اظہار کرنا کوئی بہادری اور مردانگی نہیں، لیکن جب حالات ناسازگار ہوں اور باد مخالف تیز و تند چل رہی ہو، جب بڑے بڑے جوانمردوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں، جب کسی اصول اور عقیدے کو اختیار کرنا دار و رسن کو دعوت دینے کے مرادف ہو، جب کسی قوم کے تنزل کا زمانہ ہو، اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا ہو، اور زمانہ کی نگاہیں اس سے پھری ہوئی ہوں، اس وقت اس مسلک پر ثبات و استقامت اور اس جماعت سے انتساب و نسبت بڑے شیر مردوں کا کام اور بڑی وفاداری اور نمک حلالی کی بات ہے۔

اسلام پر قائم رہنا، اس سے اپنی نسبت قائم کرنا اور علانیہ اس کے شعائر کا اظہار

اس وقت بھی سعادت و فخر کی بات ہے، اور اس میں اس وقت بھی مزا ہے، جب حالات اس کے لئے سازگار ہوں اور جب مسلمانوں کی کامیابی کا دور اور دنیا میں اسلام کا دور دورہ ہو اور کسی معاملہ میں ان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا ہو، لیکن امتحان و آزمائش کے موقعہ پر وفاداری اور جاں نثاری میں جو لذت ہے وہ لذت کسی چیز میں نہیں، یہ وہ وقت ہے، جب حق پر قائم رہنے والوں، حق و صداقت کی تبلیغ کرنے والوں، اور اپنے عقیدے و ضمیر کے خاطر مفادات، اور اعزازات کی قربانی کرنے والوں کو اس دنیا ہی میں جنت کا مزا آنے لگتا ہے، اور ان کے بدن کے روئیں روئیں سے خدا کی حمد و شکر کا ترانہ بلند ہوتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی موقعہ کے لئے کہا تھا۔ ع

بہشتے بہرپا کان حرم ہست　　بہشتے بہرار باب ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست(۱)

---

(۱) ماخوذ از مطبوعہ تقریر "دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں۔" ص ۲۰ تا ۲۴

”میں سوچنے لگا کہ میری آج کی تقریر کا موضوع کیا ہو، مجھے احساس ہوا کہ گفتگو کا دائرہ تنگ اور موقع نازک ہے، ایسے وقت میں قرآن نے میری دستگیری کی اور قرآن ہمیشہ ہی متحیر اور پریشان آدمی کی دستگیری......اور......رہنمائی کرتا ہے، اسے خدا کا الہام اور اس کی توفیق کہیے کہ استاذ عبدالرزاق فیاض نے اپنی شیریں اور گونجنے والی آواز میں نماز سے پہلے سورہ انبیاء کی تلاوت کی تھی، میں نے اسی سورہ کی ایک آیت ”لقد أنزلنا إليكم كتابا فيه ذكركم أفلا تعقلون“ کو لے لیا اور اس آیت کریمہ نے گفتگو کا ایک وسیع میدان میرے سامنے کر دیا، ایسی گفتگو جو دلوں کو چھوتی تھی، زندگی سے جس کا گہرا تعلق تھا اور جو صورت حال پر منطبق بھی ہوتی تھی۔“

قصص وواقعات

”قرآن مجید کے بعد:

میں:

تاریخ انسانی کا، اقوام و ملل کی تاریخ کا بھی، امتِ اسلامیہ کی تاریخ کا بھی تہذیبوں، فلسفوں، سلطنتوں اور اصلاحی، تربیتی اور انقلابی تحریکات و مساعی کی تاریخ کا بھی۔ ایک حقیر طالب علم ہوں......

میں:

تاریخ کو قرآن مجید کی تفسیر کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن قرآن کی تصدیق ضرور کہوں گا، یعنی قرآن مجید میں سنن الٰہیہ کا جو تذکرہ ہے اور کہا گیا ہے:۔﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَحْوِيلاً﴾ (فاطر: ۴۳) ”آپ اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے، اور نہ آپ اللہ کے دستور کو متغیر ہوتا ہوا دیکھیں گے“۔

تاریخ :- ایک شاہد عینی کے طور پر اس کا دستاویزی ثبوت پیش کرتی ہے، اور دکھاتی ہے کہ اقوام و ملل، تہذیبوں اور حکومتوں کی تاریخ میں بھی، اور افراد کی زندگی میں بھی کس طرح قرآن مجید کی بیان کی ہوئی سنن الٰہیہ کا ظہور ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، قرآن مجید میں افراد سے لے کر انسانی گروہوں اور ملتوں اور قوموں کی زندگی تک میں تعلیماتِ آسمانی اور فطرتِ انسانی دونوں سے انحراف کے جو نتائج بیان کئے گئے ہیں، اور ان کی پیشین گوئی کی ہے، وہ کس طرح صحیح ہوئے ہیں، اور کس کس طرح ان کا ظہور ہوا ہے؟“۔

(حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی)

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ

(جیل کے ساتھیوں کو توحید کا وعظ)

"ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ. اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ. وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ."

"یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں، اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ واسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے مذہب پر چلتا ہوں"۔

(یوسف: ۳۷۔۳۸)

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس دو قیدی جیل خانہ کے خواب کی تعبیر پوچھنے گئے تو انھوں نے فرمایا: "ذلکما مما علمنی ربی" یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں!

آغاز گفتگو کا حسین پیرایہ

گفتگو کا آغاز کس حسین پیرایہ سے کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک اعلیٰ درجہ کی بات کے لئے گفتگو کا پیرایہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہئے، آداب کلام میں

اس کی بڑی اہمیت ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بات کا حسن ختم ہو جاتا ہے، جس طرح ایک پُر شکوہ اور حسین عمارت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پھاٹک بھی دیدہ زیب اور عالیشان ہو جس کو دیکھتے ہی عمارت کی اہمیت معلوم ہو اور آدمی اندر داخل ہونے میں سہولت و مسرت محسوس کرے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ وہ ان خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہیں، اور جس مقصد سے یہ لوگ ان کے پاس آئے ہیں، اس میں ان کو کامیابی ہوگی، انھوں نے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی ہے وہ صحیح منزل پر آگئے ہیں، جس شخص سے انھوں نے رجوع کیا ہے وہ اس کام کا اہل ہے جس کی انھیں ضرورت ہے، اور جو ان کو اس ذہنی الجھن سے نکال کر صحیح طریقۂ عمل بتا سکتا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ضرورت مند یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت جلد سے جلد پوری ہو جائے، ایک مریض جب کسی معالج کے پاس جائے کہ وہ اس کے مرض کی تشخیص کر کے دوا تجویز کرے اور وہ معالج ٹال مٹول کرنے لگے یا یہ کہنے لگے میں کتابیں دیکھ کر بتا سکوں گا، ذرا میں فلاں ڈاکٹر، فلاں حکیم سے مشورہ کرلوں تو مریض کا دل ٹوٹ جائے گا، اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے گا، اور شاید دوبارہ کبھی اس معالج کی طرف رخ بھی نہ کرے، لہٰذا گفتگو کا پہلا جزو یہ ہوتا ہے کہ طالب حاجت کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا جائے کہ وہ جس کے پاس آیا ہے، وہ کار برآری کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی، "قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ" فرمایا: جو کھانا تم کو ملنے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ

میں اس سے پہلے تم کو ان کی تعبیر بتادوں گا، یعنی ان کی ضرورت بلا تاخیر پوری کر دی جائے گی، اس طرح کہ وہ جو پوچھنا چاہتے ہیں، اس کا جواب ان کو بعجلت مل جائے گا، ظاہر ہے کہ وہ دونوں قیدی تھے، اور جیل خانہ کے قوانین کے پابند، زیادہ دیر تک حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھارا کھانا (جو آیا کرتا ہے) پہونچنے بھی نہ پائے گا کہ میں تم کو خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کردوں گا۔

دعوت کی طرف روئے سخن

یہ نبی کا کلام تھا اور اس میں ایک طرح کی خود ستائی کی بو تھی، اس میں اپنی تعریف کی بو نکلتی تھی اور یہ وہم ہو سکتا تھا، اس لئے انھوں نے فوراً فرمادیا:-

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ. یہ ان باتوں میں سے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں۔

آپ اس ماحول کو اپنی نگاہ میں رکھئے جس میں یہ دعوت دی گئی ہے، اس حکیمانہ اسلوب میں جس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو صرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں، لیکن اس کے علاوہ دعوتِ دین اور داعیانِ دین کی طویل تاریخ میں مجھے اس سے زیادہ نازک ماحول نہیں نظر آتا اور نہ اس سے زیادہ لطیف پیرایۂ بیان ملتا ہے، جہاں سے بات شروع کی ہے، "**لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ**" سے آیت "**ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ.**" تک پڑھیے، اور دیکھئے کس طرح رب کے لفظ سے توحید کے وعظ کا راستہ نکال لیا ہے کیا اس سے زیادہ سہل، لطیف، قابل قبول اور تیزی سے بات کا رخ بدلا جا سکتا

ہے؟ گویا وہ فرمارہے ہیں میں تمھاری اس موقع پر مدد تو کر سکتا ہوں، مجھے اللہ نے یہ علم عطا فرمایا ہے، لیکن یہ علم کیوں عطا کیا ہے؟ "اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ"۔ یہ میری ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، میری نجابت کا بھی یہ نتیجہ نہیں...... حالانکہ یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور بدرجۂ کمال و جمال، لیکن انھوں نے فرمایا "اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَهُمْ بِالآخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ" اس علم کا اضافہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس قوم کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر تھی "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ" اور اس کے بعد انھوں نے وہیں سے توحید کے وعظ کا مدخل پیدا کر لیا، عزیزو! تم جس کو بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو اور جو مشکل تم کو یہاں لے کر آئی ہے، اس سے بڑی مشکل درپیش ہے، وہ ہے عقیدہ، یہ خواب جو تم نے دیکھا، خواب تو خواب ہی ہوتا ہے، لیکن معاملہ بیداری کا ہے، معاملہ زندگی کے مستقبل کا ہے، معاملہ ابدی اور دائمی زندگی کا ہے، مان لو تم کو خواب کی تعبیر دینے والا دنیا میں، کوئی بھی نہ ملے تب بھی کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن اس خواب ہستی کی تعبیر دینے والا اگر کوئی نہ ملا کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ کائنات کا فاطر و خالق کون ہے؟ اس کی صحیح معرفت نہ ملی تو اصل خطرہ یہ ہے، پھر انھوں نے اتنا ہی Dose دیا جتنا Dose دینا چاہئے تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ غرض لے کر آئے ہیں، ان کو ایک ذہنی پریشانی ہے، یہ اتنا صبر نہیں کر سکتے کہ ان کو ایک یا دو گھنٹہ تبلیغ کروں، اس لئے انھوں نے بالکل صحیح احساس تناسب کے ساتھ جو ایک حاذق طبیعت رکھتا ہے اور ایک داعی حکیم رکھتا ہے، اتنا ہی ڈوز دیا جتنے ڈوز کے وہ محتمل تھے۔

دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے

آپ اس تناسب کو دیکھئے، اس میں جمال یوسفی پورے طور پر عیاں ہے، اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، ناپ تول کر جہاں رُک جانا چاہئے وہاں رُک گئے، یعنی توحید کی پوری بات کہی لیکن اس کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وہ لوگ یہ کہنے لگتے کہ آپ اگر خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں تو دیجئے، ورنہ پھر فرصت سے آئیں گے۔ حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ ان کے دل و دماغ کا دروازہ کھلا ہے، اور دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے، قسمت سے کھلتا ہے، کبھی کسی غرض سے کھلتا ہے، کبھی کسی پریشانی سے کھلتا ہے، اس دروازہ سے جو اصل پیغام ہے وہ داخل کر دینا چاہئے، لیکن وہ پیغام اس سبک روحی کے ساتھ داخل ہو کہ وہ دروازے بند نہ ہو جائیں اور احتجاجاً بند نہ ہو جائیں، میں تو حیران رہ جاتا ہوں اور افسوس ہے کہ یہ پورا حصہ بائبل سے حذف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کس کی تصنیف ہے اور قرآن کس کا نازل کیا ہوا ہے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ یہ کتنی بات کے محتمل ہو سکتے ہیں، اتنی ہی بات انھوں نے کہی، مریض چاہتا ہے کہ اس کو اس کے درد کا مداوا جلد مل جائے تو انھوں نے کہا "قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ" تمھارا راشن جو مقرر ہے اس کے آنے سے پہلے تعبیر دے دوں گا، مخاطب کو یہی دوا اطمینان چاہئیں، اس کی دوا مل سکتی ہے یا نہیں؟ اور جلد ملتی ہے یا نہیں؟ اس درمیان میں توحید کا وعظ کہہ دیا۔(۱)

(۱) "حدیث پاکستان" از ص ۱۴۷ تا ص ۱۴۸۔ "دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب" ص ۵۱ تا ص ۵۴ سے مشترک اخذ و تلخیص۔

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قِصّہ

اُور ایمان کی قدر و قیمت

فَانطَلَقَا حَتّٰی إِذَا لَقِيَا غُلٰماً فَقَتَلَهٗ. قَالَ أَقَتَلْتَ نَفساً زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ. لَقَدْ جِئْتَ شَيْئاً نُكراً. ...... أَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً وَّكُفراً. فَأَرَدْنَا أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّأَقْرَبَ رُحْماً. (الکہف۔ ۷۴-۸۰۔۸۲)

مجھے صرف چند باتیں عرض کرنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر میں آپ سے کوئی معاہدہ کرتا تو یہ کرتا کہ آپ اس احساس و شعور کو زندہ رکھیں کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے، ایمان جان سے زیادہ پیارا ہے۔ اور ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بچہ کی جان سے، اس کی صحت سے، اس کا ایمان زیادہ عزیز ہے، ایمان زیادہ قیمتی ہے۔

اس کے لئے میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتا ہوں، اور جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے، اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی، لیکن مجھے اندیشہ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے صحیح نتیجہ نکالا

ہے، اسلاف کرام اور مفسرین عظام کا ذہن بیشک ان چیزوں کی طرف گیا ہوگا، جہاں ہمارا ذہن جا نہیں سکتا، لیکن آج کے پڑھنے والے بہت کم یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

قرآن مجید کی سورۂ کہف میں آخر یہ قصہ بیان کیا گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کی جان لے لی، اور وہ بھی ایک اولوالعزم اور ایک عظیم الشان پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی اور رفاقت میں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے جب پوچھا کہ آپ نے بچہ کے ساتھ یہ کیا معاملہ کیا؟ اس کا کیا جرم تھا؟ اور کیا وہ جرم ایسا تھا کہ اس کی جان لے لی جائے؟ حضرت خضرؑ نے کہا کہ اس کے ماں باپ دونوں صاحب ایمان اور نیک تھے۔ اور یہ بچہ فتنہ بننے والا تھا۔ اگر یہ زندہ رہ جاتا تو اپنے ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنتا، تو میں نے اس لئے ان کو اس خطرہ سے بچالیا اور اس کی جان لے لی کہ اللہ اور اولاد دے گا، آج کہیں پوری دنیائے اسلام میں بڑی سے بڑی آزاد حکومت اور شرعی حکومت بھی اس پر عمل نہیں کر سکتی، آپ سب جانتے ہیں کہ محض اس خطرے سے کہ یہ بچہ کبھی فتنہ بن جائے گا (اور بہت سے بچے فتنہ بن رہے ہیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں) اس کی جان لینے کی اجازت نہیں، اور جان لینا تو جان لینا ہے۔ کوئی اور بہت بڑی سزا معصومیت کی حالت میں نہیں دی جا سکتی، اور یہاں سوال پیدا ہوگا کہ پھر قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس قصہ کو سورۂ کہف میں داخل کر کے اُسے زندہ جاوید کیوں بنادیا؟ یہ کہ قیامت تک پڑھا جائے گا۔ تو اس نے ایسا اس لئے کیا تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ایمان کی یہ قیمت ہے۔ اگرچہ آج اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اور تشریعی طور پر اس پر عمل کرنا حرام بھی ہے اور قتل ناحق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے قرآن مجید کی سورۂ کہف میں بیان فرما رہا ہے، اُسے ایک

پیغمبر اور اس کے رفیق کا (جن کا کم سے کم درجہ اولیاء اللہ کا ہوگا) فعل بتایا جا رہا ہے۔ آخر اس کی حکمت کیا ہے؟

حکمت یہی ہے کہ ہم آپ سوچیں کہ ایمان وہ قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے حضرت خضر علیہ السلام نے (جو بڑے فقیر، بڑی عارف باللہ اور بڑے صاحب بصیرت اور مقبول عند اللہ تھے) یہ کام کیا کہ اس بچے کی جان لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سنایا۔ اور قرآن مجید میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ تاکہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ ایمان اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لئے جو چیز خطرہ بننے والی ہے، اس خطرہ کو بھی دور کرنا چاہئے، چاہے وہ کیسی ہی پیاری اور عزیز کیوں نہ ہو، مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز اور الہامی نکتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں بیان فرمایا ہے، کہ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام ایک بستی میں گئے اور وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک دیوار مسمار ہونے والی ہے، اس موقع پر وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم پردیسی ہیں اور ہماری ضیافت ہونی چاہئے اور زبان قال سے بھی جیسا کہ قرآن مجید سے اشارہ معلوم ہوتا ہے لیکن پوری بستی میں کسی نے خبر نہیں لی، اور کھانا پیش نہیں کیا، اور وہ بھوکے رہے، مگر دیوار جو گر رہی تھی حضرت خضر علیہ السلام اس کے سنبھالنے میں لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، حیرت کی بات ہے کہ کہاں سے وہ مسالہ لائے، اور انھوں نے کتنی محنت کی ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجب تضاد ہے، جنھوں نے کھانے تک کی خبر نہیں لی، ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا، ان کا کہاں سے یہ حق تھا اور کیسا احسان تھا کہ آپ نے

اس دیوار کو جس کی مرمت میں وہ مزدور لگاتے، پیسے خرچ کرتے اور خود توجہ کرتے۔
آپ نے اس دیوار کو سنبھال دیا تو انھوں نے کہا۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحاً. فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَّبِّكَ۔ (سورۂ کہف)

یہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا باپ نیک تھا، یہ دیوار اگر گر جاتی تو جو خزانہ اندر دبا ہوا تھا وہ کھل جاتا، سامنے آجاتا اور لوگ لوٹ لے جاتے، اور ان کو غربت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور ان کے پاس کچھ نہ رہتا۔ ایک طرف جان لی ایمان کے خطرے سے، ایک طرف دیوار سنبھالی ایمان کی فضیلت کی وجہ سے، یعنی وہ خود بھی نہیں بلکہ ان کے باپ نیک تھے معلوم نہیں ان کے انتقال کو کتنا زمانہ ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے اس ایمان کی اتنی قیمت جانی کہ اس دیوار کو سنبھالا، اور اس کو کھڑا اور ٹھیک کر دیا۔ اور وہ خزانہ دبا رہا۔

یہ دونوں واقعے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورۃ میں اور اوپر نیچے بیان کئے تاکہ آپ کو ایمان و کفر کا فرق معلوم ہو، ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جو بچہ خطرہ بننے والا تھا اس کو ختم کر دیا، اور ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جن کا باپ نیک تھا ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے اور وہ دو یتیم بچے تھے، ان کا باپ چونکہ صاحب ایمان تھا، اور نیک تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی قدر دانی میں دیوار سنبھالنے کا انتظام فرمایا اور الہام کے ذریعہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار سنبھال لی۔

ایمان کو جان پر مقدم سمجھنا ایمان کا تقاضا ہے

بس میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے آپ ایمان کی قیمت سمجھئے اب یہ حکم نہیں ہے کہ جس کو آدمی سمجھے اس کو اس طرح ختم کر دے بلکہ، بہتر یہ ہے کہ اگر خطرہ سمجھے تو اس کو اس دیوار کی طرح سنبھالے، جو گر رہی تھی ویسے ہی اپنی اولاد کو اور آئندہ آنے والی نسل کو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دے، اس کو مضبوط بنائے، مستحکم کرے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے ذہن اور ہمارے عقیدے نے اس کو قبول کر لیا، کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے تو پھر علاج و معالجہ اور کپڑے بنانے اور اس کی پوشاک کا خیال کرنے اور پھر آگے بڑھ کر اعلیٰ تعلیم دلانا، ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہوگا کہ ان کے دل میں ایمان بٹھایا جائے، ان کے علاج و معالجہ سے، کپڑے بنانے سے، انھیں دعائیں دینے سے، اور انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے ایمان کا تحفظ کرے، اور ایسا انتظام کرے کہ ایمان جانے نہ پائے، آخری بات میری طرف سے یاد رکھئے کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے(۱)۔

---

(۱) ماخوذ از۔ تعمیر حیات لکھنؤ۔ ۱۰/ اگست ۱۹۹۸ء

قرآن ایک صاف شفاف آئینہ ہے

جس میں افراد اور قومیں اپنا چہرہ دیکھتی اور اپنا مقام پہچانتی ہیں

میں نے ایک عزیز دوست سے سورۃ الانبیاء کی تلاوت سنی تو اس کی ایک عبرت آموز آیت نے میرے ذہن میں بے شمار معانی کے دریچے کھول دیئے۔ ارشاد باری ہے:۔

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ. أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.
(الانبیاء۔۱۰)

ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے، جس میں تمھارا تذکرہ ہے تو تم غور کیوں نہیں کرتے۔؟

یہ آیت ہمیں...... بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف شفاف، سچا، وفادار و دیانت دار آئینہ ہے، جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے، اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے، کیونکہ قرآن انسانوں کے اخلاق و صفات بیان کرتا ہے، اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ "فِيْهِ ذِكْرُكُمْ" "یعنی اس کتاب میں تمھارا بیان ہے، تمھارے حالات و اوصاف مذکور ہیں، جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے، سلف

قرآن کو ایک زندہ، بولنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثار قدیمہ کی چیز نہیں تھی، جو صرف ماضی اور اگلے وقتوں کے لوگوں سے بحث کرتی ہو اور جس کا زندہ لوگوں سے، بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار ولا محدود نمونوں سے جو ہر زمان ومکان میں موجود رہتے ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔

ہمارے اسلاف اپنے اخلاق واوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے، ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں ہوتی تھی، وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اسی عجیب وغریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق واطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے، اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں پا جاتے تھے، اور پہچان لیتے تھے، اگر ذکر خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت احنف بن قیسؒ کا واقعہ

اس آیت کی تلاوت پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا، حضرت احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، حلم میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو ان کی غیرت وحمیت میں جوش آجاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضبناک ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ میں نے ابو عبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۷۵ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں

پڑھا ہے، مصنف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور گمان غالب ہے کہ اس کتاب کی تالیف آپ ہی کے شہر بغداد میں ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا، ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کروں اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:۔

كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ. وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ. وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (الذاریات۔۱۷۔۱۹)

رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے، اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا تھا۔

پھر یہ آیت گزری:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً وَّمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (السجدہ۔۱۶)

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں، (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف و امید سے پکارتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِيَاماً. (الفرقان۔۶۴)

اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے عجز و ادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

پھر ان کا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے:-

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ. وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ.
(آل عمران۔ ۱۳۴)

جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے ہیں، اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، اور خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

پھر ان کے سامنے کچھ نمونے آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:-

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.
(الحشر۔ ۹)

اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

پھر یہ آیت سامنے آئی:-

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ. وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ. وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ.
(الشوریٰ۔ ۳۷۔ ۳۸)

اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں، اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر رک گئے اور فرمایا، اے اللہ! یہاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پا رہا ہوں اور

دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا:۔

إِنَّهُمْ كَانُوٓا إِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ. وَيَقُوْلُوْنَ أَإِنَّا لَتَارِكُوٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ. (الصّٰفّٰت۔۳۵۔۳۶)

ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو غرور کرتے تھے، اور کہتے تھے بھلا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔

پھر ان کا ذکر گزرا:۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ.

(الزمر۔۴۵)

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے، تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں، اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے، خوش ہو جاتے ہیں۔

پھر ان لوگوں کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا :

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ. قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ. وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ. وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. حَتّٰى أَتَانَا الْيَقِيْنُ.

(المدثر۔۴۲۔۴۷)

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں پڑے، وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی۔

پھر ٹھہر گئے اور فرمایا: اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے براءت ظاہر کرتا ہوں، اس کے بعد ورق الٹتے رہے، اور تلاش کرتے رہے، آخر کار جب اس آیت پر نظر پڑی

وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَيِّئاً. عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ. اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ۔ ۱۰۲)

اور کچھ لوگ اور ہیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، انھوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے (۱)۔

تو فرمانے لگے: "خداوندا! میں انھیں لوگوں میں سے ہوں (۲)"۔

ہم بھی اپنا تذکرہ تلاش کریں

آیئے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر پوری دیانت داری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں قرآن بشیر بھی ہے، اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے، قرآن افراد اور جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ. وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ. وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ. وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ. وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ. (البقرۃ۔ ۲۰۴۔۲۰۶)

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دل کش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے (۱) تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے، اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کرو، تو غرور اسکو گناہ میں پھنسا دیتا ہے، سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

---

(۱) آیات کا ترجمہ مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ قرآن سے برائے نام فرق کے ساتھ منقول ہے۔
(۲) کتاب قیام اللیل طبع ملتان ۱۳۲۰ھ ص ۱۳۔ (۳) بعض لوگوں نے "تولی" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ جب اس کو حکومت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔

پھر اس کے بعد ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَؤُوْفٌ بِالْعِبَادِ. (البقرۃ۔۲۰۷)

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے، اور خدا بندوں پر بہربان ہے۔

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے:-

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ. ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ. وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (المائدہ۔۵۴)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا، جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں، اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں، اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور خدا بڑی کشائش والا، اور جاننے والا ہے۔

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے:-

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً. (الاحزاب۔۲۳)

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں، جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا، اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں بعض ایسے ہیں، جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے، اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں، اور انھوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے، اور ناشکری، احسان فراموشی، غرور اور حسن سلوک کا جواب بدسلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے، اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ.

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے خدا کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے، جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا۔اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہوتا ہے:-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَداً مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ. (النحل۔۱۱۲)

اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی، ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا، مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی، تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھادیا۔

یہ لازوال انسانی نمونے ہیں

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کئے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون، کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ہامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد، کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت قوم کے نام سے مثلاً ثمود، یہ تمام لازوال انسانی نمونے ہیں، جو کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان افراد اور جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کرے گا، اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان افراد اور جماعتوں کا ہوا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ. وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَراً مَّقْدُوْراً. (الاحزاب ۳۸)

جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے، اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے۔(۱)

---
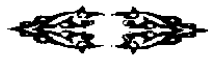
(۱) ماخوذ از دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ ص ۲۰۳ تا ۲۱۳۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
قرآنی افادات ۲
رسال الدین احمد حقانی ندوی
ناشر
محمد الحسنی ٹرسٹ
تکیہ کلاں رائے بریلی

طبع اول

صفر المظفر ۱۴۳۵ھ - دسمبر ۲۰۱۳ء

کتاب	:	قرآنی افادات (دوم)
مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
جمع وترتیب	:	رسال الدین حقانی ندوی
صفحات	:	۳۶۸
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
قیمت	:	

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی
☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ
☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہیدؒ... محمد الحسنی ٹرسٹ

تکیہ کلاں رائے بریلی

باب (چہارم) حقائق وعبر (۲۵۸ تا ۳۰۳)

باب (پنجم) بلاغت واعجاز (۳۰۴ تا ۳۶۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو عمومی طور پر ایک مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فہم قرآن میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس پایہ کے ہوں، اس کی دو بڑی وجہیں ہیں: ایک تو عربی زبان وادب، بلاغت اور اعجاز قرآنی پر حضرتؒ کی وسیع وعمیق نگاہ، دوسرے ان لوگوں کی صحبت جن کی زندگی قرآن مجید کی علمی تفسیر ہے۔ حضرتؒ نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں لیکن ان سب پر قرآن مجید کا رنگ غالب ہے، حضرتؒ نے خود ایک جگہ لکھا ہے :

''میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے۔'' (قرآنی افادات: ۱/۱۳)

اس ذوق سے حضرتؒ کی مناسبت کا آغاز تو اسی وقت ہوگیا تھا جب والدہ صاحبہؒ اپنے مخصوص لحن میں بڑے درد وسوز کے ساتھ تلاوت فرماتی تھیں۔ حضرتؒ اپنے بچپن کے اس دور ہی میں جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں اس کی حلاوت محسوس فرمانے لگے تھے اور اسی وقت دل کی نرم زمین میں اس کا بیج پڑ گیا تھا۔

پھر جب خلیل عرب صاحبؒ سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا اور فہم کی صلاحیت پیدا ہوئی تو خود حضرتؒ ہی فرماتے تھے کہ تلاوت کا ذوق پیدا ہوگیا اور اس میں مزہ آنے لگا۔ خلیل عرب

صاحبؒ عربی زبان کے رمز شناس اور اس کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے استاد تھے اس کا اثر تھا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت بڑی حلاوت اور درد کے ساتھ کرتے تھے اور اس میں سرشار ہو جاتے تھے۔

خواجہ عبدالحی صاحب فاروقیؒ سے بھی حضرتؒ نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کا درس لیا، اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں باقاعدہ شرکت فرمائی، حضرت ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

''میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحبؒ کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں:۱۸۶)

دارالعلوم دیوبند کے قیام میں قرآن مجید کی بعض آیات اور مشکل مقامات کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ سے بھی استفادہ فرمایا۔

اس پورے دور میں حضرتؒ نے کم سے کم تفسیروں کی مدد لی اور براہِ راست قرآن مجید سے استفادہ فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؒ کسی مخصوص طرزِ فکر یا نظریہ سے متاثر نہیں ہوئے اور بلا واسطہ فہم قرآن کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ جب کسی خاص تفسیر کی مدد ہی سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو فہم قرآن میں اس مفسر کا عکس پڑ جاتا ہے۔

پھر وہ دور آیا جب حضرتؒ نے دارالعلوم میں سالوں قرآن مجید کا درس دیا، اس دوران مختلف تفسیروں کا مطالعہ فرمایا، اس طرح فنی طور پر مزید گہرائی پیدا ہوئی۔ درس کے زمانہ میں حضرت نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ سے بھی اس باب میں استفادہ کیا جس سے مزید وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ جب حضرتؒ ''ادارہ تعلیمات اسلام'' میں اور اس کے بعد ''مرکز دعوت و تبلیغ'' میں برسوں قرآن مجید کا درس دیتے رہے۔ اس درس کی بنیادی خصوصیت یہی تھی کہ معاشرہ سے اس کا انطباق فرماتے اور اس طرح آیات کی تفسیر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیتیں ابھی ابھی نازل ہوئی ہیں اور ان میں موجودہ مسائل ومشکلات کا حل موجود ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ درس بہت مفید اور عمومی طور پر بڑا موثر ہوتا تھا اور اس میں خواص کا اتنا بڑا مجمع ہوتا تھا کہ کم

کسی تقریب میں ہوتا ہوگا۔

حضرتؒ کا قرآن فہمی کا یہ ذوق حضرتؒ کی تقریروں اور تحریروں میں نمایاں تھا، قرآنی افادات کے نام سے حضرتؒ کی اس سے متعلق تحریروں کا جو انتخاب شائع ہوا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

عزیزی محترم مولوی رسال الدین حقانی صاحب نے بڑا قابل قدر کام کیا کہ حضرت مولاناؒ کی تقریروں اور تحریروں سے وہ اقتباسات لے کر یکجا کر دیے، جن میں قرآنی نکات تھے، مختلف قرآنی موضوعات انہوں نے جمع کیے اور بڑی خدمت انجام دی، قرآنی افادات کے نام سے پہلی جلد حضرت مولاناؒ کی زندگی میں طبع ہوئی، اور اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی، اس کے کئی ایڈیشن نکلے، اب یہ دوسری جلد قارئین کے سامنے ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑا حصہ وہ ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہوسکا، یہ زیادہ تر حضرت مولانا کے درس قرآن سے انتخاب ہے، جو حضرت مولانا نے دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں رمضان المبارک میں دیا کرتے تھے، اور اس کا سلسلہ حضرت مولانا کی وفات تک جاری رہا۔ محترم موصوف نے بڑی عرق ریزی سے ان دروس قرآن سے بطور خاص منتخبات لیے، اور اس کے علاوہ بعض تحریروں اور تقریروں سے بھی اخذ کر کے یہ مجموعہ تیار کیا، یہ سارا کام انہوں نے ہمارے مربی وسرپرست برادر معظم حضرت مولانا سید عبد اللہ حسنی صاحبؒ کے مشوروں سے کیا ہے، دوسری جلد انہیں کی زندگی میں مکمل ہوئی تھی، اور انہوں نے اس کو دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا، لیکن افسوس ہے ان کی زندگی میں وہ طبع نہ ہوسکی، اب یہ قارئین کے سامنے ہے، امید ہے کہ اس سے ہمارے حضرت مولاناؒ اور برادر معظمؒ دونوں کی روحیں خوش ہوں گی، اور یہ کتاب ان حضرات کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کو بھی پہلی جلد کی طرح مقبولیت عام عطا فرمائے۔

بلال عبد الحی حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي، دار عرفات

تکیہ کلاں رائے بریلی

۴/صفر المظفر/۱۴۳۵ھ

کلمات تحسین ودعا

عزیزی مولانا رسال الدین احمد حقانی ندوی!

مبارک ہو آپ کو یہ توفیق الٰہی، توفیق حق کی ارزانی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے کلام کے عجائبات اور نہ ختم ہونے والے بعض غرائب کو یکجا کرنے کی سعادت ملی، وہ عجائب جو بخشنے والے نے اس سینہ کو ودیعت کیے جو اسرار حق کا خزینہ تھا، "**من جاء بالصدق وصدق به أولئك هم المتقون**" کی شہادت جس کی دولت تھی، اول وآخر یہی اس کی ثروت تھی، اسی سے اس کی زندگی نورانی تھی، اور آج اسی نور سے اس کی قبر پرنور ہے، روشن ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک روشن رہے گی۔

مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (**یا رب قدس روحه ونور قبره وبرد مضجعه**) کو اللہ تعالیٰ نے پاک دل، پاک زبان، پاک سیرت بنایا تھا، قرآن اللہ کا نور ہے، "**أوله نور وآخره نور**" کا مصداق "**نور ظاهره ونور باطنه**" کا جلوۂ تاباں، لہٰذا ایک نور سے بھرے دل، اور کلام اللہ کی صداقت پر گواہی دینے والی زبان سے جو نکلا وہ عین منشائے الٰہی ہے۔

ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جولانی طبع کا ایک خوشنما مظہر یہ تھا کہ آپؒ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو اکثر یہ ہوتا کہ جلسہ کا افتتاح جن آیات کریمہ سے کیا جاتا آپؒ انہی آیات کی روشنی میں ایمان کی روشنی دکھاتے، ایسا معلوم ہوتا کہ قرآن کریم کا معجزہ اصلی یہی آیات ہیں، ہر لفظ محبت وصداقت کا حامل ہے، اگر صرف انہی آیات کو جمع کرلیا جاتا تو ایک مکمل تفسیر ہوتی، مگر یہاں تو وہ آیات ہیں جن کی تفسیر آپ کے قلب مبارک پر وارد

ہوئی یا یوں کہیے کہ القاء ہوئی، اور مبارک زبان نے مبارک لہجہ میں ان کو ادا کیا۔

مولانا رسال الدین! آپ کو اللہ نے دین کا فرستادہ بنایا، قرآن کریم کے تفسیری افادات جمع کرنے میں آپ کامیاب ہوئے، ان تفسیری نکات کو پڑھنے والے کا ذوق خاکہ ایسا بن جائے گا کہ قرآن کریم کی صحیح روح سمجھنے میں اس کو آسانی ہوگی، بلکہ عربی لفظ استعمال کیجئے تو و کہیے کہ قرآن کریم کی عربیت اس کے لیے ''شراب سائغ'' بن جائے گی، مثال صرف ایک مثال لیجئے ''تزئین'' زینت دینا، مزین کرنا، جیسے رات کو، تاریکی کو چاند ستاروں سے زینت بخشی گئی ہے، اب اعمال کی زینت کس طرح دی جاتی ہے، اس کو قرآن کریم میں پڑھیے ''**زینا لھم اعمالھم**....'' ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کردیئے''۔

حضرت مولانا اس لفظ کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

''کرنے والا تو اللہ ہی ہے کوئی کتنا ہی کسی چیز کا ارادہ کرے، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کی اجازت نہ دے یعنی چھوٹ نہ دے، اور ڈھیل نہ دے، اس وقت تک وہ ہوتی ہی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی کہ خالق حقیقی وہی ہے، جیسے وہ اجسام کا خالق ہے ویسے ہی وہ ارادوں کا، ارادے بھی بغیر اس کی اجازت کے نہیں ذہن میں آسکتے، تو ان کے لیے ان کے اعمال مزین ہیں۔

''**فھم یعمھون**'' تو وہ اس میں بھٹکے پھر رہے ہیں، بالکل اندھے بنے ہوئے ہیں، چیزوں کو اسی پیمانے سے تولتے اور ناپتے ہیں۔

دیکھئے اس وقت کا جو تمدن ہے یہ ''**زینا لھم أعمالھم**'' کا بہترین مظہر ہے آپ امریکہ سے لیکر انڈونیشیا تک چلے جائیں گے، ہر جگہ آپ کو ایک بڑا طبقہ ملے گا، جس کو اپنی یہ شان وشوکت اور وہ اختیارات اور اعزاز واستقبالات اور ممبریاں، ممبرشپ، فلاں پارلیمنٹ کی، اسمبلی کی، کونسل کی، اور جو کچھ بھی ہوں وہ سب ان کے نزدیک بڑی ترقی بڑی عزت کا معیار ہے، ''**زینا لھم أعمالھم**'' اس کے لیے ''تزئین'' عربی کا بہترین اور مناسب ترین لفظ ہے۔

"أولئک الذین لهم سوء العذاب وهم فی الآخرة هم الأخسرون"

''وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں سخت نقصان میں رہنے والے ہیں یعنی وہ اپنے کو یہاں کامیاب سمجھ رہے ہیں، اور آخرت میں وہ سب ناکام ثابت ہوں گے''۔

پورا مجموعہ اس طرح کے نوادرات سے پر ہے، اللہ کا کلام سچا ہے، اس کی تفسیر کے لیے سچا دل اور سچی زبان چاہیے جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہے۔ اللہ اس کی روشنی سے آپ کی زندگی بھی منور کردے اور ہماری بھی، اور تمام مسلمانوں کی زندگیاں روشن ہوں۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

عبداللہ عباس ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳/۹/۲۰۰۴ء

مُقَدَّمَہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین وبعد:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر سے شغف رہا، اور جب ندوۃ العلماء میں ان کا تدریسی دور آیا تو ترجمہ وتفسیر قرآن ان کا خصوصی موضوع بنا، اس طرح اس مضمون سے ان کو نمایاں تعلق رہا۔ تفسیر وعلوم قرآن کے علاوہ ادب عربی اور علوم حدیث بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مضمون رہے، اور ادب عربی میں تو مولانا کو خاص امتیاز حاصل رہا، اس کی وجہ سے انہیں قرآن مجید کے الفاظ وعبارت کی بلاغت اور حسن تعبیر کو بہتر طریقہ سے سمجھنے اور اس کی اثرانگیزی کو محسوس کرنے میں خصوصیت حاصل رہی، قرآن مجید کے مضامین کی ادائیگی میں جو حسن بیان اور حسن ادا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے نزول قرآن کے زمانہ میں کلام عربی میں جو محاورے رائج تھے نیز الفاظ میں انسانی زندگی کی نفسیات کی پیچ وخم کی جو رعایت ہوتی ہے اسکو سامنے رکھتے ہوئے آیات قرآنی کے تعبیری اسلوب پر نظر ڈالی جائے، تو قرآن مجید کا تعبیری اعجاز سامنے آتا ہے، اور جو مضامین اور معانی بیان کیے گئے ہیں ان کو ان کے مزاج

ومقصد کے مطابق سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اور یہ بات عربی زبان وادب کا اچھا ذوق حاصل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ ایک طرف انہوں نے عربی زبان وادب اور اس کے محاوروں اور اس کے اسالیب کلام کی خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کی تھی، دوسری طرف ترجمہ وتفسیر قرآن کے لائق ترین اساتذہ سے تلمذ حاصل کیا تھا، اور تدریس کے زمانہ میں مزید گہرے مطالعۂ قرآن اور اس کی مستند تفاسیر کے مطالعہ کا حق ادا کیا تھا، اس طرح ان کو قرآن مجید کی تعبیرات اور اسالیب بیان کی معجزانہ بلاغت اور معانی ومطالب کا فہم اور ان کی اثر انگیزی کا ذوق حاصل ہوا تھا، انہوں نے اپنے اس ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے باقاعدہ کوئی تفسیر نہیں لکھی لیکن ان کی تقریروں، مضامین اور اصلاح وارشاد کے خطابات میں استشہاد کے طور پر جن آیات کا تذکرہ آتا تھا تو ان کی تشریح میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن فہمی کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار ہوتا تھا۔

مولانا نے اپنی عمر کے آخری برسوں میں رمضان المبارک کے موقعوں پر اپنی مسجد میں عام مسترشدین ومستفیدین کے لیے درس قرآن بھی دیا جو قرآن مجید کی صرف چند سورتوں اور پاروں تک پھیلا، اس درس قرآنی میں قرآنی آیات والفاظ کی تشریح میں مولانا جو بیان کرتے تھے وہ تفسیر قرآن کے اصول ومبادی کے اندر رہتے ہوئے بڑا فکر انگیز اور مضمون کلام کے نہایت نہایت موزوں وبرمحل ہونے کی خوبی کو آشکارا کرنے والا ہوتا تھا، دوسری خصوصیت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ ہوتی تھی کہ زندگی کے موجودہ طور وطریق میں ان سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کی بہت موزوں تطبیق کرتے تھے۔

قرآن مجید تو تاقیامت رہنمائی کرنے والا کلام ہے اس لیے زمانۂ صحابہ کے لوگوں کے انسانی مزاج وکردار کے لیے اس کلام میں جو سبق ملتا ہے، وہ اسی دور کے لیے محدود نہیں تھا، بلکہ اس کے افادہ وہدایت کا امتداد قیامت تک قائم رہنے والا ہے، جس کو قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے والے برابر نسلاً بعد نسل اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے حاصل

کرتے رہے اور کرتے رہیں گے، البتہ اس کے لیے یہ ضرورت برابر رہے گی کہ صحابہ کرام اپنی زبان عربی کے الفاظ ومحاوروں اور مضمون کلام کے موقع ومحل کو جس طرح جانتے تھے اور اس کی بنیاد پر وہ قرآن مجید کے کلام سے رہنمائی اور اثر پذیری حاصل کرتے تھے ان کے اس انداز واقفیت اور صلاحیت فہم کی نقل کرتے ہوئے قرآن مجید کو پڑھایا جائے تو ایسا کرنے سے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کے لحاظ سے کلام الٰہی کی رہنمائی وتفہیم کی فطری وطبعی تاثیر وخوبی کا ضرورت کے مطابق استفادہ ہوگا، اور اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس استفادہ میں راہ حق سے بھٹکنے سے بچنے کے لیے تفاسیر سے مراجعت کیا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے ذریعہ آیات کے اسباب نزول اور مواقع نزول کا علم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو یہ سب باتیں حاصل تھیں اسی لئے مولانا کے خطابات اور مضامین میں جہاں قرآنی آیات سے استشہاد کا موقع آتا تھا مولانا اپنی اسی اعلیٰ اور فکر انگیز صلاحیت سے کام لیتے تھے۔

مولوی رسائل الدین احمد حقانی ندوی کو اللہ تعالیٰ بہت بہت جزائے خیر دے کہ انہوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس فکر انگیز اور دل نواز خوبی اور ان کے شرح وافادہ کے اس عظیم کارنامے کو حضرت مولانا کی تصنیفات وخطابات اور درس قرآن کے غیر مطبوعہ اور ریکارڈ شدہ تقریروں سے چن چن کر جمع کرنا شروع کیا اس کی ایک جلد تیار ہوکر شائع ہوچکی ہے اور اس نے قارئین سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، حتیٰ کے برطانیہ کا ایک ادارہ اس کا انگریزی ترجمہ کرکے شائع کررہا ہے اب اس مجموعہ کی دوسری جلد اردو میں مرتب ہوکر شائع ہورہی ہے اس جلد میں اور سابقہ جلد میں مولوی رسائل الدین صاحب نے غیر معمولی محنت کی ہیں مولانا کے درس قرآن اور خطابات میں جہاں کچھ اشارے آگئیں ہیں، وہاں ان اشاروں کو خود مولانا کی تصنیفات میں تلاش کرکے ان کے حوالہ سے وضاحت کی ہے اور جہاں جہاں مولانا کے متن کلام کے لئے ماخذ کے ذکر کرنے کی ضرورت سمجھی ہے وہاں ماخذ تلاش کرکے اس سے مطابقت کا اہتمام کیا ہے اس طرح انہوں نے اپنے کام کو اعلیٰ

ریسرچ کا ایک کام بنا دیا ہے، ان کی اس کوشش کو ندوۃ العلماء کے استاد مولانا عبد اللہ حسنی ندویؒ کا مشورہ و تعاون بھی حاصل رہا اس سے اس کام کو مزید تقویت ملی بہر حال مولوی رسال الدین صاحب کی اس محنت نے قرآن فہمی کے طالبین کے لئے اور اہل علم حضرات کے لئے قرآن کریم کے مطالب کے فکر انگیز اور زندگی کے رہنمائی کرنے والے معانی کے فہم کا اچھا سامان اکٹھا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام فرمائے۔ آمین

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۹/۷/۱۴۲۵ھ - ۱۵/۹/۲۰۰۴ء

عقائدواعمال

عبودیت کی بنیاد

عقائداورایمان کی تصحیح پر ہے۔ جس کے عقائد میں خلل اورایمان میں
بگاڑ ہو، اس کی نہ کوئی عبادت مقبول، نہ اس کا کوئی عمل صحیح مانا جائے گا۔ اور
جس کا عقیدہ درست اورایمان صحیح ہو، اس کا تھوڑا عمل بہت ہے، اس لیے ہر
شخص کواس کی پوری کوشش کرنا چاہیے کہ............اس کا ایمان وعقیدہ صحیح ہو
اور صحیح ایمان وعقیدہ کے حصول اوراس پراطمنان اس کا مقصودِ عمل اور منتہائے
آرزو ہو، اس کوناگزیراور بے بدل سمجھے اوراس میں ایک لمحہ بھی تاخیر سے
کام نہ لے''!!

دستورحیات:۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عالی مرتبت کتابِ ہدایت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ: اَمَّا بَعْدُ!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿الٓمّٓ ☆ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ☆ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ☆ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ☆ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱-۵)

(یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کوئی شک نہیں (کلامِ خدا ہے) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور (آداب کے ساتھ) نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں)

بہت عالی مقام کتاب

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ "یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کوئی شک نہیں"۔

عربی میں "ذٰلِكَ" کا لفظ جو ہے وہ عظمت کے لیے بھی آتا ہے، جب کسی چیز کی نسبت "ذٰلِكَ" کی طرف آ جائے تو اس میں عظمت کی شان آتی ہے۔ یہ اہلِ زبان کے ذوق کی چیز ہے "هٰذَا الْكِتَابُ" بھی فرمایا جا سکتا ہے، لیکن "ذٰلِكَ" کہنے سے اس میں ایک عظمت اور وقعت پیدا ہوتی ہے، جیسے کوئی دور کی چیز بہت اہم ہوتی ہے، ہم نے اشارہ کیا تھا، توجہ دلائی جاتی ہے، تو اس "كِتَابُ" کی طرف "ذٰلِكَ" کا لفظ لانے سے نفسیاتی طور پر اور ادبی طور پر، ذہنی طور پر اس میں یہ بھی بات آئی کہ اس کے طویل اور وسیع مطالب ایسے ہیں کہ جو بہت بلند مقام پر ہیں اور بہت دور تک ہیں، اس لیے "ذٰلِكَ" یہ اشارہ بعید کے لیے آتا ہے وہ یہاں استعمال کیا گیا ہے، یہ یونہی نہیں اتفاق "هٰذَا" کے بجائے "ذٰلِكَ" کہہ دیا بلکہ اس میں مطلب یہ ہے کہ اس سورہ میں وہ مضامین آنے والے ہیں جو بہت وسیع المقام ہیں اور بعید المکان ہیں، اس لیے "ذٰلِكَ" "یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں"۔

یہ جو لفظ بار بار ہماری نظروں سے گذرتے ہیں، کانوں میں پڑتے ہیں، سامنے آتے ہیں ان کی اہمیت و عظمت نکل جاتی ہے ان کی جو طاقت ہے، ان کا جو حق ہے، وہ پھر اس طرح سمجھ میں نہیں آتا ہے، اس کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" اس میں کوئی شک نہیں، یہ کوئی معمولی بات کا دعویٰ نہیں، بلکہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی بڑے سے بڑے بلیغ لوگوں کے کلام میں، ادیبوں کے کلام میں شاعروں کے کلام میں، یہاں تک کہ اہلِ قلوب کے کلام میں بھی کوئی ایسا اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں "رَيْبَ" کی گنجائش باقی رہتی ہے، "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" "جو بہت عالی مرتبہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں" جب کوئی چیز عالی مرتبہ ہو

تو اس میں شک کا امکان زیادہ ہوتا ہے، دور کی چیز میں آدمی کہے نہیں یہ نہیں ہے، تو اس میں کہا گیا کہ "یہ کتاب عالی مقام ہے، اس میں کوئی شک نہیں" "یعنی وہ اپنے بلندی مقام کے لحاظ سے بہت وسیع اور بہت فاصلے پر ہے، لیکن ایسی چیز میں جلدی شک پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں "لَا رَيْبَ فِيْهِ" یہیں نفی کر دی کہ اس کتاب ہی میں کوئی شک نہیں"۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

قرآن کی سب سے بڑی اور معجزانہ اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم قطعی اور یقینی ہونا ہے۔ "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" یہ کتاب ایسی ہے جس میں شک کا کوئی گذر نہیں، قرآن کی اس خصوصیت کو کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے، قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ "علم الٰہی" ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ "وحی الٰہی" ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب ونقصان، شک واشتباہ، ظن وتخمین، تدریج وترقی اور تعارض واختلاف سے پاک ہے، اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی اور قطعی ہے، مشاہد اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے۔

متقین کے لیے ہدایت ہے

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" "ہدایت ہے متقین کے لیے" یہ ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے اندر خوف خدا ہے اور جس کے اندر اپنے انجام کی فکر ہے، یہاں "مُتَّقِيْنَ" کا معنی یہ نہیں کہ خالی زاہدوں کے لیے ہدایت ہے، عابدوں کے لیے ہدایت ہے "مُتَّقِيْنَ" کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو ہمیشہ عابد وزاہد لوگ ذہن میں آتے ہیں، بڑے متقی لوگ ہیں، فلاں جگہ بڑے متقی لوگ رہتے ہیں، فلاں خانقاہ میں متقی ہیں، فلاں مدرسے میں متقین ہیں، تو ہمارے ذہن میں متقین کے ساتھ عابدوں کا تصور آتا ہے، متقین اور عباد، زہاد دونوں بالکل مرادف بن گئے ہیں لیکن "مُتَّقِيْنَ" وہ نہیں، "مُتَّقِيْنَ" اس سے اونچا مقام ہے، جسکے اندر احتیاط ہو، جس کے اندر بہت ہی تیز شعور ہو، حساسیت ہو کہ یہ گناہ کی بات ہے، اس

سے بچنا چاہیے، یہ مشتبہ چیز ہے اس کو نہیں کرنا چاہیے، اس کو "مُتَّقِیْنَ" کہتے ہیں۔

تو "مُتَّقِیْنَ" سے مراد "عابدین، زاہدین" نہیں، بلکہ جن کے اندر یہ احساس ہے کہ ہمارے لیے فلاں چیز مضر ہے، ہمارے لیے فلاں چیز مہلک ہے، ہمارے لیے فلاں چیز بڑی خطرناک ہے، جن کے اندر یہ احساس ہو، خوف کا یہ شعور ہو اور وہ بہت ہی امان چاہتے ہوں تو ان کے لیے "مُتَّقِیْنَ" کا لفظ کہا گیا۔

"قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اس کے خوف پر ہے جس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اور جس کے لیے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اس میں درحقیقت دین کا مادہ نہیں ہے اور وہ گویا دین کے حاسہ سے محروم ہے۔ جب کسی کا کوئی حاسہ کم ہو تو اس کے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کرسکتا۔ تو قرآن نے اپنے کو ان لوگوں کے لیے ہدایت اور مفید بتایا ہے جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہے"۔

ایمان بالغیب کا مطالبہ

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" "ہدایت ہے متقین کے لیے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں"، پہلی چیز تو یہ ہے کہ جس کا تعلق عقائد سے ہے اور صفات الٰہی سے ہے اور ذات الٰہی سے ہے اور دین کے اسرار سے ہے اس کا تعلق تو "غیب"[1] سے ہے۔

پہلے تو عقیدہ کا ذکر کیا "اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" عقیدہ اس میں آ گیا سب، "جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، غیب پر یقین رکھتے ہیں" اب اس کے بعد عمل کا درجہ آیا "وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" "کہ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے وہ خرچ کرتے ہیں" ایمانیات میں سب سے اولین چیز ہے "ایمان بالغیب" اور عملیات میں سب سے اہم چیز ہے "نماز اور زکوٰۃ"، "ہدایت ہے متقین کے لیے جو غیب پر

(۱) غیب اصطلاح میں اس حقیقت کو کہتے ہیں جس کا مجرد حواس یا عقل خالص سے ادراک نہ کیا جا سکے (مذہب و تمدن: ۶۷)

ایمان رکھتے ہیں'' اور غیب پر ایمان رکھے بغیر نہ قرآن مجید سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے نہ انبیاء کے بشارات پر پورا ایمان مکمل ہو سکتا ہے۔

''ایمان بالغیب'' میں یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ شرط نہیں تھا کہ ہر چیز ہمارے سمجھ میں آئے اور ایسے ہی ہر چیز ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو دین کا جو بنیادی حصہ ہے وہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور جو عملی حصہ ہے وہ شہود سے اور جسمانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر دین کے لیے اور خاص طور سے دین اسلام کے لیے سب سے پہلی شرط جو ہے جس کے بغیر آدمی آگے بڑھ ہی نہیں سکتا وہ ''ایمان بالغیب'' ہے یعنی اللہ کی صفات پر ایمان لانا ہوگا، آخرت کے وقوع پر ایمان لانا ہوگا، قسمت اور تقدیر پر اللہ کے ہاتھ میں ہونے پر ایمان لانا ہوگا، نفع و ضرر پر خدا کے مالک ہونے پر ایمان لانا ہوگا۔ یہ سب چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں اور دین کا جو بڑا حصہ ہے یعنی عقائد کا جو بڑا حصہ ہے، مسلمات کا جو حصہ ہے، ایمانیات کا جو حصہ ہے وہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور باقی اس کے بعد پھر عمل ہے، عبادات ہیں، فرائض ہیں، واجبات ہیں، سیرت و معاشرت سب ہیں، لیکن پہلی چیز جو دین میں مطلوب ہے اور شرط ہے وہ ''ایمان بالغیب'' ہے اگر ''ایمان بالغیب'' نہیں ہے تو دین پر ایمان نہیں ہو سکتا، قدم قدم پر وہ چیز آئیں گی کہ جن میں ''ایمان بالغیب'' کی ضرورت ہوگی، اللہ تعالیٰ کا رحیم و رحمان ہونا، اللہ کی ذات و صفات اور یوم آخرت اور اعمال و افعال کا نتیجہ جو آخرت میں نکلنے والا ہے، ان سب چیزوں کے لیے ''ایمان بالغیب'' کی ضرورت ہوگی۔ تو سمجھنا چاہیے کہ دین کا بنیادی جو مطالبہ ہے اور بنیادی شرط ہے وہ ''ایمان بالغیب'' ہے اگر ''ایمان بالغیب'' نہیں ہے تو بالکل وہ دین نہیں، کوئی ناصحانہ بات ہوئی، موعظت ہوئی، تعلیم و تربیت ہوئی، حکیمانہ بات ہوئی، یہ سب ہو سکتا ہے لیکن دین نہیں ہو سکتا، دین کے لیے تو ''ایمان بالغیب'' ضروری ہے، اللہ کیسا؟ اللہ کی ذات اللہ کی صفات اور آسمانوں کا پورا نظام اور پھر یہ نظام قدرت اور پھر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اسکے علاوہ وہ قادر مطلق ہے حکیم برحق ہے اور وہ رحمٰن و رحیم ہے اور اس کے ساتھ عزیز و جبار ہے، منتقم ہے، یہ ساری چیزیں ''ایمان بالغیب'' سے تعلق رکھتی ہیں، اگر ''ایمان بالغیب نہیں'' تو دین میں تو وہ آدمی داخل ہی نہیں ہوا، قدم ہی نہیں رکھا اس نے دین کی عمارت میں، اس لیے کہ

قرآن مجید ''ایمان بالغیب'' پر بہت زور دیتا ہے، اس کو ہدایت اور دین سے فائدہ حاصل کرنے کی بنیادی شرط، ہدایت یافتہ لوگوں کا شعار اور ارباب صلاح وتقوی کی اہم پہچان قرار دیتا ہے اور بہت زور اور قوت کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ ''اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' اور جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اسلام (جو تمام انبیاء کا دین ہے) پر ایمان لاتے ہیں۔

اب اس کے بعد دوسرا درجہ نماز اور زکوۃ کا ہے، فرمایا ''وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'' اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں وہ خرچ کرتے ہیں۔

ایمانیات نبوی کا اشتراک

''وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ'' ''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں''

اس میں جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو اس میں بھی پوری ایک مساحت ہے، اس کا پورا سلسلہ ہے جو تعلیمات نبوی اور حضور پاک (ﷺ) پر جو قرآن نازل ہوا اور جو احکام نازل ہوئے اس پر ایمان سے لے کر رسول آخر کے ایمان تک، دین اول کے ایمان سے لے کر دین آخر کے ایمان تک مسلسل جاری ہے اور اس سب پر ایمان لانا ضروری ہے، مسلمانوں کے لیے یہ بات بالکل کافی نہیں ہے اور نہ اسلام کے تحقق کے لیے، نہ اسلام کی صحت کے لیے کہ جو حضور پاک (ﷺ) پہ نازل ہوا، ہم قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں باقی تمام پیغمبروں کو نہ ہم جانتے ہیں، نہ ماننا ضروری ہے، وہ نہیں، بلکہ پہلے ان سب کا ماننا ضروری ہے، قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے اور ان پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے اور ان کی شان بیان کی گئی ہے اور پھر چونکہ ایمانیات نبوی میں ایک اشتراک ہے، اس لیے جب کسی چیز میں اشتراک ہو تو فیصلہ میں بھی اشتراک ہوتا ہے، پورے اجزا کا ماننا ضروری ہوتا ہے۔

عقیدۂ آخرت کا اہتمام

"وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ" "اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" قرآن کی ترغیب و ترہیب اور وعظ و اصلاح کی ایک اہم بنیاد آخرت ہے، وہ آخرت سے ڈراتا ہے، آخرت کے ثواب کی امید دلاتا ہے اور اس اہم سفر کی تمام ضروری معلومات اور اس کی پیش آنے والی منزلوں کی صحیح اطلاع اور ضروری ھدایات دیتا ہے، اس لیے جو لوگ آخرت کے آرزو مند اور معتقد ہیں، وہ قرآن مجید سے کسی حال میں مستغنی نہیں ہو سکتے، لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، یا عقیدۃً منکر نہیں ہیں مگر عملاً ان پر دنیا پرستی اور دنیا غالب ہے اور زندگی کے تمام مسائل میں ان کا نقطۂ نظر بالکل مادی ہے، ان کے لیے قرآن بے اثر، یا کم اثر ہے، مادیت کا غلبہ ان میں ایسی بلادت اور غباوت پیدا کر دیتا ہے کہ غیر مادی چیزوں کے بارے میں ان کا دماغ کام ہی نہیں کر سکتا" اس لیے فرمایا "وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ" "اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں" یہ پورے دین کی تعریف آ گئی۔

"أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" "وہی لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، جنہیں اللہ کی طرف سے ہدایت نازل ہوئی" وہ نبیؐ کے ذریعہ سے ظاہر ہوئی، اس پر وہ قائم ہیں، "وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" "اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں" یہ "فلاح" کا لفظ بہت جامع اور وسیع ہے، جب اللہ تعالی فرمایا "مفلح" تو اس کے اندر دین و دنیا ہر طرح کی فلاح آ جاتی ہے اور اصل جہنم سے نجات اور جنت کا استحقاق۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از:- درس سورۂ بقرہ (غیر مطبوعہ آیات) مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی ۱۶، اور ۱۵۷، اور ۱۶۳۔ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ۹۲۔۹۳۔

نماز زکوۃ اور آخرت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿طٰسٓ تِلْکَ آیٰتُ الْقُرْآنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ☆ ھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْآخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ☆ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَۃِ زَیَّنَّا لَھُمْ اَعْمَالَھُمْ فَھُمْ یَعْمَھُوْنَ☆ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَھُمْ سُوْءُ الْعَذَابِ وَھُمْ فِی الْآخِرَۃِ ھُمُ الْأَخْسَرُوْنَ﴾(سورۃ النمل: ۱-۵)

(ترجمہ-"یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں اور کھلی ہوئی کتاب کی ہدایت ہے اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے، وہ لوگ جو کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ہم نے ان کے اعمال کو مزین کردیا ہے ان کے لیے، پس وہ بھٹکتے پھرتے ہیں")

علم وعمل کے محرک پہلو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ﴿طٰسٓ تِلْکَ آیَاتُ الْقُرْآنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ﴾ "یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں اور کھلی ہوئی کتاب کی" "ھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ" "ہدایت ہے اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے"۔ "ہدایت" اور "بشارت" یہ دونوں علم وعمل کے ایسے

محرک پہلو ہیں جن سے جامعیت پیدا ہوتی ہے۔ "ہدایت" تو یہ کہ بتایا جائے کہ یہ راستہ ہے اس پر چلو، لیکن اس راستہ پر آدمی تب چلتا ہے جب اس کے فوائد سامنے ہوں، عام زندگی میں بھی یہی ہے کہ اگر آپ کسی سے کہدیں (اور آپ پر اس کا اعتبار نہ ہو، تجربہ نہ ہو، آپ کا معتقد نہ ہو) کہ دیکھئے فلاں جگہ یہ راستہ جاتا ہے، تو آدمی ڈرے گا کہ کہیں غلط راستہ تو نہیں بتلایا، کوئی اور مقصد تو نہیں.... اس لیے اس کے ساتھ یہ لفظ "بشارت" زائد نہیں ہے، "ہدایت" کا لفظ کافی تھا، لیکن "ہدایت" کے ساتھ جب "بشارت" شامل ہو جائے، تو اس میں ایک محرک قوی، محرکِ عملی اور محرکِ ذہنی محرکِ وجدانی دونوں پیدا ہو جاتے ہیں، "هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ" "ہدایت اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے"!

اقامت صلوٰۃ

"يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ" "وہ لوگ جو کہ نماز کو قائم کرتے ہیں" "نماز کو پڑھتے ہیں نہیں کہا یہاں پر نماز کو پڑھنا الگ چیز ہے، پھر عربی میں "صَلّٰى، يُصَلِّى" کے لفظ آتے ہیں سادے "نماز پڑھتے ہیں" نہیں کہا گیا، اگر کہنا ہوتا کہ نماز پڑھتے ہیں تو "يُصَلُّوْنَ" کہتے، لیکن "يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ" کہا "اِقَامَةِ الصَّلٰوةَ" میں "صلوٰۃ" کے فقہی احکام بھی آجاتے ہیں اور اس کے روحانی اثرات بھی آجاتے ہیں، اس کے اندر نماز کے تمام حقوق ومطالبات، اس کے اجزاء، اس کے نتائج، اس کے آداب اور وسائل اور صحیح طریقہ پر نماز پڑھنا بھی آجاتا ہے اور اس کا حق ادا کرنے کا یعنی معیار جو ہے نماز کا کہ اس معیار سے نماز پڑھی جائے، سنت کے مطابق پڑھی جائے، عمل ہو اس حدیث پر "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ"[1] (اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) یا "قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" (سورۂ بقرہ: ۲۳۸) (اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزوں کی طرح کھڑے رہا کرو) ان سب کو "اقامت" کا لفظ حاوی ہے "يقيمون الصلوة" صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں "اقامت" سے بڑھ کر کوئی لفظ ہو نہیں سکتا، جب قائم کرنا کسی چیز کے لیے

(۱) بخاری شریف

کہا جائے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسی قد وقامت کے ساتھ، اسی خصوصیات کے ساتھ قائم کیا جائے'' اور اقامت'' کے اندر قنوت بھی آجاتا ہے ''قُومُوا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ'' اور ہیئت بھی آجاتی ہے، توجہ اور انابت بھی آجاتی ہے خشوع بھی آجاتا ہے اور پھر اس میں ''صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' یعنی اتباع سنت بھی آجاتا ہے تو ایک مفرد لفظ سے یہ ساری چیزیں اس میں شامل ہو گئیں کہ نماز ہو، اس میں خشوع ہو اور نماز پڑھنے والا یقین کرے کہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، ''کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ''[1] والا مضمون کہ'' ایسی نماز پڑھنی چاہیے کہ جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھتے ہو تو یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور یہی وہ نماز ہے جو ہر مسلمان سے مطلوب ہے اور نجات کی شرط اور ایمان کی محافظ ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت وتقویٰ کی بنیادی شرط کے طور پر بیان کیا ہے۔[2]

ان سب کو ایک مفرد لفظ اگر عربی کا (یعنی عربی زبان سے مناسبت ہونے کی بنا پر عرض کر رہے ہیں) کوئی لفظ ان سب کو حاوی ہو سکتا ہے اور ان سب کو جامع ہو سکتا ہے، تو وہ ''''اقامت'' کا لفظ ہے ''اقام'' سے (یہ اردو میں جو عربی کے لفظ آ گئے ہیں، ان کی وجہ سے ذرا سا مفہوم میں تنگی پیدا ہو گئی ہے یا کچھ چیزیں اور شامل ہو گئی ہیں، جب تک عربی الفاظ کی روح اور عربی الفاظ کی طاقت اور ان کا درجہ نہ معلوم ہو، آدمی سمجھ نہیں سکتا ہے) ''اقامت'' کا لفظ عربی میں بہت ہی وسیع اور بہت سی ذمہ داری کو چاہنے والا اور حقوق کے ادا کرنے کا ضامن اور اس کو بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کرنے کے معنی میں ہے، ''اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ'' ''جو کہ نماز کو قائم کرتے ہیں''

زکوٰۃ کی اہمیت

''وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ'' ''اور'' زکوٰۃ'' دیتے ہیں'' اللہ تعالیٰ نے نماز کے قیام اور زکوٰۃ

---

(۱) متفق علیہ۔ (۲) سورۂ بقرہ: ۱-۳ سورۂ اعلیٰ: ۱۴-۱۵۔
نیز تفصیل کے لیے مصنف کی کتاب'' ارکان اربعہ: نماز، ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

کی دائیگی کو اسلام کی صحت و قبولیت اور اس کے احکام کی بجا آوری کی علامت قرار دیا ہے، قرآن مجید میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ۸۲ رمقامات پر آیا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے اوصاف جہاں جہاں بیان کئے گئے ہیں، وہاں بھی ہمیشہ "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکوٰۃَ" آیا ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ محض کوئی ٹیکس یا جرمانہ یا سرکاری مطالبہ نہیں ہے وہ نماز، روزے کی طرح ایک مستقل عبادت ہے اور خدا سے قرب حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور اخلاقی اصلاح اور تربیت کا ایک الٰہی نظام ہے، نیز ہمدردی و غمخواری اور حسن سلوک کی کم سے کم حد ہے، یہ ایسا فریضہ ہے جس سے روگردانی اور فرار اللہ تعالیٰ کو کسی صورت میں منظور نہیں اسلامی شریعت نے نہایت جزم اور سختی کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا ہے اور اس کو اسلامی شریعت مسلمانوں کا شعار اور دین کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے"۔

زکوٰۃ کی تشریعی حکمت، اموال و نفوس کا تزکیہ و تطہیر، رضائے خداوندی کا حصول، رحمت الٰہی کا نزول، مساکین و فقراء کے ساتھ مؤاسات و غمخواری، ضرورت مندوں کی حاجت برآری اور حرص و بخل اور اکتناز (دولت کی ذخیرہ اندوزی) سے حفاظت ہے[1]۔

آخرت پر ایمان کی شرط

"وَبِالْآخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" "اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں" جہاں تک فرائض کا تعلق ہے، اس میں "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" کو لیا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو زندگی میں تو...... یہ کہ ایک کا تعلق جسم سے، دماغ سے، قلب سے، ارادوں سے اور قلب کی کیفیات سے ہے، وہ "اِقَامَتِ صَلٰوۃ" ہے اور پھر ایک بہت بڑی آزمائش جو مال کی محبت کی ہے اس کے لیے "وَیُؤْتُوْنَ الزَّکوٰۃَ" "اور زکوٰۃ دیتے ہیں" اور پھر اس کے بعد تیسری چیز جو اس کے لیے گویا ایک تکملہ ہے، وہ ہے "وھم بالآخرۃ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" اور وہ آخرت پر

(۱) زکوٰۃ کا پورا نظام اور روح سمجھنے کے لیے "ارکان اربعہ" میں زکوٰۃ کا باب دیکھنا چاہیے۔ (مرتب)

یقین رکھتے ہیں۔ "صلوۃ" اور "زکوۃ" ہو، لیکن "اگر آخرت پر" یقین نہ ہو تو پھر بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں، بہت سی چیزوں میں آدمی کوتاہی کرتا ہے اور کوئی راستہ نکال لیتا ہے، بہانے کرتا ہے اور تاویل کر لیتا ہے اور تساہل سے کام لیتا ہے، لیکن جب "آخرت پر یقین" بھی ہو اس کے ساتھ، تو وہ سب چیزیں آجاتی ہیں، پوری شریعت آجاتی ہے، پھر آدمی یہ پوچھتا ہے کہ آخرت میں کیا چیز مفید ہے، کیا چیز مضر ہے؟ وہاں پر سنت کی ضرورت ہوتی ہے، حضور ﷺ نے ان چیزوں کو فرض بتایا ہے، ان چیزوں کو حرام بتایا ہے، ان چیزوں کو آخرت میں مفید ہونا بتلایا ہے، اسی لیے جس وقت اہل جنت جنت کے دروازے پر پہنچیں گے، ایسا جامع اللہ تعالیٰ نے ان کا بیان نقل کیا ہے، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ" (۱) "اللہ ہی نے ہم کو یہاں تک پہنچایا ہے، ہم خود پہنچنے والے نہیں تھے اگر اللہ ہم کو یہاں نہ پہنچاتا" اتنا کافی تھا، پھر اس کے بعد اس کا تکملہ یہ ہے، ﴿لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ یہ براہ راست بلا واسطہ نہیں ہو سکتا تھا، کہ اپنی عقل سے، فہم سے، مطالعہ سے، ذہانت سے، ہم آخرت تک پہنچ جاتے، یا ادیان کے مطالعہ سے، "لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" اس میں پیغمبروں کا واسطہ ہے، اصل میں جنت تک پہنچانے کا صحیح راستہ بتانے والے وہ ہیں اور ضامن ہیں وہ یہاں بھی شرط لگائی "وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"۔

اب "اقامتِ صلوٰۃ" ہے اور "ایتاءِ زکوٰۃ" ہے عملاً یعنی لوگ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آدمی نماز قضا نہیں کرتا ہے، لوگ دیکھ رہے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، لیکن اس کے دل میں آخرت کا خوف نہیں ہے اور آخرت کا استحضار نہیں ہے، تو اس سے بہت سی وہ غلطیاں ہوں گی جو "اقامت صلوٰۃ" اور "ایتاءِ زکوٰۃ" کے ساتھ ہو سکتی ہیں اور مثلاً بہت غصہ آجانا، اشتعال میں پڑ جانا، ظلم کرنا، کسی کا حق دبا لینا، یا غرور پیدا ہو جانا، یہ وہ چیزیں ہیں جو "اقامت صلوٰۃ" اور "ایتاءِ زکوٰۃ" کے ساتھ بھی شامل ہو سکتی ہیں اور لوگوں کی زندگیوں میں اگر غور کیا جائے تو اکثر خرابیوں اور کمزوریوں کی وجہ ہوتی ہے آخرت پر ایمان کی کمزوری، آخرت پر یقین کی کمزوری اور آخرت کے استحضار کی کمزوری، جن لوگوں کا استحضار تھا آخرت پر، خلفاء

راشدین تھے، صحابہ کرامؓ تھے، تو ان کو کسی وعظ و نصیحت، زجر و توبیخ کی بالکل ضرورت نہیں تھی، سب چیزوں میں آخرت ان کے پیش نظر رہتی تھی، یہ چیز آخرت میں کیا رنگ لائے گی، یہ آخرت میں کیا نتیجہ لائے گی، بس وہ چیز کافی تھی۔

یہ دراصل اس عقیدہ کی خاصیت ہے، یہ قدرتی طور پر اپنے ماننے والوں میں اس زندگی کی بے وقعتی، خواہشات پر قابو اور مردانگی و حق پرستی کے یہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی فتوحات و ترقیات اور اس کی عام ترویج و اشاعت اسی ایمان و عقیدہ کی مرہونِ منت ہے۔

نفسیاتی کمزوری کی تشخیص

" اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالآخِرَۃِ زَیَّنَّا لَھُمْ اَعْمَالَھُمْ فَھُمْ یَعْمَھُوْنَ " جب آخرت کا ذکر آیا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ فرما دیتا ہے کہ " جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال کو مزین کر دیا ہے، ان کے لیے " فَھُمْ یَعْمَھُوْنَ " پس وہ بھٹکتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں "۔

یہ آخرت کے عدم ایمان کے ساتھ " تزئین اعمال " یہ ایک ایسی نفسیاتی کمزوری، نفسیاتی مرض کی تشخیص ہے اور ایک حقیقت واقعہ کی کہ جو اعجاز قرآنی ہی کا نتیجہ ہے کہ " جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، ان کو اپنے اعمال دنیا میں بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں " یہ کوٹھی بنائی، اب ان سے پوچھئے یہ آخرت میں کیا کام آئے گی؟ کچھ اس کا فائدہ ہے؟ کوئی فائدہ نہیں دے گی، اتنا سرمایہ جمع کر لیا، بینک میں اتنا روپیہ جمع ہو گیا، یہ عہدہ حاصل ہو گیا، یہ ایک منسٹری مل گئی یہ اعزاز ہو گیا، ایسی وہ چیزیں کہ آخرت میں بالکل جن کی کوئی قیمت نہیں ہے، وہ " مزین " ان کو نظر آتی ہیں، لیکن جس کے سامنے آخرت ہے، وہ آخرت کے پیمانے سے تولتا ہے، ناپتا ہے اس چیز کو کہ یہ جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی ہے آخرت میں اس کی کیا قیمت ہو گی؟ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک موقع دیا اب ایثار کرنے کا، ایک موقع دیا قربانی کرنے کا، ایک موقع دیا حج و عمرہ کرنے کا، ایک موقع دیا بذل اموال کا،

سخاوت کا، فقیروں کو دینے کا، تو آدمی خوش ہوگا کہ یہ آخرت میں کام آنے والی ہے، لیکن جن کا آخرت پر یقین نہیں ہے، وہ مظاہر کے فریفتہ ہوتے ہیں، اسی پر بہت پھولے نہیں سماتے، بڑے خوش ہوتے ہیں، یہ ہم نے خرید لیا، اتنی قیمتی چیز خرید لی، یہ کوٹھی خرید لی، ایک اتنا بڑا اتھری اسٹار ہوٹل بنالیا اور ہم نے وہاں کا سفر کیا اور وہاں یہ انعام ہم کو دیا گیا، ہمارا وہاں یہ ریسپشن Reception ہوا، استقبالیہ ہم کو دیا گیا، یہ سب چیزیں ان لوگوں کی نظر میں وقیع ہوتی ہیں آخرت پر جن کی نظر نہیں ہوتی ہے اور جن کی آخرت پر نظر ہے، وہ تو اپنے اندر خود دیکھتے ہیں اور دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ آخرت میں یہ بات کتنی کام آنے والی ہے ؟ اب اگر انہوں نے کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا، کسی ایسے مریض کو جس کا علاج ناممکن ہو رہا تھا اور قدرت نہیں رکھتا تھا، خود اپنی طرف سے اس کے علاج کا سامان کر دیا اور چھپ کر کوئی کام ایسا کیا، کسی کار خیر میں حصہ لیا، تو وہ اس لحاظ سے خوش ہوں گے کہ یہ آخرت میں کام آنے والی چیز ہے۔

اس لیے ''صلوٰۃ'' اور ''زکوٰۃ'' کے ساتھ آخرت کے یقین کا تذکرہ نہایت مناسب موقع اور فطرت انسانی کے مطابق اور شریعت کا جو مطالبہ ہے اور جو معیار ہے شریعت کا، تقویٰ کا، خوف خدا کا، احتیاط کا، ان سب کے ساتھ یہ ضروری چیز ہے۔

" زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ " ... ''ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیئے'' کرنے والا تو اللہ ہی ہے، کوئی کتنا ہی کسی چیز کا ارادہ کرے، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کی اجازت نہ دے یعنی چھوٹ نہ دے اور ڈھیل نہ دے، اس وقت تک وہ ہوتی ہی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی کہ خالق حقیقی وہی ہے، جیسے وہ اجسام کا خالق ہے، ویسے ہی وہ ارادوں کا، ارادے بھی بغیر اس کی اجازت کے نہیں ذہن میں آسکتے، تو ان کے لیے ان کے اعمال ''مزین'' ہیں،

" فَهُمْ يَعْمَهُونَ " تو وہ اس میں بھٹکے پھر رہے ہیں، بالکل اندھے بنے ہوئے ہیں، چیزوں کو اسی پیمانے سے تولتے اور ناپتے ہیں۔

دیکھئے اس وقت کا یہ جو تمدن ہے، یہ " زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ " کا بہترین مظہر ہے،

آپ امریکہ سے لے کر انڈونیشیا تک چلے جائیں، ہر جگہ آپ کو ایک بڑا طبقہ ملے گا، جس کو اپنی یہ شان وشوکت اور وہ اختیارات اور اعزاز واستقبالات اور کمبریاں، ممبر شپ، فلاں پارلیامنٹ کی، اسمبلی کی، کونسل کی اور جو کچھ بھی ہوں، وہ سب ان کے نزدیک بڑی ترقی، بڑی عزت کا معیار ہے "زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ" اس کے لیے "تزئین" عربی کا بہترین اور مناسب ترین لفظ ہے۔

"أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ" "وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں سخت نقصان میں رہنے والے ہیں یعنی وہ اپنے کو یہاں کامیاب سمجھ رہے ہیں اور آخرت میں وہ سب سے ناکام ثابت ہوں گے۔ (۱)

---

(۱) درس قرآن-سورۂ نمل: ۱-۵ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات ذیل بالترتیب حسب کتب سے اخذ وتلخیص ہیں: ☆ ارکان اربعہ: ۱۹۲-۱۹۳ ☆ ایضاً: ۲۰۰-۲۰۱ ☆ ایضاً: ۱۵۰-۱۵۱ ☆ مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۵۷ ☆ تحفۂ دین ودانش (تلخیص): ۹۶-۹۷ ☆ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں: ۹۲ ☆ معرکۂ ایمان ومادیت: ۹۹

حج کے اہم مقاصد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ (حج: ۲۶)

(اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانہ بنایا، بیت اللہ کی جگہ کا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کے لیے)

موزوں ترین لفظ "بَوَّأْنَا"

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ﴾ "اور جب ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانہ بنایا بیت اللہ کی جگہ کا"

ایک ایک آیت نہیں ایک ایک لفظ سمندر ہے، معانی کا، موعظت کا اور تفکر کی دعوت کا، ....کہا کرتے ہیں کہ لفظوں کے مزاج ہوتے ہیں اور لفظوں کے حدود ہوتے ہیں اور لفظوں کی طاقت ہوتی ہے اور یہ کسی زبان کے سمجھنے والے، اس کے ترجمے کرنے والے نہیں، جو زبان کے مزاج داں ہوتے ہیں، ایک زبان دانی ہے اور ایک مزاج دانی ہے، اردو میں بھی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک مطلب کے لیے، ایک مقصد کے لیے چار، دس، بیس، لفظ ہو سکتے ہیں، لیکن اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس کا اندازہ ہوتا ہے، جب اس کے ماحول پر

نظر ڈالی جائے، جب اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، اس کی نوعیت پر نظر ڈالی جائے، تقابل کیا جائے، اب بھی ہے (ہم تو عرب نہیں ہیں، عربی اللسان نہیں ہیں، یہیں اسی گاؤں، دیہات کے رہنے والے ہیں) کہ کسی ادیب سے کہا جائے کہ یہ کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا، جگہ بتائی گئی، تو دس لفظ، چار پانچ تو ہم ہی بول سکتے ہیں، "اِخْتَرْنَا" اور "فَضَّلْنَا" "مَكَّنَّا" سب، لیکن "بَوَّأْنَا" کا جو لفظ ہے، یہ لفظ اس مقام اور محل کے لیے بہترین موزوں ترین لفظ ہے، "تَبْوِيَة" کے لیے کئی چیزوں کی شرط ہے، یہ کہ وہ جگہ جہاں آسانی سے آدمی پہنچ سکے، "مُبَوَّأ صِدْقٍ"۔ "مُبَوَّأ" اس جگہ کو کہیں گے کہ جہاں پہنچنا آسان ہو، یہ نہیں کہ ٹکٹ لینا پڑے، کچھ خوشامدیں کرنا پڑیں اور بڑی مشقت سے آدمی وہاں پہنچے۔ "بوّانا" "اس کو تیار کر دیا" یعنی اس کے اندر تمکین بھی ہے، اس کے اندر استقرار بھی ہے، اس کے اندر امن بھی ہے، اس کے اندر موزونیت بھی ہے اور اس کے اندر دوام بھی ہے، اس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا (تفسیر میں بھی یہاں تک کہ کشاف جو علامہ زمخشریؒ کی تفسیر ہے اور وہ عربی کے بڑے مزاج داں تھے، وہ بھی حق نہیں ادا کر سکے ہوں گے اس کا)

"مُبَوَّأ" کا مصداق وہ جگہ ہوگی، جہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو، جانے میں، جہاں کوئی مزاحمت نہ ہو، آسانی سے پہنچ جائے، (سفر کی طوالت یا خرچ یہ چیزیں الگ ہیں) یہ نہیں کہ وہاں پر کسی کا پہرا ہو، یہاں کیوں آئے تم؟ یہاں نہیں آسکتے، ٹکٹ لو، پہلے یہ کام کرو، وہ کام کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ جگہ آرام دہ ہو یعنی اس کے اندر کوئی نشیب و فراز زیادہ نہ ہو پہاڑیاں نہ ہوں، کانٹے نہ ہوں، یہ بھی "بَوَّأْنَا" میں آتا ہے، یا نخلستان نہ ہو، مکانوں کا کوئی بہت بڑا جھنڈ یا بڑا محلہ نہ ہو، کہ اس سے بچے، اس سے نکلے، یہاں پردہ، یہاں اجازت، یہ سب کچھ نہیں، بلکہ اٹھا آدمی وہاں پہنچا اب پہنچنے میں جو کچھ بھی ہو "بِشِقِّ الأَنْفُسِ" لیکن جب وہاں پہنچا اب جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جگہ ہے یہ۔

ٹھکانے کا سب سے بڑا مقصد

"وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ" "ہم نے جب کہ ٹھکانہ دیا ابراہیم علیہ السلام

کے لیے، بیت اللہ کی جگہ کا" "اَلْبَیْتُ" خانہ کعبہ کی جگہ کا ("اَلْبَیْتُ" جب "بیت" کے ساتھ "ال" آ جائے تو پھر اس سے مراد کعبہ ہی ہوتا ہے) کہ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ "اَنْ لَاتُشْرِکْ بِیْ شَیْئاً" کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو، دیکھئے "شَیْئاً" میں بھی خدا کے ساتھ جو چیزیں شریک کی جاتی ہیں، وہ ہر صنف کی چیزیں ہیں، یعنی ان میں انسان بھی ہیں، جیسے ملوک ہیں، یا مقدس لوگ ہیں، ان میں حیوانات بھی ہیں، گائے بھی ہیں، ان میں جگہیں بھی ہیں (یہ جگہ جیسے اجودھیا کی بابری مسجد یہاں انہوں نے مسجد گرائی ہے) اسکے اندر تخیلات بھی ہیں اور اس کے اندر اعضائے انسانی بھی ہیں، ہم نے دیکھا ہے گجرات وغیرہ کے مندروں میں، کہ بعض اعضائے انسانی کی پرستش ہوتی ہے، تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

"شَیْئاً" میں جو تنکیر ہے، اس میں جو عمومیت ہے، وہ کسی چیز میں نہیں ہے، وہ لفظ آخری لفظ جس کا بالکل اطلاق ہے، اطلاق محض، وہ "شَیْ" کا لفظ ہے، کہ "کسی چیز کو" اور یہ عالم الغیب ہی کہہ سکتا تھا، کہ مذاہب میں کتنے قسم کے معبود گڑھے گئے ہیں، کتنے قسم کے معبود مانے گئے ہیں اور ان کی کتنی اصناف ہیں اور ان کے کتنے طبقات ہیں اور ان کی کتنی صورتیں ہیں اور کن کن انواع سے متعلق ہیں، ایران کا یہ جو ساسانی، یہ زردشت، ان کے یہاں آگ معبود تھی، اب وہ اگر کہا جاتا ایسا لفظ جو صرف انسانوں پر یا حیوانات پر صادق آتا ہے، تو آگ نکل جاتی، لیکن "شَیْئاً" میں وہ بھی آ رہی ہیں اور اسی طریقے سے کہیں بعض جانور ہے، بعض حشرات الارض ہیں، کہیں بعض دریا ہیں، اب یہاں دریا ہے، ہندوستان میں گنگا ہے، تو اگر ایسی چیز ہوتی جس میں دریا نہ آ سکتے تو کہتے کہ اس میں تو اس سے نہیں روکا گیا، دریا اس میں کہاں داخل ہے، لیکن "شَیْئاً" کے اندر سب آ گیا۔

تذکرہ موحد اکبر کا

اب یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے اور چونکہ ذکر ہے موحد اکبر کا، اس وقت جو دنیا کے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سارے مذاہب کی تاریخ میں اور ساری دنیا کے صنم پرستی کے) سب سے

(بڑے کا لفظ تو مناسب نہیں) جنگ کرنے والے تاریخ میں جن کا نام محفوظ رہ گیا ہے، وہ سیدنا ابراہیمؑ ہیں، جو آزر کے گھر پیدا ہوئے (آپ نے ان کا واقعہ بھی پڑھا ہوگا کہ) آگ ان کے لیے تیار کی گئی، اس میں ڈالے گئے، دنیا میں اصل میں صحیح تقسیم یہ دو چیزیں ہیں ''ابراہیمیت، برہمیت'' ایک طرف ابراہیمیت ہے، ایک طرف برہمیت ہے، یہ سب برہمیت ہے، ہندو مذہب ہو، یہاں تک کہ عیسائیت میں بھی برہمیت ہے کہ وہ برہما کے نام کے نہیں، لیکن اصل ایک انسان کی تقدیس، اس کو ابن اللہ ماننا، یہ برہمیت ہی کا امتیاز ہے، اس کی دعوت ہے۔

اللہ تعالیٰ موحد اکبر کا ذکر فرماتا ہے، کہ جب یہ مکان ہم نے اس مکان کو اس لیے تجویز کیا اور اس کو اس لیے آسان بنایا، ہر ایک کا پہنچنا وہاں ممکن ہوا، اب وہ تمام دنیا کا مرکز بنا کہ ''اَنْ لاَ تُشْرِکْ بِیْ شَیْئاً'' میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔

''وَ طَهِّرْ بَیْتِیَ'' اور میرے گھر کو پاک کرو اور پاک رکھو، ''لِلطَّائِفِیْنَ وَالْقَائِمِیْنَ'' طواف کرنے والوں کے لیے، قیام کرنے والوں کے لیے، جو وہاں نماز پڑھیں ''وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ'' اور جو رکوع میں ہوں اور جو سجود میں ہوں، اس گھر کو اس کا مرکز بنایا گیا۔ یہاں پر ''طہارت'' میں دونوں چیزیں ہیں، کوئی گندگی نہ آنے پائے جس کا تعلق نجاستوں سے ہے، اجسام سے اور اجرام سے اور کوئی غلط عقیدہ نہ آنے پائے، کسی غلط عقیدہ کی فرماں روائی نہ ہونے پائے، یہ سب گندگی میں شامل ہے۔

حج کے اہم مقاصد

میرے محدود علم و مطالعہ میں حج کے مقاصد و فوائد پر حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے جامع کسی نے نہیں لکھا، انہوں نے دو باتیں بڑی کام کی کہی ہیں، حج کی فرضیت اور حج کو دین کا رکن بنانے میں دو چیزیں بڑی بنیادی ہیں اور بڑی امتیازی ہیں اور اس کا عالمی فائدہ ہے، ایک تو یہ کہ ملت ابراہیمؑ سے اس امت کا تعلق باقی رہے، دین ابراہیمؑ سے ملت ابراہیمؑ سے اس کا تعلق قیامت تک باقی رہے اور یہ بڑی ضروری چیز ہے۔

ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب اپنے مؤسس اول سے، داعی اول سے تعلق ٹوٹ گیا، تو اس کی روح نکل گئی، عیسائیت کا یہی معاملہ ہوا، یہ عیسائیت جس کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور جو دنیا کے متمدن ترین اور ترقی یافتہ خطوں میں حکومت کر چکی ہے، بحیثیت مذہب کے بھی اور بحیثیت اپنے علمبرداروں کے بھی، اس عیسائیت کا یہ حال ہے کہ نصف صدی کی مدت کے اندر بھی، یہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکی، اب کتابیں نکل رہی ہیں، ابھی حال ہی میں ERNEST DE BENSEN کی کتاب جس کا نام ہے ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY شائع ہوئی ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے۔

''موجودہ عیسائیت کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ وہ عیسائیت نہیں، جس کی دعوت اور اشاعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی، یہ عیسائیت سینٹ پال کی بنائی ہوئی ہے''[1] تو موجودہ مسیحیت کو حضرت مسیحؑ سے کوئی تعلق ہی نہیں، یہ تو سینٹ پال کی وضع کی ہوئی ہے، ساری کی ساری یہ مسیحیت سینٹ پال کی ہے، اس میں ولدیت مسیح، ابنیت مسیح کا، صلیب مقدس کا عقیدہ جو ہے سب کچھ یہ ''سینٹ پال'' نے کیا تھا، وہ رومی تھا، رومی الاصل تھا اور اس کا ذہن مشرکانہ خیالات سے اور بت پرستی سے اور انسانی تقدیس سے پاک نہیں ہوا تھا، اس نے ایک سازش کی بہت بڑی، دنیا میں مذہبی سطح پر، انقلابی سطح پر کم سازشیں اتنی کامیاب ہوئی ہوں گی، جتنی سینٹ پال کی سازش کامیاب ہوئی، آج مسیحیت خالص سینٹ پال کی مسیحیت ہے۔

تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک نکتہ تو یہ لکھا ہے کہ حج کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ یہ ملت حضرت ابراہیمؑ سے مربوط رہے، جو اس دین کے بانی ہیں، "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" جب قرآن کہتا ہے تو ہم کیا کہیں، وہ کہتا ہے کہ "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هٰذَا" تمہارا نام مسلم انہوں نے رکھا ہے اور یہ ملت ابراہیم ہے، پھر اس کے مجدد اور اس کے دنیا میں پھیلانے والے اور کامیاب بنانے والے، اس کی

(1) 'ISLAM OR TRUE CRISTIANITY':P.128 بحوالہ خلفاء اربعہ، ص/۱۶۔

حفاظت کرنے والے، اس کی تفصیل دینے والے اور اس کو عملی بنانے والے، اس کو کامیاب کرنے والے، وہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں، لیکن قرآن کہتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ اس کے بانی ہیں، یعنی توحید کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کے بعد سب سے بلند اور طاقتور صدا حضرت ابراہیمؑ ہی نے بلند کی اور وہ ابھی تک سلسلہ چل رہا ہے، تو شاہ ولی اللہؒ صاحب کہتے ہیں، ایک تو بڑا مقصد یہ ہے کہ ملت ابراہیمی "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" ملت ابراہیم کا، دین ابراہیمؑ سے تعلق باقی رہے اور حضرت ابراہیمؑ کی جگہ، حضرت ابراہیمؑ کے طریقۂ عبادت، حضرت ابراہیمؑ کا جذبۂ توحید، اعلاءِ توحید اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اپنی حد تک حق ادا کرنے کے، جو انہوں نے طریقے اختیار کیے وہ محفوظ رہیں اور مسلمانوں کے سامنے آتے رہیں، اس لیے ایک تو مقصد یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ کا تعلق دین ابراہیمؑ سے باقی رہے، یہ جہاں بھی رہے، ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ سے مربوط و وابستہ رہے، اسی میں اس ملت کے ابراہیمی ومحمدی مزاج اور خمیر کی حفاظت اور ملتوں اور قوموں میں اس کا تشخص وامتیاز ہے، یہ وہیں ہو سکتا ہے، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے منتخب کیا، اپنے دین کی اشاعت وتبلیغ کے لیے بھی اپنے خاندان کے لیے بھی اور اپنے قیام کے لیے بھی۔

دوسرا، انہوں نے لکھا ہے کہ دوسرا مقصد ہے، دین کو تحریف سے بچانا، کہ ایک کوئی ایسا موقع آئے کہ مسلمان دیکھ لے، مسلمانوں کی نماز اس طرح پڑھی جاتی ہے اور وہ دیکھے کہ ہر ملک کا مسلمان اس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اگر ایسا نہ ہو تو ملک ملک، شہر شہر میں قسم قسم کی نمازیں شروع ہو جائیں، فرض کرو، ایک ملک میں نماز کا ایک طریقہ ہوا کہ نہیں بھائی پہلے بیٹھیں اور پھر بیٹھ کر کچھ کھڑے ہوں، رکوع، پھر قیام ہو، اس طرح پڑھیں، پہلے یہ پڑھیں اور یہ اضافہ کریں اور خبر بھی نہ ہو دوسرے شہر والوں کو اس شہر میں کیا ہو رہا ہے، ملک کا ذکر کیا دوسرے شہر والوں کو ایک مرتبہ بدعت پر کلام کیا کسی کتاب (ارکانِ اربعہ) میں، تو اس میں لکھا کہ بدعت اور سنت میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ بدعت لوکل (Local) ہوتی ہے، اور

سنت عالمی (Universal) ہوتی ہے، ایک بدعت ہندوستان کی ہے، کہ مغرب والوں کو، مراکش والوں کو، مصر والوں کو اور حجازیوں کو خبر نہیں ہوگی، کہ کونڈے کس طرح بھرے جاتے ہیں؟ اور تیجا کس طرح ہوتا ہے؟ اور چالیسواں کس طرح ہوتا ہے؟ بالکل امکان ہے کہ ہندوستان سے قریب تر ملک میں افغانستان میں بھی معلوم ہو اور اس لیے کہ کسی چیز کا تعلق میسے سے ہے، کسی چیز کا تعلق دیوی سے ہے، کسی چیز کا تعلق پیرانِ کلیر سے ہے، کسی چیز کا بہت بڑا تعلق اجمیر شریف سے ہے تو بدعت "لوکل" ہوتی ہے۔ اور سنت، مشروع جو چیز ہے وہ بالکل عام ہوتی ہے، اس کا ایک ثبوت ہم بتاتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا، اگر ہندوستان کا آدمی شام چلا جاتا یا مراکش چلا جاتا، اس سے کہا جاتا کہ آج آپ جمعہ کی نماز پڑھایئے، تو اس کو ایک گائڈ بک (Guide book) کی ضرورت ہوتی، کہ ذرا پہلے یہ بتا دیجئے کہ یہاں جمعہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے، کیا کیا پہلے کہنا پڑتا ہے، اور خطبہ کتنا طویل ہوتا ہے، کتنا نپا تلا ہوتا ہے اور اس سے پہلے کیا اذان دی جاتی ہے، اس سے پہلے کیا کہلوایا جاتا ہے؟ تو فرمایا شاہ ولی اللہ صاحب نے کہ اگر حج نہ ہوتا تو بہت سی بدعتیں [1] ایسی رائج ہو جاتیں مسلمانوں کے اندر عالم اسلام کے مختلف حصوں اور ملکوں میں کہ دوسری جگہ خبر بھی نہ ہوتی اور صدیوں چلتیں وہ، جیسی بدعات چل رہی ہیں، یہاں کی بدعات کچھ ہیں اور مغرب کی بدعات کچھ ہیں، بزرگوں کے نام پر بھی اور اس کے علاوہ بھی طریقے مختلف ہیں کہ اس کے لیے ایک اچھی خاصی گائیڈ بک کی ضرورت ہے، بتایا جائے کہ یہ کام یوں کیا جاتا ہے، اس لیے کہ نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں ہے۔

اور تیسری بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ حج جو ہے وہ دربار عام ہے، جس طرح ہر سلطنت میں، ہر بادشاہ کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ایک دربار کرے، تا کہ لوگوں کا اخلاص

---

(۱) بدعت کسی اور چیز کو جس اللہ و رسول ﷺ نے دین شامل نہیں کیا ہے اور اس کا حکم نہیں دیا، شامل کرنا اور اس کا ایک جز بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لیے کرنا اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کئے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی کی جاتی ہے۔ بدعت ہے۔ (اسلام کے قلعے ۴۴-۴۵)

معلوم ہو، وفاداری معلوم ہو اور لوگ اس کی طاقت کو، اس کے دائرۂ اثر کو دیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور سیکھیں، تو یہ حج کی تین چیزیں ہیں، شاہ ولی اللہؒ صاحب نے زور دیا ہے، ان الفاظ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

''وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَ الْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْد'' ''میرے گھر کو پاک کردو، طواف کرنے والوں کے لیے قیام کرنے والوں کے لیے اور رکوع سجود کرنے والوں کے لیے'' پھر اس گھر میں کوئی شرک کا نشان باقی نہ رہے۔ (۱)

(۱) درسِ قرآن۔ سورۂ حج (آیت۔۲۶) غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ اپنے گھر سے بیت اللہ تک، ص: ۸۱-۸۳ ☆ اسلام کے قلعے: ۴۴-۴۵ ☆ خلفائے اربعہ کی تربیت، ص: ۱۶، سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔

حج جذبۂ عشق کی تسکین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ. لِيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ وَيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهِ فِىۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ. فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآٮِٕسَ الۡفَقِيۡرَ. ثُمَّ لۡيَقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ وَلۡيُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ. ذٰلِكَ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ.﴾ (سورۂ حج: ۲۷-۲۹)

(''اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لیے آموجود ہوں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں پس تم بھی اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور چاہیے کہ (اس) قدیم گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں'')۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ" ''اور اعلان کر دو لوگوں میں حج کا، لوگ آئیں گے، پیدل بھی آئیں گے، پیادہ پا بھی آئیں گے اور ہر دبلی اونٹنی یا لاغر جانور پر بھی آئیں گے، جو اتنا بڑا سفر اس پر نہیں کرنا

جاہتے، مجبور ہو کر آئیں گے، اپنے جذبے اور شوق میں آئیں گے"۔

"ضَامِرٌ" کا اسی لیے ذکر کیا کہ صرف وہی لوگ نہیں آئیں، جنکے پاس اچھی سواریاں ہیں، جن کے پاس وسائل و اسباب ہیں، بلکہ وہ بھی آئیں گے، جن کے پاس کم سے کم اسباب ہیں اور یہی ہو رہا ہے کہ کون کون وہاں پہنچتا ہے، اب تو خیر بہت سے مقاصد ہو گئے ہیں، تجارتی اور ملازمت کے، سونا لانے کے، زیور بنانے کے سب، لیکن پہلے جب حج ہی مقصود تھا، تو لوگ کس طرح گرتے پڑتے پہنچتے تھے، پیدل جاتے تھے اور بعض عمر بھر کا اندوختہ، پیسہ پیسہ، روپیہ روپیہ جمع کر کر کے اور دس برس کے بعد جاتے تھے، "وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" یہ جانور جو آئیں گے ہر گہرے راستے سے۔

"كُلُّ فَجٍّ عَمِيْق" جب یہ کہنا ہو کہ ہر طرف سے آئیں گے، تو "كُلّ فَجٍّ عَمِيْق" کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ حسب حال بھی ہے، یعنی یہ صرف عمومیت ہی کا فائدہ نہیں دیتا، بلکہ یہ واقعہ کی تصویر بھی ہے، کہ یہاں خیال بھی نہیں، ہم نے نام بھی نہیں سنا اس کا، ہم نے تم نے جغرافیہ دانوں نے نام بھی نہیں سنا ہوگا، اس کا کہ اچھا یہ بستی بھی ہے، یہ شہر بھی ہے، کہیں دنیا میں وہاں کا آدمی، اب وہاں جب مطاف میں بیٹھے ہوتے ہیں، نماز میں دیر ہوتی ہے، انتظار ہوتا، طواف کر چکے ہوتے ہیں (اللہ تعالیٰ تم کو بھی نصیب فرمائے، جاؤ دیکھو) تو پاس والا کوئی مغربی ہوتا ہے اور انڈونیشی ہوتا ہے اور ملیشیا کا ہوتا ہے، کوئی مغرب اقصیٰ کا ہوتا ہے، تو باتیں ہوتی ہیں، وقت ہے ابھی یا پڑھنا جو کچھ ہوتا ہے، پڑھتے رہتے ہیں، آپ کہاں کے ہیں (ایک تو کرسی والے تو جلدی نہیں بتاتے ہیں کہاں کے ہیں، یا اور کوئی بدنام شہر ہوتا اس کو نہیں بتائیں گے، آگرہ کو بھی کم بتاتے ہیں وہاں پاگل خانہ ہے) تو "يَاتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" معلوم ہوتا ہے کہ یہ آج نازل ہو رہی ہے آیت۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، تو "مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" سے لوگ نہیں آتے تھے، نہ اسلام اتنا پھیلا تھا، نہ یہ وسائل تھے، لیکن اللہ نے چودہ سو برس پہلے وہ کہا کہ جو آج آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، ایسی ایسی جگہ کا آدمی نظر آئیگا، کہ جغرافیہ کے نقشہ میں ہی نہیں ملے گا اس کا، بڑی دیر میں تم سمجھو گے کہ یہ کس بر اعظم میں ہے، اس بر اعظم کے کس حصہ

میں ہے، جنوبی افریقہ ہے، وہ بہت پھیلا ہوا ہے، اس میں بعض جگہ مسلمان بہت کم ہیں اور زبانیں بھی بہت مختلف ہے (جنوبی افریقہ کا ایسا نام لے گا کہ پتہ نہیں ہمارے دار العلوم میں پڑھتے تھے بعض بعض لوگ جنوبی افریقہ کے کپتاؤن کے ہیں فلاں جگہ کے ہیں)

حج کے منافع اور اس کا اصل مقصد

"لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے "مَنَافِعَ" کو مطلق فرمایا ہے، اور اس کے لیے نکرہ کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس بلیغ تعبیر منافع کی کثرت اور تنوع اور ہر دور میں اس کی بدلتی ہوئی قسموں راستوں، طریقوں اور پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، جن کا شمار نا ممکن ہے، "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" "تاکہ وہ اپنے منافع کا مشاہدہ کریں"

حج بلاشبہ ایک ایسا موسم اور ایسی تقریب ہے، جس میں پورے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کے مسلمان جمع ہو کر اس کے مختلف فوائد اور مادی نفع میں حصہ لے سکتے ہیں، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اہم مسائل پر مفید تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں، ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے مشترک مفاد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حج کی یہی حکمت اور سب سے بڑی افادیت نہیں ہے، جیسا کہ بعض جدید اہل قلم کی تحریروں اور بیانوں سے اندازہ ہوتا ہے، وہ صرف ایک سیاسی کانفرنس بھی نہیں، جیسا کہ بہت سے معاصر اہلِ سیاست اور مسلمانوں کے رہنما اور زعماء اس کی یہی تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اگر حج کا مقصد یہی ہوتا تو حج میں سکون کی ایک فضا ہوتی اور زیادہ تر ایک جگہ قیام ہوتا، تاکہ اس سے غور وفکر، مطالعہ وجائزہ، بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال میں سہولت ہو، لیکن اس کے برعکس یہ ایک مستقل سفر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا ایسا سلسلہ ہے، جن میں ان چیزوں کا موقع ہی نہیں، اس کے علاوہ اول الذکر صورت میں حج کی یہ دعوت صرف علماء، واہلِ فکر وتدبیر اور مسلمانوں کے طبقہ خواص تک محدود ہونی چاہیے، اس لیے کہ وہی لوگ اس طرح کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس قسم کے متفرق منافع بلاشبہ حج کے ثمرات اور اس کی برکتوں میں سے ہیں، لیکن حج محض انہی مقاصد کی تکمیل کے

لیے نہیں ہے، وہ عامی و جاہل ہر قسم کے مسلمان پر فرض ہے، بشرطیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

" وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا. وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ " (سورۂ آل عمران: ۹۷) "اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لیے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس کے پاس زاد راحلہ یعنی اتنا سامان سفر ہو، جو بیت اللہ تک پہنچا سکے، پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے، یا نصرانی" اس کے علاوہ اگر حج صرف ان ہی چیزوں کے لیے ہوتا تو اس کی شکل ہی دوسری ہونی چاہیے تھی، اور اس کو ایسے دور دراز "صحرائی" علاقہ میں نہ ہونا چاہیے تھا"

"مَنَافِعَ لَهُمْ" اس کا احصاء نہیں ہوسکتا، کوئی اس کو شمار نہیں کرسکتا، کہ اسی قسم کے منافع حج سے حاصل ہوتے ہیں، جو ان منافع سے بدرجہا زیادہ اور تخیل سے بالاتر، خیال بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ منافع وہاں حاصل ہوتے ہیں، ان کا کوئی بھی احصاء نہیں کرسکتا، ایک سب سے بڑی منفعت تو توحید کی دولت ہے، پھر نماز پڑھنے کا طریقہ ہے اور خشوع ہے۔

اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے، اس دین کے ساتھ، ملت ابراہیمی کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، پھر اس کے بعد پھر تعارف ہوتا ہے، پھر ضرورتیں معلوم ہوتی ہیں، کس چیز میں کمی ہے؟ ہم کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں؟ وہاں مثلاً کس لیٹریچر کی ضرورت ہے؟ وہاں کیسے داعیوں کی ضرورت ہے؟ کیسے مدارس کی ضرورت ہے؟ وہاں اقتصادی حالت کیا ہے؟ ہم کیا مدد کرسکتے ہیں؟ یا ہم کیا نفع حاصل کرسکتے ہیں؟ یہ سب "مَنَافِعَ لَهُمْ" میں آتا ہے، لیکن اس میں سرفہرست جو ہے، وہ دینی منافع ہیں، دینی اور شرعی منافع اس کے بعد پھر آپس کا تعارف اور اتحاد المسلمین، مسلمانوں کی ضرورتوں کا سمجھنا اور ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کی مدد کا جذبہ یہ سب ہے۔

" لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُم " "منافع" اللہ تعالیٰ نے اس کی تخصیص نہیں کی، صدہا قسم

کے منافع ہو سکتے ہیں، اس میں ایک ضمنی منفعت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا جا سکتا ہے، اس کا انکار ہم نہیں کرتے، نفی نہیں کرتے، لیکن یہ اصل مقصد نہیں ہے، تشریعی مقصد نہیں ہے اس لیے حج فرض نہیں کیا گیا، "وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ" اور اصل چیز یہ ہے کہ اللہ کا نام لے، اللہ کو یاد کرے، "فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ" مقرر دنوں میں، حج کے جو تین دن چار دن ہیں اس میں خاص طور سے اللہ کا نام جتنا زیادہ سے زیادہ لے سکے۔

"عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" اور جوان کو قربانی کرنی ہے، جانور کی اس پر بھی اللہ کا نام لے، اس کے بغیر بھی اللہ کا نام لے، ان دنوں میں چوپایوں کی جو ہم نے ان کو موقع دیا ہے، ان کو میسر ہے، اور ان کی قربانی کریں اور اللہ کا نام لیں۔

فرماتا ہے "فَكُلُوا مِنْهَا وَ أَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ" ان میں سے تم بھی کھاؤ، اور ان میں سے محتاج، بے بس آدمی کو بھی کھلاؤ، جس کو گوشت میں بہت کم ملتا ہے، بہت سے ایسے لوگ ہیں، جس کو ہفتوں گذر جاتے ہیں، گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

حج کا محور

"ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ" پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، یعنی جو احرام باندھ رکھا تھا، بعض لوگوں نے آٹھ دن دس دن سے۔ (آپ کو معلوم ہے حج کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہے کہ جس میں صرف عمرہ کا احرام باندھے اور عمرہ کرکے احرام کھول دے اور پھر حج کے موقع پر آٹھویں تاریخ کو دوبارہ احرام باندھ کر حج کرے یہ "تمتع" ہے۔ دوسرا حج "قران" ہے، جس میں عمرہ اور حج دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھا جاتا ہے اور ایک احرام سے دونوں کو ادا کرنے کی نیت کی جاتی ہے اس کا احرام جب کھلتا ہے جب طواف زیارت کر لیا جاتا ہے اور تیسرا حج "افراد" ہے۔ "افراد" یہ ہے کہ تنہا حج کی نیت سے احرام باندھا ہے تو باندھا رہے اور طواف زیارت کرکے کھولے) تو یہ اس کے تین دن ہو سکتے ہیں، دس دن ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ قران کا احرام باندھا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بیس

دن پہلے مدینہ طیبہ سے چلا ہو، اپنے میقات سے گذرا ہو، اسی وقت سے اس نے احرام باندھ لیا ہو، اب وہ احرام جب کھولے گا، جب حج کے مناسک ادا کرلے گا، تو اس میں میل کچیل سب چیزیں ہو سکتی ہیں، بال بھی نہیں بناتے تو "ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ" وہ اپنے میل کچیل دور کرے۔

"وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ" اور اپنی نذریں پوری کریں، جو انھوں نے دل میں ارادہ کیے تھے، کہ ہم اس طرح دعا کریں گے، ہم اس طرح روئیں گے، ہم اس طرح خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھیں گے، اور اللہ کا نام لیں گے، وہ سب نذریں پوری کریں، یہاں "نـــــــذور" سے مراد وہ نذریں نہیں ہیں جو بزرگوں کے نام پر ہوتی ہیں، منتیں وغیرہ، "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" اور طواف کریں "البیت العتیق" کا، یہ جو گھر توحید کا سب سے پرانا مرکز ہے۔

"فطرت انسانی" فطرت انسانی ہی ہے، ایک ایسی چیز کی جستجو اور آرزو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے، جس کو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے، اس کے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کر سکے اور قرب و وصال اور تعظیم و تسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کر سکے، جو ہمیشہ سے اس کے خمیر میں ہے۔

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں، جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں، اسی کی کہلائی جاتی ہیں اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے، اس کے علاوہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات و معاملات اور اعمال و احوال وابستہ ہیں، جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دین توحید اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں، ان چیزوں کا نام اس نے "شعائر اللہ" رکھا، ان کی تعظیم، اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ و مستور محبت اور مشاہدہ و قرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں" سارا حج

اصل میں اس عشق و بے خودی کے اظہار کا ذریعہ ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر موجوداور شرعاً وعقلاً مطلوب ہے۔"وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبّاً لِلّٰهِ" (سورۃ البقرہ:۱۶۵)(اور ایمان والوں کوتو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے،"يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ" (سورۃ المائدہ:۴-۵)اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

شعائراللہ اوراس کی حرمت

ارشاد ہے ﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ یہ ہوا (اور جوکوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا اور اللہ کے حدود کی اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قوانین کی تعظیم کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی عزت کی جگہیں جو ہیں جیسے بیت اللہ ہے، مطاف ہے، مکہ معظمہ خود ہے پورا، پھر منیٰ ہے، مزدلفہ ہے، عرفہ ہے، جو زیادہ اس کی تعظیم کرے گا) سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا۔ یہ تعظیم جو ہے اس کو دینی طریقے پر بھی، تشریعی طریقے پر بھی اور نفسیاتی طریقے پر بھی بہت بڑا دخل ہے تعلق قائم کرنے میں، اس میں جب کوتاہی ہوتی ہے، تو بالکل فائدہ فوت ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو ایمان بھی چلا جاتا ہے، بے حرمتی سے، مثلاً کوئی مسجد میں کوئی بے حرمتی کا کام کرے، اس کا خطرہ ہے کہ ایمان نہ سلب ہو جائے اور بیت اللہ شریف، منیٰ، مطاف اور عرفات مناسک کی جگہیں ہیں حرمات اللہ ہیں، وہاں اگر کوئی بے ادبی کرے گا، تو اس کے لیے سلب ایمان کا خطرہ ہے، حرم میں معصیت (گناہ) یوں بھی سخت چیز ہے، لیکن بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ حرم میں ارادہ معصیت بھی معصیت میں شامل ہے، بخلاف دوسری چیز کے، وہ اس کے ثبوت میں یہ آیت پیش کرتے ہیں "وَمَنْ يُرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ" (سورۂ حج:۲۵) اور جوکوئی بھی اس کے اندر کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حرم کی خصوصیت ہے کہ یہاں پر ظلم کا ارادہ کرنے والا بھی قابل مواخذہ اور لائق عتاب ہیں خواہ وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں"۔

اس لیے اس رکن عظیم کی عظمت وجلال اور اپنی ذمہ داری اور فرضِ منصبی کا استحضار اور احساس حاجی کے اندر پوری قوت کے ساتھ پیدا ہونا چاہیے، اور وہ اپنی تمام نقل وحرکت اور قیام وسفر میں ذکی الحس، حاضر دماغ اور بیدار، ہوشیار رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس روحانی فضائے غافل اور بے پرواہ ہو، جو اس کے گرد وپیش میں محیط ہوتی ہے۔ تعظیم کو بشر طیکہ وہ حدود میں ہو اور اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو اور توحید سے کسی طرح معارض نہ ہو، اس میں بہت بڑی تاثیر ہے، تعلق پیدا کرنے میں اور روحانی ترقی دینے میں۔ [1]

(۱) درس قرآن سورۂ حج: ۲۷-۲۹ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ ☆ارکان اربعہ (ص: ۲۸۸) ☆تحفۂ جنگل (ص: ۷۱-۷۲) سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار (۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

﴿وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ☆ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ☆ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ☆ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ☆ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (الحج: ۲۹-۳۳)

(''اور تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے ہیں سوائے ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، تو بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، صرف ایک خدا کے ہو کر اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا کر اور جو شخص (کسی کو) خدا کے ساتھ شریک مقرر کرے، تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے، پھر اس کو پرندے اُچک لے جائیں، یا ہوا کسی دور جگہ اُڑا کر پھینک دے، (یہ ہمارا حکم ہے) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے، تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیز گاری میں سے ہے، ان میں ایک وقت مقرر تک تمہارے لیے فائدے ہیں، پھر ان کو خانۂ قدیم (یعنی بیت اللہ) تک پہنچنا (اور ذبح ہونا) ہے'')

بت پرستی کے ساتھ نجاست کا ذکر

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ" اور تمہارے لیے چوپائے حلال کردیے گئے، سوائے ان کے جنکی تلاوت تمہارے اوپر کی جاتی ہے، یعنی سور نہیں ہیں، جو حرام ہیں، اور حلال نہ کیے گئے، "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" بچو تم گندگی سے بتوں کی، "وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ" اور جھوٹ بولنے سے بچو۔

قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ بت پرستی کے ساتھ نجاست کا ذکر کرتے ہوئے، "قَوْلَ الزُّوْرِ" (جھوٹی بات) کا بھی ذکر کیا۔ اور یہ مذاہب کی تاریخ کا ایک فیصلہ ہے، ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بت پرستی کے ساتھ غلط بیانی اور افسانہ سازی اور افتراء یہ ہمیشہ چلتا آرہا ہے، جتنے بت پرستی کے مذاہب ہیں، سب میں افسانے کہ انہوں نے یہ کردیا تھا، انہوں نے یہ کردیا تھا، جب ہی سے ان کی تعظیم، ان کے مزاروں پر چادر چڑھانا، (ابھی دیوی کا ذکر آیا تھا قومی آواز میں کہ یہاں میرے بزرگ ہیں ایک مسلمان خاتون نے کہا تھا، یہاں وہ بزرگ ہیں جو وہ چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، سب کی مرادیں یہاں ملتی ہیں اور جلسہ تھا ہندو مسلم اتحاد کا) اسی طرح یہ عیسائیت کی تاریخ پڑھیں گے آپ تو اس کا سرچشمہ نبوت ہے، لیکن جو دوسری تاریخ ہے بودھ مذہب کی تاریخ ہے، جینی مذہب کی تاریخ پڑھیں گے اور اس کے علاوہ درجنوں مذہب، بلکہ درجنوں سے زیادہ مذاہب ہیں، سب کے ساتھ شروع سے "قَوْلَ الزُّوْر" چلے گا کہ وہ کہانیاں ان کے ساتھ چلی آرہی ہیں کہ انہوں نے یہ کردیا، انہوں نے یہ کردیا اور الٹ پلٹ کردیا، رات کو دن کردیا اور دن کو رات کردیا اور جو جس کو کھانے کو نہیں ملتا تھا، اس کو بادشاہ بنادیا، راجہ بنادیا اور جو راجہ تھا اس کو تخت سے اتار دیا، یہ سارے قصے، یہ سب بت پرستی کے مشرکانہ ادیان و مذاہب کا لازمہ ہیں اور یہ معجزہ ہے قرآن مجید کا، اتنے ہی ہو سکتا تھا۔

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" کہ ان بتوں کی گندگی سے بچو، لیکن "وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْر" (اور جھوٹ بولنے سے بچو) اور یہ ہم نے پڑھا ایک انگریزی کی کتاب میں کہ

اکثر شرمنس اور مقدس جگہیں جو عیسائیوں کی ہیں کہ یہاں فلاں دفن ہے، یہاں فلاں اور لوگ سفر کر کے وہاں جاتے ہیں، ان میں سے اکثر جعلی ہیں، اس نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے بنا لیے ہیں، وہاں نہ حضرت عیسیٰ کا کوئی نشان ہے اور نہ وہ جس کو ولی سمجھ کر وہاں جاتے ہیں اور ہندوستان میں بھی کتنے مزارات ہیں، جن کی کوئی اصل نسل نہیں، کہہ دیا کہ یہ فلاں کا مزار ہے، یہ فلاں کا مزار ہے اور وہ بالکل جعلی اور نقلی ہیں، جو لوگ جاننے والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے سامنے بنا تھا۔

درگاہوں اور قبروں کا فتنہ

"ان سب چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس سلسلہ کو شدت کے ساتھ بند کرنے کا راز یہی ہے، آپ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ عادت توحید کے علمبرداروں اور دنیا کی اس آخری امت میں بھی سرایت نہ کر جائے، جس پر قیامت تک پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے، آپ نے اپنی آخری آرام گاہ کو بھی ہر قسم کے شرک وبدعت اور غلو سے پاک رکھنے کا حکم دیا، اپنے مرض وفات میں آپ کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:۔ "لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيْصَةً لَهُ عَلٰى وَجْهِهِ فَإِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهِ فَقَالَ وَهُوَ كَذٰلِكَ، لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا" جب آپ بیمار ہوئے تو اکثر چادر مبارک کو چہرے پر ڈال لیتے اور جب گھبرانے لگتے، تو چہرے سے ہٹا دیتے، آپ نے اس حال میں فرمایا اللہ یہود ونصاری پر لعنت کرے، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا، آپ امت کو ان کے اعمال سے ڈرا رہے تھے۔

آپ سے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ "اے میری قبر کو بت نہ بنا، جس کی پوجا ہونے لگے، اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں پر سخت غصہ ہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا دیا۔"

رسول اللہ ﷺ نے مقابر اور آستانوں کی زیارت کے لیے باقاعدہ سفر کرنا اور اہتمام

تیاری اور نیت کے ساتھ متبرک مقامات اور درگاہوں میں حاضری ممنوع قرار دی ہے، مشہور حدیث ہے کہ "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدُ الرَّسُوْلِ وَالْمَسْجِدُ الأَقْصٰى" "اہتمام وارادہ کے ساتھ با قاعدہ سفر صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے، مسجد حرام، مسجد الرسول اور مسجد اقصیٰ"

آپ نے اس ذریعہ سے اس امت کو درگاہوں اور قبروں کے اس فتنہ سے محفوظ رکھا، جس نے ان کو کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا کر دیا تھا۔

لیکن مسلمانوں کی بہت سی جماعتوں نے آپ کی اس اہم وصیت پر پوری طرح عمل نہیں کیا، جس کو آپؐ نے اپنے مرض وفات میں بھی فراموش نہ فرمایا تھا، وہ بھی ان درگاہوں، آستانوں اور مزاروں کے فتنہ میں پڑ گئیں، لوگ بہت دور دور سے اور بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان مزارات پر جانے لگے، ان قبروں کے سامنے تعظیماً جھکنے لگے، منتیں ماننے اور مرادیں مانگنے لگے اور ان مزاروں کے ساتھ اس قدر شیفتگی اور تعظیم کا مظاہرہ کرنا شروع کیا، جو یہود و نصاریٰ کا شعار تھا اور آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہو گئی کہ "تم اپنے پہلے لوگوں کی پوری پوری اتباع کرو گے، وہ ایک بالشت چلیں گے تو تم بھی ایک بالشت چلو گے وہ ایک ہاتھ چلیں گے تو تم بھی ایک ہی ہاتھ چلو گے"۔

ان مزاروں اور آستانوں نے (جن میں بہت سے جعلی اور نقلی بھی تھے) نہ صرف مسجدوں کا حق غصب کیا، بلکہ بعض اوقات انہوں نے مسجد حرام اور بیت اللہ کی جگہ لینے کی کوشش کی، بہت سے جاہلوں نے ان مزاروں اور درگاہوں کو خانۂ کعبہ کی طرح اہم اور مقدس سمجھ لیا، دور دور سے کھنچ کر وہاں جمع ہونے لگے، ان کا عرس ہونے لگا اور ایک میلہ سا لگ گیا۔

قرآن مجید کا اعجاز

یہ میلے دیوی دیوتاؤں کے واقعات اور میتھالوجی اور علم الاصنام کے ساتھ ملوث ہیں، ان کو دیکھ کر قرآن مجید کا اعجاز نظر آتا ہے، کہ اس نے تعمیر بیت اللہ کے وقت سب سے پہلے شرک باللہ اور افسانوی روایات پر کاری ضرب لگائی ہے، جس سے دوسری قوموں کے حج و

زیارت کے اعمال ورسوم پوری طرح آلودہ ہیں اور قرآن نے "بت پرستی" کو "شرک اکبر، گندگی" اور "جھوٹی بات" کا نام دیا ہے اور بہت زوروں سے اس کے معائب بیان کیے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ. وَاُحِلَّتْ لَکُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ" " یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا اور اللہ نے حلال کر دیے ہیں تمہارے لیے چوپائے بجز ان کے کہ جو تم کو پڑھ کر سنا دیے گئے، سو تم بچے رہو بتوں کی گندگی سے اور بچے رہو جھوٹی بات سے"(۱)

"حُنَفَاءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ" یکسو ہو کر اللہ کے لیے اس کے ساتھ بالکل شرک کے شائبہ سے پاک۔

ازل سے تا امروز

"وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ" اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرے گا، تو ایسا ہے کہ کوئی آسمان سے گرا دیا جائے، آسمان سے گرے "فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ" جب اوپر سے آرہا ہے، آسمان سے تو کیا ہوگا، یا تو چڑیاں اچک لے جائیں گی، یا ہوا اس کو اڑا لے جائے گی، کہیں بہت دور جگہ، اس لیے کہ جب آدمی فضا میں ہوتا ہے، تو کوئی وزن نہیں ہوتا تو ہوا بھی اس کو اڑا سکتی ہے اور چڑیا بھی پکڑ سکتی ہے، کوئی بہت بڑی چڑیا بھی ایسی ہو سکتی ہے "اَوْتَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ" "یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے"۔

"یہی بت پرستی اور شرک (یعنی خدا کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانا اور ان کے سامنے انتہائی ذلت ومسکنت کا اظہار، ان کے سامنے سجدہ ریزی، ان سے دعا ومدد کی طلب اور ان کے لیے نذر و نیاز) عالمگیر طویل العمر اور سخت جان " جاہلیت " ہے، جو کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں اور یہی نوع انسانی کا قدیم ترین ومہلک ترین مرض ہے، جو تاریخ انسانی کے تمام ادوار، تمدن، معاشرت، معیشت وسیاست کے تمام تغیرات اور انقلابات کے باوجود

(۱) ارکان اربعہ: ۳۴۷-۳۵۱

بھی نوع انسانی کے پیچھے لگا رہتا ہے، اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے، بندوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا روڑا بنتا ہے اور ان کو انسانیت کے بلند درجے سے گرا کر پستی کے عمیق و مہیب غاروں میں اوندھے منہ ڈال دیتا ہے"۔(۱)

شعائر اللہ کا احترام

"ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" یہ بات ہے اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا، یہ قلوب کا تقویٰ ہے، جب قلب میں تقویٰ ہوتا ہے، خدا کا ڈر ہوتا ہے، خدا کی عظمت بیٹھی ہوتی ہے "تقویٰ" کے معنی ڈر ہی کے نہیں ہیں، بلکہ احتیاط اور استحضار اور ادب یہ سب چیزیں "تقویٰ" میں جب دلوں میں "تقویٰ" ہوگا، تو اللہ سے نسبت رکھنے والی، اللہ کی طرف جو چیزیں منسوب کی جاتی ہیں، یہ اللہ کی چیز ہے، سب کی تعظیم آدمی خود بخود کرنے لگتا ہے، اگر دلوں میں تقویٰ ہے اور اسی لیے ہمارے نظام تعلیم میں کتاب کی تعظیم، استاذ کی تعظیم اور ایسے اچھے متبرک مقامات کی تعظیم اور قبلے کی طرف پاؤں کرکے نہ بیٹھو، بہت سے ملکوں کے لوگوں کو دیکھا کہ بالکل قریب ہیں، بیت اللہ شریف کے اور پاؤں اس طرف کیے ہوئے ہیں اور جوتے وہاں رکھے گئے ہیں، تعلیم نہیں دی گئی، وہ آگئے تو ان کے اندر وہ ادب نہیں ہے، جو ہونا چاہیے۔

یہ جو کچھ آپ شریعت کو دیکھتے ہیں، یہ سب احترام کی باتیں ہیں، کرنا کرانا تو بعد کا مرحلہ ہے اور ضروری ہے، لیکن پہلا مرحلہ احترام کا معاملہ ہے۔ اللہ اور رسول کو اللہ و رسول سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو کس نظر سے دیکھا جائے، یہی حقیقت ہے شعائر اللہ کی۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" تو تعظیم شعائر اللہ، دلیل ہے قلوب میں تقویٰ کی، قلب میں کوئی چیز نہیں اور کون کیا چیز ہے، سوائے اللہ کے رسول کے اور اللہ کے رسول کے صحابہ کے اور کبار اولیاء اللہ کے سب برابر ہیں، ایک طرح کے لوگ ہیں، لیکن سارا انحصار جو ہے وہ نظر پر ہے، طریقۂ فکر پر ہے، نقطۂ نظر پر ہے اور ذہنی کیفیت پر ہے۔ "وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ" میں ذہنی کیفیت کو

(۱) دستور حیات: ۸۴

بیان کیا گیا ہے، ایک بزرگ کو بہت بڑے مدارج عالیہ ملے، مجھے اس وقت ان کا نام یاد نہیں، فضیل بن عیاض یا جنید بغدادی کا نام یاد آتا ہے، کسی نے پوچھا کہ حضرت اتنا بڑا درجہ اللہ نے نصیب فرمایا، کیا بات ہے، کہنے لگے بات تو اتنی ہے کہ میں چلا جا رہا تھا ایک جگہ میں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا، اس پر اللہ کا نام لکھا تھا، میں نے اٹھایا، آنکھوں سے لگایا اس کو ایک جگہ عزت کے ساتھ کسی دیوار وغیرہ میں حفاظت سے رکھ دیا، اللہ کو یہ ادا پسند آئی اور اللہ نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا۔

اصل میں تعظیم جو ہے، محبت ووقعت کا اس پر انحصار ہے، اس کی دلیل ہے، یہی علم کا حال ہے، تو سارا معاملہ عزت واحترام کا ہے، سب وہیں سے ہوتا ہے، وہیں سے ملتا ہے، جس کو ملتا ہے، لیکن جو قلبی کیفیت ہے، وہ بڑی چیز ہے"۔ (۱)

یاد رکھو! قرآن مجید کا ادب کرنا یہاں تک کہ ہمارے اساتذہ بتاتے تھے کہ کتاب کا ادب کرنا، تو یہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کہ جو اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرے گا، یہ دلوں کا تقویٰ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حدود کی اور اس کی طرف منسوب جو چیزیں ہیں، اس سے خاص نسبت رکھنے والی چیزوں میں سے مطاف ہے، کعبہ ہے اور عرفہ ہے، مقام ابراہیم ہے، " **فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ** " اس کے رب کے یہاں اس کے لیے بہتر ہے، یعنی اس کو ثواب دلوائیگا اور اس کا مرتبہ بڑھائیگا اور پھر اس کا وہاں اجر پائے گا۔

"**وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى**" تمہارے لیے بہت سے منافع ہیں ایک مقرر مدت تک، کئی طرح کے منافع، خشوع پیدا ہوگا، علم بڑھے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھے گا، سنت کا شوق پیدا ہوگا، دین کی معرفت پیدا ہوگی، "**ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ**" پھر اس کے بعد اس سب کی جو آخری جگہ ہے وہ "**البیت العتیق**" ہے، وہ طواف زیارت جو ہوگا، اس پر حج ختم ہوگا اور احرام پھر اتر جائے گا۔ (۲)

---

(۱) تحفۂ جنگل ۱۷-۲-۷ (۲) درس قرآن، سورۂ حج: ۲۹-۳۳، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ کتب سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے: ☆ ارکان اربعہ: ۳۴۷-۳۵۱ ☆ دستور حیات: ۸۲ ☆ تحفۂ جنگل: ۱۷-۲-۷

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار (۲)

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ. فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ. وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ. وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى. وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ. لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ. فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ. وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّالِّيْنَ. ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ. وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ. اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَائَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾(سورۃ بقرہ: ۱۹۷-۲۰۰)

(”ترجمہ:۔ حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا اور جو کوئی بھی نیک کام کروگے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا اور زادِ راہ لے لیا کرو اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے، سوائے اہل فہم! میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو) تمہیں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو، پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کر لیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں

بتایا ہے اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے، ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو، تو اللہ کو یاد کرو، اپنے باپ داداؤں کی یاد کی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو......"!

شریعت کے حکیمانہ انتظامات

حج اپنے سارے ارکان واعمال اور مناسک وعبادات کے ساتھ اطاعت محض، مجرد امتثال، بے چون و چرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے۔

حج کا سفر اکثر اوقات ایک طویل سفر ہوتا ہے... اس میں انسان کو مختلف حالات پیش آتے ہیں، مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، نئے نئے لوگوں کی طویل عرصہ تک صحبت ورفاقت رہتی ہے، طرح طرح کے معاملات سامنے آتے ہیں اور یہ سب چیزیں بہت سے ممنوعات، غلط قسم کی ترغیبات اور ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کی حد تک پہنچا سکتی ہیں، حاجی اس سفر میں بہت سی چیزوں سے تنگ دل ہوتا ہے، بعض اوقات کسی ناگوار بات سے اس کی طبیعت میں سخت اشتعال پیدا ہوتا ہے اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں، جن کو وہ اپنے وطن اور اپنے گھر میں بھی برا سمجھتا تھا اور حتی الامکان ان سے بچتا تھا، وہ بعض ایسی معصیتوں اور اخلاق قبیحہ میں گرفتار ہو جاتا ہے، جو حج کی روح اور مقاصد کے یکسر منافی ہیں، حج میں ان چیزوں کی ممانعت خاص طور پر اسی لیے آئی ہے، کہ اس میں اس کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ" "ایام حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے، تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور جھگڑا اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا"۔

ان قوانین، احکام اور تعلیمات نے (جن کا تعلق قلب و جوارح، نیت و عمل اور زمان و مکان سے براہِ راست) حج کو تقدس و طہارت، تورع و زہد، مراقبہ و حضور، محاسبۂ نفس اور مجاہدہ و جہاد کی ایک ایسی خلعت عطا کی ہے، جو دوسرے مذہبوں اور ملتوں کے اس قسم کے اعمال میں ہرگز نہیں ملتی، ان کی وجہ سے نفسِ انسانی اخلاقِ عامہ اور نظام زندگی پر جو اثرات پڑتے ہیں، اس کو دیکھ کر حضور ﷺ کی اس حدیث قدسی کی تصدیق ہوتی ہے "مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ" [1] "جس نے خالص اللہ کے لیے حج کیا اور پھر دورانِ حج نہ بری بات زبان سے نکالی، نہ فسق و فجور اختیار کیا، تو (وہ پاک ہو کر) ایسا ہو کر لوٹا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا"۔

حج نے مرورِ زمانہ کی وجہ سے اپنا تقدس، پاکیزگی اور سادگی و صفائی بڑی حد تک کھو دی تھی اور جاہلیت کے میلوں کی طرح ایک میلہ بن کر رہ گیا تھا، جس میں ہر طرح کی تفریح، کھیل تماشے اور لڑائی جھگڑے ہونے لگتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی مذمت فرمائی اور ارشاد ہوا "فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوْقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ" "تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا" ابن کثیر کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن وہب نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں مالک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول "وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ" یہ تھا کہ قریش مزدلفہ میں مشعرِ حرام کے پاس قیام کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک گروہ کہتا تھا ہم حق پر ہیں، دوسرا کہتا تھا ہم حق پر ہیں، ہمارے خیال میں یہی بات تھی، باقی صحیح علم اللہ کو ہے، محمد بن کعبؓ کہتے ہیں کہ "قریش جب منیٰ میں جمع ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہمارا حج تم سے زیادہ مکمل ہوا ہے، دوسرے لوگ بھی اسی طرح جواب دیتے تھے"۔

بہترین زادِ راہ

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوىٰ" "اور زادِ راہ لے

(۱) بخاری و مسلم

لیا کرو اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے" ایک رواج تھا کہ بعض لوگ حج کے لیے زادِ سفر کا انتظام کرنا اور اپنے ساتھ سامان لے جانا گناہ سمجھتے تھے، وہ توکل کا مظاہرہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں، اس لیے ہم کو زادِ سفر و راحلہ کی کیا ضرورت؟ البتہ سوال کرنے اور بھیک مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا ایک مجاہدہ سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا "وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" "اور زادِ راہ لے لیا کرو بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے"

ابنِ کثیرؒ عوفی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "کچھ لوگ اپنے گھر سے اس حالت میں نکلتے کہ ان کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوتا اور یہ کہتے کہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، کیا اللہ ہمیں نہ کھلائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، (وَتَزَوَّدُوْا) یعنی اتنا ضرور اپنے ساتھ رکھو، جس سے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

بخاری میں ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "اہل یمن حج کے لیے جاتے تھے تو اپنے ساتھ زادِ سفر نہ لیتے تھے اور کہتے تھے ہم متوکلین میں سے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی "وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى"

" وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ" "سوائے اہلِ فہم میرا ہی تقویٰ اختیار کیے رہو"

"وَاتَّقُوْنِ" .... چونکہ اردو میں جو الفاظ مشترک ہیں ان سے ایک خاص مفہوم بن جاتا ہے....، قاعدہ ہے کہ جب دو زبانوں میں کوئی لفظ مشترک ہو جاتا ہے تو جس زبان کی طرف وہ لفظ آیا ہے، اس زبان کے اثرات پڑتے ہیں، تو جب "تقویٰ" کا لفظ آتا ہے تو ہمارے ذہن میں آتا ہے "زیادہ تہجد گزار" "مشتبہ مال سے بچنے والا..." لیکن عربی میں "اِتِّقَاء" اور "تقویٰ" کے معنی ہیں بچ کر، احتیاط سے کام کرنا اور بچنا اور "پرہیزگار" کا جو لوگ ترجمہ کرتے ہیں وہ اچھا ترجمہ ہے، ......تو "اِتَّقُوْن" کے خالی یہ معنی نہیں کہ "ڈرو مجھ سے" ورنہ آدمی کی چیخ نکل جائے، ڈر سے رونے لگے اور گھبرائے "اتَّقُوْا" "اِتِّقَاء" میں خوف بھی ہے اور عمل بھی ہے، یعنی "لحاظ کرو" اور اس کی عظمت، اس کے حقوق، اس کے تقاضے اور اس کے مقام کے لحاظ سے جو زندگی اختیار کرنی چاہیے، وہ زندگی اختیار کرو، یعنی احتیاط اور اس کی

پابندی اور اس کا پاس و لحاظ، اس "لحاظ" میں اکثر چیزیں آجاتی ہیں" اور "اتقاء" کے اندر صرف عقیدہ اور ذہنی کیفیت ہی نہیں آتی بلکہ اس میں عمل اور تبدیلی بھی آجاتی ہے۔

"لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِنْ رَّبِّكُمْ" "تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش کرو معاش"

اہل جاہلیت اس موسم میں تجارت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے اور ایک حلال چیز کو حرام سمجھ بیٹھے تھے، بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز، جاہلیت کے مشہور بازار تھے، لیکن حج کے موسم میں تجارت جرم تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "اہل عرب حج کے ایام میں بیع و شراء اور تجارت و کاروبار سے پرہیز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ذکر الٰہی کے دن ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی" لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِنْ رَّبِّكُمْ"

" فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ. وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ" "پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کرلیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے"۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ. اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" "ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ، جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔

زمانہ جاہلیت میں قریش حاجیوں کے ساتھ عرفات نہیں جاتے تھے، بلکہ حرم ہی میں رکے رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ میں سے ہیں اور بیت اللہ کے محافظ و مجاور ہیں، ان کا منشا یہ تھا کہ وہ بقیہ لوگوں سے ممتاز رہیں، اپنی پوزیشن اور حیثیت اور جو امتیاز و فوقیت ان کے خیال میں ان کو حاصل تھی، اس کو برقرار رکھ سکیں، اللہ تعالیٰ نے اس جاہلی اور نسلی امتیاز کو ختم کیا اور ان کو حکم دیا کہ جس طرح اور لوگ کرتے ہیں، وہی وہ بھی کریں اور عرفات میں قیام کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" "ہاں تو تم وہاں

جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں"

امام بخاریؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "قریش اور وہ لوگ جو ان کے طریقہ پر مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور ان کو "حمس" کہا جاتا تھا، بقیہ سب عرب عرفات میں قیام کرتے تھے جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ عرفات جائیں اور وہاں قیام بھی کریں، پھر سب کے ساتھ وہاں سے واپس ہوں اور یہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے "مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" ابن کثیر، ابن عباس، مجاہد، عطاء، قتادہ، سدی اور دوسرے اکابر کا یہی خیال ہے، ابن جریر سے بھی یہی مروی ہے اور سب کا اس پر اجماع ہے۔

عہد جاہلیت میں حج کا موسم ایک دوسرے پر فخر کرنے اور مناظرہ و مقابلہ کا اسٹیج بن گیا تھا، جس طرح "عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز" کے بازار اور میلے تھے، اہل جاہلیت ہر ایسی تقریب اور ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، جہاں قبائل کو جمع ہو کر قصیدہ خوانی اور لن ترانی کا موقع مل سکے اور اپنے آباء و اجداد کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کئے جائیں، "منیٰ کا اجتماع" اس جاہلی جذبہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع فرمایا اور اس کا بہترین بدل عنایت فرمایا، ارشاد ہوا "فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا" "پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو تو اللہ کی یاد کرو، اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح، بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو،

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "اہل جاہلیت حج کے موسم میں ایک دوسرے سے مفاخرت کرتے تھے، کوئی یہ کہتا تھا کہ میرے باپ اس کو کھلاتے تھے اور اس طرح دوسروں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور دوسروں کی طرف سے خوں بہا دیتے تھے، اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کی توصیف کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا"۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ مومنون: ۲۳، و سورۂ حج: ۲، غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ تلخیص ارکان اربعہ: ۲۸۷-۳۵۷
☆ اپنے گھر سے بیت اللہ تک: ۹۵-۹۶

حج۔ براہیمی دعوت و تعلیم کی تجدید

اور

عقیدۂ توحید کی صدائے بازگشت

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ. إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ. وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ. ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ. مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾(سورۂ حج: ۷۳–۷۴)

(اے لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے، اسے غور سے سنو، بیشک جن لوگوں کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے، چاہے اس کے لیے سب مجتمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان کے سامنے سے کچھ چھین لے جائے، تو وہ اس سے چھڑا تک نہیں سکتے، طالب اور مطلوب (یعنی عابد اور معبود دونوں) گئے گذرے ہیں، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی پوری قدر نہیں کی، بے شک اللہ تعالیٰ ہی زبردست (اور) غالب ہے)۔

حسن خاتمہ اور مضامین سابقہ سے ربط و مناسبت

اللہ تبارک وتعالیٰ اس سورۂ حج کو ایسی آیات پر ختم کر رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو حج کے موضوع، حج کے مقصد، حج کے مقام اور حج کا حضرت ابراہیمؑ سے جو تعلق ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا حج سے جو تعلق ہے اور جو حج کی روح اور مقاصد ہیں ان کے لیے جس کو کہنا چاہیے کہ حسن خاتمہ ہے۔ یوں تو سب اچھا ہی اچھا ہے، لیکن خاتمے کا جو تعلق ہونا چاہیے، مضامین سابقہ سے وہ بڑا گہرا اور غور طلب، بلکہ ذہانت طلب تعلق ہوتا ہے ہمیشہ سے، تمام دنیا کے ادبیات میں اور اللہ کے کلام میں بھی اور رسولؐ کے کلام میں بھی۔ کسی کلام کے خاتمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس خاتمے کا اور اس کے مضامین سابقہ سے ربط جو ہوتا ہے، وہ بڑی عمیق چیز ہوتی ہے جس پر ان لوگوں کی نظر ہوتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ مناسبت عطا فرماتا ہے اور چیزیں تو نہیں کہتیں، مناسبت اصل چیز ہے۔ [(1)]

مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے معاملے کی یا اس کے اتارے ہوئے دین کی کوئی قیمت نہیں، لیکن جو عوامل کام کرتے رہتے ہیں، نفسیاتی طریقے پر اور اخلاقی طریقے پر، فکری طریقے پر اور ماحول کا جو اثر پڑتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر ادیان تقریباً بلکہ تمام ادیان کا اپنے مؤسس سے تعلق تقریباً ختم ہو گیا، جو بانی تھے ان مذاہب کے، ان بانیوں کا اصل جو مقصد تھا اور جو چیز ان پر غالب تھی، طاری تھی اور بلکہ حاوی تھی، اس سے تعلق ختم ہو گیا۔ اگر آپ دیکھیں، یہودی مذہب تو کھلا ہوا ہے، اب وہ

(۱) ہمارا محدود مطالعہ ہے، ہمارے مطالعے میں سابقین اور متاخرین میں سے حج پر اتنا حکیمانہ کلام نہیں کیا اور ایسا اصولی اور بنیادی جیسا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے یہاں ملتا ہے حجۃ اللہ البالغہ میں، یہ ہم اس لیے نہیں کہتے کہ لوگوں کا فکری اور دعوتی اور اعتقادی اور مسلکی تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے، ہم نے امام غزالی سے لیکر امام ابن تیمیہؒ تک اور امام ابن تیمیہ سے لے کر متاخرین تک کا سب کلام دیکھا، لیکن حج پر حالانکہ انہوں نے دو تین حج کئے ہوں گے، ان کا قیام مکہ معظمہ میں جتنا رہا، اس میں جتنے حج کے موقع آئے ہوں گے، لیکن یہ ان کی اصل توفیق الٰہی اور دینی ذہانت اور روح دین کے ادراک کا نتیجہ ہے کہ حج پر انہوں نے اتنا عمیق کلام کیا ہے۔

صرف ایک نسبی تفوق، ایک جنسی اور ایک نسبت انبیاء، انبیاء علیہم السلام سے جو ان کو ایک نسبت حاصل ہے صرف اس پر فخر اور ساری دنیا کو اور پوری نوع انسانی کو یہ سمجھنا کہ یہ ہماری چاکری کے لیے بنائی گئی ہے اور ہماری کامیابی اس میں ہے کہ ہم اس کو اپنا تابع رکھیں، چاہے بنا کر تابع رکھیں، چاہے بگاڑ کر تابع رکھیں، بگاڑنے کی صاف صاف تصریحات موجود ہیں، (آپ اگر "بروۃ الکرات صھیون" پڑھیں ہمارے پاس کتاب غالباً ابھی تک تھی وہ کتب خانہ میں داخل کردی) تو اس میں صاف صاف یہ ہے کہ نوع انسانی کو اتنا متاثر کردینا چاہیے، اتنا خراب (Corrupt) کردینا چاہیے کہ پھر ہم جو چاہیں وہ کریں اور وہ شطرنج کے مہروں کے طرح ہو جائیں، ہم جس مہروں کو جہاں سے اٹھائیں، جہاں رکھنا چاہیں، وہاں رکھدیں اور بالکل صاف صاف تصریحات موجود ہیں اور یہ اگر آپ ان دی فورٹ (In the Fort) کتاب پڑھیں، جو یہودی چلنے نہیں دیتے، معلوم ہے کہ جب اس کا اسٹاک (Stock) نکلتا تھا، ایک ایڈیشن نکلتا تھا، پورا کا پورا ایڈیشن اس کا عربی ترجمہ ہوا خوش قسمتی سے وہ ہمارے پاس تھا) اور انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ صحافت کے ذریعہ ناولوں کے ذریعہ، کہانیوں کے ذریعہ، ریڈیو کے ذریعے اور سب سے بڑھ کر پارلیامنٹ میں جن کے اثرات ہو سکتے ہیں ان پر اثر ڈالنے کے ذریعہ، جتنا بھی کسی ملک کو سوسائٹی کو اپنی مٹھی میں لیا جا سکے لیا جائے، خراب کر کے یا خاص تعلیم دے کر، تو ملت یہودی کا یہ حال ہے، ایسے ہی عیسائی ملت کا یا ہندوستان کے جو مذاہب ہیں، وہ تو بالکل کھلے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی بانی ہی نہیں معلوم ہوتا ہے، اول تو اس کا جو بانی معلوم ہوتا ہے تو اس کی تعلیم ہی موجود نہیں، بقول مفتی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے انہوں نے بڑے لطف کے ساتھ کہا حیدرآباد کی ایک تقریر میں کہ اللہ کے بندو! تم سے ان کے ناموں کا تو بوجھ اٹھایا نہیں جا سکا، یہ سب کیا لیے پھرتے ہو، پشتارا کہ یہ ہے ان کی تعلیم، نام بھی محفوظ نہیں کہ اگر پیغمبر آتے ہیں تو ان کے نام کیا تھے، یہ دو چار نام رہ گئے ہیں، کرشن جی، رام چندر جی۔

دینِ براہیمی سے تعلق قائم رہے

اس میں کچھ باتیں خاص طور پر بہت امتیازی ہیں، ایک توحج کا سب سے بڑا مقصد (شاید دنیاوی مقصد) ہے "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ" کہ اس ملت کا ملت ابراہیم سے، دین ابراہیم سے اور ذوق ابراہیم سے اور مسلک ابراہیمی سے اور جذبۂ ابراہیمی سے ہے۔ اس لیے کہ جذبہ میں محبت و عشق کی خاص کیفیت چاہیے۔ تاکہ تعلق قیامت تک باقی رہے، یہ حج کا بہت بڑا مقصد ہے۔ توحید کے ساتھ، دیکھئے یہ بہت نازک چیز ہے، توحید کی انتہائی حساسیت کے ساتھ محبت کی پوری کارفرمائی اور یہ بہت کم ہوتا ہے، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، جب ہم موحد ہو گئے، تو اب اس کے بعد یہ محبت کا اظہار جو گھر اس کی طرف منسوب ہے، اس سے بھی محبت اور ملتزم پر بھی جانا اور حجر اسود کو بوسہ دینا اور کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعاء کرنا اور اس بیت اللہ کا، بیشک بیت اللہ ہے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے، اللہ کے نام، لیکن اس کا طواف کرنا گیا، پھر عمرہ کرنا اور صفا مروہ کی سعی کرنا، یہ چیزیں ہیں، تو ایسا بہت کم ہوا ہے کہ توحید کی آخری حد جو آخری کنارہ ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ محبت کا بھی پورا اثر ہو، یعنی وہ توحید جو محض عقلی اور فلسفیانہ نہ ہو، محض منفی نہ ہو کہ یہ خدا نہیں، یہ خدا نہیں، نہیں یہ خدا ہے، تو پھر اس خدا پر جان دینا۔

توحید کی نزاکت

دیکھو مثبت منفی کا ایک فرق بتاتے ہیں، اگر توحید صرف اس کا نام ہے بڑی نازک بات ہے، توحید میں بہت زیادہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی اور تربیت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے توحید نہ پہنچی ہو اور کچھ تربیت نہ ہوئی ہو، تو توحید میں اس کا بڑا خطرہ ہے کہ اس پر سلبیت غالب آجائے، منفی یہ نہیں، یہ نہیں ہاں یہ ہے، اخیر میں گویا ایک مجبوری کہیے یا یہ کہ جس حد تک جائے آدمی کہیں نہ کہیں رکتا ہے، خدا تو بیشک ہے، لیکن بس اتنے ہی خدا ہے، نہیں اس توحید کے ساتھ ایک طرف تو توحید ایسی کھری اور پکی اور ایسی ہو کہ اس میں کوئی سایہ بھی نہ پڑ سکے غیر اللہ کا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و

تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک عاشقانہ تعلق ایک سرفروشانہ تعلق، دلبرانہ تعلق ہو، فدویانہ تعلق ایسا ہو یہ دو چیزیں کم جمع ہوتی ہیں، یہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات میں بھی جمع تھیں [1] تو ایک تو بہت بڑا مقصد حج کا ملت ابراہیمی کا امت محمدی کا امت اسلامیہ کا حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے ذوق کے ساتھ، حضرت ابراہیمؑ کی عاشقانہ کیفیت کے ساتھ قائم رہے، اس لیے وہاں لے جایا جاتا ہے، دکھایا جاتا ہے، انہی جگہوں پر ٹھہرایا جاتا ہے، یہ سب کام کرایا جاتا ہے۔

تحریف سے حفاظت

اور ایک دوسری بات یہ ہے (بڑی کام کی بات، بڑی فکر انگیز جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے) کہ تحریف سے بچانا، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ (یہی دین ابراہیمی) یہی دین محمدی ایک ملک میں کوئی شکل اختیار کر لیتا، دوسرے ملک میں کوئی شکل اختیار کر لیتا، کہیں نماز کس طرح پڑھی جا رہی ہو، کہیں نماز کسی طرح پڑھی جا رہی ہو، دیکھا ہے، وہاں، ایسی چیزیں جو ایسے حلقوں میں ہوتی ہے، مثلاً پیر پرستی ہے، جہاں دینی تعلیم عرصے سے نہیں ہے، یا غیر مسلموں کے اثرات ہیں کہ وہ چیزیں ایک ملک کو دوسرے ملک

---

(۱) آپ کو معلوم ہے کہ اسمٰعیلؑ کے ذبح میں جو بات ہے کہ ایک طرف تو توحید کی دعوت اور ایک طرف ایک خواب دیکھ لینے کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا معلوم کرنے کی بنا پر اپنے بیٹے کو گرا دیا اور چھری رکھدی، چھری پوری طاقت سے چلائی، یہ تو چونکہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے سمجھیں کہ رسماً تھی، نہیں تو پوری قوت سے چلائی، جب ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یا ابراہیم قد صدّقت الرّؤیا" تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، یہ "صدّقت الرّؤیا" اس کے معنی جو عربی سے واقف ہیں، زبان کی روح سے وہ اس کے معنی سمجھیں گے کہ یہاں پر تصدیق کا لفظ باب تفعیل کا لفظ کیوں لایا گیا ہے؟ "صدقت الرؤیا" بھی ہو سکتا تھا، "اَوْفَیْتَ الرُّؤیَا" دس لفظ ہو سکتے تھے، "صدّقت الرّؤیا" تم نے اپنے خواب کو پورے طور پر سچ کر دکھایا، کہ تم نے پوری طاقت سے چھری چلائی، لیکن ہمیں اسمٰعیل کے گلے پر چھری چلوانا مقصود نہیں تھی، جو محبت ہماری محبت کے مقابلے میں آسکتی تھی، اس کے گلے میں چھری چلوانی مقصود تھی، وہ چل گئی، جیسے ہی تم نے اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری رکھی، وہ تو ذبح ہو گئی، وہ محبت اس لیے کہ وہ تو آخری درجے کی چیز ہے وہی اس پر چھری رکھے گا اپنے بیٹے کے گلے پر کہ جو اس محبت کو فنا کر چکا ہو۔

کی خبر ہوسکتا ہے کہ نہ ہو، کہ وہاں کس طرح عبادت کی جا رہی ہے؟ کیا عقیدہ ہے؟ اسلام کے کیا کیا عقائد ہیں؟ کیا کیا فرائض ہیں؟ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شہر کو دوسرے شہر کی خبر نہ ہو اور یہ ہوسکتا ہے کہ ایک محلے کو دوسرے محلے کی خبر نہ ہو۔

• یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ محلے کو تحریف سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز باجماعت کا انتظام کیا، مسجد میں آؤ سب کو دیکھ لو، ہر ایک دوسرے کو دیکھے کہ اس طرح نماز پڑھیں، ٹھیک ہے، یوں کھڑے ہوتے ہیں، یوں رکوع کرتے ہیں، سجدہ کوئی اپنے گھر میں کیسے کرنے لگے اور شہر کو تحریف سے بچانے کے لیے جامع مسجد جمعہ کا انتظام کیا اللہ تعالیٰ نے [1] اور پورے عالم اسلام کو تحریف سے بچانے کے لیے حج کا انتظام کیا گیا، گھروں کو بچانے کے لیے محلے کی مسجد اسی لیے ترغیب ہے کہ مسجد ہی میں نماز پڑھو اور شہر کو تحریف سے بچانے کے لیے جامع مسجد اور پوری امت کو بچانے کے لیے حج کا انتظام کیا گیا، تو ایسا اگر حج نہ ہوتا تو ایسا ہوسکتا تھا کہ دنیا کے، عالم اسلامی کے کسی حصے میں ایک نیا دین شروع ہو جاتا، اس پر برسوں ممکن ہے کہ صدیوں تک عمل ہوتا رہتا اور پتہ نہ چلتا کیا ہو رہا ہے، معلوم نہیں کیا عقائد پرورش پاتے، کیا صورتیں بن جاتیں عبادت کی؟ لیکن وہاں جا کر سب دیکھ لیتے ہیں کہ یہ وہی نماز ہے جو ہمیں بتائی گئی ہے، جو قرآن و حدیث میں آئی ہے، اگر نماز میں جو باتیں کی گئیں، بدعات کی گئیں، وہ صحیح ہوتیں تو یہاں ہوتیں، اس لیے کہ اصل جگہ تو یہی ہے، یہاں نہیں ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ غلط ہے، تو مستند ہوتا نہ ہوتا وہاں جا کر معلوم ہو جاتا ہے۔

دین براہیمی کی اصل بنیاد اور اس کی دعوت

ہم نے یہ تمہید اس لیے کہی کہ اب یہ سورۂ حج جس سورت کا نام ہے اور جس میں حج پر

(۱) اور اسی لیے امام شافعیؒ کی بات، ان کی ذہانت کی بات تھی اور قابل قدر ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ کی نماز ہونی چاہیے، شافعی مسلک میں ترجیح اسی کو حاصل ہے اور ہم نے جامع ازہر کی مسجد میں دیکھا کہ لوگوں نے جمعہ کی نماز کے بعد پھر نماز پڑھی اس لیے کہ جو شافعی تھے، وہ جانتے ہیں کہ معلوم نہیں کتنی جگہ جمعہ ہو رہا ہے۔

بہت سی آیتیں حج سے متعلق تھیں اور وہ خالی احکام کے انداز میں نہیں تھیں، بلکہ جذبات پیدا ہوں، حج کا جذبہ اور حج کی روح پیدا کرنے کے انداز میں بھی تھیں، اب اس کا یہ آخری رکوع ہے، اب اس رکوع کو اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر ختم کر رہا ہے، جو دین ابراہیمی کی اصل بنیاد اور اس کی دعوت اور انکا ذوق، دعوت ہی نہیں بلکہ ان کا ذوق، ان کا جذبہ ہے، وہ کیا چیز ہے پہلی؟ وہ توحید ہے۔

توحید بدیہی کا ثبوت

تو پہلی آیت اس کے متعلق " یا اَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ " یہاں پر یہ خاتمہ ایسا ہونا چاہیے، جو طاقتور بھی ہو، واضح بھی ہو، واضح بھی ہو تو طاقتور بھی ہو، یہ خاتمے کے لیے ضروری ہے، جس مضمون کا خاتمہ کمزور ہوگا، وہ مضمون بلیغ نہیں سمجھا جائیگا، اب اس سے زیادہ کیا الفاظ صاف ہو سکتے ہیں اور شرک کی اصلی بے بنیادی، بے بنیاد ہونے، بے حقیقت ہونے اور توحید کے بدیہی ہونے اور قطعی ہونے کے لیے اس سے بہتر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ" اے لوگو! کیا انداز ہے دیکھ لیجیے پہلے، اے لوگو! ایک مثال دی جا رہی ہے، کان کھول کر سنو! "فَاسْتَمِعُوْا"، معلوم ہوتا ہے کہ ایکدم جیسے کوئی خطیب ہو، جب آخری درجہ پر اس کو جوش آ جاتا ہے، (اللہ تبارک و تعالیٰ معاف فرمائے) لیکن یہ کہ سورت کے مضامین کا اقتضا بھی یہی تھا، اب اس کو عام فہم اور مؤثر سے مؤثر اور واضح سے واضح طریقے پر اس کا خاتمہ کرنا چاہیے" اے لوگو! ایک مثال دی جا رہی ہے، ایک مثال دی گئی ہے، اس کو کان کھول کر سنو، "اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا، وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ" "بے شک جن لوگوں کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو، بلاتے ہو عبادت کرتے ہو، وہ ایک مکھی تک پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، چاہے سب جمع ہو کر یہ کام کریں" پھر کوئی کانفرنس بلائیں، کوئی کنونیشن بلائیں، لیکن ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے، سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے اور اتنی بات نہیں، "وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ" اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے، تو اس کو

بچا بھی نہیں سکتے اور یہ سب دیکھنے میں آتا ہے، اچھے اچھے بڑے بڑے رئیسوں کو اگر دیکھئے تو وہ زور کا پنکھا نہ چل رہا ہو اوپر سے اور وہ دوسرے انتظامات نہ ہوں اور وہ جراثیم کش چیز یں وہاں نہ لگی ہوں، تو مکھی تک ان سے نہیں بھاگ سکتی، مکھی ان کے ہاتھ میں جو لقمہ ہے، اس میں بیٹھ جائے گی، اس میں سے کچھ لے جائیگی۔

''وہ انسان جو شعر و فلسفہ اور سیاست و معاشرت کے باب میں بڑے بڑے دعوے کرتا ہے اور بڑی خوش فہمیاں رکھتا ہے، جس نے بارہا قوموں اور ملکوں کو غلام بنایا ہے، جس نے اپنے ہنر سے ٹھوس پتھروں کو مہکتے اور لہلہاتے پھولوں میں بدل دیا ہے اور پہاڑوں کے سینوں سے نہریں نکالی ہیں اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا بھی دعویٰ کیا ہے، یہی انسان ایسی حقیر و ذلیل چیزوں کو بھی سجدہ کرتا رہا ہے، جو نہ نفع دے سکتی ہیں، نہ نقصان، نہ کسی کو کچھ دے سکتی ہیں، نہ اس سے روک سکتی ہیں''،(۱) ''ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوب'' طالب بھی کمزور، مطلوب بھی کمزور، یہ معبود بھی کمزور یہ عابد بھی کمزور ہے۔

''اور یہی جہالت انسانوں کو مسجود ملائک کے بلند و بالا مقام سے گرا کر ضعیف مخلوقات اور ذلیل و بے حقیقت اشیاء کے سامنے سجدہ ریز کر دیتی ہے اور انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کر دیتی ہے، قادر مطلق پر، اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتی ہے اور سمیع و بصیر، صاحب قدرت و قلم، صاحب جود و عطاء اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کی لامحدود صفات اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے کمزور، عاجز، فقیر اور حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں''،(۲) ''ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوب'' طالب بھی کمزور، مطلوب بھی کمزور، یہ معبود بھی کمزور یہ عابد بھی کمزور ہے۔

''مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِه'' انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا پورا اندازہ نہیں لگایا، اردو میں کہتے ہیں قدر کرنا، اللہ تعالیٰ کی پوری قدر نہیں کی، قدر کے معنی اصل میں عربی میں اندازہ کے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پورا اندازہ ہی نہیں لگایا، انصاف ہی نہیں کیا''اِنَّ اللّٰهَ

(۱) اسلام کے اثرات و احسانات: ۲۲ (۲) منصب نبوت: ۲۰۷۔۳

لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ" بیشک اللہ تعالیٰ ہی قوی وعزیز ہے اور دیکھئے اوپر جو باتیں کہی گئیں ہیں ان سب کے لیے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی صفات یہ "اَلْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ" ہے، اس لیے کہ مکھی کی کمزوری بتائی گئی اور ان کے عابدین کی اگر ہو سکتے ہیں، یا انسانوں کی کمزوری بتائی گئی، تو یہاں پر اللہ ہی ہے جو "اَلْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ" ہے جو چاہے پیدا کرے نہ کوئی ان کا ہاتھ روک سکتا ہے، نہ کوئی اس کے یہاں سے لے سکتا ہے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہے، قوی بھی ہے، عزیز بھی، ہر قوی کے لیے عزیز ہونا ضروری نہیں، قوی ہے بہت لیکن غالب نہیں ہے، کوئی ترکیب ہے، کوئی جھانسہ دے جاتا ہے، کوئی اور طریقے سے کوئی چھین لے جاتا ہے، لے جا سکتا ہے، سو رہا ہو تو اس وقت قبضہ کر سکتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ قوی عزیز بھی ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ عزیز قوی بھی ہو، بہت سے ہیں جو عزت حاصل کر لیتے ہیں، غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن قوی نہیں ہوتے، تو قوی وعزیز دونوں صفتیں پائی جائیں تو پھر کوئی بات رہتی ہی نہیں، "اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ" "بیشک اللہ تعالیٰ ہی قوی اور عزیز ہے"۔

"یہ پوری کائنات (Universe) اسی کے ارادہ سے ہے، وہ "قوی" زبردست اور "عزیز، غالب" ہے، نہ کوئی اس کی طرح ہے، نہ اس کا کوئی مقابل اور برابری والا ہے، وہ بے مثال ہے، وہ کسی مدد کا محتاج نہیں، کائنات کے چلانے اور اس کا انتظام کرنے میں اس کا کوئی شریک، ساتھی اور مددگار نہیں"[1] ...."وہی اس کا خالق وصانع اور اس کا مدبر ہے اور خلق و امر کا اختیار اسی کو ہے، "اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (اسی کا کام پیدا کرنا ہے اور اسی کا کام حکم دینا ہے) اس دنیا کی ہر چیز اسی کے امر اور قدرت کے ذریعہ وجود میں آتی ہے اور اس کے وجود کی علت حقیقی اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے، اس طرح یہ کائنات اپنی تخلیق و وجود میں اس کے ماتحت اور تابع فرمان ہے "وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اس لیے ان مخلوقات کو جو ارادہ و اختیار رکھتی ہیں، اس کا فرماں بردار ہونا چاہیے، "اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ"[2]

(۱) اسلام کا تعارف: ۱۹ (۲) درس قرآن سورۂ حج: ۳۷-۴۷، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے بالترتیب اخذ و تلخیص کی گئی ہے: ☆ اسلام کے اثرات و احسانات: ۲۲ ☆ منصب نبوت: ۲۷-۳۷ ☆ اسلام کا تعارف: ۱۹ ☆ اسلام کے اثرات واحسانات: ۲۴

قربانی کی حکمت اور اس کی ضرورت (۱)

﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ. فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾(سورۂ حج: ۳۴-۳۵)

''اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے قربانی کا طریق مقرر کر دیا ہے، تا کہ جو مویشی چار پائے خدا نے ان کو دیے ہیں، (ان کے ذبح کرنے کے وقت) ان پر خدا کا نام لیں، سو تمہارا معبود ایک ہی ہے، تو اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ اور عاجزی کرنیوالوں کو خوشخبری سناؤ، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور (جب) ان پر مصیبت پڑتی ہے، تو صبر کرتے ہیں اور نماز آداب سے پڑھتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔

قربانی کا شجرۂ نسب

''وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا'' ''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی رکھی''

قبل اس کے کہ ان آیتوں کی تشریح اور کچھ تفسیر کی جائے، جن کا مرکزی محور اور مرکزی

نکتہ قربانی ہے، قربانی کا مقصد اور قربانی کا وجہ اور قربانی کی ضرورت اور قربانی کی شریعت اسلامی نہیں بلکہ شرائع الٰہی ہے، اس لیے قربانی کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ ہر مذہب میں قربانی تھی، مختلف جانوروں کے احکام تھوڑے تھوڑے اختلاف میں زمانے کے مطابق تھے، لیکن قربانی یہ قدر مشترک ہے، تمام مذاہب وادیان میں، اس کو سمجھ لینا چاہیے، اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان لانے اور عقیدۂ توحید کا یہ طبعی تقاضا ہے، بلکہ اس کا مطالبہ ہے اور اس کی حقیقت وفطرت میں داخل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز اللہ کے اوپر قربان کی جائے، یعنی یہ لفظ جو ہم بول رہے ہیں یہ قصداً ہے، عربی میں بھی یہ لفظ ہے تھوڑے فرق کے ساتھ، ماسوی اللہ جو ہے اس کو اللہ پر قربان کیا جائے، اس کو قربان کرنے کا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا، مثلاً کسی خواہش کا قربان کرنا، وہ کوئی مجسم چیز نہیں ہے کہ اس کے گلے میں چھری پھیری جائے، اولاد کو قربان کرنا، اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اولاد کو ذبح کر دیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کریں گے، محبوبات کو قربان کرنا، مرغوبات کو قربان کرنا، عادات جاہلیہ کو قربان کرنا، رسم ورواج کو قربان کرنا، حب جاہ اور اعزاز طلبی، بڑے بننے کے شوق کو قربان کرنا اور دوسرے کے مقابلے میں اپنی ذات کی بڑائی کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کے جذبے کو قربان کرنا، یہ سب قربانی کے ذیل میں آتا ہے، لیکن ہر چیز کی قربانی الگ الگ ہوتی ہے، ہر چیز کی قربانی اس طرح نہیں ہوسکتی ہے، ان کا جسم ہی نہیں ہے کہ ان کو لٹا کر ان کے گلے پر چھری پھیری جائے۔

"مجھے افسوس ہے کہ قربانی کا لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور ہماری سیاسی تحریکوں نے (لکھنؤ کی زبان میں کہوں گا کہ) اس کی مٹی ایسی پلید کی ہے (اور علمی زبان میں کہوں گا کہ) اس کا ایسا غلط استعمال کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کھو چکا ہے، قربانی تو وہ چیز ہے کہ اس کو سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، لیکن ہم قربانی کا لفظ جب استعمال کرتے ہیں تو ملازمت کی قربانی کو تنخواہ کی معمولی سی قربانی کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں، لیکن قربانی وہ باعظمت اور مقدس چیز ہے، جس کی تاریخ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتی

ہے، ہر چیز کا شجرۂ نسب ہوتا ہے، مسجد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی مسجد کعبہ یعنی بیت اللہ سے ملتا ہے اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمیؑ پر جا کر ختم نہ ہو، وہ مسجد خانۂ خدا کہلانے کی مستحق نہیں وہ مسجد ضرار ہے اور جس مدرسہ کا شجرۂ نسب صفۂ نبویؐ پر ختم نہ ہو، وہ مدرسہ دانش کدہ نہیں، جہالت کدہ ہے، تو اس طرح میں کہوں گا کہ جس قربانی کا شجرۂ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبۂ ایثار و حب خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی و تسلیم و رضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے"۔ (۱)

اب اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا کم سے کم امت اسلامیہ میں جو شریعت محمدی اور امت اسلامی، یہ اسلام وہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ" یہ تمہارے جد امجد، تمہارے مورث اعلیٰ، دینی مورث اعلیٰ ابراہیم کا مذہب ہے، ان کی ملت ہے، انہوں نے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے اور اسلام کے معنی ہیں، دست بردار ہو جانا اور قربان کر دینا، بے ادبی نہ ہو تو ہم کہیں گے اس کے لیے خاص اصطلاح ہے انگریزی میں سرینڈر (Surrender) کر دینا، یعنی بالکل اس کے سامنے بے حقیقت بن جانا اور کسی قسم کا معارضہ نہ کرنا، بلکہ اپنے کو حوالہ کر دینا اور تقاضے کو بھی اس پر قربان کر دینا، تو قربانی کو یوں سمجھیں کہ ملت اسلامی میں جو قربانی ہے، وہ اس طرح ہوتی ہے۔

دنیا کی ہر قوم و تہذیب میں قربانی کا رواج

"لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا" "اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے قربانی کا طریق مقرر کر دیا ہے"

دنیا کی کوئی قوم اور ملت ایسی نہیں جو کچھ نہ کچھ مقدس مقامات نہ رکھتی ہو اور اس کے متبعین اور پیرو کسی خاص مذہبی موقع پر ایک جگہ جمع نہ ہوتے ہوں، ان مذہبی مقامات کی زیارت یا مذہبی سفر کے لیے کچھ اصول اور طریقے اور رسوم و روایات ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عمل فطرت بشری کے عین مطابق اور ضمیر کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے، انسان

(۱) دعوت فکر و عمل ۲۵-۲۶

برابر کسی ایسی چیز کی جستجو اور آرزو میں رہتا ہے، جس سے قریب ہو کر وہ اپنے جذبۂ عقیدت و محبت کی تسکین کر سکے، وہ ایک ایسا طویل اور بڑا عمل چاہتا ہے، جس سے اس کے بڑے بڑے گناہوں اور مہلک غلطیوں کی تلافی ہو سکے اور وہ ضمیر کی چبھن، مذہبی حس کی کھٹک اور سوسائٹی کی ملامت سے چھٹکارا پا سکے، اس کے اندر ایک ایسے عظیم اور عام دینی اجتماع کی طلب پوشیدہ ہے، جہاں صرف دینی اخوت اور روحانی رشتہ کارفرما ہو، کوئی دوسری اساس اور دوسرا جذبہ اس میں شامل نہ ہو۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اور تہذیب کا کوئی دور ان مذہبی سفروں، زیارت گاہوں اور مقدس و متبرک مقامات سے خالی نہیں، جہاں لوگ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور یا اپنے خودساختہ معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کے لیے قربانیاں کرتے ہیں، نذریں مانتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

قربانی کے فوائد و مصلحتیں

تو قربانی ہر مذہب میں رہی ہے، قربانی کے فوائد بھی آپ سمجھ لیجیے[1] قربانی کا ایک فائدہ ہے کہ مرغوب چیز کو خدا کے راستے میں قربان کرنا اور مرغوبات میں صدہا ایسی چیزیں ہیں جن کے قربان کرنے کی اللہ تعالیٰ اجازت نہیں دے سکتا، انسانوں سے محبت ہوتی ہے، حقیقی بھائی سے محبت ہوتی ہے، بہن سے محبت ہوتی ہے، ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، استاد سے محبت ہوتی ہے، کسی سے روحانی فائدہ پہنچا ہو اس سے محبت ہوتی ہے اور محلے والوں سے

(۱) بعض روشن خیالوں اور بہت ترقی پسند لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی، انہوں نے مضامین لکھے اور تحریک چلائی، کہ اب قربانی کی ضرورت نہیں کہ قربانی معاذ اللہ ایک بھدا سا فعل ہے، نماز پڑھنی چاہیے، دعاء کرنی چاہیے، اپنے اخبات و انابت کا اظہار کرنا چاہیے، جانور کا کیا قصور ہے، جانوروں کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر اس میں وہ اقتصادیات بھی شامل ہو گئے اور مادیات بھی شامل ہو گئے، تو اب تو یہ فتنہ تقریباً ختم ہو گیا ہے، ہمارے بچپن کا زمانہ رہا ہوگا، کہ جب یہ باقاعدہ روشن خیال لوگ یونیورسٹیوں کے فضلاء اور یورپ سے پڑھ کر آنے والے قربانی پر انہوں نے اعتراض کرنا شروع کیا، تشکیک پیدا کرنی شروع کی کہ قربانی ایک غیر عقلی فعل ہے، اس کی اب ضرورت نہیں، وہ ایک زمانہ تھا۔

محبت ہوتی ہے، رفیق کار سے محبت ہوتی ہے، بعض ایسی چیزیں ہیں کہ جن سے محبت ہے ان سے قربانی، مثلاً کسی کو اپنی شیروانی پسند ہے، تو اسکی قربانی کیا ہوگی، کسی کو اپنی گھڑی پسند ہے، کسی کو اپنا عصا پسند ہے، تو ہر چیز کی قربانی نہیں ہوسکتی، قربانی جانور کی ہوسکتی ہے، اس لیے مرغوبات کی قربانی کا نمائندہ بنایا اللہ تعالیٰ نے مظہر بنایا جانور کو، اس میں محبوب چیز کی قربانی کا پورا مظاہرہ آگیا، عمل آگیا۔ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ قربانی کے عمل میں، قربانی کے حکم میں، ردشرک بھی مقصود ہے، قربانی کے حکم میں ایک بہت بڑا جو اس کا نکتہ جو اس کا مقصد ہے، وہ ہے ایسی چیز کو ایسے جانوروں کو قربان کرنا، جن کو کبھی نہ کبھی کسی زمانے میں کسی قوم میں یا کسی نہ کسی مذہب میں مقدس سمجھا گیا، معبود بنایا گیا اور آج بھی، اسی لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بڑے نکتے کی بات لکھی ہے، کہ ''ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است'' کہیں کوئی بات ہوئی ہوگی کہ گائے کی قربانی کا رواج کم ہوگیا ہوگا نہیں، انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی اور زیادہ ضروری ہے، یہ شعائر اسلام ہے، اس لیے کہ یہاں اس کی پرستش ہوتی ہے، تو یہاں تو خاص طور سے اس کی قربانی کر کے مسلمانوں کو ثابت کرنا چاہیے۔ کہ دیکھو یہ معبود نہیں ہو

(۱) مرغوبات میں قربانی کا نمائندہ جانور کی قربانی، چونکہ اس میں پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں، ہر ایک جو بھی شخص ہوگا، کسی نے دیا ہوگا جانور یا خریدا ہوگا، اس نے یا موروثی ہوگا، تو ابھی اوپر سے تو پیسے بھی خرچ، لیکن عام طور سے قربانی کے لیے لوگوں کو جانور خریدنے پڑتے ہیں، وہ کتنے آدمی ہیں، جن کے یہاں بکری پلی ہوتی ہے، بہت دن سے، بس وہ بکری کافی ہے، اگر ہوگی اس سال، تو قربانی کی تو تکرار ہوتی ہے، یہ بڑی مصلحت ہے دین کی، کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ قربانی کافی نہیں، ہر سال قربانی کرنی چاہیے ورنہ یہ ہوتا کہ ایک جانور تھا ہمارے پاس خرچ نہیں ہوا چلو اس کو قربانی کر دیں، نہیں اس سال پھر قربانی کرو، اچھا اور اس میں ایک نکتہ بھی ہے، کہ دام بھی بڑھتے رہتے ہیں، اس میں بھی بڑا نکتہ ہے، اب وہ ہمیں یاد ہے بچپن میں کہ بکری آٹھ روپے کی لے آئے، دس روپے کی لے آئے، اب دیکھو لو گوشت کی قیمت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، تو دام بھی بڑھتے رہتے ہیں تو اور قربانی کی اس کے اندر صفت پیدا ہوگئی ہے، کہ ہر سال کرنے میں یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اتنے دام خرچ ہوتے ہیں، وہ بڑھتے جائیں گے، تو قربانی کی قیمت بھی بڑھتی جائیگی، قربانی کی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں قدر و قیمت بھی بڑھتی جائےگی، اتنا خرچ کر کے کیا، پھر اگلے سال اتنا خرچ کر کے کیا۔

سکتا، یا اپنے کو بچا بھی نہیں سکا، قربانی تو عبودیت کی آخری نشانی ہے، عجز کی اور ناطاقتی کی[1] غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ قربانی میں بڑی مصلحتیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ سنت ابراہیمی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کے بعد پھر تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں، لیکن چونکہ لوگوں نے کہا، اس لیے ہم نے بتایا کہ قربانی میں ایک تو مرغوب کی قربانی ہے، ایک کو مرغوبات کا نمائندہ بنا کر اس کو قربان کرنا ہے، جس کے ساتھ بہت سے مفادات اور فوائد وابستہ تھے، اس کا گوشت لذیذ ہے اور اس میں لذت بھی ہے، قوت بھی ہے، غذائیت بھی ہے، یہ سب کچھ ہے، اس کو ہم نے قربان کیا اور گوشت سب تقسیم ہو گیا۔

اور دوسری بات یہ کہ اس میں رد شرک ہے اور رد شرک اتنا بڑا ہے کہ کسی اور چیز سے اتنا رد شرک ہو ہی نہیں سکتا، جس کی پرستش کی جا رہی ہے، اس کو لٹا کر ہم اس پر چھری پھیر رہے ہیں اور اس کو ذلیل کر کے اللہ کا نام تو لیتے ہیں لیکن بالکل اس کو بے بس بنا کر قربان کر رہے ہیں۔

قربانی کی ابتداء ذکر الٰہی سے ہونی چاہیے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" "تا کہ اللہ کا نام لیں وہ اس چیز پر جس کو اللہ نے ان کو عطا کیا ہے" چلنے والے جانوروں میں سے چوپایوں میں سے جو ہم نے عطا کیا، اس میں معلوم ہوا کہ وہ مرغوب چیز ہے، اللہ نے رزق کی نسبت اپنے طرف کی ہے کہ ہم نے جو اس کو ایک نعمت کے طور پر ایک مفید اور کارآمد

(۱) اس میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مذاہب کی تاریخ کے تقابلی مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے (Comprative Study) جسے کہتے ہیں اور آج کل اس کے بہت ذرائع پیدا ہو گئے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا لکھے گئے ہیں، مذاہب کے بارے میں پوری معلومات ہیں تو مذاہب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کی تقدیس اور تقدیس ہی نہیں جانوروں کی پرستش کا بہت سے مذہبوں میں یا کہا جا سکتا ہے اکثر مذہبوں میں کسی نہ کسی طریقے سے رواج ہو گیا، کہیں کسی جانور کو مقدس ماننے لگے، ہر نسبتیں الگ الگ رہی ہیں، کیوں مانتے ہیں یہ ہمارے پیر کا جانور ہے، یہ ہمارے استاد کا، یہ ہمارے فلاں بزرگ کا جس کی دعا سے کام ہوا، کبھی کسی نسبت سے اور کبھی کسی نسبت سے اور کبھی اسکے کسی اور فعل کو دیکھ کر جس پر آدمی نے محمول کیا، غیر اتفاقی چیز پر اور ہندوستان میں شروع سے جانور کی پرستش ہو رہی ہے اور گائے اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

چیز دی ہے، اس پر اللہ کا نام لے کر اس کو قربان کردیں، یہی قربانی کی روح ہے، اس میں کوئی لفظ زائد نہیں ہے، ہر لفظ کے اندر مطالب ہیں اور حقائق ہیں، "لِيَذْكُرُوْا"[1] تاکہ ذکر کریں، معلوم ہوا کہ یہ عبادت ہے عادت نہیں ہے اور یہ کوئی سرکاری حکم نہیں ہے، بلکہ یہ ایمان و احتساب کی چیز ہے، اللہ کی رضا کے لیے کی جارہی ہے، اس کی ابتداء ذکر الٰہی سے ہونی چاہیے اللہ کا نام اس پر لینا چاہیے اور اللہ کا نام لیں اس پر "عَلٰى مَارَزَقَهُم" "اس چیز پر جو اللہ نے اس کو عطا کی تھی" چوپایوں میں سے جانوروں میں سے۔

"فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" اب دیکھیے ہم نے جو بات کہی تھی کہ بہت بڑا جو اس میں راز ہے، مقصد ہے وہ توحید ہے، توحید کا اعلان ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز کا عاجز ہونا ثابت کرنا اور ہمارے اپنے گویا قابو میں ہونا ثابت کرنا ہے، "فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" اس لیے یہ اس کے ساتھ فوراً آیا ہے کہ "فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا" "پس تمہارا پروردگار معبود اِلٰہ واحد ہے" "فَلَهٗ اَسْلِمُوْا" "اسی کے سامنے سر جھکادو"۔

"وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ" اور بشارت دیجیے ان لوگوں کو جو حکم مانتے ہیں بے چون و چرا اور فوراً، اخبات کے اندر، سرعت کے ساتھ جو اطاعت ہو اور بلا چون و چرا جو اطاعت ہو، اس کو اخبات کہتے ہیں، "اَخْبَتُوْا" بالکل سر افگندہ ہو گئے، بالکل سر تسلیم خم کردیا، حکم کے بندے بن گئے "اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" ان مخبتین کو بشارت دیجیے کہ جب اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں، "وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ" اور اسی طریقے سے بشارت دیجیے ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں، اس چیز پر جو ان کو پہنچی، اب اسی میں جو پیسہ خرچ ہوا، وہ بھی اس طرح "عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ" میں شامل ہے، ایک جانور پلا ہوا تھا، روز دیکھتے تھے، ایک اس سے تعلق پیدا ہو گیا تھا، مانوس ہو گیا تھا وہ، یہ بھی ہے، "وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ" اور بشارت دیجیے نماز کی پابندی کرنے والوں کو، "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" اور جو ہم نے ان کو دیا اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، اس لیے کہ قربانی میں یہ صفت بھی شامل ہے۔[1]

(۱) درس قرآن سورۂ حج ۳۴ - ۳۵، غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ ارکان اربعہ: ۳۳۱-۳۴۲ ☆ دعوت فکر و عمل: ۲۵-۲۶، سے مشترک اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

قربانی کی حکمت اور اس کی ضرورت (۲)

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ. فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ. كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ. لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا. وَلَٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ. كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ. وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(سورۃ الحج: ۳۶-۳۷)

"اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر خدا مقرر کیا ہے، ان میں تمہارے لیے فائدے ہیں، تو (قربانی کرنے کے وقت) قطار باندھ کر ان پر خدا کا نام لو، جب پہلو کے بل گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور قناعت سے بیٹھ رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ، اس طرح ہم نے ان کو تمہارے زیرفرمان کر دیا ہے، تاکہ تم شکر کرو، خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے، اسی طرح خدا نے ان کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس بات کے بدلے کہ اس نے تم کو ہدایت بخشی ہے، اسے بزرگی سے یاد کرو اور (اے پیغمبر) نیکوکاروں کو خوشخبری سنادو"۔

اونٹ بھی اللہ کی ایک نشانی ہے

"وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" اور یہ اونٹ جو ہیں ہم نے ان کو تمہارے لیے عرب کے لوگ جو قرآن مجید کے مخاطبین اولین تھے، جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا، ان کے نزدیک اونٹ بہت بڑی دولت ہے اور ان کی زبان و ادب معاشرہ اور عادات میں اونٹ داخل ہے، یعنی ان کے نفسیات میں اونٹ داخل ہے۔ اس کا اندازہ ہم آپ نہیں کر سکتے، اگر ہم شاعری پڑھیں، ہم حماسہ پڑھیں، جاہلیت کا کلام پڑھیں، اس زمانہ کے مکالے دیکھیں، اس زمانے میں آپس میں ملنے جلنے میں جو بے تکلف باتیں ہوتی ہیں، تو معلوم ہوا کہ اونٹ کتنی بڑی چیز تھی، اس کا ہم عجمی وہ تصور نہیں کر سکتے اور آج عربوں میں بھی وہ بات نہیں رہی، ان کے یہاں اونٹ بھی تلاش کرنے سے اب دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ تو فرمایا کہ "ہم نے اونٹوں کو تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں بنایا ہے" یعنی اللہ کی نشانیوں میں سے وہ ایک چیز ہے اور علامت ہے گویا، "لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ" تمہارے لیے اس میں بڑی خیر ہے، اب یہ اس طرح اور "يَا عَلِيُّ لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ" اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو "حمر النعم" سے بھی بڑھ کر ہے اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے وہ واقعہ سنایا کہ آج حضور ﷺ نے امتحاناً ایک بات پوچھی جیسے پہیلی بجھائی جاتی ہے، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان سے بہت مشابہ ہے، اس کے پتے نہیں گرتے، وہ ہلاکت کا شکار نہیں ہوتا، ہر سال پھلتا ہے، تو "فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي" کہتے ہیں کہ لوگ جنگل کے درختوں میں جا پڑے اور پہیلی کا فلسفہ یہ ہے کہ جتنی روزمرہ کی چیز کو پہیلی بنا کر پوچھا جائے، اتنی ہی وہ مشکل ہوتی ہے، آدمی کا ذہن وہیں جاتا ہے کہ یہ کوئی بات پوچھنے کی تھوڑے ہوگی، پانی کی کوئی پہیلی بنائے تو "فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي" لوگ جنگل کے درختوں میں پڑ گئے کہ وہ ہوگا یہ ہوگا، میرے دل میں آیا "وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا نَخْلَةٌ" میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کے بارے میں آپ پوچھ

رہے ہیں، اس لیے کہ کھجور کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ سامنے کی چیز ہے، آپ نے خود ہی فرمایا کہ کھجور ہے، تو حضرت عمرؓ سے جب یہ واقعہ فرمایا تو کہنے لگے کہ ارے ہمیں سرخ اونٹ مل جاتے تو ہمیں اتنی خوشی نہ ہوتی، جتنی تمہارے بتا دینے سے، بیٹے کی کامیابی سے خوشی ہوتی ہے باپ کو کہ کیسا ذہین بیٹا ہے۔

تو اونٹ جو ہے یہ عربوں کی زبان میں ادب میں، تخیل میں، ضرب الامثال میں ہے ہم نے ان کو شعائر اللہ میں سے بنا دیا ہے، تمہارے لیے اس میں بہت نفع ہے، بہت خیر ہے "فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ" تم اس پر اللہ کا نام لو، اس کو کھڑا کر کے قطار میں بنا کر کے، اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ پچھاڑا جائے بکرے کی طرح، گرنا بھی اس کا مشکل، بہت بڑا ہوتا ہے اور پھر وہ پڑا رہے یہ بھی مشکل ہے، تو جب کئی اونٹ ہوں، حضور ﷺ نے کئی اونٹ ذبح کیے، حجۃ الوداع میں، تو اس کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ قطار در قطار کھڑا کر دیا جائے اور پھر اس پر چھری پھیری جائے اور وہ عرب جو ہیں قصائی وہی سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سینے میں چھری ڈال دیتے تھے تمام خون بہہ جاتا تھا، خود گر پڑتا تھا، پھر اس کے بعد باقاعدہ اس کو ذبح کرتے تھے، "فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا" "جب وہ اس کے پہلو گر جائیں" اور وہ ٹھنڈا پڑنے لگے، "فَكُلُوْا مِنْهَا" یعنی وہ بالکل اس کی جان نکل جائے، "فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" "تو تم بھی کھاؤ اس میں سے اور اس کو بھی کھلاؤ جو اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں ہے" مانگتا نہیں ہے "قَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ جو بار بار مانگتا ہے، ہمیں بھی دیجیے، ہمیں بھی دیجیے اور پھر عربوں کو اونٹ کا گوشت پسند بھی بہت ہے، ہم لوگوں کو تو پورے طور پر ہضم بھی ہونا مشکل ہے۔ ہم نے امتحاناً ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں کھایا۔

"كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" "اسی طریقے سے ہم نے اس کو تمہارے قابو میں دیا، تا کہ تم شکر کرو"۔

اللہ کے دربار میں صرف تقویٰ کی رسائی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا" اب وہ قربانی اللہ کے لیے کی جاتی ہے، اللہ کا حکم ہے، اتنی تاکید ہے، اتنا ثواب ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز آسمان میں پہنچتی ہے کیا اور یہ بتائیں آپ کو کہ عیسائیت میں اور بعض مذاہب میں یہ تھا کہ جو قربانی کی جاتی ہے بعض بت پرستانہ مذاہب میں وہ دیوتاؤں تک پہنچ جاتی ہے اور دیوتا اس کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کا خون پیتے ہیں، یعنی وہ اس سے لذت حاصل کرتے ہیں اور غذا حاصل کرتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کے ویدوں میں یا کسی چیز میں نکلے تو مل جائے "لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا ولَا دِمَاؤُهَا" اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کے گوشت پہنچیں گے نہ ان کے خون پہنچیں گے، "ولٰكِنْ يَنَالُه التَّقْوىٰ مِنْكُم" اللہ کے یہاں جو چیز تمہاری پہنچنے والی ہے، وہ تمہارا تقویٰ ہے کہ اللہ کے خیال سے، اللہ کے حکم سے اس کی محبت میں تم نے یہ کیا "كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ" "اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس کو مسخر کر دیا، تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اور تکبیر کہو اس پر جس کی تمہیں اللہ نے ھدایت دی اور نیکوکاروں کو بشارت دیجیے"۔

(۱) درس قرآن۔ سورۂ حج: ۳۵-۳۷، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ حسب ذیل کتب سے اخذ و تلخیص کیے گئے ہیں: ☆ ارکان اربعہ: ۳۳۱-۳۳۴ ☆ دعوت فکر و عمل: ۳۵-۳۶

ذبح عظیم کی حقیقت اور اس کی مصلحت

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى، قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا. اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، وَاِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾(سورۃ الصفت: ۱۰۲-۱۰۷)

"جب وہ (بیٹا حضرت اسمٰعیل) ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو کہا (حضرت ابراہیمؑ نے) میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا ابا جان! اس کو آپ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے۔ مجھے آپ دیکھیں گے میں صابر ہوں۔ جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا اور ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! تم نے خواب سچ کر دکھایا، بیشک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو اور بیشک یہ بہت بڑی آزمائش تھی اور ہم نے ان (اسمٰعیلؑ) کا فدیہ دیا ذبح عظیم سے"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ" "جب وہ بیٹا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا" واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے یہاں بڑی دعاؤں اور ارمانوں

کے بعد بیٹا ہوا، اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا انہوں نے، بیٹے سے باپ کا تعلق ہوتا ہے، وہ ہوتا ہی ہے، لیکن باپ سے بیٹے کا اس وقت تعلق بڑھ جاتا ہے اور اس میں بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ اس سے زیادہ ملتا رہے، اس کے ساتھ زیادہ وقت گذارے اور اس کے ساتھ کچھ چلنے پھرنے لگے، یہ فطری بات ہے، جس کے ساتھ جتنا وقت گذرتا ہے اس کے ساتھ اتنا علاقہ ہوتا ہے، جب تک لڑکا ماں کی گود میں ہے اور ماں کی نگرانی اور کفالت میں ہے، وہی لٹاتی ہے، اٹھاتی ہے، بٹھاتی ہے، کھلاتی ہے، اس وقت تک ماں کا تعلق زیادہ ہوتا ہے باپ سے، باپ کسی کسی وقت دیکھتا ہے، باپ میں اور ماں میں تو فرق ہے، باپ گھر میں ہمیشہ نہیں رہتا اور بچے کی چارپائی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتا، اس کمرے میں بھی ہمیشہ نہیں رہتا اور ہو سکتا ہے کہ اس گھر میں بھی نہیں رہتا۔

یہ حکمت ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کہ کوئی لفظ قرآن مجید کا اعجاز سے خالی نہیں، "**فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ**" جب بیٹا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، اب وہ گرویدگی پیدا ہوئی، ہر وقت دیکھنا، صورت دیکھنا اور پیار کرنا، پیار آنا اور اس کی بھولی بھولی باتیں سننا اور محبت کا جوش پیدا ہو جانا اور کبھی کبھی بچہ ساتھ جا رہا ہے، ابا ہم بھی چلیں گے، کبھی بازار کے لیے یا تھوڑے فاصلے کے لیے وہ بھی چلا، انگلی پکڑ کر چل رہا ہے، کبھی دامن پکڑ کر چل رہا ہے، اب اصلی تعلق پیدا ہوا، "**فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ**" اب اس وقت "**قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ**" کس طرح ہوا، یہ بھی اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ صاف صاف وحی کے ذریعہ سے نہیں کہا گیا، بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہے، ایک صورت یہ بھی کہ وحی آتی کہ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو قربان کرو، تو اس میں کوئی چارہ ہی نہیں، لیکن خواب کا معاملہ ایسا ہے کہ آدمی اس کی تاویل کر سکتا ہے، بھئی خواب تو خواب ہی ہے، لیکن محبت وعشق کا اظہار اور اخلاص کا جو اظہار ہے، وہ بالکل اللہ تعالیٰ کے سامنے سرافگندہ ہو جانا اور اپنے کو بالکل حوالے کر دینا اور اس کے ہر اشارہ کو حکم سمجھنا اور اس کے ہر ایماء کو نص سمجھنا، اس کا فرق سمجھتے ہیں؟ ہر ایماء کو اشارہ کی حلت میں اس کو بھی نص صریح سمجھنا، یہ بڑی محبت کو چاہتا ہے اور اطاعت کلی کو چاہتا ہے اور فدویت کو چاہتا ہے۔

تو اب دیکھئے کتنا مشکل موقع تھا، کہ ایک تو بیٹا ایسا کہ بڑی دعاؤں اور ار مانوں سے پیدا ہوا اور اس کو جد امجد ہونا ہے، نبی آخر الزماں کا اور سچ پوچھئے کہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف ہو گیا تھا کسی طریقے سے، کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"، تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ان کے چہرے کو دیکھتے ہی دیکھتے سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کا نور پوری دنیا میں پھیلے گا اور سچ پوچھئے تو آج دنیا میں جو عقیدۂ توحید ہے اور جو دین حنیف ہے اور جو دین صحیح ہے وہ اس کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ پر تو ختم ہوتی ہے، لیکن ابراہیمؑ کا جو بیٹا ہوا اسمٰعیلؑ (اسمٰعیلؑ یہ جد امجد ہیں حضور ﷺ کے) ایسا ہونہار بیٹا ہے، تو معمولی لوگ سمجھ جاتے ہیں، ان کو کچھ نجابت کے، ہونہاری کے اور ترقی کے آثار نظر آتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام تو نبی تھے، تو امتحان کو دیکھئے ایک تو بیٹا وہ جو بڑی امیدوں کے بعد پیدا ہوا، بیٹا بھی وہ کہ دوسرے بھی دیکھیں تو ان کا تعظیم کرنے کو جی چاہے، گود میں لینے کا جی چاہے اور پیشانی کو بوسہ دینے کا جی چاہے، پھر وہ وقت آیا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے، اس وقت وہ پھر صاف صاف آواز نہیں آئی، فرشتے نے آکر نہیں کہا کہ آپ ان کو ذبح کیجئے، بلکہ خواب میں دکھایا گیا، دوسرا ہوتا تو کہتا کہ بھئی خواب کا کیا اعتبار ہے، خواب تو ہر طرح کے دکھائی دیتے ہیں، اتنا بڑا کام کہ بیٹے کو ذبح کرو، محض خواب کی بناپر۔ بھئی یہ معاملہ تو عاشق کا سا محب محبوب کا سا معاملہ تھا، یہ تو حضرت ابراہیمؑ اور اللہ کا معاملہ تھا، اللہ اور ابراہیمؑ کے درمیان جو تعلق ہے، وہ تعلق ہر دو کے درمیان نہیں ہوتا، پھر عجیب بات یہ ہے اس کی ایک ایک چیز اعجاز کی ہے، کہ ایسی بات جس کے ساتھ یہ عمل کرنا ہے، اس کو نہیں کہی جاتی، مثلاً کوئی کہے کہ آج ہمیں تمہیں مارنے کو جی چاہتا ہے، بہت دنوں سے میں نے مارا نہیں ہے، آج میرا مارنے کو جی چاہتا ہے، کوئی نہیں کہے گا اس کو، یہاں تک کہ کسی طریقے سے اور اظہار کرنا وہ بھی ناگواری کا، وہ بھی ایک تجربہ کار استاد نہیں کیا کرتا، صرف یہ کہ استاد نہیں کہ پہلے تو یہ کہ خواب میں دکھائی دیا، خواب میں کیا چیز کہی جاتی ہے، آخری درجہ کی چیز کہ ذبح کرو۔

اور پھر ابراہم علیہ السلام اسمٰعیلؑ سے کہتے ہیں، "يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ" میرے بیٹے، اس سے یہ بھی بات معلوم ہوئی کہ ابراہیمؑ سمجھ گئے یہ بچہ ہے،

جس کے ذریعہ سے عقیدۂ توحید اور دین خالص دین دنیا میں پھیلے گا، تو یہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس سے کہا جا سکتا ہے، اسی وقت اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا اس سے گھبرائے گا نہیں، یہ کسی تفسیر میں نہیں لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خود آدمی اپنے قیاس و تجربہ سے سمجھ سکتا ہے، مگر حیرت کی بات ہے، اللہ اکبر کیسے کہا گیا ان سے "یَابُنَیَّ اِنِّی اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّی اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" میں دیکھ رہا ہوں، بار بار میں دیکھتا ہوں، امام بخاری نے ترجمۃ الباب لکھا ہے، "رُؤیا الأنبیاءِ حَقٌّ" انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی و حق ہوتا ہے، میرے بیٹے، لاڈلے میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، پھر اس کے بعد اس سے زیادہ آزمائش کی چیز حیرت ناک یہ کہ "فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" تم بتاؤ تمہاری رائے کیا ہے، یعنی اگر اس کو اس کا اطمینان نہ ہوتا کہ یہ فوراً سر تسلیم خم کر دے گا، تو تب یہ نہ پوچھتے، یہ ہم اپنے قیاس سے کہتے ہیں کہ ایسی بات جس کی نسبت خدا کی طرف ہو اور جس کا خدا کی طرف سے اشارہ ہو، اس میں آدمی مشورہ نہیں کیا کرتا۔ اس وقت مشورہ کرتا ہے، جب اس کو سو فیصد یقین ہو کہ وہ سر تسلیم خم کرے گا، اس میں اور کوئی امکان ہی نہیں ہے، "یَابُنَیَّ اِنِّی اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّی اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" بیٹا عجیب بات ہے، میں خواب میں بار بار دیکھ رہا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، "فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی" بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟

"قَالَ یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِی اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ" ابا جان مجھے تعجب ہے اتنے بڑے پیغمبر ہونے کے بعد پوچھتے ہیں، "یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" "ابا جان جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے، اس کو آپ کر گذریئے" یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں، "اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" جہاں تک میرا تعلق ہے چونکہ مجھ سے پوچھا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں، ورنہ اسے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ آپ خود دیکھ لیتے وہاں کہ آپ نے پوچھا ہے میں کہہ رہا ہوں "سَتَجِدُنِی اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ" جہاں تک میرا معاملہ ہے آپ مجھے دیکھیں گے میں صابر ہوں۔

اس کے بعد وہ منیٰ گئے اور وہاں وہ جگہ ہے موجود (اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دکھائے) متبرک، پاک جگہ، وہاں لڑکے کو لٹا دیا، معلوم نہیں ماں سے بھی کہا تھا کہ نہیں کہا تھا، بہر حال

بہلا کے اپنے ساتھ لے گئے، وہ تو بچہ تیار ہی تھا، کہا لیٹ جاؤ، لیٹ گئے اور چھری گلے پر رکھی تھی ارادہ کیا تھا، اب چلاتے ہیں چل نہیں رہی تھی، وہ چھری کند ہو گئی، چل نہیں رہی ہے، بالکل جیسے ایک موٹا سا لوہا ہو، وہ قلم ہو، کوئی لکڑی ہو، ان کو تعجب ہوا بھائی کیا بات ہے؟ وہاں سے آواز آئی "فَلَمَّا أَسْلَمَا" جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا، یہ بھی دیکھنے سوچنے کی بات ہے، ایک نہیں چاہیے کہ دونوں جب کسی عمل کو، کسی عاقل و بالغ کے ساتھ دین کے تقاضے سے اللہ کے حکم سے کرنا ہو تو اس کا بھی مطیع و سرافگندہ ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ مجبوری کی بات ہے "فَلَمَّا أَسْلَمَا" جب دونوں نے اپنے کو حوالے کر دیا، "وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ" ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا کہ چہرے پر نظر نہ پڑے، یوں چھری نہیں چل سکی، "وَنَادَيْنَاهُ يَا إِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا" تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھایا، ہمیں اسمٰعیلؑ کو ذبح کرانا نہیں تھا، اسمٰعیلؑ کے ساتھ جو محبت پیدا ہو گئی تھی اس میں یہ اس کا امکان تھا کہ خدا کی محبت کا ہمسر ہو، اس کو ذبح کرنا تھا، وہ ذبح ہو گئی، جب تم نے چھری رکھ دی وہ محبت تو ذبح ہو گئی، اس لیے کہ اب اس میں کوئی کسر تو باقی نہیں رہی، یہ الگ بات ہے کہ اس کا نتیجہ نہیں نکلا، لیکن جہاں تک بیٹے کو اللہ کے حکم سے قربان کرنے کا تعلق تھا، تم نے اس میں کوئی کمی نہیں کی، کوئی اس میں کسر نہیں رہی، اب یہ جو چھری کام نہیں کر رہی ہے، یہ ہمارے حکم سے کام نہیں کر رہی ہے، تو ہمیں اسمٰعیلؑ کو ذبح کرانا نہیں تھا، اس محبت کو ذبح کرنا تھا، جس کے متعلق دوسرا شبہ کر سکتا تھا، ہم نہیں، ہم تو عالم الغیب ہیں اور کسی طرز عمل سے یہ ظاہر ہو سکتا تھا، کہ تمہیں اسمٰعیلؑ سے ایسی محبت ہے کہ تم اوامر الٰہی کو اس پر قربان کر سکتے ہو، ان کو اوامر الٰہی پر قربان نہیں کر سکتے ہو۔

"إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ" "یہ بہت بڑی آزمائش تھی" اتنی بڑی آزمائش شاید اس سے پہلے ہوئی ہو، "وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ" " اور ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ دیا ذبح عظیم سے" وہ "ذبح عظیم" اپنی جسامت کے لحاظ سے، اپنی قیمت کے لحاظ سے، اپنی شکل کے لحاظ سے، وہ ذبح عظیم اس لیے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ جانور کو ذبح کر دو، لیکن "ذبح عظیم" اس لحاظ سے ہے کہ کوئی اس کی تعداد نہیں بیان کر سکتا ہے کہ اس کی

تقلید میں کتنے ذبح کیے جائیں گے، آج تک عید الاضحیٰ میں جو جانور ذبح کیے گئے ہیں، دنیا کا کوئی اعداد وشمار کا کوئی محکمہ اور کوئی بڑا سے بڑا مورخ اور کوئی بڑے سے بڑا ماہر حسابیات نہیں کہہ سکتا کہ کتنے کروڑ جانور ذبح ہو چکے ہیں اور کتنے ارب جانور ذبح ہو چکے ہیں، تو یہ ''ذبح عظیم'' اس لحاظ سے ہے کہ یہ قیامت تک رہے گا، اپنے دوام کے لحاظ سے بھی، اپنی تعداد سے بھی، یعنی کمیت کے لحاظ سے بھی، کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ (۱)

(۱) درسِ قرآن، سورۃ الانبیاء:۳۴، ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا'' کے ضمن میں۔

احکامِ الٰہیہ کی تعمیل

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ. هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۷۷-۷۸)

(ترجمہ: اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور خیر کا کام کرو، تا کہ تم کامیاب ہو اور اللہ (کے کام) میں کوشش کرتے رہو، جو اس کی کوشش کا حق ہے، اس نے تمہیں برگزیدہ کیا اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی)

اہل ایمان سے خطاب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" "اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو" یہ "آمَنُوا" ماضی کا صیغہ ہے..... ہر لفظ پر غور کیجیے، قرآن مجید کا کوئی لفظ اتفاقی، یا بھرتی کا نہیں ہوتا، یہ کوئی شاعری نہیں ہے، فرمایا "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو......... یہ خطاب کس سے ہے؟ ایمان والوں سے ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ خطاب جب کسی خاص صفت کے ساتھ ہوتا ہے تو گویا وہ لوگ اس خطاب کے مستحق ہیں اور اس صفت کا وہ تقاضا اور شرط ہوتا ہے، مثلاً میں کہوں، اے پڑھے لکھے لوگو! اور اے پڑھے

لکھے انسانو، دیکھو کوئی غلط بات نہ ہونے پائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان انسانوں کا یہ تقاضا ہے اور ان سے یہ بعید ہے کہ یہ اس قسم کی کوئی بات کریں، تو جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" تو سب کے کان کھڑے ہو جانا چاہیے، کہ اہل ایمان کو خطاب ہے اور ضرور کوئی ایسی بات کہی جانے والی ہے جو ایمان کی تکمیل کے لیے شرط ہے۔

"ارْكَعُوا وَ اسْجُدُوا" "رکوع اور سجدہ کرو"..... "تاکہ نفس میں خشوع و خضوع اور احساس ذلت کی کیفیت زیادہ پیدا ہو، سجدہ خدا کے قرب کی سب سے آخری شکل ہے اور خدا کو سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے "أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ" "بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدے میں ہوتا ہے"۔

اپنے رب کی عبادت کرو

"وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ" "اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو"..... اس کو مالک مانو اور خالق مانو اور عبادت کے لائق مانو۔ اول تو عبادت کا مفہوم سمجھ لیں، عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ عبادت کا مفہوم ہے کسی کام کو اللہ کی خوشی کے لیے، اللہ کے حکم کے مطابق، اس کے رسولؐ کی تعلیم کے مطابق، اجر و ثواب کی لالچ میں کرنا، ہر وہ عمل جو اللہ کی خوشی کے لیے بلکہ اللہ کے حکم اور شریعت کی تعلیم کے مطابق اور اگر اس میں کوئی سنت ثابت ہے تو اس سنت کے مطابق اس کو ادا کرنا، اجر و ثواب کی امید پر اور اس پر جو وعدے ہیں ان پر یقین کے ساتھ انجام دینا عبادت ہے اور یہ بات ہر عادت کو عبادت بنا دیتی ہے اور یہ روح نکل جائے تو ہر عبادت خالی عادت اور محض رسم اور نفس کی پیروی رہ جاتی ہے"

"یہ عَبَدَ یَعْبُدُ" کے معنی عربی میں "صَلّٰی ۔ یُصَلِّی" (نماز پڑھنے) کے نہیں ہیں، "یَصُوْمُ" (روزہ رکھنے) کے نہیں ہیں اور "یَحُجُّ" (حج کرنے) کے نہیں ہیں خالی، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں، اللہ کی بندگی اللہ کے سامنے سر اطاعت خم کرنا اور اپنے کو اس کے حوالے (اسلام جس کا نام ہے) کر دینا، یہ عبادت ہے۔

"وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن" "اور نیک کام کرو، خیر کا کام کرو، تا کہ تم کامیاب ہو"۔

جہاد کا حق اور اس کے مراتب

"وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" "اور اللہ کے راستے میں کوششیں کرو، جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے"۔

جہاد کی چار قسمیں ہیں: (۱) نفس سے جہاد (۲) شیطان سے جہاد (۳) کفار سے جہاد (۴) منافقین سے جہاد، اور چاروں قسم کے جہاد کے الگ الگ درجات و مراتب بھی ہیں حدیث میں آیا ہے: "مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ، وَلَمْ یُحَدِّثْ نَفْسَهٗ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ" "جو اس حال میں مر جائے کہ اس نے جہاد نہ کیا ہو اور نہ جہاد کی تمنا اور ارادہ کیا ہو، وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرے گا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ کامل وہ شخص ہے جو جہاد کے تمام درجات و مراتب کا جامع ہو"۔

جہاد صرف جنگ وقتال ہی پر (جو ضرورت کے وقت جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم اور افضل ترین مظہر ہے) منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کوشش جو اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کے غلبہ کی خاطر کی جائے جہاد ہے، حدیث پاک میں آتا ہے "سب سے افضل ترین جہاد ہے کہ ظالم بادشاہ یا ظالم حکمراں کے سامنے حق وانصاف کی بات کہی جائے" اسی طرح مسلمانوں کے لیے بالکل اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے ان دینی بھائیوں اور کمزور و مظلوم مسلمانوں کے حالات سے چشم پوشی اختیار کرلیں اور تغافل برتیں، جو دنیا کے کسی گوشہ میں ظلم و بربریت، ذلت واہانت، تعذیب وایذا رسانی اور طرح طرح کے سفاکانہ اور بہیمانہ مظالم کے نشانہ بنائے جا رہے ہوں اور ان کا قصور صرف اتنا ہو کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ مسلمانوں کی یہ مجموعی ذمہ داری ہے کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑنے والے ان مجرموں کو کم سے کم اپنی ناپسندیدگی، نفرت اور شدید بے چینی کا احساس دلائیں۔ کیونکہ آپ کا ارشاد گرامی ہے:۔

"مَنْ لَمْ يَهْتَمَّ بِأَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ"" مسلمانوں کے حالات کی جو شخص فکر نہ کرے، وہ ان میں سے نہیں"

"جَاهَدَ. يُجَاهِدُ" کے معنی ہیں "اپنی توانائی صرف کرنا"۔ "جُهْدٌ" کے معنی ہیں "توانائی جو اصل طاقت ہے"۔ "جَاهَدَ يُجَاهِدُ" کے معنی "مشقت برداشت کرنا اور اس پر صبر کرنا اور مقابلہ کرنا"۔ یہ سب "جہاد" میں آجاتا ہے! اس میں معمولی کوشش سے لے کر جہاد تک سب آگئیں، "جب کوئی انسان کسی مقصد کے لیے تکلیفیں اٹھاتا ہے اور قربانیاں کرتا ہے، تو اس کی کیفیتیں اس کے اوپر پوری طرح طاری ہو جاتی ہیں اور اس کو صحیح لذت وحلاوت ملتی ہے" ...."جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر حکمت وایمان اور فہم وبصیرت کے ایسے دروازے کھولتا ہے، جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا"۔

"جہاد جب اپنے شرائط، احکام وآداب کے ساتھ ہو، بڑے خیر وبرکت کا سرچشمہ دنیا کے لیے سعادت اور پوری انسانیت کے لیے رحمت کا ذریعہ ہے"

"هُوَ اجْتَبَاكُمْ" اور کیوں نہ کرو، یہ ایک دلیل کے طور پر ہے، کہ جب کسی آدمی پر کوئی انعام ہوتا ہے اور کسی کے ساتھ خصوصیت برتی جاتی ہے، تو اس پر ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے، اس کی شرافت کا تقاضہ ہوتا ہے، اس کے تشکر کا تقاضا ہوتا ہے اور محسن کے احسان کا تقاضا ہوتا ہے تو کیوں اللہ کے راستے میں جہاد کا حق ادا کرو؟۔ "هُوَ اجْتَبَاكُمْ" اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے، تمہیں تو شوق وذوق سے اور بڑے والہانہ طریقے پر جہاد میں حصہ لینا چاہیے۔

دین آسان ہے

" وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُم فِي الدِّيْنِ مِن حَرَجٍ" "اور تمہارے لیے اس دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"، لیعنی جہاد میں ایک طرح کا نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اب یہ وقت ہے کہ تم اس وقت کوشش کرلو ورنہ سارا دین جو تمہیں دیا تھا، اس میں کہیں تنگی نہیں تھی، تم سے ایسی نمازیں نہیں پڑھوائی گئی تھی جو ہو نہ سکیں اور جس کے لیے بڑی قربانی دینی پڑے، تم سے یہاں تک کہ حج بھی ایسا نہیں کروایا گیا تھا کہ جس میں جان جانے کا خطرہ ہو، تو سارا دین تو

اس نے "إِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَه" "یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین میں سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کردے گا" اور جگہ جگہ قرآن مجید میں ہے، "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" "خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا" اور "رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا" "اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو" وغیرہ تو اس میں مطلب یہ کہ اس وقت تمہیں اللہ کے راستے میں محنت کرنے اور خطرہ مول لینے اور قربانی دینے کا تم کو حکم ہو رہا ہے، ورنہ اس نے تمہارے پورے دین میں کہیں حرج نہیں رکھا تھا، پورا دین "مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ" یہ تمہارے دینی مورث اعلیٰ، تمہارے دینی گویا جدامجد جو ہیں، یہ ان کا دین ہے، یہ ان کی ملت ہے، ان کا دین ہے۔ (۱)

(۱) (البقرہ ۲۸۶) درس قرآن سورۃ الحج: ۷۷-۷۸، غیر مطبوعہ۔

براہیمی محمدی تہذیب کی خصوصیات وامتیازات

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ .هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ .وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ .فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ .هُوَ مَوْلَاكُمْ .فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ (سورة الحج: ۷۸)

ترجمہ: (تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت (پر قائم رہو) اس نے تمہیں مسلم قرار دیا ہے پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تا کہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ٹھہرو، سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو، وہی تمہارا کارساز ہے، سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار)۔

براہیمی محمدی تہذیب

"مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ" "دین تمہارے باپ ابراہیم کا، اسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان"

"ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لیے اور اپنی اس ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کے لیے جو عقل وقیاس سے ماوراء ہے اور

جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں، انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا، اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو، پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات وصفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا اور اپنے منشاء اور احکام اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا''

پھر اس گروہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی محبوبیت اور نسل انسانی کی امامت سے سرفراز فرمایا ''قَالَ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' [1] فرمایا اللہ نے (ابراہیمؑ سے) کہ میں کروں گا تجھ کو سب لوگوں کا پیشوا''۔

ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سراپا اسلام تھے، ان کی پوری سیرت بتاتی ہے کہ مجسم اسلام تھے یہ حضرت اسمٰعیل کی قربانی یہ اسلام ہی تو ہے، اسلام کے معنی ہیں حوالہ کر دینا، آج کی سیاسی زبان میں سرینڈر Surrender کر دینا، حوالہ ہو جانا، حوالہ کر دینا، ایک حوالہ کر دینا ہوتا ہے، حوالہ ہو جانا اس میں نہیں ہوتا۔ ایک حوالہ ہو جانا ہوتا ہے، حوالہ کر دینا نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام میں حوالہ ہو جانا بھی ہے، حوالہ کر دینا بھی ہے، ہم بھی اسی کے ہیں، اور ہمارے پاس جو بھی ہے، وہ بھی اسی کا ہے، ﴿فَلَمَّا اَسْلَمَا وَ تَلَّه لِلْجَبِیْنِ﴾ تو انہوں نے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا۔ ابراہیم نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا، اسمٰعیل نے ذبح ہونے کے لیے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا۔

امامت ودعوت کی خصوصیت

''اس امامت ودعوت کی خصوصیت توحید خالص اور شرک، اصنام پرستی، مظاہر پرستی اور ہر مشرکانہ عقیدہ اور تخیل سے نفرت اور بیزاری ہے، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں؟ جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مشرکین سے کہے ''اِنَّا بُرَآءُ وا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ . کَفَرْنَا بِکُمْ . وَبَدَا بَیْنَنَا وبینکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَداً حَتّٰی تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ'' [2] ''ہم بے تعلق ہیں تم سے اور ان سے جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، ہم انکاری ہوئے تمہارے مسلک کے اور کھل پڑی ہے ہم میں اور تم میں عداوت اور بیر یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ واحد پر'' اپنے اور اپنی اولاد کے متعلق

(۱) البقرہ:۱۵ (۲) الممتحنہ:۱

ان کی تمنا اور دعا ان الفاظ میں منقول ہے "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" "اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو اصنام پرستی سے"۔

اب دنیا میں جہاں تک ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قبولیت کا تعلق ہے، سیدنا ابراھیم ومحمد علیہما السلام کا وہی دور امامت ہے، عقائد بھی انہیں کے تلقین کئے ہوئے معتبر ہیں، ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کی وحدانیت کا جو تصور اور عقیدہ انہوں نے تعلیم کیا ہے، وہی معیاری تصور اور صحیح عقیدہ ہے، اخلاق اور معاشرت اور تہذیب وتمدن کے جن طریقوں اور شعائر کو انہوں نے اختیار کیا وہی خدا کے نزدیک صحیح اخلاق وتہذیب اور پسندیدہ اور مقبول معاشرت ہے، انہیں کی پسندیدگی اور میلان کو خدا نے پسند کیا اور دوسروں کی پسندیدگی اور میلان پر ترجیح دی اور اس پر اپنی تصدیق اور پسندیدگی کی مہر لگا دی، جس چیز کی انہوں نے پابندی کی اور جس کی طرف ان کی فطرت سلیم ہمیشہ کے لیے مائل ہوگئی، اسی کو خدا نے آخری دین کا شعار اور ہدایت یافتہ انسانوں کی تہذیب قرار دیا، اسی کو کبھی حدیث کی زبان میں "خصال فطرت" سے اور شریعت کی اصطلاح میں "سنت سے" تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے دونوں ہاتھ اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، لیکن داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کیوں فضیلت ہے؟ اور اچھے کاموں میں اس کے استعمال کرنے کی کیوں ہدایت ہے؟ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے اور ابراہیمی اور محمدی تہذیب کا شعار ہے، اسلامی معاشرت اور تہذیب میں جن چیزوں کو مسنون ومستحب اور اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے، غور کرنے کے بعد ان سب کی حقیقت یہی نکلے گی کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا شعار اور ابراہیمی تہذیب کی علامت ہے"۔

مستند نام "مسلم" ہے

"لہٰذا! ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد سے انہیں کا دور امامت اور پیشوائی ہے، اور دور ابراہیمی قیامت تک قائم رہے گا، اسی دور ابراہیمی کے آخری پیغمبر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس دور کی آخری دینی امت (مسلمان) ہیں۔ "مسلمانوں کو خطاب کر کے صاف کہا گیا ہے:

"هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" "اس نے تم کو پسند کیا اور نہیں رکھی دین میں تم پر کوئی مشکل "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هـــذَا" یہ دین تمہارے باپ ابراہیم کا ہے، اس سے پہلے بھی انھوں نے تمہارا نام مسلم رکھا، "وَفِي هٰذَا" اور اس دین میں جب اللہ کے آخری نبی ورسول محمد ﷺ آئے تو انہوں نے بھی تمہیں اسلام ہی کا نام دیا، حضرت ابراہیم کے اقتداء میں، وراثت میں "هُــوَ سَــمّـــاكُمُ الـمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا" "اس نے تمہارے لیے وہی دین تجویز کیا جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا اسی خدا نے اگلی کتابوں میں پہلے سے تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی" حالانکہ "مسلمانوں کو اپنے پیغمبر (محمد ﷺ) کی ذات گرامی سے جو عشق و شیفتگی اور جو عقیدت اور محبت ہے، وہ دنیا میں ضرب المثل اور مذاہب واقوام کی تاریخ میں بے مثال ہے، اسی طرح گہوارۂ اسلام عرب کی سرزمین اور اس کے دو محبوب شہروں مکہ اور مدینہ سے جو روحانی اور ذہنی وابستگی ہے، وہ بھی محتاج تشریح نہیں، لیکن اپنے تعارف اور امتیاز کے باوجود انہوں نے ان محبوب مرکزوں میں سے کسی کی طرف نسبت کو اپنے نام کا جز اور اپنا قومی نام نہیں بنایا اور ہر دور میں صرف "مسلم" ہی کہلائے۔

"لہذا مسلمان کا مستند نام "مسلم" اور اس ملت کا نام "امت مسلمہ" ہے، جس کے معنی خدا کے فرمانبردار یا اسلام کے پیرو کے ہیں۔

امت اسلامیہ کا منصب ومعیار اور اس کی ذمہ داری

"لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ" "...... اور یہ اس لیے تمہارے اوپر ذمہ داری ڈالی جارہی ہے" تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنے" اور کل قیامت کے دن گواہی دیں کہ انہوں نے حق ادا کیا اور گردن کٹانے اور جان دینے میں ان کو دریغ نہیں ہوا۔

"وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" "اور تم لوگوں کے لیے نمونہ بنو اور گواہ بنو"۔

"امت اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات وسکنات پر حاوی ہے، اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی واحتساب کا

منصب ہے، بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے "وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" تا کہ تم دنیا کے انسانوں پر گواہ ہو، "تم کو دنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور تم ان پر مامور ہو، کہ ان کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہو، جو راہ راست سے منحرف ہو جائے، اس کو صراط مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے، اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں"۔

........تم کو "شُهَدَاءَ عَلَى الْأَرْضِ" بنا کر بھیجا گیا ہے، تمہیں اپنے گھر تعمیر کرنے کے لیے، اپنی دکانیں، اپنی تجارتیں کامیاب کرنے کے لیے، اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا، تم "شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" (لوگوں کے لیے گواہ اور نمونہ ہو) اور اس کا معیار اور اس کی جانچ کیا ہے؟ "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ" تا کہ رسول تمہارے لیے گواہ بنے، حیات طیبہ مبارکہ! رسول اللہ ﷺ نے تمہارے اوپر شہادت کا جو فرض انجام دیا اور وہ جس درجہ کے تم پر شاہد تھے، اس کے شایان شان تم امتوں کے سامنے شہادت دو"۔

"فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ" نماز کے پابند ہو، نماز کو قائم کرو، نماز میں ایمان اور دین کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، دائرۂ اسلام میں رہنے اور جماعت مؤمنین میں شمولیت کی حفاظت و سلامتی کا راز پوشیدہ ہے۔

"وَآتُوا الزَّكٰوةَ" اور زکوٰۃ دو، زکوٰۃ کی روح خدا کا خوف اور اطاعت، اس کی رضا جوئی، فقراء کے حال پر غمخواری، دل کی نرمی، اخلاص اور اغراض سے آزادی ہے۔

"وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ" اور اللہ (کی رسی) کو مضبوط پکڑ لو"۔

"هُوَ مَوْلٰكُمْ، فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيرُ" "وہ تمہارا کارساز ہے اور مختار کل ہے اور بہترین مختار اور کارساز اور بہترین مددگار ہے"۔

(۱) درس قرآن سورۂ حج: ۷۸، کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے باختصار و تلخیص ماخوذ ہیں: ☆ تکبیر مسلسل: ۱۷۷ ☆ تکبیر مسلسل: ۱۷۸ ☆ کشمکش: ۲۷۸ ☆ عروج و زوال کا اثر: ۱۳۵ ☆ تحفۂ پاکستان: ۴۷۔

ملتِ ابراہیمی

مکمل دین، مستقل تہذیب

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، وَاِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ، قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۱۳۰-۱۳۱)

''اور ملت براہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان (ابراہیم) کو دنیا میں (عہدۂ رسالت کے لیے) منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العلمین کی''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ'' (جو کوئی حضرت ابراہیمؑ کے مذہب سے حکم عدولی کرے گا) یہ''وَمَنْ يَّرْغَبُ'' دیکھئے الفاظ کی طاقت اور الفاظ کا محل استعمال اور اس کی وسعت اور تنگی یہ سب اہلِ زبان (اہلِ زبان بھی معمولی نہیں بلکہ زبان میں تبحر رکھنے والوں میں) سے سمجھ میں آتی ہے اور وہی ان کی قدر کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا ہر لفظ ایک مستقل معجزہ ہے اور یہاں پر بہت سے لفظ استعمال کیے جاسکتے تھے کہ جو شخص

عربی سے واقف ہے اوراس کا ذوق رکھتا ہے اور جس نے عربوں (معمولی عربوں سے بھی نہیں بلکہ بڑے عربوں سے جولوگ عربی کا ذائقہ رکھتے تھے ان) سے عربی حاصل کی ہے، وہ اس لفظ کی عمومیت اوراس کی طاقت کو سمجھ سکتے ہیں، عربی زبان کے دس لفظ یہاں بولے جاسکتے تھے بلکہ بیس لفظ بولے جاسکتے تھے" ینحرف عن ملة ابراهيم، يعدل عن ملة ابراهيم، يذهب عن ملة ابراهيم، ينكر عن ملة ابراهيم، يرتد عن ملة ابراهيم" لیکن" يَرْغَبُ" کا لفظ بہت ہی جامع اور وسیع اور بڑا ہی ذمہ دارانہ ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے مذہب سے بے رغبتی کرے گا حکم عدولی اورانحراف کرے گا۔ ہے تو" رَغِبَ" لیکن نفی کے معنی ہوتے اس کے، اگر چہ" رَغِبَ" اثبات ہے لیکن اس میں نفی اثبات دونوں شامل ہیں،" رَغِبَ"" عن" کے ساتھ جب آئے گا تو معنی ہوگا" انحراف کرے گا" اور" رَغِبَ"" الی" یا" فی" کے ساتھ جب ہوگا تو اسکے معنی ہیں" دلچسپی کے"" عمل کرے گا" تو یہ قرآن مجید کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے، جزئی حیثیت سے بھی معجزہ ہے، ایک ایک لفظ اس کا ایسا ہے کہ اس کا بدل نہیں ہوسکتا تو" وَمَن يَّرْغَبُ عَن مِّلَّةِ اِبْرَاهِيمَ" اور جو حضرت ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کرے گا اور" ملت" کے اندر دین، تہذیب، تمدن، معاشرہ سب آگیا، حضرت ابراہیمؑ کا دین ہی اللہ کو پسند نہیں ہے اور وہ معیار ہی صرف۔ بلکہ اس دین کے ذریعہ سے جو تمدن قائم ہوا۔ اس لیے کہ تمدن قائم کرنے کے لیے کچھ بنیادیں چاہیے، کچھ عقائد چاہیے، کچھ مسلمات چاہیے، تب تمدن قائم ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ یہ ایک اچھی چیز ہے، یہ اجتماعی چیز ہے، یہ اخلاقی چیز ہے، اعتدال اچھی چیز ہے، نماز اچھی چیز ہے، ریاکاری اچھی چیز نہیں ہے، مظاہرہ کرنا اپنی شان وشوکت دکھانا اچھی چیز نہیں ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں تمدن بھی شامل ہے، صرف ان کے بتائے ہوئے عقائد کا ماننا ہی مقصود ومطلوب نہیں ہے بلکہ ان کی تہذیب، ان کا طرز زندگی، ان کے اخلاق وعادات، ان کی تمام پسندیدہ چیزوں کو اوران کے عقائد اور خصوصیات کو اپنانا اور ہر ہر چیز میں ان کی تقلید واتباع کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ کی شخصیت

حضرات انبیاء علیہم السلام نے صرف عقیدہ وشریعت اور صرف ایک نئے دین، اسلام، ہی کی دعوت نہیں دی، بلکہ وہ تہذیب وتمدن اور نئے طرز حیات کے بھی بانی ہیں، جو "ربانی تہذیب" کہلانے کی مستحق ہے، اس تہذیب کے کچھ مخصوص ارکان اور شعائر وعلامات ہیں جن کے ذریعہ دوسری تہذیبوں اور جاہلی تمدنوں سے نمایاں طور پر ممتاز ہو جاتی ہے، یہ امتیاز روح اور اصل واساس میں نمایاں ہوتا ہے اور تفصیلات ومظاہر میں بھی۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس خدا پرست تہذیب کے بانی وامام تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرک کی نجاست سے بچایا، بت پرستی کی نجاست سے بچایا، اوہام پرستی کی حماقت سے بچایا۔ اپنے جیسے انسانوں کو اپنا معبود، اور اپنی قسمت کا مالک سمجھنے کی جہالت سے بچایا، آپ کے دماغ کو روشن کیا، آپ کے دل کو روشن کیا، آپ کی آنکھیں کھولیں، آپ کو اتنی سمجھ عطا کی کہ آپ سمجھیں کہ عبادت کا مستحق کون ہے؟ بندگی کا مستحق کون ہے؟ خوف کا مستحق کون ہے؟ کس سے ڈرنا چاہیے؟ کس سے امید رکھنی چاہیے؟ کس سے دعاء کرنی چاہیے؟ کس سے نذر و نیاز اور منت مانگنی چاہیے؟ کس سے اپنی مرادیں مانگنی چاہیے؟ کون بحر و بر کا مالک ہے؟ کس کا سکہ خشکی اور تری پر رواں ہے؟ کون ہواؤں کا مالک ہے؟ کون بادلوں کا مالک ہے؟ کون روزی کا مالک ہے؟ کون قسمت کا مالک ہے؟ ابراہیمؑ (اور ان کے ساتھ سارے پیغمبروں پر اللہ کا درود وسلام ہو) کہ انہوں نے دنیا کے سامنے خالص توحید پیش کی، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ساری دنیا کے بتکدے میں جب ساری دنیا میں اللہ کو چھوڑ کر سب کی پرستش ہو رہی تھی، وہ اللہ کا مست توحید بندہ، مست معرفت بندہ، مست یقین بندہ کھڑا ہوا، ساری دنیا سے باغی، ساری دنیا کے طلسمات سے باغی، ساری دنیا کے عقائد سے باغی، ساری دنیا کے مذاہب سے باغی، سارے خداؤں کی خدائی سے باغی، اکیلا یہ مرد خدا کھڑا ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس صفت وکیفیت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان کیا ہے۔

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلَّهِ حَنِيفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. شَاكِراً لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ. وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ. ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (۱)

"بے شک ابراہیم بڑے مقتدا اللہ کے فرماں بردار اور اس کی طرف یک رخ رہنے والے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے بڑے شکرگزار، اللہ نے ان کو چن لیا تھا، اور انہیں سیدھی راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم نے دنیا میں بھی بھلائی دی تھی اور آخرت میں وہ تو صالحین میں ہیں ہی پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے پر چلئے جو بالکل یک رخ کے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے"۔

ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک تھے۔ لیکن ایک پوری نسل کے بانی، ایک پورے عہد کے بانی ایک پوری تاریخ کے بانی، انسانیت کے نئے دور کے بانی، تمدن کے نئے دور کے بانی، ساری مذہبی اقوام کے مورث اعلیٰ اور بانی، توحید کے داعی، وہ ایک تخم تھے، تخم دیکھنے میں ایک، لیکن سارا کھیت اس تخم کا نتیجہ، دانہ ایک لیکن سارا باغ اس ایک دانہ کا نتیجہ، ایک قلم دیکھنے میں ایک، گننے میں ایک، لیکن سارا درخت، اپنی پوری شاخوں، پتیوں اور پھولوں کے ساتھ اس کا شرمندۂ احسان، اسی طرح ابراہیمؑ ایک تھے، لیکن ایک پوری دنیا تھے، ابراہیمؑ ایک تھے۔ (سورۃ النحل: ۱۲۰-۱۲۳)

لیکن پوری ایک نوع تھے۔ پوری ایک قسم تھے۔ انسانوں کی ایک پوری قسم، انسانوں کا ایک پورا گروہ وہ اللہ کا بندہ سب سے پہلے دنیا میں کھڑا ہوا، جس وقت ساری دنیا میں شرک کا اور بت پرستی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، بادشاہ پرستی کا، آتش پرستی کا، کواکب پرستی کا، انسان پرستی کا درخت و شجر و حجر پرستی کا سایہ اور اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس وقت وہ اللہ کا بندہ اکیلا کھڑا ہوا اور اس نے کہا، "إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ" (سورۃ الانعام: ۷۸) ہم تم

سے بری اور بیزار ہیں اوران سب چیزوں سے جن کی تم عبادت اور پرستش کرتے ہو"وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ" (سورۃ الزخرف:۲۸)اور وہ اس عقیدہ توحید کواپنے اخلاف میں قائم رہنے والی بات کر گئے تاکہ مشرک آئندہ بھی توحید کی طرف رجوع کرتے رہیں۔

اور پھر اس توحید کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے امانت چھوڑ گئے کہ وہ اس توحید کی طرف آئیں، ساری دنیا سے اس اصل کی طرف آئیں یہ مرکز ہے انسانوں کا اس مرکز کی طرف رجوع کریں، یہ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا احسان ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی دعوت میں ان کی ندامیں، ان کی کوشش اوران کی محنت میں ہم نے بہت بڑی برکت عطا فرمائی۔قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔

"وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ. سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيمَ. كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ" (سورۃ الصافات:۱۰۸-۱۱۰)

اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کی یادگار باقی رکھنے کا فیصلہ کیا، ہم نے کہا ابراہیمؑ پھیلیں گے، پھولیں گے، اور پھلتے پھولتے ہی چلے جائیں گے، انہوں نے جو درخت لگایا ہے یہ درخت کبھی خشک نہیں ہوگا، انہوں نے جو چشمہ جاری کیا ہے، کبھی اس کا پانی زمین میں جذب نہیں ہوگا، پھیلتا ہی چلا جائے گا، پھیلتا ہی چلا جائے گا، چنانچہ وہی چشمہ ہے جو برما تک پہنچا، ملابار، ملایا تک پہنچا، انڈونیشیا پہنچا، ہندوستان، فرنگستان تک پہنچا، چین تک پہنچا، ترکستان تک پہنچا، یہ دعوت ابراہیمی ہے جو ساری دنیا میں پھیلی، پھولی اور پھل لائی۔

"وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ" "اور جو حضرات ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کریگا" اس میں وہ تمدن اور تہذیب سب چیزیں ہیں۔اس کے اندر دین کے بنیادی عقائد بھی آجائیں گے۔عبادات بھی آجائیں گی۔اور طرز زندگی بھی آجائے گا۔اور کن چیزوں کو کرنا چاہیے۔ضروری سمجھنا چاہیے۔کن چیزوں سے بچنا چاہیے اور کیا طرز زندگی اختیار کرنی

چاہیے سب آجائے گا اور یہ بہت بڑی مسلمانوں سے غلطی ہوئی ہے تمام عالم اسلام میں خاص طور پر ہندوستان میں جہاں دوسرے مذاہب تھے کہ انہوں نے عقائد کو لیا، مثلاً توحید کو لیا اور معاد کا عقیدہ، بعث بعد الموت کا عقیدہ بھی لیا، رسالت کو بھی لیا، لیکن تمدن اور تہذیب حضرت ابراہیم کی، حضور ﷺ نے جس تمدن اور تہذیب کی توثیق کی اور تجدید کی، دونوں باتیں کام کی ہیں کہ جہاں اذانیں بھی ہوتی ہیں نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں، توحید کے قائل ہیں، لیکن اس میں پردہ نہیں ہے، یا مثلاً بڑوں کا احترام، چھوٹوں کا پاس لحاظ اور ان کا خیال رکھنا یا مثلاً عورتوں کے حقوق ادا کرنا، یا شرعی، عائلی قانون ہے اس پر عمل کرنا، میراث دینا، بہنوں کا بھی حق دینا، جائداد کا تقسیم ہونا اور جائداد میں سب کا شریک ہونا یہ سب چیزیں ہیں ان کو ضروری نہیں سمجھا بہت سے مسلمانوں نے اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا کھوٹ، بہت بڑی کمی واقع ہوتی ہے اور اس کا اثر صرف دین اور عقائد پر پڑتا ہے۔

اسلامی شریعت اور ابراہیمی تہذیب

اب دنیا میں جہاں تک ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قبولیت کا تعلق ہے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا ہی دور امامت ہے عقائد بھی انہیں کے تلقین کئے ہوئے معتبر ہیں ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کی وحدانیت کا جو تصور اور عقیدہ انہوں نے تعلیم کیا ہے۔ وہی معیاری تصور اور صحیح عقیدہ ہے، اخلاق اور معاشرت اور تہذیب و تمدن کے جن طریقوں اور شعائر کو انہوں نے اختیار کیا وہی خدا کے نزدیک صحیح اخلاق و تہذیب اور پسندیدہ اور مقبول معاشرت ہے، انہیں کی پسندیدگی اور میلان کو خدا نے پسند کیا اور دوسروں کو پسندیدگی اور میلان پر ترجیح دی اور اس پر اپنی تصدیق اور پسندیدگی کی مہر لگا دی جس چیز کی انہوں نے پابندی کی اور جس کی طرف ان کی فطرت سلیم ہمیشہ کے لیے مائل ہوگئی، اسی کو خدا نے آخری دین کا شعار اور ہدایت یافتہ انسانوں کی تہذیب قرار دیا، اسی کو بھی حدیث کی زبان میں ''خصال فطرت'' سے اور شریعت کی اصطلاح میں ''سنت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے دونوں ہاتھ اللہ کے پیدا کئے ہوئے

ہیں، لیکن داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کیوں فضیلت ہے اور اچھے کاموں میں اس کے استعمال کرنے کی کیوں ہدایت ہے؟ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے اور ابراہیمی اور محمدی تہذیب کا شعار ہے، اسلامی معاشرت اور تہذیب میں جن چیزوں کو مسنون و مستحب اور اسلامی شعائر قرار دیا گیا ہے، غور کرنے کے بعد ان سب کی حقیقت یہی نکلے گی کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا شعار اور ابراہیمی تہذیب کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کا مذہب سے حکم عدولی نہیں کرے گا۔ انحراف نہیں کرے گا مگر وہ جس نے کہ اپنے نفس کی جہالت کے راستہ پر ڈال دیا۔ "سفہ نفسہ" یہ بڑا جامع لفظ ہے کہ جس نے اپنے نفس کی پوری قدر نہیں کی اور اپنے نفس کو غلط راستے پر ڈال دیا اور یہ جامع اور عمیق لفظ ہے۔

"وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی انتخاب کیا اور یہ عرض کریں گے کہ "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" اس کے اندر تمدن وغیرہ سب آجاتا ہے۔ اس کے لحاظ سے "ولقد اصطفیناہ فی الدنیا" بھی اس کی ایک دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا تمدن، اس کا طرز زندگی اور ان کا اختیار و انکار ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی یہ سب پیمانے جو ہیں ان کو کیوں اختیار کیا اختیار کرنا ضروری ہے اس لیے کہ "وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا" ہم نے ان کو دنیا میں بھی انتخاب کیا اور کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ تو آخرت کا معاملہ ہے، عقائد ہمارے وہی ہوں گے۔ ہم فرائض بھی ادا کریں گے۔ لیکن وہ کس طرح کھائیں، کیا نہ کھائیں، ہم اور دوڑ کر کھانا کھائیں، کھڑے ہو کر کھائیں اور پردہ ہو ہمارے گھر میں یا نہ ہوں اس کا کیا تعلق؟ تو فرمایا کہ نہیں یہ جو دنیا کی چیزیں ہیں انہوں نے کہا کہ ہم نے دنیا میں بھی ان کو انتخاب کیا یہ اعجاز ہے بالکل کہ کوئی شخص اگر کہے کسی زمانے میں بھی کہ یہ تو دنیا کی باتیں ہیں، آپ ہمیں ان کا کیوں پابند کرتے ہیں؟ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب دین اور صاحب دعوت تھے یہ آخرت میں کام آنے والی چیز ہے، جو آخرت میں کام آنے والی

ہے ہم سب کریں گے نماز پڑھیں گے، عقیدہ توحید کا رکھیں گے، لیکن ہم کیا پہنیں، کیا نہ پہنیں، کیا کھائیں، کیا نہ کھائیں، کسی کے ساتھ کیا معاملہ کریں اور اس میں کیا موقف ہے؟ اس میں آپ ہم کو کیوں پابند کرتے ہیں؟ تو اللہ نے کہا کہ یہ دنیا کی بات ہے تو ہم نے دنیا میں بھی ان کا انتخاب کیا، ہم نے جب ان کو انتخاب کیا تو ان کا طرز رہائش، ان کا طرزِ معاشرت، ان کی زندگی، ان کے معاملات یہ سب ہمیں پسند ہیں، وہی معیار ہیں، جب ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پسند ہیں، ہمارے منتخب بندے، تو اب ان کی پوری تعلیم عقائد سے لے کر معاشرت تک ان کا نمونہ یہ سب ہمیں محبوب ہیں۔

"وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" اور وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں ہیں" دونوں چیزیں آگئیں اور وہ آخرت میں اللہ کے نیک بندوں میں ہیں، تو ان کے دین پر عمل کرنے سے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی صلاح حاصل ہوتی ہے، وہاں "اصْطَفَيْنٰهُ" کا لفظ کہا، یہاں "لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" کہا، ان کے اعمال کی جزاء اور وہاں جو ان کو جنت میں ملے گی جو انعام ملے گا وہ سب اس کے لیے "صالحین" کا لفظ کہا اور "اِصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا" یہ عام ہے کہ ہم نے ان کو دنیا میں پسند کیا تو ہمیں ان کی ہر ادا پسند ہے، ان کا سونا پسند ہے، ان کا ہنسنا پسند ہے، ان کا بیٹھنا پسند ہے، ان کو بولنا پسند ہے۔

تو یہ یاد رکھئے کہ دین صرف عقائد کا نام نہیں ہے، عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ تمدن کا بھی نام ہے، طرز زندگی بھی دین کے اندر آتا ہے، یہ کہ آدمی کہے کہ عقائد میں دین ابراہیمی کو اختیار کرے اور طرز معاشرت میں وہ برہموں کا طرز اختیار کرے، یا بدھوں کا طرز اختیار کرے یا عیسائی راہبوں کا طرز اختیار کرے، یا اسرائیلیوں کا نہیں، بلکہ ہمیں طرز زندگی بھی وہی اختیار کرنا چاہیے جو حضرت ابراہیم نے اختیار کیا تھا، اس لیے کہ ان کو دنیا میں "اصطفی" حاصل ہے اور آخرت میں "صلاح" دونوں چیزوں میں، دنیا اور آخرت میں وہ اللہ کے مقبول ترین بندے ہیں، تو ہمیں بالکل اپنی زندگی کو ان کے سانچہ میں ڈھال دینا چاہیے، یہ ملت

ابراہیمی ہے، سنت ابراہیمی اور سنت مصطفوی، سنت محمدی ہے اور یہ جو ہے شریعت محمدی یہ بالکل پرتو ہے دین ابراہیمی کا اور طرز ابراہیمی کا۔

خدا کے موحد اور وفادار بندے

"اِذْقَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ" اور جب کہا کہ ہم نے اُن کو دنیا میں انتخاب کیا اور آخرت میں وہ صالح بندوں میں ہیں۔ تو ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، چاہے زبان سے کوئی نہ کہے، بے ادبی سمجھے، کیا بات ہے؟ کیوں حضرت ابراہیم کو یہ مقام حاصل ہوا؟ اس کے لیے فرماتا ہے، ہر آیت کا دوسرے آیت سے ربط ہے۔

"وَاِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ" جب کہ ان سے ان کے رب نے کہا کہ اسلام لے آؤ، ایک خدا کے سامنے سر جھکا دو، اور ایک کے بن ہو جاؤ، انہوں نے کہا "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں نے سر جھکا دیا اور پورے طور پر مان لیا رب العالمین کو، اسلام کے معنی ہیں، انگریزی میں Surrender کرنا کہتے ہیں، ہم نے رب العالمین کے سامنے بالکل اپنے کو حوالہ کر دیا، اپنے اختیارات سے ہم بالکل سبکدوش ہو گئے، اختیارات سے منکر ہو گئے، اب اختیار صرف اللہ کا ہے، "اسلمت لرب العالمین" یہ بڑا جامع کلمہ ہے، اس کے اندر سب چیزیں آجاتی ہیں، اس کے اندر منکرات، اس کے اندر طرز زندگی اور معیار زندگی اور اقدار زندگی، اس وقت کے جو ذرائع ہیں کہ بے عزتی کن سے ہوتی ہے، یہ جو پوری زندگی کا جو ایک سانچہ بنا رکھا ہے دنیا پرست قوموں نے اور جن کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے دین اور شریعت سے کٹ گیا، تو انہوں نے بالکل اپنی زندگی کا ایک نیا ڈھانچہ بنایا، عقائد سے لے کر رہائش تک اور یہ...... ہے بالکل پوری زندگی کو شریعت کے سانچہ میں اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بالکل ڈھال دینا چاہیے اور اسلام کے معنی ہی یہی ہیں کہ دوسری چیزوں سے دستبردار ہو جائے اور اللہ کے حوالے کر دے، اسلام رب العالمین کو حوالہ کر دیا، حوالہ کرنا یہ ہوتا ہے کہ پھر اور ملکیت کا دعویٰ نہیں ہوتا اور اس میں کسی چیز پر فخر اور کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑیں یہ کچھ نہیں ہوتا بلکہ اب ہم جو اللہ کا حکم آئے گا ہم اس کو مانیں گے۔

اس سب کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ہم "ملت ابراہیمی" اور "امت محمدی" کے فرد اور ایک مخصوص شریعت اور آئین و مسلکِ زندگی کے پیرو اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین و مسلک کی وفاداری میں گذرے اور یہیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجود نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراطِ مستقیم پر جائیں۔[1]

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص: ☆ درس قرآن سورۂ بقرہ: ۱۳۰-۱۳۱ (غیر مطبوعہ) ☆ تحفۂ برما: ۳۶-۴۹ ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۱۲۱-۱۲۲ ☆ اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب: ۳۳ ☆ عصر جدید کا چیلنج: ۱۲-۱۷

عملِ صالح بشرط ایمان واحتساب مطلوب ہے

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴾ (الانبیاء: ۹۴)

''جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان ہے تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی اور ہم اس کے لکھنے والے ہیں''۔

ایک عام قانون

ایک اصل اور ایک کلیہ کے طور پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ" یہ اصول اور یہ کلیہ جو ہے، یہ حاوی ہے پوری تشریع پر، پوری انسانی زندگی پر، اعمال اور جزائے اعمال پر اور اندرونی محرکات پر، اسکی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

یہ آیت ایک مستقل معجزہ ہے کہ" جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان ہے، تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی"!

یہ شریعت الٰہی، آیات الٰہی، قانون سماوی اور فرائض وواجبات کے بارے میں ہے، لیکن اگر آپ دیکھئے گا تو ذرا نیچے اتر کر یعنی اس بلندی کے ساتھ نہیں تو یہاں مراد ہے اعمال، عقائد، عبودیت اور اطاعت اور شریعت پر عمل، لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور ثواب کی نیت

سے کام کرنا جو اصل ہے۔ لیکن دیکھئے گا تو یہ ایک عام قانون ہے کہ "جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان بھی ہے تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی" یعنی کوششوں کا محمود اثر، مشکور اثر قائم رہتا ہے۔

یہ پوری انسانی ترقی کی تاریخ اور نسل انسانی کے کارناموں کی، نسل انسانی کی کوششوں کی، نسل انسانی کی بہبودی اور اسکی فلاح اور اس کی سرسبزی کی پوری تاریخ جو ہے، اور علوم کی تحقیقات اور انسانی خدمات اور تعمیری کام اور انصاف .... ان سب کی تاریخ کا ماحصل یہ ہے کہ جو کوئی کوشش کرتا ہے اس کا نتیجہ نکلتا ہے اور ناشکری نہیں ہوتی ہے!

تو شریعت الٰہی کے بارے میں... کہ "جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کا کام کرے گا اس حالت میں کہ اس کے اندر ایمان بھی ہے"...... یہ بہت اہم بات ہے، صرف شرائع الٰہی اور وحی سماوی ہی نے اس پر زور دیا ہے، ورنہ عام اخلاقی تعلیمات اور مصلحین کے کاموں میں یہ مرکزی نقطہ نہیں ہے، وہاں تو یہ ہے کہ اچھا کام کرو، کچھ بنا دو، رفاہ عام کا کوئی کام کر دو، سرائے تعمیر کر لو، کنواں کھود دو، تالاب بناؤ، مسافر خانہ بناؤ، اسپتال بناؤ، یتیم خانہ بناؤ...... اس میں ان کے نزدیک یہ شرط نہیں ہوتی کہ اس میں اللہ کی رضا مطلوب ہو اور اخلاص ہو!

لیکن انبیاء علیہم السلام جب کہتے ہیں تو اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اس میں اللہ کی رضا مطلوب ہو...... جب جا کر اس میں حقیقت پیدا ہوتی ہے،...... کوئی عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا اور اس کی اس میں کوئی حقیقت، کوئی قیمت نہیں ہے، جب تک کہ اس میں رضائے الٰہی مطلوب نہ ہو۔

جذبہ ایمان و احتساب

اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَاناً وَ اِحْتِسَاباً غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ" فَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَاناً وَّاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (متفق علیہ)..... اس میں شرط لگائی کہ روزہ جو ایک خالص عبادت کی چیز ہے، اس میں آدمی کو قربانی کرنی پڑتی ہے، اسکے ساتھ بھی کہ..... "جو روزہ رکھے اللہ پر یقین کرتے

ہوئے اور اس کے اجر و ثواب کے لالچ میں" یعنی اس کا جو محرک ہو وہ ایمان ہو کہ اللہ کا حکم ہے، ہم کچھ نہیں جانتے، بس اللہ کا حکم ہے کہ روزہ رکھو اور اسی کی رضا کیلیے، اس کی خوشی کے لیے، ثواب کی نیت سے ہم کرتے ہیں، تو پھر: غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِه" اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے" معلوم ہوا کہ جو کام ایمان واحتساب سے خالی ہے تو "غُفِرَ له ما تَقَدَّمَ من ذَنْبِه" کا اس کے ساتھ وعدہ نہیں ہے، مقبول نہیں ہے۔

ایسے ہی "مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْر" رات کو اٹھنا آسان نہیں ہے اور پھر ہر طبقہ کے آدمی کے لیے، ہر صحت کے آدمی کے لیے۔ لیکن جو شب قدر میں عبادت کے لیے اٹھے گا اس میں بھی یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ "إِيمَاناً وَ احْتِسَاباً" ایمان واحتساب کے معنٰی یہ ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اس کے بتائے ہوئے اجر و ثواب پر پورا یقین ہو اور وہ ان اعمال کو شوق و عظمت کے ساتھ انجام دے۔ اعمال کی قبولیت اور وزن میں اس کو بڑا دخل ہے، اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بھی ہے، کہ ایک عمل کے محرکات صدہا ہو سکتے ہیں، اب یہ اعجاز ہے قرآن کا تشریع کا... ورنہ ایک عمل کے اتنے محرکات ہو سکتے ہیں کہ آدمی احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔(۱)

ایک آدمی سے اگر کہا جائے کہ تم سوچو کہ اس عمل کے مقصد کیا کیا ہو سکتے ہیں،

---

(۱) بعض مرتبہ تو ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، کہ اچھا اس نیت سے بھی کام کیا جا سکتا ہے؟ جیسے ہماری ایک تقریر ریکارڈ تھی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اور ہم چلے گئے کوئٹہ کی طرف پاکستان کی سرحد کے قریب ہمارے بھائی ابو بکر حسنی نے وہ تقریر ریڈیو پر پڑھی، تو جس دن وہ پڑھی گئی اسی دن ہماری دعوت تھی۔ انگریزی فوج کے ایک بڑے مسلمان افسر کے یہاں جو غالباً بریلی کی طرف کے رہنے والے تھے۔ بہت اہتمام تھا، ہم تھے اور مولانا منظور نعمانی صاحب ان کے مہمان اور ان کے احباب تھے، ہمیں خیال بھی نہیں تھا اور ضرورت بھی نہیں تھی وہ تقریر سن کر آئے تھے، ان کے یہاں ریڈیو تھا، معلوم ہوا کہ ہماری تقریر تھی، انہوں نے کہا کہ مولانا آپ نے بڑی اچھی تقریر کی، بڑے کام کی بات کی، لیکن ایک بات اس میں رہ گئی اور آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا، آپ نے روزے کے فوائد بتائے سب، ایک بات نہیں بتائی کہ افطار کرنے میں جو مزہ آتا ہے۔ وہ کسی کھانے میں مزہ نہیں آتا ہے، کسی دعوت میں مزہ نہیں آتا ہے اور میں بھی اسی لیے روزہ رکھتا ہوں، صاف کہہ دیا انہوں نے اور انہوں نے گویا ایک راز فاش کر دیا، یہ تو خیر بعد کی بات ہے، لیکن ایک ایسی بات نکلتی ہے محرکات میں کہ جو نفسیات انسانی کی کارفرمائی ہے۔

؟ صبح سے شام تک سوچتا رہے، اس کے بعد جب وہ ایک آدمی بتائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ تو آیا ہی نہیں تھا ہمارے ذہن میں، کہ یہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ نظر آتا ہے، اخباروں سے بھی معلوم ہوتا ہے اور تقریروں سے بھی اور لوگوں کی ملاقاتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس مقصد سے کام کئے جارہے ہیں اور کیسے کیسے نیک کام کئے جارہے ہیں.... لیکن مقصد صرف مثلاً اپنی پیشوائی یا اپنی قیادت یا اپنا استحقاق اور دوسرے مادی منافع ہوتے ہیں، تو اس میں شرط ہے "وَهُوَ مُؤمِنٌ" یہ شرائع الٰہی کی خصوصیت ہے اور کلام الٰہی کی، ورنہ کوئی مصلح کہتا تو کہتا "فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" بس اسی پر ختم کر دیتا، کہ جو نیک کام کرے گا اس کی کوشش کا اعتراف کیا جائے گا، ناشکری نہیں کی جائے گی۔

نبوت کا مزاج

تاریخ بھی بتاتی ہے اور مشاہدہ بھی بتاتا ہے کہ ایسا ہو رہا ہے، لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جس طرح لوگ صدر جمہوریہ کا عہدہ حاصل کر لیتے ہیں اور وزارت عظمیٰ حاصل کر لیتے ہیں، نہ معلوم کیا کیا اور دولت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں، تو بول رہا ہے یہ کلام کہ یہ خدا کا کلام ہے۔!

"وَإِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ" .... "اور ہم اسکے لکھنے والے ہیں" کہ ابھی سے اس کے نامۂ اعمال میں لکھدیا گیا ہے کہ اس نے یہ کام کیا ہے، لیکن اسکے ساتھ (ضمناً ہم یہ کہتے ہیں) جہاں تک دنیاوی اثرات کا اور خدمت انسانی کا اور رفاہ عامہ کا تعلق ہے، یہ عمل "مِنَ الصَّالِحَاتِ" کا اثر بہرحال ہوتا ہے کوئی سبیل لگادو، چاہے تمہاری نیت ثواب لینے کی نہ ہو لیکن لوگوں کی پیاس بجھے گی، لوگ پانی پی سکیں گے، اپنی جگہ پر "فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ" ہے لیکن نبی تو یہ کہے گا کلام الٰہی تو یہ کہے گا، "وَهُوَ مُؤمِنٌ"۔

لیکن مصلحین یہ کہہ سکتے ہیں کہ "فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" پورا معاشرہ، شہر کی آبادی سب شکر گذار ہوگی اور اسکی تعریف میں مضامین بھی چھپیں گے، زبان سے بھی لوگ کہیں گے اور دعائیں بھی دیں گے، لیکن شریعت الٰہی میں یہ ہے کہ کیسا ہی نیک کام ہو لیکن "ایمان" کی شرط ہے۔ ہمیں اس ایمان و احتساب کی طرف توجہ سب سے پہلے حضرت

مولانا الیاسؒ کی خدمت میں پہنچ کر ہوئی، سچی بات یہ ہے، ہم تو عربی پڑھاتے تھے اور لکھتے تھے لیکن "اِیْمَاناً وَّ اِحْتِسَاباً" کے معنی انہوں نے جو بیان کئے کہ اللہ پر یقین رکھتے ہوئے اور اجر و ثواب کی لالچ میں احتساب کے معنی اجر و ثواب کی لالچ میں اتنے مختصر اور جامع معنی خود ہم نہیں کر سکتے تھے اس وقت مولانا نے اسکی اور مثالیں دیں کہ کتنے آدمی جو وضو کرتے ہیں فرمایا کہ بالکل طبعی طریقے پر اور آجکل جو ٹونٹیاں چل گئیں ہیں اور نل لگ گئے ہیں مسجدوں میں اب تو اور بھی آسان ہے کہ جیسے مشین میں رکھدیا گیا ہو دھلا دھلایا نکل آیا ہو، ٹونٹی کھولی اور ہو گیا اور حدیث میں آتا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس وقت (مومن) آدمی وضو کرتا ہے اور اپنا ایک ایک عضو دھوتا ہے تو اسکے جتنے گناہ ہوئے ہیں وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں" (ترمذی) اب اسکے بعد جب منہ میں پانی ڈالا، کلی کی تو اس میں اگر کوئی غلط بات کہہ دی تھی یا اس کی گفتگو سے کسی کو تکلیف پہنچی تھی، دلآزاری ہوئی تھی، حقوق العباد کا تو معاملہ الگ ہے، کیونکہ ایسی چیزوں کو جو سہواً اور عادتاً ہوں گی، اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا، آنکھ سے جو بدنگاہی ہوتی ہے، اسکا بھی تعلق گناہ سے ہے، وہ معاف کردی جائیگی، کانوں پر پانی پڑا، کان نے اگر کوئی غلط چیز سنی ہے اور اس پر اس کو کچھ لطف آیا ہے، تو فرماتے تھے (اور ان کے فرمانے سے معلوم ہوا) کہ واقعی کتنی بڑی دولت ہم ضائع کرتے ہیں، ایک وضو سے ہم کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں اٹھائیں کہ ہمارا ذہن حاضر ہی نہیں ہوتا، وہ خیال ہم پر طاری نہیں ہوتا کہ اب یہ ہو رہا ہے، اب یہ ہو رہا ہے، اللہ کے رسول نے، صادق و مصدوق نے فرمایا ہے کہ جب جو عضو دھلے گا تو اسکے پانی کے قطرے بہیں گے ان میں پانی کے ساتھ، پانی کے آخری قطرے کے ساتھ وہ سب بہہ گیا، جو اسکے اس عضو سے تعلق رکھتے تھے، ان کا وہ عضو اسکا سبب تھا، ان کا عامل تھا، وہ گناہ دھل جائیں گے، صرف وہ عضو ہی نہیں دھلیں گے، گناہ بھی دھل جائیں گے۔

تصحیح نیت

اسی طرح سے مولانا بڑی توجہ دلاتے تھے جو کام بھی ہو، اس میں نیت کو درست کرلینا

چاہیے اور اس بارے میں بڑی حیرت ہوتی ہے (کہنے کو تو بہت معمولی بات ہے) کہ معلوم نہیں کیا موقع تھا کیا سبب پیش آیا، سید احمد شہیدؒ نے فرمایا، معلوم نہیں کس عمر میں فرمایا، اس وقت چھیالیس سال کی تو حضرت کی عمر ہوئی، چھیالیس سال کی عمر میں شہادت ہوئی، اب معلوم نہیں چھیالیس کی عمر میں فرمایا کہ پینتیس (۳۵) سال کی عمر میں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، شعور پیدا ہوا ہے اس وقت سے اس وقت تک میں نے امور شرعیہ میں سے ہی نہیں امور طبعیہ میں سے کوئی کام بغیر نیت کے نہیں کیا، جس میں رضائے الٰہی کی نیت نہ ہو، کپڑا پہننا، کھانا کھانا، سونا، کسی سے اخلاق سے ملنا، کسی کو دیکھنے جانا، کوئی کام ایسا جو امور طبعیہ میں ہے، وہ بھی میں نے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کے اور بغیر ثواب کے ارادے کے نہیں کیا، بہت بڑی بات ہے، یعنی اس شخص کا درجہ کتنا بڑا ہوگا، کہ جو اس کے عادات بھی عبادات تھے، مجاہدات اسی سے عبادات بنتے ہیں اور اسکے بغیر عبادات عادات بن جاتی ہیں کوئی نماز اس لیے پڑھتا ہے اور کتنے لوگ ہوں گے جو کہدیں گے کہ بے تکلفی میں کہ بھئی ہم تو نماز اس لیے پڑھتے رہے کہ محلہ ایسا تھا اور ویسے آدمی کیلیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ نماز پڑھے بغیر وہاں رہے اور لوگوں سے ملے۔

پوری زندگی عبادت ہے

''یہ بعثت محمدی کا بہترین تحفہ اور اس کا بڑا احسان، اس کا یہ عالمگیر اعلان تھا کہ اعمال و اخلاق کی اساسی دریافت ہی انسان کا مطلوب نصب العین ہے اور جسے شریعت نے ایک مفصل و بسیط مگر وسیع و محیط لفظ ''نیت'' سے تعبیر کیا ہے۔

''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰی'' ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی ہوگی'' ہر وہ کام جو انسان اللہ کی مرضی کے لیے خلوص کے ساتھ اور اس کے حکم کی بجا آوری کے خیال سے کرتا ہے، وہ اس کے لیے قرب الٰہی اور یقین کے اعلیٰ طبقات اور ایمان کے بلند درجات تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی وہ دین خالص ہے، جس میں کوئی دنیوی شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس میں ہر طرح کے کام داخل ہیں، مثلاً جہاد و قتال، حکومت و انتظام، دنیوی لذتوں سے استفادہ، طبعی تقاضوں کی تکمیل، روزی کی

طلب، جائز و مباح تفریح اور عائلی و ازدواجی زندگی اور ہر عبادت اور دینی خدمت۔

اس کے برعکس یہی چیزیں اس وقت ''دنیاداری'' میں داخل ہو جاتی ہیں، جب ان میں رضائے الٰہی کی اور اس کے حکموں کی پیروی کی نیت نہ شامل ہو، بلکہ ان کا مقصود غیر اللہ اور اُن پر غفلت اور آخرت فراموشی کا پردہ پڑا ہو، ایسی حالت میں فرض نمازیں، ہجرت و جہاد ذکر و تسبیح بھی دنیاوی عمل بن جاتی ہیں اور ان پر عمل کرنے والے آدمی اور عالم و مجاہد اور داعی کے لیے وہ بجائے ثواب کے وبال جان اور اس کے اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں''۔

''مومن کی زندگی متفرق اور متضاد اکائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایسی وحدتِ کاملہ ہے، جس میں عبادت و احتساب کی روح کارفرما ہے، اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا جذبہ اس کی قیادت کرتا ہے، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور جہد و عمل کے سارے میدانوں اور سبھی قسموں کو شامل ہے، بشرطیکہ وہ اخلاص، صدق نیت، رضائے الٰہی، اور انبیاء کے طریقے پر ہوں''۔

تو یہ ''مومن'' کی شرط ہے ہمیں (اگر اللہ ہمیں توفیق دے) کہ ہم جو عادتاً کام کرتے ہیں ان میں بھی تھوڑا سا ہم ذہن کو حاضر کر لیں اور کوشش کریں پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، پھر وہ اسکی عادت پڑ جائیگی، لیکن ابھی ذرا سوچنے کی ضرورت ہوگی کہ جو کام ہم راحت کیلیے کرتے ہیں، تفریح کیلیے کرتے ہیں، دوسروں کو خوش کرنے کیلیے کرتے ہیں، یا ضرورتاً کرتے ہیں، ان میں بھی کوئی نیت سوچ لیں کہ اس سے یہ ثواب ملے گا، ہم یہ نیت کر کے جا رہے ہیں، مثلاً ملاقاتیں ہیں، اہل حقوق سے آدمی ملاقاتیں کرتا ہے، نہ جائیں گے شکایت ہوگی، ملامت کریں گے اور جی بھی چاہتا ہے ذرا بیٹھیں باتیں کریں، تفریح کریں، دل خوش ہو، نہیں نہیں، ان کا حق ہے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، مسلمان مسلمان سے ملے، اور اپنے عزیزوں سے ملے، بزرگوں سے ملے اور بھی زیادہ نیت کر لی جائے اللہ ہمیں آپ کو سب کو توفیق دے، کہ ہم ایمان واحتساب کا اہتمام کریں، تا کہ عمل وزنی ہو، کیوں کہ خدا کے یہاں وہی عمل وزنی ہوتا ہے، جو ایمان و احتساب کے ساتھ ہو، عادتاً اور رواجاً، میکینیکل طریقہ پر عمل ہونا کچھ سودمند نہیں۔[1]

(۱) مشترک اخذ و تلخیص۔ از: ☆ درس قرآن، سورۂ انبیاء۔ ع۔ ے۔ (غیر مطبوعہ) ☆ تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات: ۸۹-۹۰-و-۹۲

ایمان و اعمال صالحہ کی جزاء اور رضائے الٰہی کی قیمت

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ. وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ﴾ (الحج:۲۳-۲۴)

''بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ایسی جنتوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، (اور) وہاں ان کو پہنائے جائیں گے سونے کے کنگن اور موتی اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا اور ان کو ہدایت کی گئی پاکیزہ کلام کی اور بتائی گئی خدائے حمید کی راہ''

اہل جنت کا اکرام

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ ..... ''بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا، ان

لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ایسی جنتوں میں جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی" ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا﴾ "ان کو زیور پہنایا جائے گا، کڑے ہوں گے سونے کے اور موتی۔ ﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ "ان کا لباس اس میں ریشم ہوگا"۔

یہ ہر جگہ کا لباس اور ہر جگہ کی زینت، اس مقام، زمانے اور ذوق کے مطابق ہوا کرتا ہے، تو یہ جو زیور ان کو پہنایا جائیگا، اگر ہم سوچیں آپ سوچنے لگیں، اپنے اوپر قیاس کریں اپنے زمانے پر قیاس کریں کہ مردوں کو کنگن پہنائے جائیں گے سونے کے اور موتی پہنائے جائیں گے، اول تو وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں کی شکل کوئی ضروری نہیں کہ انہی کنگنوں اور موتیوں کی طرح ہو اور وہ اسی نظر سے دیکھے جائیں، وہاں کا تو عالم ہی دوسرا ہو گا، وہاں ذہن ایسا بدل جائے گا، اللہ تعالیٰ نیا ذہن بنائے گا، نئی نفسیات ہوں گی، نئے معیار ہوں گے، نئے احساسات ہوں گے، تو وہاں کے تقسیم کو یہاں کے تقسیم پر اور وہاں کے قانون کو یہاں کے قانون پر قیاس نہیں کرنا چاہیے (۱)

یہ زبان میں جتنی گنجائش ہے، زبان جتنی چیز کی متحمل ہے یہ کہہ دیا گیا، اس کو "أَسَاوِرَ" کہا گیا، اس کو "لُؤْلُؤ" کہا گیا، لیکن یہ اپنے مقام و محل اور زمانے اور وہاں کے عرف کے مطابق ہوگا اور وہ بالکل معیوب نہیں سمجھا جائیگا۔

(۱) خود دنیا میں موجودہ عہد میں بھی یہ حال ہے کہ ایک ملک میں۔ عرف کی بات ہوتی ہے، جس کو عرف کہتے ہیں، اس کا ترجمہ مشکل ہے، ایک چیز جو اس کے ساتھ ایک خاص تاثیر بن جاتا ہے، کہ یہ عرف تھا اسکے لیے، یہ عرف تو لباس بھی عرف ہی ہوتا ہے تو بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں مثلاً ہندوستان ہی نہیں ایشیا میں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لیکن وہ مغرب میں معیوب نہیں، کچھ ہیں جو مغرب میں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ایشیا میں معیوب نہیں ہیں اور ان کی شکلیں بھی ذرا مختلف ہوتی ہیں، بالکل اس کو یوں سمجھنا کہ وہ مرد ہوں گے اور کنگن ایسے ہی، جیسے مستورات کے، خواتین کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، یہی کنگن ہوں گے، اسی شکل کے ہوں گے اور اسی طرح سے اتنے ہی بڑے ہوں گے اور ہاتھوں میں اسی جگہ پہنائے جائیں گے، یہ ہم جنت کی چیز کو اس دنیا کی چیز پر قیاس نہیں کر سکتے۔

یہ معیوب سمجھنا یہ بھی ایک عرفی چیز ہے، یہ نہ کوئی شرعی چیز ہوتی ہے اور نہ کوئی قانونی چیز ہوتی ہے اور نہ کوئی علمی چیز ہوتی ہے۔[1]

یعنی ہماری عرفی اور اصطلاحی زبان یہی ہے کہ ایک تو ان کی اس جگہ کی تعریف کی کہ باغات ہوں گے، نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خاص کر عربوں کے لیے تو یہ بہت بڑی جنت ہے اور پھر یہ کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص اکرام کا معاملہ ہوگا اور ان کو اللہ تعالیٰ ممتاز بنائے گا۔

"وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ" اور یہ حریر جس کی یہاں ممانعت ہے مردوں کے لیے، وہ وہاں اس کی ممانعت نہیں ہوگی، یہ احکام شرعی جو ہیں وہ بہت سے مصالح اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت اور اس کی مرضی اور جو اس کے نتائج ہوتے ہیں، عقلی ونفسی نتائج ہوتے ہیں، ان کی بنا پر یہاں بعض ایسے احکام ہیں جو دنیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً مرد ریشم نہ پہنے اور ایسی اور کئی چیزیں ہیں یہ یہاں کی شریعت ہے، جنت میں ضروری نہیں کہ یہ احکام وہاں نافذ ہوں، وہاں کے دوسرے احکام ہوں گے، جو اہل جنت کو معلوم ہو جائیں گے۔

دین کا اصل موضوع رضائے الٰہی کی قیمت

آپ جانتے ہیں کہ اللہ کا یہ دین جو خدا کے پیغمبر اپنے اپنے زمانہ میں اور اشرف المرسلین وسید الاولین والآخرین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری بار اور ہمیشہ کے لیے لے کر آئے، اس دین کا اصل موضوع ہے آخرت میں انسان کو اللہ کی رضا اور اس کے انعام سے سرفراز کرنا اور آخرت کی، ابدالآباد کی زندگی کو، ہمیشہ رہنے والی زندگی کو، کبھی نہ فنا ہونے والی زندگی کو پُر راحت نہیں پُر عشرت بنانا اور آخری ترقیوں تک اور ان نعمتوں تک جن کا تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں ہے اور جن کے متعلق آتا ہے، کہ "نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی دل میں خیال گذرا" ان نعمتوں تک پہنچانا، اصل موضوع اس کا اس آخرت میں اس

(۱) مثال کے طور پر (کوئی برا نہ مانیں) بعض جگہ ایسی ہیں کہ وہاں لنگی پہنی جاتی ہے۔ پہلے عرب میں دستور تھا، اب ہمارے بھٹکل کے علاقے میں کوئی اسے عیب نہیں سمجھتے، یہ پورا مردانہ لباس ہے، لیکن کوئی اگر لکھنؤ میں لنگی باندھکر نکلے، امین آباد میں تو لوگ دیکھیں گے کہ کیا ہوا سوتے سوتے اٹھ کر آگئے، بہر حال ہم نے یہ سمجھانے کے لیے کہا کہ وہاں خاص اکرام ہوگا اہل جنت کا، یہی طریقہ ہے۔

زندگی کے بعد کی زندگی میں راحت اور لذت، عزت اور دوام عطا کرنا، پھر "**لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ**" کا معاملہ ہوگا، یعنی نہ وہاں کوئی خوف ہوگا، نہ غم، خوف کیا ہے؟ آئندہ کا کھٹکا، کل کیا ہوگا؟ پیسہ نہ رہا تو کیا ہوگا؟! کوئی بیمار ہوگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی عزیز مرگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی حملہ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ قحط سالی ہوئی تو کیا ہوگا؟ طوفان آگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی ذلیل کرنے کے درپے ہوا تو کیا ہوگا؟ اور سب سے آخر میں یہ ہے کہ موت آگئی تو کیا ہوگا؟

اور حزن ہوتا ہے **ماضی** پر، گذشتہ پر، ہائے حسرت یہ کام کیوں کیا، یہ چوک کیوں ہوگئی، یہ انتظام کیوں نہیں کرلیا، یہ بات پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی، تو جنت میں دونوں چیزیں نہیں ہوں گی، "**لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ**" نہ آئندہ کا کھٹکا، نہ پچھلے کا افسوس، اس کی کھٹک اور خلش اور پھر اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر "**وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ**" اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑی ہوگی، اس کا ذائقہ تو وہی کچھ سمجھ سکتا ہے، جس کے دل میں کسی کی محبت ہو اور کسی کی عزت ہو، محبت تو اس لیے کہ محبوب کی ذرا سی پسندیدگی، اس کا دیکھ لینا، یہی انسان کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے محبت سے حصہ عطا فرمایا ہو، بس آخرت کی کامیابی ہے اور عزت، اس لیے کہ جب کوئی معزز آدمی کسی سے خوش ہوجاتا ہے، خوشی کا اظہار کرتا ہے، تعریف کرتا ہے، تو پھر آدمی پھولے نہیں سماتا، اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے (۱)

---

(۱) بہت سی اس کی مثالیں ہیں پہلے انگریز حکام کے زمانہ میں ریاستوں کے زمانہ میں ایسا ہوا کرتا تھا کہ وہاں سے آئے اور کہا "مہاراجہ صاحب ہنس کر بولے تھے اور مہاراجہ صاحب نے یہ کہا تھا کہ خیریت ہے؟ کہتے ہوئے ہاتھ بھی ذرا سا اٹھ گیا اور ہونٹوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ بھی تھی، اس وقت بہت آدمی بیٹھے تھے، لیکن مہاراجہ صاحب نے میری ہی طرف دیکھا اور فرمایا کہ کہو قاضی صاحب مزاج اچھا ہے؟ بال بچے اچھے ہیں۔
ایک صاحب کا واقعہ یہ ہے کہ گھر آئے تو بات نہیں کرتے تھے، بیوی بچوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف ہوگئی؟ بہت مشکل سے بولے کہ میں حاکم سے بات کرکے آیا ہوں، اب اس منہ سے کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، جیسے کوئی بہت مزیدار چیز کھائی ہو، تو اس کے بعد کوئی کڑوی چیز یا دوا کھلائے تو آدمی کہتا ہے منہ کا مزا خراب ہوجائے گا، ابھی مزا آرہا ہے اس کا، تو انھوں نے کہا کہ اب حاکم سے بات کرکے آیا ہوں، اب کس سے بات کروں، بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، یعنی وہ جو عزت ملی تھی، وہ جاتی رہے گی، وہ لذت جو حاصل ہوئی تھی جاتی رہیگی۔

آخرت کی عظمت ووسعت

وہ آخرت.... اس کا تو ہم تصور ہی نہیں کرسکتے، ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہو اس سے آپ کہیے یا ابھی پیدا ہوا ہو، اس سے اگر کوئی بات کرسکتا ہو اور وہ بات سمجھ سکتا ہو، تو اس سے کہیے کہ بیٹا! جب تم دنیا میں آؤ گے تو بڑا وسیع میدان ہوگا، ہزاروں ہزار میل کا، وہاں باہر ہوائیں چل رہی ہوں گی اور پانی برسے گا، وہاں پر ریلیں چلتی ہیں اور وہ بچہ بے چارہ ماں کے پیٹ میں کیا سمجھے کہ ریل کیا بلا ہوتی ہے، ریل کا ہے پر چلتی ہے اور کتنی تیز چلتی ہے اور تو اور ہوائی جہاز اڑیں گے،

بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اور یہ اس سے کہہ رہا ہے، کہ ایسا بھی وقت آسکتا ہے، کہ ہوائی جہاز میں بیٹھو گے، بالکل ایسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر آخرت کا معاملہ ہے،...... یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت ہے اور اس کی مصلحت ہے کہ اتنا بھی ہماری سمجھ میں آگیا، ورنہ ہماری سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے، کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں کیا ہوگا، کیا ملے گا، وہ کتنی وسیع ہوگی "عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" اس کی وسعت میں زمین و آسمان ایسے ہیں کہ جیسے سمندر میں کوئی کنکری، ٹکی ڈال دے، یہ بھی پتہ نہیں چلے گا، گئی کہاں؟ تو ایسے ہی یہ ساری دنیا، حدیث میں آتا ہے، "مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا" ایک کوڑا رکھنے کی (پھیلا کر کے نہیں، کھڑا کر کے) رکھنے کی جگہ ساری دنیا سے وسیع ہے، تو اس آخرت کا تو کیا کوئی تصور کرسکتا ہے اور پھر آخری بات یہ ہے کہ "وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اللہ کی رضا جب بندوں کو معلوم ہوگا، جنت میں کہ اللہ راضی ہوا، میرا مالک یہاں راضی ہے، رب مجھ سے خوش ہے، اب ناراضگی کا کوئی کھٹکا نہیں، اس کی لذت کو، اس کی عزت کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

تو دین کا اصل موضوع ہے اس آخرت میں کامیابی دلانا، اس آخرت کے خطروں سے بچانا، اس آخرت کا عیش نصیب کرنا، اس آخرت میں زندگی دوام، ہمیشہ رہنے والی، کبھی فنا نہ ہونے والی زندگی عطا کرنا ہے، اللہ فرماتا ہے، "لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

اِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُوْلٰی" جب اس دنیا سے جانے لگیں گے تو ایک ہی مرتبہ موت کا تجربہ ہوگا اور اس کے بعد موت کا کوئی امکان نہیں، پھر موت نہیں آئیگی، یہ دین کا اصل موضوع ہے، اس لیے کہ دین جتنا بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے جتنا خوش ہوتا ہے، اس کے انعام کی اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں، اس دنیا میں تو بہت چیزوں کی گنجائش نہیں، کتنے آدمی ہیں جن کو شادی مرگ ہو جاتی ہے، ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ برداشت نہیں کر سکے اور دم نکل گیا، تو اللہ تعالیٰ کے اصل انعامات کی تو اس دنیا میں گنجائش نہیں، اس لیے اس نے آخرت رکھی ہے، وہ جنت حقیقی جنت ہے اور وہ زندگی حقیقی زندگی ہے اور وہ گھر حقیقی گھر ہے۔"(۱)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "هُدُوا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ" اور ان کی ھدایت کی گئی "اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ" اچھے قول کی طرف، اب یہ اس میں اتنی عمومیت ہے کہ اس کی تحدید اور اس کا احصاء نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیا ہے، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث نفع ہو، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث ھدایت ہو، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث مسرت ہو، باعث تفکر اور عقل ہو اور جس سے نفع پہنچتا ہو، یہ سب "الطيب من القول" میں شامل ہے، ان کو ھدایت کی جائے گی "اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ" اچھی بات کہنے، اچھی بات زبان سے نکالنے کی "وَهُدُوا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيدِ" اور ان کو ھدایت کی گئی، "الْحَمِيد" کے راستے کی طرف، اللہ تبارک وتعالیٰ جو "الْحَمِيد" ہے اس کے راستے کی طرف ان کی ھدایت کی گئی، یہ وہ لوگ ہیں جو "اَلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" میں داخل ہیں، ان کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہے، جنت میں یہ معاملہ ہوگا اور دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو توفیق دی اچھی بات کہنے کی جو لوگوں کے لیے نافع اور مفید ہو، چشم کشا ہو، بصیرت افزا ہو اور باعث ھدایت ہو اور خود ان کی ھدایت کی گئی، "صِرَاطِ الْحَمِيد" کی طرف۔

اب یہ "صِرَاطِ الْحَمِيد" میں اگر "الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيم" بھی کہہ دیا جاتا تو اس میں وہ عمومیت نہ ہوتی جو "صِرَاطِ الْحَمِيد" ہے، وہ اللہ تبارک تعالیٰ جو قابل حمد ہے،

(۱) تحفۂ دین ودانش۔ص۔۹۴۔۹۸ سے باختصار ماخوذ ہے

مستحق حمد ہے، اس کے راستے کی طرف، نسبت سے اضافت سے چیز کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، آپ کہئے یہ بادشاہ کی چیز ہے، یہ حاکم کی چیز ہے، یہ حکومت کی چیز ہے، یہ سرکار کی چیز ہے، یہ قطب وابدال اور اولیاء اللہ کی چیز ہے، اضافت سے وہ چیز کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، چیز وہی ہوتی ہے، لیکن اضافت سے اس کا درجہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے، جس کی طرف اضافت کی گئی، جو مضاف الیہ سے اس کی عظمت اس میں شامل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس زندگی میں بھی جنت کا کچھ لطف آنے لگے، عارفوں کو تو چھوڑیے، وہ تو کہتے تھے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کیا عیش کر رہے ہیں، کس لطف میں ہیں، تو ہمیں بیٹھنے نہ دیں، تلوار لے کر ہم پر حملہ کریں اور کوئی اللہ کا بندہ کہتا تھا کہ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، مجھ سے کیا چھین سکتا ہے، میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، میں کھڑا ہوں تو جنت، میں بیٹھوں تو جنت میں، "جَنَّتِیْ فِیْ صَدْرِیْ" میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، متوسط درجہ کے مسلمانوں کو بھی اس زندگی میں وہ راحت وہ عزت، وہ سکون حاصل ہو سکتا ہے، کہ جس کی غیر مسلم جو دین سے ناآشنا ہیں، تصور نہیں کر سکتے، مگر شرط یہ ہے کہ اس دین پر عمل کریں۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۲۳-۲۴ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ ☆ تحفۂ دین ودانش: ۹۳-۹۸ سے باختصار ماخوذ ہے۔

دعا کی رفعت شان

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ☆ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ (البقرۃ: ۱۸۶)

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں تو قریب ہی ہوں (اور) دعا کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس لوگوں کو چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں، عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں''۔

دورِ جاہلیت میں عبد و معبود کے رشتہ کا اضمحلال

جن لوگوں کی مذاہب و عقائد کی تاریخ پر گہری اور تفصیلی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں جو جاہلیت کے نام سے موسوم ہے عبد و معبود کے تعلق میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا کہ دعا کا سرچشمہ (جو یقین اور محبت و خوف کے بغیر جاری نہیں ہو سکتا) اندر ہی اندر خشک ہو گیا تھا، عبد اپنے معبود کے متعلق اتنی غلط فہمیوں اور اتنی جہالتوں کا شکار تھا کہ اس کے اندر دعا کا جذبہ اور تقاضہ پیدا ہونا ہی مشکل تھا.......... مشرکانہ جاہلیت نے (صفات الٰہیہ کو مخلوقات کی طرف منسوب کر کے) دعاء و التجاء کا رخ خدا سے موڑ کر بندوں کی طرف تبدیل کر دیا تھا، دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ براہ راست خدا سے طلب و سوال اور دعاء و التجاء کا رواج ہی

تقریباً ختم ہوگیا تھا، زمانہ بعثت میں پورے ملک اور وسیع علاقوں میں ایسے چند آدمی بھی ملنا مشکل تھے، جن کو خدا سے دعاء کرنے کی عادت اور اس کا سلیقہ ہو اور جو اس سے تسکین حاصل کرتے ہوں اور اسی کی دعوت دیتے ہوں۔

دعا سے محرومی کا ایک سبب

دعاء سے محرومی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کا یہ غلط تخیل تھا کہ خدا ہم سے بہت دور ہے، ہماری آواز وہاں کہاں پہنچ سکتی ہے........دوسرا غلط عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی نفع وضرر کا مالک اور انسانوں کی امداد و اعانت پر قادر ہے، اس عقیدہ نے دعاء و استعانت کو "حقیقی نافع وضار" سے ہٹا کر خیالی معاونوں اور دادرسوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور عالم کا عالم شرک و بت پرستی کا شکار تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ (ارواحنا ونفوسنا فداہ) نے محروم و محجوب انسانیت کو دوبارہ دعاء کی دولت عطا فرمائی اور بندوں کو خدا سے ہمکلام کر دیا اور دعاء کی کیا دولت عطا فرمائی، بندگی کی بلکہ زندگی کی لذت اور عزت عطا فرمائی، اس مطرود انسانیت کو پھر اذنِ باریابی ملا اور آدم کا بھاگا ہوا فرزند پھر اپنے خالق و مالک کے آستانے کی طرف یہ کہتا ہوا واپس ہوا۔

بندہ آمد بدرت بگریختہ   آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

آپ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمایا اور یہ مژدہ سنایا کہ "وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں، تو میں قریب ہی ہوں، (اور) دعاء کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعاء کرتا ہے"۔

عبدیت کا ظہور اور نتیجہ دعاء ہے........اور دعاء کے لیے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے، جس سے دعا کی جائے، پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے اور دینے کے لیے اس کے پاس سب کچھ ہے، پھر اس یقین کی کہ اس کے در کے سوا اور در نہیں، پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے اور محبت و رحمت، بخشش و عطاء اور احسان و انعام

اس کی خاص صفت ہے اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا، جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے، پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاج سرتا پا کشکول گدائی ہے، پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے دنیا کی ہر چیز سے یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے"۔ (۱)

یہ یقین اور ذوق عبودیت وانابت الی اللہ جب پیدا ہو جاتا ہے اور باطن میں سرایت کر جاتا ہے، تو انسان میں اپنی بے بسی اور بے چارگی، اپنی تہی دستی و بے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے، کہ وہ آستانہ شاہی پر کشکول گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خدا کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے ۔

شیئاً للہ از جمال روئے تو	مفلسا نیم آمدہ درکوئے
آفریں بردست و بربازوئے تو (۲)	دست بکشا جانب زنبیل ما

"پھر آپ نے صرف اسی کو واضح نہیں کیا کہ بندہ اپنے مالک سے دعاء کر سکتا ہے اور وہ اس کی سنتا ہے اور اس کی مدد کر سکتا ہے، بلکہ آپ نے یہ ثابت کیا کہ" خدا کو دعاء مطلوب ہے اور وہ اس سے خوش اور راضی ہوتا ہے، بلکہ دعاء نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے، بندگی کا نہایت واضح اور مؤثر مظاہرہ ہے اور عدم دعاء بندگی سے گریز و استکبار و سرکشی کی علامت ہے"۔

آپ کے اس اعلان نے دعا کا پایہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کو بندگی کے فعل اضطراری کے درجہ سے اعلیٰ عبادت اور قرب کے مقام تک پہنچا دیا۔

" وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ. اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ" "اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعاء قبول کروں گا، بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں عنقریب وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا نہ کرنا محض محرومی کا باعث نہیں، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا بھی باعث ہے، حدیث کے الفاظ ہیں "مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ"۔ "جو اللہ

(۱) سیرت محمدیؐ دعاؤں کے آئینہ میں: ۸-۱۶ (۲) تزکیہ واحسان وتصوف وسلوک: ۵۴

سے سوال نہیں کرتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے''۔

پھر آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دعاء کو مغز عبادت قرار دیا، "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ"۔ دعا کو رحمت و برکت کے دروازے کی کلید قرار دیا گیا اور فرمایا گیا "مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ"۔ ''جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے''۔

اس طرح دعا کا شعبہ جس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، عبادات اور معابد بھی اس کے نور سے خالی ہو چکے تھے اور جاہلیت کے سالک و مرتاض اور عبّاد و زہّاد بھی اس دولت سے محروم تھے، دوبارہ زندہ اور تازہ ہوا اور یہ دولت اتنی عام ہوئی کہ

ع رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

کتنی خوش قسمت ہے وہ امت جس کو نبوت کی وراثت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے طفیل میں دین۔ دنیا کا خزانہ اور غیب کی نعمتوں اور دولتوں کی یہ کنجی ملی اور کتنی بدقسمتی اور پست ہمتی ہے اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے''۔ (۱)(۲)

---

(۱) سیرت محمد دعاؤں کے آئینہ میں (تلخیص): ۱۵-۵۲

(۲) درس قرآن، سورۂ بقرہ: ۳۳ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے:
☆ سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں: ۸-۱۹ ☆ تزکیہ و احسان و تصوف و سلوک: ۵۴ ☆ سیرت محمد دعاؤں کے آئینہ میں (تلخیص): ۱۵-۵۲

باب دوم

اوصاف واخلاق

اسلام

بیک وقت عقیدہ وعمل، معاملات واخلاق، جذبہ وشعور کا حامل ہے،
اسی طرح وہ ایک خاص طرح کا ذوق بھی ہے ایسا ذوق جو انسان کا احاطہ کرلیتا ہے
اور اسے ایک نئے طرز میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے شرح
صدر نصیب کرے اور وہ اس پر خدا کے پسندیدہ دین اور آخری رسالت سمجھ کر ایمان لائے
تو وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔ اس پر ایک نیا رنگ چڑھ جائے گا اور اس طرح اس
کا کایا پلٹ ہو جائے گی۔ گویا وہ ازسر نو پیدا ہوا ہے، کیوں کہ وہ ایک مستقل زندگی اور کامل و
جامع زندگی ہے اس میں انقلاب وتغیر اور کمال وجمال کا ہر پہلو موجود ہے۔
اسلام... کوئی خشک وبے روح عقیدہ اور لفظی وکتابی مذہب نہیں بلکہ وہ ایسا دین
ہے جو انسان کے باطن واندرون میں جذب وپیوست ہو کر رگ وپے میں
بجلی کی لہر بن کر دوڑنے لگتا ہے، جیسے کرنٹ ایک تار سے دوسرے
تار میں جاری اور منتقل ہو جاتا ہے۔

(نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں: ۸۱)

رحمٰن کے مقبول بندوں کے مخصوص اوصاف

مخصوص بندوں کے تعارف میں ارض وسماء کا واسطہ

اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے مخصوص اور اپنے مخلص اور اپنے منتخب بندوں کی تعریف کرنی ہے، ان کا سراپا پیش کرنا ان کے اخلاق، ان کے معاملات، ان کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ، ان کی اپنی اندرونی صفات، پاکدامنی اور خشیتِ الٰہی، انسانی ہمدردی اور خدا کا خوف یہ ساری چیزیں بیان کرنی ہیں!

"تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوْجاً" کوئی آیت دوسری آیت سے بےتعلق نہیں، قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں تدبر کرنے کی گنجائش ہے اور نئے نئے مضامین اور نئے نئے نکات سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اب تعریف تو کرنی ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے ان بندوں کی جو اصل میں "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" "اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً ......الخ"۔ لیکن اپنی صفت میں یہ بیان کیا کہ "ہم نے چراغ بنایا" اور ایک روشن چاند بنایا۔ اب آسمان میں یہ بنایا تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی کوئی شانِ خلاقی اور اپنی شانِ تربیت... اور اپنا انعام زمین میں نہیں فرمائے گا۔ زمین بھی تو ایک اللہ کی مخلوق ہے ...... بہت بسیط ہے۔ بہت پھیلی ہوئی ہے اور وہ جگہ ہے جہاں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی ہے، یا بعثت ہوئی اور جہاں اللہ تعالیٰ کے عارفین

اور کاملین پیدا ہوئے ......اور جہاں عبادت ہوتی ہے اور جہاں مسجدیں بنتی ہیں اور جہاں اللہ کا علم پھیلایا جاتا ہے اور جو راستہ ہے جنت تک جانے کا یعنی جنت تک جانے کا راستہ یہ زمین ہے... آسمان تو بعد میں پڑے گا۔ پہلے یہ زمین ہے!

زمین کے چاند سورج

تو پہلے فرماتا ہے کہ: ''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ بنایا اور ایک روشن چاند چمکتا ہوا۔ چاند۔ بنایا''!

تو جب آسمان میں اس نے یہ کیا تو زمین میں کیا کیا؟ لیکن زمین میں نہ برجوں سے فائدہ اور چراغ سے فائدہ اور نہ ''قمر امنیرا'' وہ آسمان کا ہے اور پوری اس کی روشنی یہاں زمین پر پڑ رہی ہے!

یہاں کے جو چاند سورج ہیں، وہ آدمی ہیں، یہاں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کا بہترین نمونہ ہے وہ یہاں کے آدم کی اولاد ہیں۔ جن میں انبیاء ہیں، اولیاء ہیں، عارفین ہیں، کاملین ہیں، عشاق ہیں، اور عشاق الٰہی ہیں، محبوب رب العالمین ہیں، مجاہدین ہیں، مصلحین ہیں، شہدا ہیں، یہ سب زمین میں ہیں،!

تو اللہ تعالیٰ نے آسمان کی چیزیں بنائی، برج بنائے اور ایک چراغ جلتا ہوا اور ایک چمکتا ہوا چاند،!

تبدیلی روز و شب میں تذکیر کا سامان

اللہ پاک آگے فرماتا ہے۔ ﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ ۔اور وہ پاک ذات ہے جس نے کہ رات اور دن کو بدلنے والا بنایا۔ یعنی باری باری سے آنے والا، ابھی رات ہے، پھر دن ہے، دن ہے، پھر رات ہے۔

''لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْاَرَادَ شُكُوْرًا'' ''اس کے لیے جس نے ارادہ کیا کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا شکر کرے۔''

یہ جو تبدیلی ہے یہ تبدیلی بہت بڑی معاون ہوتی ہے تذکیر کے لیے اگر بالکل یکساں حالت رہی تو آدمی بالکل سوسا جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی نیا تقاضہ اور کوئی احساس نہیں پیدا ہوتا، دن ہی اگر رہتا تو لوگ دن کا کام کرتے رہتے، وہی کھانا کھانا، دوڑنا دھوپنا وغیرہ! لیکن دن کے بعد رات کا آنا اور رات کے بعد دن کا آنا اس تبدیلی میں بہت بڑا تذکیر کا سامان ہے کہ اب دن گیا بھی تو دن میں تھوڑی کوتاہی ہوئی ہوگی تو رات کو ہم اس کی کمی پوری کریں تہجد سے، عبادت سے، رات کو سو گئے اور پوری رات سوتے رہے، تو دن میں اب ہم کچھ قرآن شریف پڑھ لیں، نفلیں پڑھ لیں، کچھ خدمت کرلیں!

یہ دن رات کا الٹ پھیر جو ہے یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک ہدایت کا اور ترقی کا ترقی روحانی کا سامان ہے۔ (۱)

اللہ کے خاص بندوں کی تعریف

اب اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں سے اپنے خاص بندوں کی تعریف کرتا ہے:۔

قدر مشترک... "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" "رحمٰن کے وہ بندے" اب اس میں ہر چیز ایک اعجاز ہے......! ان انسانوں کو جو تعریف کی ہے، اس میں جو قدر مشترک ہے، جو ان کی صفات کا محرک ہے یعنی کہ ان کی ہر صفت میں اس کا پرتو پایا جاتا ہے وہ ان کا آہستہ آہستہ چلنا، کوئی کیڑا مر نہ جائے، یہاں تک کہ کسی کی کوئی چیز خراب نہ ہو جائے اور جب لوگ ان سے الجھتے ہیں تو کہتے ہیں "بھائی سلام ہو" "معاف کرنا" "ہمارے پاس وقت نہیں ہے"۔

(۱) اور ہماری کوئی بڑی وقیع شہادت نہیں لیکن بہرحال ذوق ہے اپنا اپنا اور یہ رکوع ہے جو ہمارے استاد خلیل عرب کو بہت ہی محبوب تھا اور وہ اکثر فجر کی نماز میں یہ پڑھتے تھے، اکثر ان پر گریہ ایسا طاری ہوتا تھا کہ ختم کرنے سے پہلے رکوع ان کو کرنا پڑتا تھا اور انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ہم آرہے تھے یونیورسٹی سے تو کچھ غیر مسلم، ہندو عیسائی، یہ لوگ! انہوں نے ایک کمیٹی بنائی تھی کہ مذاہب کا مطالعہ کیا جائے۔ ہر ایک کا نمونہ پیش کیا جائے، پہلے سے ان سے کہہ رکھا تھا، یہ ہمیں یاد نہیں بہت پرانی بات ہے، ہم طالب علم تھے یا وہ ادھر سے گذرے تو ان کو بھی دعوت دی کہ آپ اسلام کو پیش کریں! تو جب وہ اپنا اپنا پیش کر چکے، جو کچھ انہیں پیش کرنا تھا اس کے بعد ہم نے یہ رکوع پڑھا۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے کہتے ہیں کہ ان پر گریہ طاری ہوگیا کہ یہ ایسی جماعت انسانوں کی ہوتی ہے!

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جو تعریف کی ہے ان سب میں قدر مشترک ہے وہ رحمت کی صفت ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا ظہور ہوا ہے، بشری دائرہ میں، بشری قالب میں جتنا ظہور ہو سکتا ہے رحمت کا، وہ ہوا ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کی صفت تجلی ہے!

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اسمائے حسنیٰ میں، کم سے کم ننانویں تو مدون ہیں اور محفوظ ہیں ان میں سے کوئی اسم اعظم لے سکتا تھا "عباد الرحمن" کہا جا سکتا تھا لیکن یہاں "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کہا، اس لیے کہ "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی صفت ان سب میں مشترک ہے!

سب سے زیادہ معروف تو یہی ہے، اسم ذات ہے اور "عِبَادُ الْکَرِیْم" کہا جا سکتا تھا اور "عِبَادُ الْقَادِرْ" کہا جا سکتا تھا اور "عِبَادُ الْقَهَّار" کہا جا سکتا!

ان کا "رحمٰن" کا بندہ ہونا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا طرز عمل، ان کا طرز زندگی، ان کی سیرت ساری کی ساری "عباد الرحمٰن" کو ظاہر کرتی ہے! کہ یہ اس پروردگار کے بندے ہیں، جس کی خاص صفت "رحمٰن" ہونے کی ہے! تو ان "رحمٰن" کے بندوں میں بھی اس کا پرتو آیا ہے۔

۱- دیکھ بھال کر چلنا

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا" "جو زمین پر ہلکے ہلکے چلتے ہیں" اللہ کے وہ بھلے انسان وہ معقول انسان جو زمین پر شریفوں کے چال چلتے ہیں، بھلے مانسوں اور انسانوں کی طرح چلتے ہیں، "یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ" "دبے پاؤں چلتے ہیں" کہ چیونٹی بھی ان کے پاؤں کے نیچے نہ آنے پائے، کوئی کمزور ہستی ان کے پاؤں سے روندی نہ جائے، کسی پر ظلم نہ ہونے پائے، ان کی زندگی کی حرکت کسی کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے۔ (تحفۂ برما، صفحہ ۳۲)

یعنی ان کی چال سے نہ تو تکبر ظاہر ہوتا ہے اور نہ کسی کو ایذا پہونچتی ہے۔ کوئی سو رہا تھا اتفاق سے یا کوئی بچہ بیٹھا ہوا تھا، یا کوئی درخت کسی نے لگایا وہ دب گیا کچل گیا، یہ نہیں بلکہ

ہلکے ہلکے چلتے ہیں اور دیکھ بھال کر چلتے ہیں۔

اور اس کے لیے "ھَوْناً" کا لفظ استعمال کیا جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے اس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ جو زمین پر (غالباً حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''دبے پاؤں'' ترجمہ کیا ہے) ہلکے ہلکے چلتے ہیں دبے پاؤں چلتے ہیں۔

۲- جاہلانہ بات کا شریفانہ جواب

"وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً" اور جب جاہل ان سے منھ لگتے ہیں تو کہتے ہیں بھائی صاحب! سلامت، معاف کرو، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تم سے لڑنے کا، تم سے بحث کرنے کا، جب جاہل ان سے الجھتے ہیں ان کو خطاب کرتے ہیں، مثلاً کوئی ایسی اشتعال انگیز بات کہہ دی کہ مقابلہ پر آجائیں اور پھر وہ دھینگا مشتی بھی ہوجائے اور لڑائی ہوجائے تو جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں کوئی جاہلانہ بات کہتے ہیں تو "قالوا سلاماً"'' کہتے ہیں بھائی سلام جاؤ'' سلامتی ہو تم پر ہمیں فرصت نہیں۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ''اگر کوئی شخص تمہیں (روزے کی حالت میں) گالی دے یا تم سے جہالت کا سلوک کرے تو تم اس سے کہہ دو ''انی صائم'' بھائی میں روزے سے ہوں'' میرے لیے گنجائش نہیں اس جھگڑے کی۔ ویسے ہی وہ ہیں کہ جب جاہل ان کو خطاب کرتے ہیں اور جاہل کا خطاب ان سے یہ مطلب نہیں ''خاطبھم'' کا کہ وہ ان کی عزت کے ساتھ کہ'' آیئے مولانا صاحب،،،، تشریف لایئے حضرت ......اس طرح تھوڑی..... جب جاہل کا لفظ یہاں لایا گیا تو مضاف الیہ سے مضاف کا تعین ہوجاتا ہے۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْعُلَمَاءُ" سمجھئے کہ کسی نے کوئی عالمانہ بات کہی......!

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الشُّعَرَاءُ'' معلوم ہوا کوئی شاعرانہ بات کہی......!

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْمُلُوْكُ'' معلوم ہوا کوئی بادشاہانہ بات کہی......!

تو ''وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ'' جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو یہ عام کوئی خطاب نہیں ہوا کہ ''صاحب یہ راستہ بتا دیجئے، ہم کدھر جائیں، کیا کریں...؟ یا آج

کیا تاریخ ہے...؟ یہ نہیں جاہل اس وقت خطاب کرتے ہیں... جاہل جاہلانہ خطاب کرتے ہیں۔ تو کیا اس کا جواب ہوتا ہے ان کا "سلاماً"!

ایک مفرد لفظ میں سب کچھ کہہ دیا، یعنی لمبی ایک اگر عبارت ہوتی تو وہ بھی اس کو پورے طور پر ادا نہ کرتی۔ "سَلَاماً"۔

''سلام میں سلامتی ہے'' سلام میں خاموشی ہے اور صلح پسندی ہے اور ایک ہمدردی کا جذبہ ہے!

تو "سلاماً" میں سب کچھ آ گیا یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ کہہ دیں! بھائی ہمیں فرصت نہیں..... ایک یہ بھی ہے..... بڑے زور لہجے سے کہا تو کچھ بھی نہیں۔

یعنی جو تعریف ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے وہ اس پر صادق نہیں آتی اب کسی نے ایک دم سے بلایا بھائی ہمیں فرصت نہیں... جھٹوا تو یہ نہیں ہوا "قَالُوا سَلَاماً" یہ نہیں ہے بلکہ بھائی معاف کرنا، ہاتھ اٹھا دیا کچھ ''سلام کر دیا معاف کرنا بھائی، ہمیں فرصت نہیں تم اپنا کام کرو۔

۳- شب بیداری....

"وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِيَاماً" اور یہ تو ان کے دن کی حالت ہوئی ہے چلنے پھرنے کی اور لوگوں میں گزارنے کی اور رات ان کی کیسی گزرتی ہے؟ اور وہ کہ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے لیے۔ "سُجَّداً وَّقِيَاماً" سجدے اور قیام میں'' یہ ان کی رات اس طرح گزرتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ پوری رات اس طرح گذرے کہ سوئے نہیں! مگر ان کی رات کا ایک معتد بہ حصہ اور جس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''رات گذارنا'' وہ سجدے اور قیام کی حالت میں گذرتا ہے!! ابھی کوئی دیکھے تو ''سجدے'' میں پڑے ہیں، پھر دیکھے تو ''قیام'' میں کھڑے ہوئے ہیں، اس طرح ان کی رات گذرتی ہے۔

چنانچہ جب ہرقل نے پوچھا اپنے ان جرنیلوں سے جو عربوں کے مقابلہ کے لیے آئے

تھے اور شکست کھا کر واپس ہوئے کہ بتاؤ تو صحیح ان عربوں کے اندر وہ کیا خوبی ہے....؟

''تو ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے، ''رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے اور دن کو روزہ دار، عہد وفا کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں''۔

دوسرے کے الفاظ ہیں ''وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گذار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں''۔

ایک تیسرے نے ان الفاظ میں تعریف کی ''رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہے، بڑے تیر انداز اور بڑے نیزہ باز، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و وردِ زبان کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے''[1]

۴-خوف خدا اور فکر آخرت.....

"وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ، اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا"

''اور وہ جو رات گذارتے ہیں کہ ابھی سجدے میں پڑے ہیں، ابھی ''قیام'' میں کھڑے ہیں اس سے نفسیاتی طور پر ایک اطمنان پیدا ہوتا ہے''۔

بلکہ غرور بھی پیدا ہوسکتا ہے، اعجاب بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ رات ہم نے ایسی گذاری، پوری رات ہماری آنکھوں میں گذر گئی اور ہم کبھی سجدے میں تھے اور کبھی قیام میں ....اور ہمارا کیا کہنا ہمیں تو کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں!

لیکن یہ ان میں خاص بات ہے کہ رات تو گذارتے ہیں ''سجدے'' اور ''قیام'' میں لیکن اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر:۱۴۳

"رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ" ان کو اس سے کوئی غرور یا عجب نہیں پیدا ہوتا، جیسے کہ بہت سی امتوں کے عابدوں میں پیدا ہوتا ہے... رشیوں اور منیوں میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو سمجھتے ہیں ... اوتار ہو گئے .... اور ہم جو چاہیں کر لیں نہیں بلکہ وہ رات تو گذارتے ہیں اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے ان سے زیادہ عبادت کرنے والا کوئی نہیں اور اب ان کو کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

"إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا" یہ ان کی جامعیت ہے اور یہ گویا ایک طرح کا جمع بین الضدین ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو جہنم کے عذاب سے دور رکھ یہی اس امت کے عابدوں اور اولیاء اللہ کی صفت ہے۔ اگر آپ ان کی عبادت دیکھیں تو کہیں کہ اب ان ڈرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب دعاء اور گریہ و بکا کرتے ہوئے دیکھیں تو معلوم ہو جیسے ان سے بڑھ کر کوئی ڈرنے والا نہیں اور ان کو اپنی عبادت پر گویا اطمینان نہیں یہ ایک تعلیم ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی تو ایسی کی جائے جتنی آدمی کر سکے لیکن اللہ کے عذاب سے بھی ڈرتا ہے۔ یہی چیز مطلوب ہے شریعت میں اور سیرت نبوی اس کی آئینہ دار ہے پوری رات آپ ﷺ گریہ و بکا کرتے اور سوال و دعاء میں لگے رہتے اور دن میں دعوت کا کام، پھر بھی مطمئن ہو کر نہ بیٹھے رہتے۔ تو بظاہر یہی جمع بین الضدین ہے حقیقۃً ضدین نہیں ہے۔

لیکن یہ ان کی جامعیت ہے اور یہ گویا ایک طرح کا جمع بین الضدین ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اے اللہ! ہم جہنم کے عذاب سے دور رکھ"!

"إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا" "اس کا عذاب تو بڑا تاوان ہے اور بہت سخت چیز ہے۔

یہی اس امت کے عابدوں اور اولیاء اللہ کی صفت ہے کہ ان کی آپ عبادت دیکھیں تو کہیں یہ تو اب ان کو کوئی خشیت کی کیفیت یا ڈرنے کی ضرورت نہیں، لیکن آپ جب ان کو دعاء کرتے ہوئے اور گریہ بکا کرتے ہوئے دیکھیں سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ ہوئے .... اور یہاں کے بزرگانِ دین ہوئے ..... تو معلوم ہوا کہ جیسے ان سے بڑھ کر کوئی ڈرنے والا نہیں اور جیسے یہ ہیں کہ اپنی عبادت پر ان کو کوئی اطمینان ہی نہیں۔

یہ تعلیم ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی تو ایسی کی جائے کہ جتنی آدمی کر سکے لیکن اللہ کے

عذاب سے بھی ڈرتا ہے۔

تو یہ بظاہر جمع بین الضدین ہے، ضدین نہیں ہے (حقیقۃ) لیکن لوگوں کے فہم نے لوگوں کے طرز عمل نے اس کو ضد بنا دیا ہے ایک دوسرے کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل دوسری قوموں میں دوسرے مذاہب میں ان کی حیثیت ضدین کی سی ہے لیکن اسلام میں نہیں ہے۔

"اِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا" جن کی شان یہ ہے کہ "يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا" وہ اس طرح سے سہمے ہوئے ہیں مانگ رہے ہیں اللہ سے کہ "جہنم کے عذاب سے اس کا عذاب تو ایک برا تاوان ہے ....اور بہت ناقابل برداشت ہے" وہ برا ٹھکانہ اور بری قیام کی جگہ ہے"۔

۵- میانہ روی اور اعتدال پسندی

"وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" اب یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام سے ناواقف آدمی، سطحی خیال کا آدمی یہ توقع رکھتا کہ جہاں خرچ کرنے کا ذکر آئے وہاں تو پھر کوئی تحدید ہوتی نہیں سب اللہ کے راستے میں لٹا دیا۔ لیکن نہیں۔ چونکہ یہ عملی تعلیم ہے اور قیامت تک کے لیے نمونہ ہے تو یہاں ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ "جب وہ خرچ کرتے ہیں تو حد سے بھی آگے نہیں بڑھتے"۔

ورنہ توقع یہ کی جاتی ہے کہ ایک صحیفہ آسمانی میں تو یہ ہوگا...گھر لٹا دیا انہوں نے ....کچھ بھی نہیں لیکن یہ چلنے والی نہیں اور وہ امت جس کو دنیا میں قیامت تک رہنا ہے اور دعوت کا کام کرنا ہے اور نمونہ بننا ہے اور دوسروں کے اندر یہ اطمینان پیدا کرنا ہے کہ دین میں آنے سے دنیا بالکل ختم نہیں ہو جاتی۔ تو ان کی شان یہی ہے "اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا" جب وہ خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور حد سے نہیں گزرتے "وَلَمْ يَقْتُرُوْا" اور بخل سے بھی کام نہیں لیتے "وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" اور حقیقت میں ان دونوں کے درمیان ایک اعتدال ہے۔ یہ قرآن مجید کا امتیاز ہے کہ اس میں اس اعتدال کی تعلیم آئی ہے

اگر آپ پڑھیں ہندوؤں کے، مجوسیوں کے مذہب کے بارے میں، اول تو ہے ہی کہاں اور کہاں تک صحیح ہے یا اس میں اور چیز پڑھیں تو اس میں صرف ایک رخ دکھایا گیا خرچ کرنے کی تعلیم ہے تو بس سب کچھ لٹا دیا ....اور سب کچھ خرچ کر دیا، رشی منی بن گئے اور انتظام کی تعلیم ہے تو بخیل ہیں، ایک ایک پیسہ، ایک ایک پائی کا حساب دینا اور لینا، لیکن قرآن مجید میں اعتدال و جامعیت ہے۔

۲- غیر اللہ کی عبادت سے اجتناب...

"وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ" ...." اور وہ لوگ کہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے"۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ خدائے تعالیٰ ہی حاکم حقیقی اور فرماں روائے مطلق ہے اور شریعت سازی صرف اس کا حق ہے .....درحقیقت خالق و مخلوق اور عبد و معبود کا تعلق، حاکم و محکوم، آمر و مامور ایک بادشاہ اور رعیت کے تعلق سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ عمیق، کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ نازک ہے....اس لیے بندے سے صرف اتنا مطلوب نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق سمجھ لے اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک نہ کرے بلکہ ان اسماء و صفات اور ان افعال الٰہی کے ذکر کا جن سے قرآن شریف بھرا ہوا ہے اور ان آیات کا جن میں خدا تعالیٰ سے محبت و تعلق اور بکثرت اور ہمیشہ اس کے ذکر کی ترغیب آئی ہے، صاف تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل و جان سے محبت کی جائے اور اس کی طلب و رضا میں جان کھپا دی جائے، اس کے حمد و ثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اسی کی دھن ہر وقت دل و دماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے اسی کے سامنے دست طلب ہر وقت پھیلائے رہے، اسی کے جمال جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے، مٹا دینے، حتیٰ کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے"۔ (۱)

---

(۱) دستور حیات: ۴۳

۷-۸-قتل ناحق اور زنا سے دوری....

"وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ" اور وہ کیس ایسی جان کو نہیں لیتے ایسے شخص کو ایسی ذات کو وہ قتل نہیں کرتے، جس کو اللہ تعالی نے حرام کیا مگر حق کے ساتھ"۔

حق کے ساتھ یہ ہے کہ میدانِ جہاد میں کریں گے، یا قاتل ہے، موذی ہے اور اس سے خطرہ ہے اور اس پر جرم ثابت ہو گیا ہے تو وہ پھر اس کی گرفت کریں گے اور انصاف و قانون کے ساتھ۔

"وَلَا يَزْنُوْنَ" "اور زنا (وغیرہ) سے بہت دور ہیں"۔

"وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" "اور جوایسا کرے گا" یعنی وہ چیزیں جس کی نفی کی ہے، ناحق کسی کو مارے گا اور اسی طرح سے اپنی خواہش نفسانی کو ناجائز طریقے سے پورا کرے گا تو یہ "يَلْقَ اَثَامًا" اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، اس کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا" "يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" "یہ عذاب قیامت کے دن دوگنا کیا جائے گا کئی گنا کیا جائے گا "وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا" "اور وہ اس میں ذلیل ہو کر رہے گا"۔

۹-توبہ وانابت...

"إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا" اور اس کے بعد ایک درجہ توبہ کا بھی ہے اگر غلطی ہو جائے جب بھی مایوسی نہیں، توبہ کر سکتا ہے، یہ بھی اسی حکم میں اللہ تعالیٰ لے آیا ہے۔

"إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا" "مگر جس نے توبہ کی اور جو ایمان لایا اور جس نے نیک عمل کئے" "فَاُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ" "تو اللہ تعالی ان کے سیات کو حسنات سے تبدیل کر دے گا" "وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا"...." اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے"۔

یہ آخری درجہ ہے کہ سیات کو معاف ہی نہیں کرے گا بلکہ سیات کو حسنات سے بدل دے گا اور یہ منحصر ہے ان کی کیفیت توبہ، انابت، خشیت اور ان کی رقت اور اظہار عبودیت پر کہ بعض مرتبہ اس طرح آدمی توبہ کرتا ہے کسی گناہ سے کہ اور درجہ اس کا بلند ہو جاتا ہے اور بعض صالحین سے بھی وہ بڑھ جاتا ہے یہ توبہ کی خاصیت ہے۔

''توبہ... ایک اضطراری وسیلہ ہی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ انسان تلافی مافات کر لیتا ہے بلکہ توبہ کا مقام اتنا اونچا ہے کہ وہ افضل ترین عبادت اور تھوڑے سے وقت میں قرب ولایت کے انتہائی درجات تک پہونچنے کا آسان راستہ ہے، جس پر بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں اور ان پاکیزہ نفوس کو بھی جو گناہ سے محفوظ رہے ہیں، رشک کرتے ہیں''۔ (۱)

توبہ ایک طرح کی نہیں ہوتی ہے، یعنی توبہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہہ دیا اے اللہ! میری توبہ بس یہی توبہ ہے، توبہ کے ناقابل شمار طریقے ہوتے ہیں، بعض توبا تیں ایسی ہوتی ہیں کہ آسمان کو رحم آنے لگتا ہے، فرشتوں کو ترس آتا ہے اور ایک کہرام سا مچ جاتا ہے۔

ایسے بعض توبہ کرنے والے ہیں اور دیکھنے والوں نے ان کو دیکھا بھی ہے اور کتابوں میں تو واقعات بے اتی ہیں۔

اور توبہ جو ہے وہ صرف توبہ کا لفظ کہہ دینا کہ ''اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَتُوبُ اِلَیْکَ'' یہ نہیں۔ بلکہ وہ کیفیت ان پر پوری طرح طاری ہوتی ہے اور مجسم توبہ بن جاتے ہیں۔

''وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَاباً'' ''اور جس نے توبہ کی'' اور صرف توبہ زبانی توبہ کہہ دینا ''استغفر اللہ'' کہہ دینا کافی نہیں بلکہ ''وَعَمِلَ صالحاً'' اور پھر نیک عمل بھی کئے'' زندگی میں تبدیلی بھی آنی چاہیے، عمل صالح کرتے ہیں'' تو وہ توبہ کرتا ہے اللہ کی طرف پوری توبہ۔

۱۰- جھوٹ سے گریز.....

''وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ'' اور وہ لوگ کہ جو کسی غلط کام، کسی جعل سازی، کسی جھوٹے، کسی سازش، کسی ایسی چیز میں... ''زور'' کا لفظ بہت جامع اور بہت وسیع ہے اس میں

---

(۱) تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: ۸۱-۸۲

یہ سب چیزیں آجاتی ہیں، سازشیں بھی آجاتی ہیں، جھوٹی گواہیاں بھی آجاتی ہیں، جھوٹی دستاویزیں بھی آجاتی ہیں اور کسی غلط آدمی، مجرم کی تائید بھی آجاتی ہے، سب اس "زور" میں ہے، عربی میں "الزور" کا لفظ بہت وسیع ہے" وہ لوگ زور میں شریک نہیں ہوتے"۔

۱۱-لغومقام سے شریفانہ گذر.....

"وَاِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا" اور جب وہ کسی لغو کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریف طریقے سے گذر جاتے ہیں"۔

یعنی (اس کا ترجمہ ہونا مشکل ہے) کہ جب کوئی غلط کام ہورہا ہے، ایسا کوئی تفریحی یا خلافِ اخلاق کوئی چیز ہے تو ایسے گذر جاتے ہیں، دامن بچا کر گذر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ اس کی سطح سے بہت بلند ہے اوپر اوپر سے گذر گئے زمین پر ہورہا ہے اور وہ اوپر ہوا میں سے گذر گئے۔

اور "کــرام" کرم کا لفظ بھی عربی میں بہت ہی وسیع الفاظ میں سے ہے اور پھر سخاوت نہیں ہے خالی، شرافت نہیں ہے خالی، بلکہ خلالِ مروت، اوصافِ انسانیت، اخلاقِ فاضلہ، مکارمِ اخلاق، یہ سب چیزیں ہیں۔

۱۲-آیاتِ الٰہیہ کی قدروعظمت....

"وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا" "اور وہ لوگ کہ جب ان کو اپنے رب کی آیات سے ڈرایا جاتا ہے، یعنی یاد دلائی جاتی ہیں تو ان آیتوں پر وہ بہرے اور اوندھے ہو کر نہیں گرتے۔

"قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اس کے خوف پر ہے.. قرآن نے اپنے کو ان کے لیے مفید بتایا ہے، جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہے، قرآن بہرحال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے، اس سے منتفع ہونے کا پہلا ذریعہ یہی ہے کہ اس کو غور سے سنے، جو سرے سے کان لگا کر سنتا ہی نہیں، اس کے بعد کے مراحل کیا طے کرے گا؟..... لیکن صرف غور سے سن لینا کافی نہیں جو حصہ عمل کے قابل

ہواس پر عمل کرنا ضروری ہے اسی لیے فرمایا ''اور وہ کہ جب ان کو اپنے پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہوکر نہیں گرتے (بلکہ غور سے سنتے ہیں) یعنی ان کے ساتھ وہ ایسا معاملہ نہیں کرتے، اس طرح رد عمل ان کا ''صما وعمیانا'' کی طرح نہیں ہوتا، بہروں اور اندھوں کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ کان سے بھی کام لیتے ہیں سنتے ہیں ادب سے، اور پورے طور پر اس کے الفاظ کی قدر کرتے ہیں اور اس کا لطف لیتے ہیں اور غور کرتے ہیں دیکھتے بھی ہیں کہ اگر گرتے تو یہ ہوتا اور اگر یہ کرتے تو یہ ہوتا.... جو کچھ فرمایا جارہا ہے بالکل صحیح ہے اور ہم نے اس کے نمونے دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے''۔[1]

۱۴۳-دین کی بقاء و تسلسل کے لیے دلسوزی وفکر مندی...

''وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' اب دیکھیے یہ بھی اعجاز قرآنی ہے، یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں اور بڑے قابل مبارک باد ہیں، اس کا سلسلہ ختم ہو ہی جاتا ہے.... تھے، اچھے تھے.... چلے گئے..... تسلسل قائم رہنا چاہیے... پھر اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں ساتھ ساتھ کہ ''اللہ ہمیں اپنی بیویوں سے ہمیں اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما'' اور ہمیں متقین کا امام بنا''۔

یعنی یہ سلسلہ جو چلتا بھی رہے یہ بھی ذمہ داری ہے صاحب دعوت قوم کی اور جو دنیا کے لیے نمونہ بنائی گئی ہے کہ وہ تسلسل کو باقی رکھے کہیں بہتر سے بہتر زمانہ گذرا، بہتر سے بہتر جماعت گذری، فرشتوں کی بھی، لیکن ختم ہوگئی، ان کے بعد ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں.... سب ختم ہوگیا۔[1]

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی۔ تلخیص: ۱۴۳-۱۲۸

(۲) یہی ہندوستان میں کئی بار ہوا اور اب بھی ڈر ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مدارس قائم کیے جائیں، تبلیغی کام کیا جائے اور اصلاح کی جائے، اس لیے کہ مسلمانوں میں ایسی کمزوریاں پیدا ہونے لگی ہیں جن سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اسلام کا جو عملی نمونہ تھا خدانخواستہ وہ کہیں بالکل روپوش نہ ہو جائے، اوجھل نہ ہو جائے، نگاہوں سے کہ وہاں ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مسلمان کبھی ایسے ہوتے تھے، اب تو ہمیں کوئی نظر نہیں آتا تو یہ نہیں۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی گویا توجہ دلائی ہے قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو کہ اس کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں، اللہ سے یہ بھی دعاء کریں کہ "رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا"

"اللہ ہمیں اپنی بیویوں سے، ہمیں اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما" اور ہمیں متقین کا امام بنا"۔

"اُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا" یہ وہ لوگ ہیں جو جنت کے بالاخانے نصیب ہوں گے ان کو دیئے جائیں گے ان کے صبر کی وجہ سے "وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا" اور ان کا وہاں استقبال ہوگا تحیۃ وسلاما سے اس طرح ان کو خطاب کیا جائے گا، بار بار تحیۃ وسلام اور مبارکباد سے۔

"خَالِدِيْنَ فِيْهَا" "ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں"۔

"حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا" "اور خالی کسی گھر کی تعریف یہ نہیں کہ ہمیشہ رہے بلکہ وہ گھر بھی اچھا ہونا چاہیے" "حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا" "وہ ان کا بہترین ٹھکانہ بھی ہوگا اور قیام کی جگہ بھی"۔

عبودیت وانابت کے بغیر کوئی وقعت وحیثیت نہیں

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ" آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کروگے۔

یہاں عبادت کا مفہوم صرف فرائض مقررہ کی ادائیگی نہیں، بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کو سب پر مقدم رکھنا اور دین کو وسیع تر آفاقی وعالمی پیمانہ پر پھیلانے کی سعی کرنا بھی اس میں داخل ہے، لہٰذا اگر مسلمانوں کا رشتہ عبودیت کی زندگی سے منقطع ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا رشتہ زندگی سے منقطع ہوگیا...... اور ان کی حیثیت دنیا کی دوسری قوموں کی طرح رہ گئی کہ اگر وہ دنیا کے عام قانون حیات کے مطابق ترقی وخوشحالی کے کام کریں گے تو ترقی و خوشحالی ہوگی

اوراد بار وزوال کی راہ پر چلیں گے تو ان کے نصیب میں ذلت وزوال آئے گا بلکہ عام قانون کے مطابق جس قدر ذلت وادبار ہونا چاہیے اس سے زیادہ ذلت ورسوائی کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ دوسری قوموں کی بقاء وتحفظ کو کسی شرط سے مشروط نہیں کیا گیا تھا اوران کے حق میں یہ آیت کریمہ صادق آئے گی۔ [1]

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ" "کہہ دو کہ اللہ تبارک وتعالی تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا اگر تمہاری دعاء نہ ہو" اگر تم اللہ سے دعاء نہ کرو، عبودیت وانابت کا اظہار نہ کرو اور دعوت کا کام نہ کرو۔

"فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا" اب یہ منکرین مکہ اور منکرین قریش ان کو خطاب ہے کہ جہاں تک تمہارا تعلق ہے "تو تم نے جھٹلا دیا" "فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا" تو عنقریب تمہارے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔ [2]

(۱) اقوام عالم کے درمیان اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۱۶-۱۷

(۲) درس قرآن، سورۂ فرقان: ۷۲-۷۷ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے باختصار بالترتیب اخذ وتلخیص کیے گئے ہیں: ☆ تحفۂ برما: ۳۳ ☆ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۴۳ ☆ دستور حیات: ۴۳ ☆ تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: ۸۱-۸۲ ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی (تلخیص): ۱۲۳-۱۲۸ ☆ اقوام عالم کے درمیان اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۱۲-۱۷

مومن کامل کے اوصاف (۱)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ، اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ، فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْعَادُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ، اُولٰئِکَ ھُمُ الْوَارِثُوْنَ، اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ۔ (المؤمنون: ۱-۱۱)

"بیشک ایمان والے رستگار ہوگئے، جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں، اور جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں، اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا کنیزوں سے جو اُن کی ملک ہوتی ہیں کہ اُن سے مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں، اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں، یعنی جو بہشت کی میراث حاصل کریں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

محبوبِ الٰہی صفات کا تذکرہ

قرآن مجید سارا اللہ کا کلام ہے اور کلام صاحب کلام کے مرتبے اور مقاصد کے مطابق ہوتا ہے، دونوں کا فرق سمجھیں، مرتبے اور مقاصد کے مطابق ہوتا ہے اس لیے سارا اللہ کا کلام ہے اور سارا معجزہ ہے اور سارا انسانی زندگی اور فلاح دین و دنیا اور کمالِ انسانی ہی نہیں، بلکہ خلقی جس لیے اللہ نے پیدا کیا ہے انسان کے ذہن سے وہ ایک محدود تخیل ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے انسان کے پیدا کرنے کے مقصد کی تکمیل کے لیے قرآن مجید کا ہر حصہ مفید ہے اور دستور العمل ہے، لیکن یہ آیات جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئیں ہیں یہ اپنے خاص طرز کی ہیں، یعنی کلام میں تنوع ہوتا ہے، کلام میں مراتب بھی ہوتے ہیں، متکلم کی شان کے مطابق، کوئی اس سے فروتر نہیں ہوتا لیکن متکلم کے مقاصد کے مطابق اس میں تنوع ہوتا ہے یہ سورت اس حیثیت سے کہ اس میں زندگی کا پورا دستور العمل پیش کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جو صفات محبوب ہیں وہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

"افلح" کی وسعت و جامعیت

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْن" پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کہنے میں یہ الفاظ عام زبان کے معلوم ہوتے ہیں، "بیشک کامیاب ہوئے اہل ایمان" کامیاب اور یہ کہنا "کامیاب ہوا" یہ کہنے والے کے درجے کے اور کہنے والے کی عظمت کے، کہنے والے کی شان کے، کہنے والے کے علم کی وسعت کے، کہنے والے کی قدرت کی وسعت کے، اور کہنے والے کے منشاء اور مقصد کے مطابق ہوا کرتا ہے (ایک استاد کہتا ہے یہ کامیاب ہو گیا، مطلب یہ کہ یہ پاس ہو گیا، طلبہ بہت سے بیٹھے ہیں، سب کی رعایت سے کہہ رہے ہیں، ایک استاد کہتا ہے درجہ میں یا باہر کہتا ہے کہ فلاں کامیاب ہو گیا ہے، فوراً ذہن جائے گا کہ یہ امتحان میں پاس ہو گیا، ایک تاجر کہتا ہے فلاں کامیاب ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دوکان چل گئی، کاروبار اس کا چلنے لگا، ایک حکومت کہتی ہے فلاں ملک کامیاب ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو فتح ہوئی، یا اس کے سیاسی حالات، انتظامی حالات بہتر ہیں، یا اس کے پاس اچھی فوجی طاقت ہے، ایک

شاعر کہتا ہے کہ فلاں آدمی کامیاب ہوا، فلاں ہمارا شاگرد کامیاب ہوا، مطلب یہ کہ شعر کہنے پر قادر ہوا، ایک ادیب کہتا ہے، اسی طرح مصنف کہتا ہے، تو جس ذوق اور جس کا جو مشغلہ ہے اور جو اس کے نزدیک قابل تعریف ہے اس کے مطابق سمجھ میں آئے گا، جب اللہ تبارک وتعالیٰ جو قادر مطلق ہے، حکیم برحق ہے، خالق ارض وسماوات ہے، مالک خزائن السماوات والارض ہے وہ کہتا ہے کہ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُوْنَ'' تو اس ''اَفْلَحَ'' کو یہ عربی کا ایک لفظ ہے ''کامیاب ہوا'' اس کو اس طرح کہے ''کامیاب ہوا'' کے معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے جیسے کہ مختلف زبانوں میں، خود عربی زبان میں ''نجح'' کے معنی میں ''فاز'' کے معنوں میں ''سبق'' کے معنی میں ''سعد'' کے معنوں میں، اس میں نہیں لینا چاہیے، دوسری زبانوں میں آپ ترجمہ کر سکتے ہیں، جب اللہ کہتا ہے ''فلاں کامیاب ہوا'' اس نے فلاح پائی، تو اس لفظ کی عظمت کو، وسعت کو، ندرت کو، جامعیت کو، ایک بڑی نعمت اور بڑی بشارت کے طور پر اس لفظ کو سمجھنا چاہیے، کیا کامیابی ہے، وہ جس کے ہاتھ میں کامیابی ہے اور کامیابیوں کا خالق ہے، دونوں ہے اور کامیابی کی اشیاء کا بھی خالق ہے اور کامیابی کے اسباب ووسائل کا بھی خالق ہے۔ جب وہ کہتا ہے، کامیاب ہوئے تو کامیابی کا جو بڑے سے بڑا بلند تخیل ہوسکتا ہے اور پیمانہ ہوسکتا ہے سامنے رکھنا چاہیے، یعنی ''وہ خدا کے یہاں مقبول ہو'' سب سے بڑی اصل چیز ہے خدا کے یہاں مقبول ہوا، خدا اس کو مدرسی زبان میں پاس کر رہا ہے اور پاس ہی نہیں کر رہا ہے، بلکہ درجہ اول کا نمبر دے رہا ہے۔ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُوْنَ''۔

اور ہم پڑھتے چلے جاتے ہیں قرآن مجید، ذہن کام ہی نہیں کرتا ہمیں عربی اتنی آتی ہے کہ ''اَفْلَحَ'' کے معنی سمجھتے ہیں کہ ہاں بہت بولتے رہتے ہیں ''اَفْلَحَ فُلَانٌ'' ''ذَهَبَ فُلَانٌ لِغَرَضٍ مِنَ الاَغْرَاضِ اِلٰى الْبَلَدِ الْفَلَانِی'' ''فَاَفْلَحَ'' یہ ''اَفْلَحَ'' کا لفظ ایسے معنوں میں کم بولا جاتا ہے عربی میں ''نجح'' وغیرہ کے چھوٹے لفظ بولے جاتے ہیں، لیکن قرآن مجید کی زبان کا خاص لفظ جو ہے وہ ''اَفْلَحَ'' ہے فلاح پائی، اب یہ ''فلاح'' جو ہے اس ''فلاح'' کا جو تصور ہے وہ کہنے والے کی عظمت، کہنے والے کی سخاوت اور کہنے والے کے جو مطلوبات ہیں، معیارات ہیں ان کے مطابق سمجھنا چاہیے، ''کامیاب ہوئے مومنین'' مطلب یہ کہ دنیا کی

زندگی میں اللہ کے جو مقبول بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے ساتھ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا ان کے ساتھ ہے اور یہاں سے جانے کے بعد جنت ان کو ملے گی اور جنت کی خالی جو نعماء ہیں وہی نہیں بلکہ "ورضوان من اللہ اکبر" جو اصل چیز ہے جنت کا جو اصل امتیاز ہے "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ایک نشان ہے۔

تو اس لیے ہم نے کہا کہ "اَفْلَحَ" جو مفردات اور کلمات کثرت استعمال سے زبان سمجھنے والوں کے لیے ان کی قدر کرنا اور ان کی پوری وسعت کو سمجھنے کی عادت جاتی رہتی ہے اس لیے بتانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱- کمالِ خشوع

فرماتا ہے "اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ" "کامیاب ہوئے اہل ایمان جو کہ اپنی نماز میں خاشع ہوتے ہیں" جو نمازیں خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں یعنی متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں، منہمک ہوتے ہیں اور غیر اللہ سے بالکل یکسو ہوتے ہیں۔ جہانتک عربی زبان کا تعلق ہے اس "خشوع" اور "خوف" کے لفظوں میں یہ ضرور یاد رکھئے آپ کہ زبانوں کے جو الفاظ ہیں ان کو مترادف کہا جاتا ہے، اس مترادف میں بڑی غلط فہمی ہے جو زبان کے ماہرین ہیں کہتے ہیں مترادفات کا وجود ہی نہیں اصل میں یعنی بالکل دو لفظوں کے ایک ہی معنی ہو، یہ نہیں ہوتا، ایک درجہ میں یہ بات ہوتی ہے یعنی کسی چیز میں اشتراک ہوتا ہے، یا مثلاً دس اگر جز ہیں تو پانچ میں اشتراک ہوتا ہے کبھی سات آٹھ میں اشتراک ہوتا ہے کبھی نو میں اشتراک ہو جاتا ہے لیکن ایک جز پھر بھی باقی رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے تو "خوف" ہے "وجل" ہے "اشفاق" ہے سب الفاظ ہیں۔

نماز سے معلوم ہوتا ہے کہ "خشوع" کسے کہتے ہیں، ورنہ لفظ تو عربی میں لغت کا ایک لفظ ہے کہ جو اپنی نماز میں "خشوع" سے کم لیتے ہیں، "خاشع" ہوتے ہیں، لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اولیاء کرام کے اور مشائخ عظام کے واقعات میں کہ بڑی سے بڑی چیز گذر گئی بڑا سے بڑا واقعہ گزر گیا خبر ہی نہیں ہوئی کیا ہوا؟ اور خود ان پر بھی بعض مرتبہ ایسی کوئی چیز طاری ہوئی، یا اطلاع

ہوئی اور بالکل انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، ''خشوع'' کا لفظ وہ ہے جو روح، قلب، جسم، تینوں پر اثر انداز ہو۔ وہ خشوع ہے اور خوف یہ ہے کہ آدمی ذہنی طور پر ڈر جائے، گھبرا جائے، ایسے میں ''وجــل'' کا لفظ ہے، قلب صرف اس سے متاثر ہوتا ہے، جتنے لفظ ہیں ان سب کے الگ الگ حدود ہیں، یہ نماز کے لیے جو نماز کا انہماک ہے، توجہ الی اللہ ہے اس کے لیے ''خشوع'' ہی کا لفظ مناسب تھا، عربی زبان کی وسعت کے باوجود '' الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ'' وہ لوگ کہ جو اپنی نماز میں سہمے ہوئے ہوتے ہیں اور یکسو اور متوجہ ہوتے ہیں۔

۲-لغو سے اعراض

''وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ'' اور وہ لوگ کہ جو لغو چیز سے اعراض کرنے والے ہیں، بظاہر دیکھو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق ہے کہ دونوں میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوئی کہ یہیں اس کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، کہیں بھی کہا جا سکتا تھا، جو لوگ اپنے نماز میں خشوع میں رہتے ہیں اور جو لغو سے اعراض کرنے والے ہیں، ان دونوں میں جوڑ کیا ہے؟ رشتہ کیا ہے؟ نماز نماز ہے، عبادت ہے اور چیز تو اور ہے وہ بازار میں ہوتی ہے، گھر میں ہوتی ہے، وہ متنازع چیزوں میں ہوتی ہے وہ جو چیزیں کشش رکھتی ہیں ان دونوں کا ذکر کیوں کیا؟ مگر اس میں ایک بڑی دونوں میں مناسبت ہے اور تلازم ہے وہ یہ کہ جو اتنے بڑے، اتنے بڑے آقا سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس میں اس پر کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی شان یہ ہونی چاہیے کہ لغو میں اس کا جی نہ لگے اور لغو سے وہ اعراض کرے۔(۱)

(۱) ہم نے اپنے بچپن میں ایک قصہ سنا تھا، لطیفہ ہے مگر اس سے ذرا سمجھ میں آئے گا اس زمانے میں انگریز تو آقا سمجھے جاتے تھے، صاحب آئے اور سرکار آئے، تو کسی زمیندار کو کسی ڈپٹی کمشنر نے بلایا بات کرنے کے لیے، ان کو بلایا ہی نہیں تھا کبھی، وہاں جانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا وہ آئے تھوڑی دیر بیٹھے بات کی، اب گھر میں آئے تو بات نہیں کرتے تھے، ایک گھنٹہ گذرا، دو گھنٹے گذرے، کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف، بہت پوچھنے پر بتایا کہ میں ایسے سے بات کر کے آیا ہوں کہ اس کے بعد اب کسی سے بات نہیں کر سکتا، جو صاحب سے بات کر کے آیا سرکار سے بات کر کے آیا اس کے بعد وہ اب بچوں سے بات کرے، نوکروں سے بات کرے؟ گھر والوں سے بات کرے؟ تو ہے تو یہ بالکل فضول بات، لیکن یہاں پر دونوں کی مناسبت یہ ہے۔

جس کو اللہ تعالیٰ نماز میں خشوع نصیب فرمائے اس کا لغو میں جی کیسے لگ سکتا ہے؟

''وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ'' دونوں میں بہت ہی لطیف مناسبت اور رشتہ ہے پھر بھی نماز کو تبدیلی لانے والی چیز، نماز کو ایک انقلاب انگیز عنصر ہونا چاہیے، فعال اور موثر عنصر ہونا چاہیے نماز بھی چلتی ہے اور غیبت بھی چل رہی ہے، نماز بھی چلتی ہے اور باتیں بھی چل رہی ہیں، نماز بھی چلتی ہے اور کھیل تماشے، ویسے ریاضت کے طور پر کوئی کرے تو دونوں میں جتنی اونچی جگہ پہونچ جائے آدمی تو اس کے بعد خیال رکھنا چاہیے کہ اب اسے اتنا نیچے بھی نہیں جانا چاہیے کہ دونوں میں کوئی کسی قسم کی مناسبت نہ ہو، کسی کو عہدہ ملتا ہے نہ تو پھر وہ بہت سی چیزیں خود بخود نہیں کرتا اور نہ اس سے توقع کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کو فلاں عہدہ مل گیا، وزارت مل گئی اب وہ بازار میں کھڑا ہوا ہے اور بازاریوں سے بات کر رہا ہے اور تماشے دیکھ رہا ہے ایسا نہیں ہوتا، تو دونوں میں ایک خاص تعلق ہے، یہ اعجاز ہے قرآن کا، اس کو بعد میں بھی کہا جاسکتا تھا، لیکن نماز کے ساتھ اس لیے کہا کہ نماز کو تبدیلی لانے والا اور زندگی کو ڈھالنے والا، زندگی کو ایک نیا سانچہ اور ایک نیا ذوق، نئی طلب اور نیا ذہن عطا کرنے والا ہونا چاہیے اور اس میں پھر گنجائش نہیں۔

۳- زکوٰۃ یا تزکیہ کی فکر

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ'' اس کی تفسیر دو کی ہیں مفسرین نے، ایک تو یہ جو اپنے نفس کی صفائی اور اپنے اخلاق کے سنوارنے اور اپنی اندرونی اصلاح کی فکر کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں، یہاں ''زکوٰۃ'' سے مراد ''تزکیہ'' ہے، تزکیہ لکھا بھی ہے اور عام ترجمہ اور تفسیر یہ ہے کہ جیسے نماز ایک رکن ہے، زکوٰۃ بھی ایک رکن ہے، ادھر نماز کا ذکر تھا یہاں زکوٰۃ کا ذکر ہے، دونوں معنی کیے گئے ہیں ''اور وہ لوگ جو زکوٰۃ کے ادا کرنے کے والے ہوتے ہیں''۔

۴- شرمگاہوں کی حفاظت

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ...... '' ''اور وہ لوگ کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اب بظاہر کوئی انسان ہوتا، کوئی ادیب ہوتا، کوئی خطیب ہوتا تو اس کے کہنے میں ذرا اس کو تامل ہوتا کہ کیسی اونچی اونچی چیزیں نماز اور زکوۃ کا ذکر ہے۔ پھر اب یہاں پہ یہ کہہ رہے ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات غنی ہے اور اس کے سامنے انسانوں کی کمزوریاں اور انسانوں کی کمزوریوں کی لاکھوں برس کی تاریخ ہے اور مشاہدہ ہے اور وہ خالق ہے اور وہی قدرت دیتا ہے تو یہ اسی کے کہنے کی بات تھی کہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک طرف عابد ہوتا ہے ایک طرف بڑا صدقہ خیرات کرنے والا ہوتا ہے ایک طرف اس میں بے احتیاط ہوتا ہے تو یہ بھی ہمیں سبق دیدیا گیا ہے کہ یہ نہیں سمجھنا چاہیے، اب ان چیزوں کے احتیاط کی ضرورت نہیں، یا ان چیزوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بہت اس کے واقعات معاشرے میں گذرتے رہے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔

''اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ'' (لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی شرعی باندیوں سے حفاظت کرتے ہیں کیونکہ ان پر اس میں الزام نہیں، ''فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ'' پس جس نے اس کے علاوہ کچھ چاہا تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

۵- امانت وعہد کا پاس

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ'' اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کا پاس کرتے ہیں اور ان کی پابندی کرتے ہیں کہ اگر کسی کی امانت ہے ادا کر دیا۔

اب بہت سے ہمارے صالحین ایسے ہیں دیندار لوگ، نماز پڑھتے ہیں، نماز میں ذوق آیا ہے خوب جی لگتا ہے، لیکن امانت وغیرہ کے لحاظ سے اور امانت کا وسیع مفہوم ہے، امانت یہ نہیں کسی نے پیسے رکھوائے، رقم رکھائی تھی یہ امانت ہے، امانت کا دائرہ بہت وسیع ہے، اپنا فرض منصبی ادا کرنا حقوق ادا کرنا، قرض ادا کرنا اور احسان ادا کرنا، یہ سب چیزاس میں آتی ہے تو وہ اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا اور اس کی عبادت کر لینا کافی نہیں، بلکہ جس کو کہتے ہیں حقوق العباد، حقوق اللہ کے

ساتھ حقوق العباد کا خیال اور ہماری دینی جماعتوں میں یہ کمزوری کبھی کبھی داخل ہو جاتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حقوق اللہ تو ادا کئے کوشش کی لیکن حقوق العباد میں کوتاہی ہوتی ہے۔ جیسا بھائی کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، محلے والوں کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے جیسے اولاد کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، جیسے شرکاء جو ہیں تجارت وغیرہ میں، ان کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے اس میں کمی ہوتی ہے آدمی کہتا ہے، کیا ہے اس میں تو آپس کے لوگ ہیں بھائی بندے ہیں کوئی خدا کا گناہ تھوڑے ہی کر رہے ہیں، یہ خدا ہی کا گناہ ہے۔

۶- اوقات نماز کے پابند

"وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ" "اور وہ لوگ کہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں" وہاں تو نماز کی کیفیت کا ذکر تھا، "خشوع" کا اور یہاں نماز کے اوقات کا ذکر ہے نماز کے اوقات کی تعداد، نماز کے مقررہ نصاب اس کا ذکر ہے، اگر بہت اچھی نماز پڑھی ہے، ایک وقت کی یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی نماز چھوٹ جائے تو اب کیا ہے، فجر کی نماز تو ایسے مزہ سے پڑھی کہ بس دنیا جہاں کی خبر نہیں تھی ہمیں اور وہ لطف آیا اور ظہر کی نماز میں سو گئے یہ نہیں کوئی کیسی اچھی نماز پڑھی جائے دوسری نماز اپنی جگہ پر ہے۔

جنت الفردوس کے وارث

"اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" "یہ وارث ہیں جو کہ فردوس کے وارث ہوں گے" اتنے ہی نہیں کہا گیا کہ "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ" بلکہ ان کا استحقاق بھی بتایا گیا ان کی صفت اور اسم فاعل کے وزن کے ساتھ کہ یہ ورثہ پانے والے ہیں، جو کہ "فردوس" کا ورثہ پائیں گے، یعنی ان کے اندر یہ استحقاق پیدا ہو گیا ہے، صفت پیدا ہو گئی ہے، "وَهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱)

---

(۱) المومنون: ۱-۱۱ (غیر مطبوعہ)

یہ اللہ تعالی کا وعدہ ہے اور اس دنیا میں بھی، دین کا جو مقام ہے جو مرتبہ ہے، اللہ تعالی کے یہاں جو اس کی عزت ہے جس کا تو تقاضا یہ ہے کہ آخرت ہو اور آخرت میں وہ سب کچھ ملے اس لیے اللہ تعالی نے آخرت کی زندگی بنائی ہے اور اللہ تعالی کے ان انعامات کی اور اس خوشنودی کی یہاں سمائی نہیں۔

اصل تو اس دین کا فائدہ اور اس دین کی برکت ظاہر ہوگی مرنے کے بعد، آنکھ بند ہوئی اور پتہ چل گیا کہ نماز کیا دلا رہی ہے اور کلمہ کیا دلا رہا ہے اور کہاں ہو تم......؟ اللہ نصیب کرے ہر مسلمان کو، لیکن اس دنیا میں بھی اس شریعت کی برکت ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ (۱)(۲)

(۱) تحفۂ دین و دانش (تلخیص): ۹۹-۱۰۰

(۲) درس قرآن، المومنون: ۱-۱۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ تحفۂ دین و دانش (تلخیص): ۹۹-۱۰۰

مومن کامل کے اوصاف (۲)

﴿إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ. وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ. أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ. وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا. وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (المؤمنون: ۵۷-۶۲)

''بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرے ہوئے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور وہ لوگ کہ جو بھی دے سکتے ہیں دیتے ہیں اور (اس کے ساتھ) ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان (خیرات) کے لیے آگے بڑھنے والے ہوتے ہیں اور ہم نہیں مجبور کرتے کسی نفس کو مگر اسی چیز کا جو اس کی گنجائش میں ہے اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق بولتی ہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی''۔

اپنے رب کے خوف سے لرزاں وترساں

"اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ" " بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے لرزاں وترساں ہیں"۔

"مُشْفِقُوْنَ" ڈرے ہوئے ہیں "مُشْفِقُوْنَ" یہ عربی میں نہیں بلکہ ہر زبان میں ہر لفظ کے بارے میں جو ماہرین السنہ ہیں، کہتے ہیں کہ مترادفات کا وجود ہی نہیں، کوئی کسی فرق کی وجہ سے لایا جاتا ہے، تو یہ جو "مُشْفِقُوْنَ" ہے اس کو بھی عربی کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے، لرزاں اور ترساں ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے، خوف ایک ذرا ظاہری چیز ہے اور محدود ہے کسی کسی وقت ڈر جانا، یا کسی خاص چیز سے سوچ کر کے ڈر جانا، لیکن جو کیفیت طاری ہو جائے اور آدمی ڈرا ہوا سہا ہوا جس کو ہم اردو میں سہما ہوا کہتے ہیں، جو ڈرنے والا اور سہما ہوا دونوں میں جو فرق ہے، وہی فرق "مُشْفِقُوْنَ" میں ہے یہاں پر "مُشْفِقُوْنَ" ہی کی ضرورت تھی، بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے لرزاں اور ترساں ہیں اور یہ صحابہ کرام کی اور صالحین امت کی اور عاملین قرآن کی صفت تھی، ہر وقت ان پر اگر آپ ان کے حالات پڑھیں کتابوں سے معلوم ہوگا اور اگر اللہ نے موقع دیا بقیہ جو لوگ جانشیں ہوتے ہیں ان کے راستے پر ہوتے ہیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بالکل لرزاں اور ترساں ہیں، کسی چیز میں ان کو وہ لطف نہیں آتا جو لطف عام لوگوں کو آیا کرتا ہے، ہم نے خود ایسے نمونے دیکھے ہیں، آج یاد ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے نبض دکھائی ہمارے سامنے ایک حکیم صاحب کو کہا کہ حکیم صاحب ایک منٹ جینے کو جی نہیں چاہتا، یعنی حالات سے اپنے انجام سے یہ سب سے ڈر ہے ایک منٹ جینے کو جی نہیں چاہتا اور لوگوں کو دیکھا ہے کہ نماز میں کس طرح ان پر گریہ طاری ہوتا تھا اور بہت سے لوگوں کی تو جان نکل گئی۔

"جس کا دل بالکل خدا کے خوف سے خالی ہے اور جس کے لیے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اس میں درحقیقت دین کا مادہ نہیں اور وہ گویا کہ دین کے حاسہ سے محروم ہے اور جب کسی کا کوئی حاسہ گم ہو تو اس کے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کر سکتا"۔ (۱)

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۶۴

اپنے رب کی آیات پر ایمان

''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ'' ''اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں'' یہ چیز ہر ایک کہہ سکتا ہے کہ کون مسلمان ہے جو اللہ کے کلام پر ایمان نہیں رکھتا اللہ کی خبروں پر ایمان نہیں رکھتا لیکن یہاں پر جس موقع پر یہ آیت آئی ہے وہ اس سے زیادہ کا مفہوم اور تاثر دیتی ہے، یعنی ایک تو ہے نظری، عقلی اور اعتقادی ایمان، سب اللہ کا کلام ہے، اللہ کی سب باتیں صحیح ہیں لیکن جب وقت آئے تو اس وقت اس کا استحضار ہو کہ یہ بات اتفاقاً نہیں ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اسی میں رحمت ہے اور ایسے ہی ہونا چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ کو اس کا اختیار ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہ ہو ذرا بھی اعتراض نہ ہو ذرا بھی شکوہ نہ ہو وہ جو نظری اعتقادی ایمان ہے جو مشترک ہے سب مسلمانوں میں، جس کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا یہ اس سے زیادہ کی بات ہے،''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ'' اور آیات میں بھی صرف آیات قرآنی نہیں بلکہ وہ نشانیاں جو اللہ تعالیٰ کی ظاہر ہوتی ہیں، کبھی ناراضگی کی، کبھی رضامندی کی، کبھی نعمت کی، کبھی قسمت کی سب ایمان ہو۔

شرک سے اجتناب

''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ'' ''اور وہ لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے''

اب آدمی کہے گا کہ جب اتنی بڑی تعریف کی، جو لوگ ڈرتے رہتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں'' اس کے بعد شرک کا کیا اندیشہ تھا، شرک کا کیا امکان ہے ان سے لیکن ہے یہ بات۔

''شرک کے معنی صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا ہم مرتبہ وہم سر قرار دو دیا جائے بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنی بلند و بالا ذات کے ساتھ خاص فرمایا ہے اور جس کو ''عبودیت'' بندگی کا شعار بنایا ہے جیسے کہ کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا کسی کے نام پر قربانی کرنا، یا نذریں ماننا، مصیبت و تنگی میں کسی

سے مدد مانگنا اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے اور اس کو کائنات میں متصرف سمجھنا یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور انسان ان سے مشرک ہو جاتا ہے خواہ اس کا یہ اعتقاد ہی کیوں نہ ہو کہ یہ انسان، فرشتہ، یا جن، جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو رہا ہے یا جس کے نام پر قربانی کر رہا ہے، نذریں مان رہا ہے اور جس سے مدد مانگ رہا ہے اللہ تعالیٰ سے بہت کم مرتبہ اور پست مقام ہے اور چاہے یہ مانتا ہو کہ اللہ ہی خالق ہے اور یہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے اس معاملہ میں انبیاء، اولیاء، جن وشیاطین، بھوت پریت، سب برابر ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی جو یہ معاملہ کرے گا وہ مشرک قرار دیا جائے گا''۔ (۱)

بعض مشرکانہ عقائد واعمال

''یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لیے نامانوس ہو، مگر حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں کچھ مشرکانہ عقائد واعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اعتراف کے لیے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ ''عنقا'' کی طرح خیالی وفرضی پرندہ نہیں اور اگر قوموں اور ملتوں کے لیے ایک ہی میزانِ عدل اور ایک ہی پیمانۂ انصاف ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ ماحول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے اگر کسی کو اس میں شبہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی ''مرجع خلائق'' مزار پر جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے یا ان عقائد وخیالات کے سننے کی کوشش کرے، جو بہ کثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیاء کرام، بزرگانِ دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم رکھے ہیں کہ ''صفت خلق'' (پیدا کرنے کی طاقت) ''ایجاد عالم'' (عالم کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت) اور مشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات وافعال الٰہی میں سے کون سی صفت

(۱) دستور حیات: ۷۷-۷۸

اور کون سا فعل وتصرف ہے جو انہوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے اور سجدہ سے لے کر دعا و استعانت تک کون سا معاملہ ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے، انہوں نے ان ہستیوں کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے؟ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی خالی مرکز میں چلے جایئے اور اس کا امتحان کر لیجئے"۔ (۱)

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام ہی کی بات ہے "وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ" اس پس کے باوجود بعض مراحل ایسے آتے ہیں، ایک مومن کی زندگی میں کہ آدمی کو اس میں اندیشہ ہوتا ہے کہ شرک میں نہ پڑ جائے کہ یہ بات اس کی وجہ سے ہوئی، یہ ہم نے فلاں عمل کیا تھا، اس لیے ہمیں یہ انعام ملا، یہ فلاں آدمی ہم سے راضی ہے اس لیے ہمارا کام بن گیا اور آدمی کبھی کسی کی قدرت کو شریک کر لیتا ہے کہ اگر وہ اس مدد کرے تو یہ بات جو بالکل ناممکن ہے وہ ہو جائے تو یہ شرک یہ بت پرستی کا شرک ہے اس سے آگے اس سے زیادہ ممتد اور وسیع وطویل اور باقی رہنے والی چیز ہے ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ﴾ "وہ کسی حالت میں بھی یہ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا" نہ قدرت میں، نہ رحمت میں اور نہ سزا دینے کے اختیار میں اور نہ برکت ونحوست جسے کہتے ہیں، کسی چیز میں نہیں، یعنی یہ نہیں کہ یہ فلاں چیز کی نحوست ہوئی، یہ فلاں آدمی سے ہم نے اس طرح بات نہیں کی تھی، تو یہ ہمیں سزا ملی، اگر ہم اس طرح ملتے، خوشامد کرتے تو یہ بات نہیں ہوتی، تو یہ حضرات جن کی تعریف کی جارہی ہے یہ توحید کامل کے اس مقام پر ہوتے ہیں جن کے یہاں وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کوئی اور کچھ کر سکتا ہے۔

خیرات میں سبقت اور خوف خدا

"وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا آتَوْا" اور وہ لوگ کہ جو دیتے ہیں جو بھی دیتے ہیں "وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ" اور اس کے ساتھ ان کے دل ڈرتے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے والے ہیں، یعنی دیتے ہیں تو فخر نہیں کرتے، ہم نے یہ خیرات کی،

(۱) مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۱۶-۱۷)

ہم نے فلاں کا کام نکال دیا، فلاں کی مدد کر دی، ہم نے فلاں کو کھانا کھلا دیا، وہ نیکی کے ساتھ ڈرتے رہتے ہیں کہ اللہ قبول فرمائے، قبول کرنے والا وہی ہے اور قیامت میں ہمیں اس کا اجر ملے اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو اس مال میں کوئی خرابی نہ ہو اس کے دینے کی حالت میں ہمارے دل میں کوئی فخر یا غرور نہ ہو تو یہ مقام ہے اولیاء اللہ کا اور خاصان خدا کا، کہ وہ عبادت کے کام، وہ سخاوت کے موقع پر صدقے کے موقع پر ایثار کے موقع پر بھی ڈرتے ہیں کہ یہ اللہ کو قبول بھی ہے یا نہیں۔

"وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ" ان کے دل اس وقت بھی ڈرتے ہوتے ہیں کہ اللہ کے یہاں جانا ہے۔ اگر اللہ نے یہ سوال کیا کہ کہاں سے لائے تھے؟ کیسے یہ ملا تمہیں، دیتے وقت یہ جذبہ تمہارے اندر کیوں تھا؟ فخر کیوں ہو رہا ہے تھا؟ یہ خیال کیوں آ رہا تھا؟ کہ ابھی تک اتنی بڑی خیرات کسی نے نہیں کی، اتنا بڑا چندہ کسی نے نہیں دیا جو ہم نے فلاں ادارے کو دیا ہے ہم نے اتنے روزہ داروں کا روزہ کھلوایا، کس کو توفیق ہوتی ہے اور بہت سے جو خیرات اور نیکی کے کام ہیں وہ اپنے ذہن میں تصور میں لا کر آدمی کے ذہن میں ایک ذرا سا خود پسندی، ترجیح پیدا ہوتی ہے وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل ڈرتے ہوتے ہیں کہ وہ "أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ"۔

"أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ" "یہی لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان خیرات کے لیے ان نیک کاموں کے لیے آگے بڑھنے والے ہوتے ہیں"۔

یعنی ان کے اندر سبقت کی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خاصیت ہوتی ہے، استطاعت ہوتی ہے جذبہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں اور بڑھ جاتے ہیں۔

"وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" اب یہ جو اتنے بڑے بڑے کام بتائے، خیال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ بھائی یہ کس سے ہو سکتا ہے اور کون کرے گا؟ تو اس کے بعد کہا اور ہم کسی نفس پر بھی اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے جو اس کی وسعت اور استطاعت سے زیادہ ہو یہ وہ ایک نفسیاتی طور پر (Psychological) پر ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ اللہ کے ڈر

سے ہمیشہ سہمے رہیں اور اس کی تمام آیتوں پر ہمارا ایمان ہو اور شرک کا کہیں شائبہ کیا تصور بھی نہ آسکے اور ہم دیں بھی خیرات بھی کریں اس کے بعد بھی ڈرتے رہیں، معلوم نہیں قبول ہو یا نہیں یہ تو بڑا مشکل ہے فرماتا ہے "وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" یہ ایسی بات نہیں ہے کہ جو بالکل انسان کی طاقت سے باہر ہو اور تکلیف مالا یطاق ہو اور ہم نہیں مجبور کرتے کسی نفس کو مگر اسی پر ہم نہیں مکلف کرتے کسی نفس کو مگر اسی چیز کا جو اس کی وسعت کا ہے اس کی گنجائش میں ہے۔

"وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق بولتی ہے، ہر ایک کا اعمال نامہ ہے اور ہر ایک کا بالکل نقشہ ہے ہمارے یہاں ہر چیز لکھی ہوئی ہے محفوظ ہے اور ہم ان سب جزئیات سے واقف ہیں لہذا اُن کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی۔[1]

(۱) درس قرآن بسورۃ المومنون: ۵۷-۶۲ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے بالترتیب باختصار تلخیص و اخذ کئے گئے ہیں: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۶۴ ☆ دستور حیات: ۷۷-۷۸ ☆ مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۱۶-۱۷)

خلوص واستغناء

﴿قُلْ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَى رَبِّهِ سَبِيلًا﴾
(الفرقان۔۵۷)

''آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا، ہاں جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) راستہ اختیار کرلے''۔

اندازِ خسروانہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''قُلْ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں''۔

آپ دیکھئے سورہ شعراء میں کہ ایک ایک نبی کا نام اللہ تعالیٰ لیتا ہے اور ہر ایک کہتا ہے ''وَ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' یعنی ایک کافی تھا لیکن اس نے پھر حضرت نوح کا نام لیا تو کہا، ہود کا نام لیا تو کہا صالح کا نام لیا تو کہا حضرت شعیب کا نام لیا تو کہا ہر ایک کہتا ہے ''وَ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یا ''اجر'' لے لیں یا ''اجرت'' لے لیں!

اس میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے خاص طور پر دینی علم حاصل کرنے والوں کو

اور آئندہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے والوں کو کہ یہ بنیادی شرط ہے کہ "وَ مَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ"۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے فطری خلقی اور دائمی طور پر اس میں بہت بڑی طاقت رکھی ہے! ساری خوبیاں جمع ہوں، لیکن آدمی نے کچھ اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کسی طریقے سے بھی اشارے کنایہ سے بلاغت کے ساتھ تو ایک دم سب پر پانی پھر جاتا ہے، اگر پوری نہیں تو کبھی آدھے پر پانی پھر جاتا ہے اور کبھی چوتھائی پر!

مثلاً تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ سب سے زیادہ جو چیز متاثر کرتی ہے بڑے بڑے دولتمند کو اور کروڑ پتیوں کو وہ "استغناء" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں بالذات خاصیت رکھی ہے، بعض چیزوں میں بالذات خاصیت ہوتی ہے اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب ملکۂ سبا نے تحفہ بھیجا تو انہوں نے کہا تم میری مدد کرنا چاہتی ہو کچھ مال سے، ہمیں جو اللہ نے دیا ہے،..... وہ جو ملکۂ سبا بعد میں ایمان لائی تو اس میں اس کا یقینی پہلا اثر اس کا پڑا ہوگا۔

یہ تو خیر حضرت سلیمان علیہ السلام تھے، ہر طرح سے ان کے لیے مناسب نہیں تھا ان کو ضرورت ہی نہیں تھی لیکن ہم آپ کو بتاتے ہیں، بزرگان دین کی سیرت پڑھ کر اور جنہوں نے اصلاحی کام انجام دیئے اور اللہ نے جن کے ذریعے سے اسلام اس وقت تک محفوظ رکھا ہو یعنی اسلام کو اس کے احکام اور اس کی اشکال کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی روح اور طاقت کے ساتھ جو اس وقت تک محفوظ رکھا ہے ان میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ اجر کے طالب نہیں ہوتے! لوگوں کو معلوم تھا کہ اس پر کوئی معاوضہ نہیں!! اس میں اللہ تعالیٰ نے (سحر کا لفظ بے ادبی ہے) ایسی دل کشی اور ایسی دلوں کو جیت لینے کی اور دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھی ہے جو نہ کسی بلاغت میں ہے نہ کسی خطابت میں ہے۔

یعنی ایک شخص بہت بڑا مقرر ہے اور مسحور کر دینے والا ہے، بڑا عالی نسب ہے اور بہت وجاہت سب کچھ لیکن اگر اس میں کسی طریقے سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چاہتا ہے کہ کچھ اس کی خدمت کی جائے، کچھ اس کی قدر کی جائے، کسی (بلاواسطہ یا بالواسطہ) طریقے پر اس کی مدد کی جائے تو تقریباً سب پر پانی پھر جاتا ہے۔

اور یہ دیکھا ہے کہ اس میں اتنا اثر ہے کہ اگر کسی شخص نے اس کا اظہار کر دیا تو جو دینے والا ہے اس کے نزدیک یہ کوئی فائدے کی بات نہیں ہوگی، یعنی وہ اس پر خوش نہیں ہے کہ ہمارا پیسہ بچ گیا بلکہ اس کا اثر ہی پڑتا ہے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت وتاثیر

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ اس سے گھبرائیں اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں اور جو اپنی مٹھی بند کر لیے اور دامن سمیٹ لے اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کر لے۔ استغناء میں ازل سے محبوبیت ومقبولیت ہے اور طلب میں ذلت، گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے اور طالب سے استغناء کا یہ بھی ایک ایسی سنت خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں، چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر آئے گا، آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہو رہا ہے(۱)

یہ تجربہ ہوا اور علمائے دین کے جو حالات پڑھے ان میں کہ بالکل وہ انہوں نے گویا قسم کھائی ہے کہ کسی والی سلطنت سے کسی سرمایہ دار سے، کسی صحب وجاہت سے، کسی سے کچھ نہیں لینا ہے، (یہ بات سب کو معلوم تھی اور یہ قصے ہم نے یہاں سنائے بھی) ایک چھوٹی سی مثال دیتے ہیں۔

حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ (جہاں ہم آپ بیٹھے ہوئے ہیں) پروانہ آتا ہے عالمگیر کی طرف سے جاگیر کا پروانہ، اس زمانہ میں جاگیر تھی اور حضرت صاف معذرت کر دیتے ہیں، وہ آدمی (قاصد) بڑا ہوشیار تھا اس نے سمجھا کہ یہاں تو دال گل نہیں سکتی، لیکن اگر اس کے گھر والوں سے کہا جائے (اس لیے کہ اول تو وہ علمی حیثیت سے بھی اور دوسرے روحانی حیثیت سے بھی اس درجہ فائق نہیں ہیں، خواتین میں اور مردوں میں بڑا فرق ہوتا ہے چاہے وہ کسی کی بیوی ہو کسی کی بیٹی ہو اس لیے کہ ضرورتیں تو ان کو پوری کرنا پڑتی ہے اور یہ تو پکا پکایا کھانا کھاتے ہیں، تو ان سے کہا جائے) تو ان کی ضرورت ہوگی

اوراس بات کا احساس ہوگا تو کہدیں گی، کیا حرج ہے لےلواس کو (اس لیے کہ کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا)۔

توانہوں نے (اہلیہ) کہا (ہم اپنے بزرگوں سے سنا ہے یہ قصہ) کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا نان ونفقہ شاہ علم اللہ کے ذمہ کیا ہے، عالمگیر کے ذمہ نہیں، تو مسئلہ بتایا انہوں نے کہ بیوی کا نان ونفقہ تو شوہر کے ذمہ ہوتا ہے، کسی بادشاہ کے ذمہ نہیں ہوتا۔(۱)

تو استغناء سے ہدایت پھیلتی ہے اور خاص جوڑ ہے ہدایت کا استغناء سے اسی لیے تو قرآن شریف میں جا بجا اسکے اشارے ملتے ہیں اور یہ جواب ہوگیا ہے کہ ہر ایک سے مانگنے کے لیے تیار اور ہر ایک سے لینے کے لیے تیار اور ہر ایک کے محتاج اس کی وجہ سے بڑی دقت ہورہی ہے اور اس میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔

"قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ" کہہ دیجئے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں۔

"اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" سوائے اس کے کہ جس نے چاہا کہ وہ اپنے رب کا رستہ حاصل کرے، ہدایت پائے تو یہ اجر تو ہے، یعنی یہ تمہاری اجرت تو میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، اس سے جو خوشی ہوگی، اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کی، یہی گویا انعام ہے اس کا۔

(۱) اسی طرح کا واقعہ ہے کہ...... حضرت شاہ مولانا غلام علی (ان کی خانقاہ دہلی میں ہے) نقشبندیہ مجددیہ وہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ ہیں، نواب امیر الدولہ والی ٹونک ان کے مرید تھے یہ امیر الدولہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ جنگ میں شریک رہے ہیں، انگریزوں سے تو ان کو معلوم ہوا کہ حضرت شاہ کی تنگدستی کا، تو نواب صاحب نے نذرانہ کے طور پر ایک بڑی رقم یا جاگیر پیش کی تو حضرت شاہ نے فرمایا۔ "فقیر نے روزہ رکھا تھا اور آفتاب غروب ہونے کے وقت کوئی روزہ نہیں توڑتا" یعنی اب میں عمر کے اس مرحلہ میں پہونچ گیا ہوں، بابِ کوئی کتنا ہی مر رہا ہو اور بالکل سورج ڈوب رہا ہو اب ان سے کوئی کہے کہ پانی پی لیجئے تو کہیں گے اب پانی پئیں؟ ارے دیر کیا ہے؟ ابھی سورج ڈوبتا ہے تو پئیں گے، بڑا بلیغ فقرہ ان کا ہے کہ "فقیر نے روزہ رکھا تھا اور آفتاب عمر غروب ہونے کے وقت کوئی روزہ نہیں توڑتا اور اس کے بعد یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم ۔۔۔ با میر خان بگو روزی مقدر است

ہم فقر وقناعت کی روزی کی آبرو نہیں ختم کرتے میر خاں سے کہدو کہ روزی مقدر ہے۔

زہد وتواضع کے نمونے

اور ہم نے بتایا کہ ابھی تک کا تو تجربہ ہے کہ اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قیامت تک سب سے زیادہ جو چیز مفید ہوتی ہے یعنی کسی خیر خواہ کے لیے، بہی خواہ کے لیے، ناصح کے لیے مبلغ کے لیے، معلم کے لیے وہ اس کی غرض ہے، یہ تمام دنیا میں (کہیں نہیں) یہاں سے لے کر کے آپ امریکہ چلے جایئے کہیں چلے جایئے سب سے زیادہ جو چیز مؤثر ہوتی ہے وہ یہ کہ کچھ لینا نہیں ہے۔(۱)

تو اس میں یہ جو ہم تک دین پہنچا ہے اور لوگوں نے مانا ہے بڑے بڑے سرکشوں نے اس میں بہت دخل اس کا تھا اب یہ بات بہت کم ہوگئی ہے اور اب تو ہر چیز کو ذریعہ بنایا گیا ہے پہلے تو یہ تھا کہ عربی ذریعہ نہ تھی اس کی، انگریزی ذریعہ تھی، انگریزی پڑھتے تھے لوگ پڑھتے ہی اس لیے تھے کہ ملازمت ملے کوئی ناجائز نہیں، لیکن اب عربی بھی ذریعہ بن گئی، اس لیے کہ اب ان ملکوں میں دولت آگئی، جہاں عربی بولی جاتی ہے اور دوسرے ملکوں سے زیادہ دولت آگئی ہے۔ تو اب عربی سے وہ کام لیا جانے لگا، جو پہلے انگریزی سے لیا جاتا تھا، ہمیں

(۱) ہمارے شیخ اول اور ہمارے مربی اور ہمارے قرآن مجید کے استاد (جن سے قرآن مجید ہم نے پڑھا اول سے آخر تک وہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ تھے) ان کا حال یہ تھا کہ کہیں سے دعوت آئی تھی کہ آپ آیئے اور وعظ فرمایئے یہاں بڑی ضرورت ہے تو اس وقت تک انتظار کرتے تھے ان کے پاس روپیہ ہو، چاہے اس میں کتنی دیر ہو، تو اپنے ہی کرایہ سے جاتے تھے، کرایہ نہیں لیتے تھے اور ہم نے خود فرمایا کہ "ایک گلاس شربت پی لینے سے اس کے بعد وہ اثر نہیں رہتا جو مؤثر کرو ے" اچھا وہاں جاتے تھے تو لوگوں نے بتایا کہ اسٹیشن پہونچے اور لوگ آئے ہیں استقبال کے لیے (حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ ان بہت نام تھا تو پورے پنجاب میں یہاں سے لے کر سندھ تک ان کی روحانیت، اخلاص، اس کی وجہ سے) تو انہوں نے بتایا کہ لوگ آئے ہوئے ہیں لینے کے لیے، تو چپکے سے نکل گئے، تھرڈ کلاس سے اترے اور کسی دروازے سے نکل کر رکشہ (رکشہ تو اس زمانے میں نہیں تھا) پر بیٹھے اور سیدھے وہاں پہونچ گئے، بلانے والے کے یہاں اور مولانا کی عادت یہ تھی کہ اپنا استقبال نہیں کراتے تھے۔ ایک مرتبہ پٹنہ ان کو بلایا گیا تھا (انہوں نے غالباً خود ہی ہمیں سنایا) کہ لاہور سے پٹنے کتنی دور ہے تو گھر میں کہہ دیا کہ تین چار دن کے لیے اتنا کھانا ایسا تیار کرو جو کہ ناشتہ ہی کی قسم کی کوئی چیز ہو تو وہ لے گئے اور اپنا ہی کھانا کھاتے رہے۔

اس سے مناسبت نہیں، ابھی تک نہیں ہے، مگر معاملہ ہے بڑا نازک اور مشکل اگر اللہ توفیق دے کسی کو تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان ممالکِ عربیہ سے بھی صرف دعوت کا تعلق ہو، جب ہی فائدہ ہوگا، ہم نے تو کہا ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ تھوڑی سی رقم مولوی صاحب کے پاس بھیجدی جائے کہ آپ کا خرچ بہت ہے، خرچ بہت سے تھوڑا سا ہم بھی اس میں شامل ہوجائیں، ہم نے کہا، ہمارا تو کچھ ایسا خرچ ورچ نہیں، آپ کا بہت خرچ ہے یعنی ہمیں آپ کی خدمت کرنی چاہیے، یعنی حوصلہ یہ ہونا چاہیے تب جا کر پھر زبان سے جو لفظ نکلے گا وہ دل پر چوٹ لگائے گا اور اس سے زندگیوں میں انقلاب ہوگا اور ملکوں میں انقلاب ہوگا اور بالکل سینکڑوں برس کی جو جمی جمائی چیزیں تھیں وہ مٹ گئیں یہ ایسے ہی نہیں ہوگیا بلکہ حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسی شخصیات کی اس کے پیچھے بڑی قربانیاں اور مجاہدہ ہے، اس کے پیچھے حضرت فضل بن عیاض حضرت جنید بغدادی اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسی شخصیات کی قربانیاں اور مجاہدات ہیں کہ آج مسجدوں میں آوازیں ہورہی ہیں یہ سب عبدالقادر جیلانیؒ کا فیض ہے۔

ان سب میں یہ چیزیں تھیں اس کی کوشش کرنی چاہیے، جہاں تک "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" کا تعلق ہے تو بعض مرتبہ میتہ کھانا بھی جائز ہوتا ہے لیکن اس کی قدر ہونی چاہیے اور جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم مستغنی ہوکر کام کریں گے۔ (۱)

(۱) درس قرآن سورۃ الشعراء: ۵۷۔ غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆دعوت فکروعمل: ۲۰۵-۲۰۶، سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

امانت ودیانت

"اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ" (سورۃ الشعراء:۱۰۷)

"میں تمہارے لیے خدا کا امین پیغمبر ہوں"۔

نوع انسانی اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ خودساختہ رہنماؤں اور برسراقتدار شخصیتوں کا کھیل اور مذاق اور قانون سازوں اور حکماء کے تجربات کا نشانہ بنتی رہی ہے ایسے لوگوں نے اپنے ابنائے جنس اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بچہ کاغذ کے کسی پرزے کے ساتھ کرتا ہے بچہ کبھی کاغذ کو لپیٹتا، کبھی کھولتا کبھی بند کرتا اور جب جی چاہے پھاڑتا اور جلا ڈالتا ہے۔

ان کے لیے انسانی زندگی اس کی ترقی کے امکانات اور اس کی سعی و مضمرات کی کوئی قیمت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انسان میں اطاعت وفرمانبرداری کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور قائدین پر اعتماد اور جاں نثاری کی جو صفت رکھی ہے اس کے سلسلے میں انہوں نے نہ خداترسی سے کام لیا نہ حق وانصاف کے تقاضے پورے کئے نہ کسی تعلق اور ذمہ داری کا لحاظ کیا اور اسے انہوں نے اپنی خواہش ومنشا کا آلۂ کار اور قیادت وسیادت اور اغراض کا ذریعہ بنالیا ان قائدین کی کوتاہ نظری، خطا کاری وگمراہی اور غلط فہمی وغلط بیانی نفس پرستی و بوالہوسی، انفرادی واجتماعی انانیت، قومی ووطنی عصبیت نے بدقسمت انسان کے سرپر طویل بدبختی اور مصیبت لادوی ہے، انہوں نے اپنے اخلاص، بصیرت خلائق دوستی اور احترام انسانیت

کے بارے میں مستقل شبہات پیدا کر دیئے اور اس بات کی اب کوئی ضمانت نہیں رہی کہ انسانیت ان کے زیر سایہ پھل پھول سکتی ہے ...... تاریخ انسانی ان المیوں اور رسوائیوں اور ایک ساتھ ہنسانے اور رلانے والے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور مشرق و مغرب میں آج بھی بہت سی قومیں انہیں طالع آزما ستم ظریف قائدین کے رحم و کرم پر زندگی گذر رہی ہیں جو اس سے کھیلتے، اسے گیند کی طرح لڑھکاتے اور اس پر ہر روز نئے تجربے کرتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی ان تجربات کی غلطی و ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور کبھی ان سے اقتدار حاصل کرنے والا اور ان کا جانشین انہیں رسوا کرتا اور ان کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور کبھی انہیں تاریخ محفوظ کر دیتی اور آنے والی نسلیں ان سے واقف ہو جاتی ہیں۔

غلطیوں سے پاک انبیاء کی ضرورت

ان ناکام تجربوں اور غلط نتائج کی زد سے عقائد و ایمانیات بھی محفوظ نہیں رہے جن پر حسن انجام، دنیا کی سعادت اور آخرت کی نجات کا دارومدار ہے اور جو صحیح اخلاق، صالح تہذیب، بندے کو خدا سے ملانے والی عبادت اور شریعتوں کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں اور جن میں کسی غلطی کی تلافی بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتی ہے اس لیے ایسے قائدین کی ضرورت پیدا ہوئی جو امانت دار، گمراہیوں اور غلطیوں سے پاک ہر لالچ اور نفع اندوزی اور مادی معاوضہ کی خواہش سے بری ہوں، جو خواہشات سے مغلوب اور جذبات سے متاثر نہ ہوتے ہوں، جو اپنی رائے اور ناقص معلومات، محدود تجربوں اور ذاتی مصلحتوں کے ماتحت کوئی فیصلہ نہ کرتے ہوں اور جب ان سے کبھی کوئی اجتہادی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کے بعد وہ ان غلطیوں پر قائم اور مصر نہ رہتے ہوں۔

امانت داری اور اخلاص

اسی لیے آپ اکثر دیکھیں گے (سورہ شعراء میں) کہ پیغمبروں کے ساتھ ''اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ'' یعنی ہر مبعوث ہونے والا نبی اپنی امت کو اپنی امانت اور اخلاص

و بے غرضی کا پورا یقین دلاتا ہے ایک ایک نبی کی زبان سے وضاحت فرمائی گئی ہے اور یقین دلایا گیا ہے: ''اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ''۔

یہ مقصد کی وحدت جو مختلف امتوں اور مختلف زمانوں کے انبیاء کے بارے میں مشترک ہے اپنے اندر بڑے عمیق معنی رکھتی ہے ''لفظ امانۃ'' ایسا جامع لفظ ہے جو صداقت وحی خداوندگی کو صحت کے ساتھ قبول کرنے، صحت کے ساتھ امت تک پہنچا کے معانی پر مشتمل اور رسالت ونبوت کے نظام کا رکن اساسی ہے، عربی زبان میں اس مقصد کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور جامع وبلیغ لفظ نہیں۔

اور یہ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول عربی ﷺ نے نبوت سے پہلے ہی اس صفت کے ساتھ شہرت پائی اور ''الصادق الامین'' کا لقب ہی قریش نے حضور کو دیا اور مکہ کے امیوں کے دل میں یہ بات خود بخود آ گئی کہ وہ آنحضرت کو ''صادق امین'' کے معزز لقب سے پکاریں اور وہ آپ کی عام بشری زندگی میں بھی صفت تھی اور پیغمبرانہ سیرت میں بھی صفت تھی۔

''اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ'' بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں''۔

''رسول'' کو ''امین'' کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے رسالت کی بھی سب سے بڑی ضرورت اور رسالت کا سب سے بڑا تقاضہ اور رسالت کا سب سے بڑا خاصہ اور رسالت کی سب سے بڑی ضرورت امانت ہے کہ جو چیز اللہ سے جو پیغام ملا اس کے بے کم وکاست پہنچا دیا جائے۔

پہلا کام یہ ہے پیغمبر کا کہ جو کام اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے اس میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو! اور یہ صرف پیغمبر کے لیے ہی نہیں بلکہ یہ گویا ان کے نائبین کے لیے بھی ایک سبق ہے اور ایک تنبیہ ہے کہ ان کو ''امین'' ہونا چاہیے۔

اور یہ ''امین'' کا لفظ اتنا عام ہے، اتنا وسیع ہے، خاص طور پر عربی زبان میں ''امانۃ'' جب کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کوئی چیز رکھوائی گئی تھی، اس نے پوری کی پوری پہنچا دی، کوئی تحفہ دیا تھا، کوئی رقم دی تھی کہ فلاں کو پہنچا دینا تو اس نے پوری

پہنچادی لیکن ''امین'' عربی میں جو ہے اور معنوی حیثیت سے بھی دیکھئے کہ امانت کا تعلق پوری بات پہنچادینے سے اسی طرح پہنچادینے سے اور بلا اس کے خیال کے کہ یہ موقع پہنچانے کا ہے یا نہیں۔ پہنچانے کا ہے، بغیر ڈر کے، بغیر لالچ کے، بے کم وکاست، پوری بات پہنچادے۔

پھر دوسری بات ''امین'' میں یہ بھی شامل ہے کہ کوئی غرض اس کی نہ ہو یعنی اس کی کوئی نیت یہ نہ ہو، مثلاً بہت ادنیٰ اغراض میں سے یہ ہے کہ مالی نفع ہو اور اس سے کچھ بہتر یہ ہے کہ ہمارا فلاں کام ہو جائے اور اس سے زیادہ نازک اور بلند چیز یہ ہے کہ حب جاہ! کہ ہمارا مرتبہ ہو، ہماری عزت کی جائے، یہ سب ''امین'' میں داخل ہے کہ اس کے اندر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو ان میں سے ہر چیز ''امانت'' کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول کے لیے اور رسول کی نیابت کا کام کرنے والے کے لیے اب جو مبلغین ہیں ان کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ امین ہوں اور بے غرض ہوں اور آج عالم اسلام کو ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے، جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال ومتاع اس کے لیے وقف کردیں، کسی جاہ ومنصب یا عہدہ وحکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، کسی کے لیے ان کے دل میں کینہ وعداوت نہ ہو، فائدہ پہنچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں، ان کا طرزِ عمل سیاسی رہنماؤں کے طرزِ عمل سے ممتاز اور ان کی دعوت وجد وجہد سیاسی تحریکات (جس کا مطمحِ نظر محض حصول اقتدار ہوتا ہے) مختلف اور جداگانہ ہو، اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز۔ (۱)(۲)

---

(۱) نیا طوفان اور اس کا مقابلہ: ۲۸

(۲) درس قرآن، سورۃ الشعراء: ۱۰۵ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۱۰۹-۱۱۳ ☆ نیا طوفان اور اس کا مقابلہ: ۲۸، سے ماخوذ ہے۔

سخاوت وایثار اور عفو عالی ظرفی

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (النور: ۲۲)

''اور جو لوگ تم میں صاحب فضل اور وسعت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ جانے والوں کو کچھ خرچ پات نہیں دیں گے ان کو چاہیے کہ معاف کردیں اور در گذر کردیں، کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو بخش دے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے''۔

ایثار وعالی ظرفی

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ'' ''کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ گنجائش دی ہے اور کچھ عطا فرمایا ہے ان کو اس بات میں کمی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اپنے قرابت داروں کو دیں۔

یہ پہلے سمجھ لیجیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کے ایک عزیز (مسطح بن اثاثہ) نے ایسی تکلیف پہنچائی تھی جس سے بڑھ کر تکلیف کا تصور کوئی شریف آدمی کر نہیں سکتا اور ان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے اس لیے کہ ہمیں آپ کو تکلیف پہونچے یا کسی بیٹی کے باپ کو تکلیف

پہونچے تو ایک ہزار بیٹی کے باپ ایک طرف اور اس بیٹی کا باپ جس کا نام ابوبکر تھا ایک طرف اور بیٹی بھی کیسی؟ اور کس کی بیوی؟ اس مسئلہ کا تعلق اس ذات سے تھا جن سے ان کو عزت حاصل ہوئی تھی، عزت کیسی عزت؟ اس پر بہتان لگایا اس پر حملہ کیا اس سے بڑھ کر کسی شریف آدمی کے لیے کیا کسی حساس آدمی کے لیے بھی زندہ آدمی کے لیے بھی کوئی آزمائش ہوسکتی ہے؟

ہوا یہ کہ ام المومنین حضرت صدیقہؓ پر جو الزام لگایا عبداللہ بن ابی نے جو سردار المنافقین تھا اس میں دو صحابی (ذہن ہوتا ہے، طبیعتیں اور مزاج ہوتے ہیں اس کو مزاج کہتے ہیں) بھی شامل ہوگئے، یعنی کہیں مجلسوں میں انہوں نے کہہ دیا کہ بھئی کیا تعجب ہے، کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے انسان انسان ہی ہے ایسی کچھ بات کہی اس میں دو تھے ان میں سے مسطح بن اثاثہ تھے وہ ابوبکر کے دور کے رشتے دار ہوتے تھے اور تھے ذرا تنگ معیشت سے، بہت تنگ تھے اس کے پاس گذر اوقات کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا کوئی تجارت یا رقم ملتی ہو، حضرت ابوبکر کا جو طریقہ تھا کہ وہ مدد کرتے تھے اس سے ان کا گذارا ہوتا تھا جب حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ مسطح بھی ان میں شامل ہیں تو اب یہ بالکل بشریت کا تقاضا تھا، قسم کھا بیٹھے کہ اب میں ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کروں گا، یہ مستحق نہیں رہے، میری بیٹی پر اتنا بڑا الزام اور پھر وہ بیٹی بیٹی ہی نہیں تھی جن کی وجہ سے ان کو ایک شرف حاصل تھا یعنی خسر ہونے کا شرف نبی کے خسر ہونے کا شرف، اتنا بڑا شرف حاصل تھا کہ وہ صدیقیت، صحابیت اور سفر میں معیت، غار ثور میں ٹھہرنا اور یہ سب چیزیں اپنی جگہ، لیکن یہ خود اپنی جگہ بہت بڑی چیز تھی کہ ان کی بیٹی سب سے زیادہ قریب ترین اور حضور ﷺ کی محبت اور قدر تھی وہ حضرت عائشہ تھیں (اخیر میں آپ ﷺ نے ازواج مطہرات سے اجازت لی تھی کہ میں بیماری کے یہ دن جو ہیں حضرت عائشہؓ کے گھر گذاروں)

تو یہ اتنا بڑا دھکا لگا حضرت ابوبکرؓ کو وہ دھکا صرف اتنا نہیں تھا کہ ان کی بیٹی پر بلکہ اس شرف پر الزام اس شرف پر چوٹ جس سے آپ کو نسبت سے حاصل تھی اور یہ بالکل بشریت تھی کہ ان کی زبان سے نکل گیا کہ اب میں ان کی مدد کروں گا...... لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو بھی پسند نہیں کیا فرمایا:-

سخاوت و ہمدردی

"وَلَايَاتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ" تم میں سے جن کواللہ تعالیٰ نے کچھ دیا ہے دولت دی ہے "فضل" کا لفظ یہاں استعمال کیا ہے یعنی ان کی ضروریات سے کچھ چیز جواس کو زائد دیا ہے، جواس کو بچ سکتا ہے بچتا ہے جو دوسروں کو دیا جا سکتا ہے، دوسروں تک منتقل کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بہترین لفظ یہاں پر "فضل" کا ہے کہ قسم نہ کھا بیٹھیں فراغت والے جن کو اللہ نے فراغت نصیب فرمائی ہے تم میں سے۔

"وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" .....اور جن کو گنجائش دی ہے کہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں اہل قرابت کو دینے کے بارے میں کہ ہم نہیں دیا کریں گے اور مسکینوں کو اور مہاجرین کو جو اللہ کے راستے میں ہجرت کر کے آئے ہیں ان کو دینے کے سلسلے میں قسم نہ کھا بیٹھیں کہ بھئی مجبوری ہے ہم نے قسم کھالی ہے اس وقت دراصل طبیعت پر ایسا اثر تھا کیا کریں، مغلوب ہوئے ہم، ہم نے قسم کھائی کہ اب ان کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کریں گے، ہم کیسے دیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، قسم نہیں کھانی چاہیے اگر قسم کھائی ہے تو اس کے خلاف کرنا چاہیے دینا چاہیے۔

عفو و درگذر

"وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا" اگر ان کی کوئی بات بری لگی ہے تو ان کو معاف کرنا چاہیے اور درگذر کرنا چاہیے، "اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ" کیا تم نہیں پسند کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے، جب یہ آیت اتری تو انہوں نے کہا کہ نہیں بیشک میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ میری مغفرت فرمائے اور اسی وقت سے انہوں نے دینا شروع کر دیا اور جو بند کر دیا تھا وہ جاری کر دیا اور معاف کر دیا اور کہا کہ بیشک میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے، بیشک مجھے اس کی ضرورت ہے کہ اللہ مجھے معاف کرے اس سے بڑھ کر کوئی نمونہ نہیں ہو سکتا صلہ رحمی کا اور پھر حدیث میں آتا ہے کہ "لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِیْ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَ" رشتہ ناتوں کو جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو

بدلہ دینے والا ہو ہم سے کوئی رشتہ جوڑ دیا ہے تو ہم بھی جوڑ رہے ہیں اصل رشتہ جوڑنے والا وہ ہے کہ اس کا رشتہ توڑا جائے تو وہ جوڑے"۔

"وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" اور اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا ہے اور رحمت والا ہے اب یہ جو ہے کہ جن سے تکلیف پہونچی ہو ان کے ساتھ سلوک کیا جائے اور ان کی ظلم کا اور ان کی بیجا کاروائی کا ان کی ایذارسانی کا جواب سلوک سے دیا جائے اور مدد سے دیا جائے یہ واقعات صحابہ کرام کی زندگی میں ملیں گے کثرت سے یا پھر صوفیاء کرام کے یہاں آپ کو ملیں گے کہ ذہن بھی نہیں دیا جاسکتا کہ ایسا آدمی کسی ہمدردی کا مستحق ہوگا۔

اعلیٰ اخلاق کا نمونہ

ایک واقعہ سنا دیتا ہوں سید احمد شہید کا کہ ایک جنگ ہو رہی ہے مسلمان کہلاتے تھے۔ وہ یار محمد خان، خدا ان کی مغفرت کرے انہوں نے زہر دلوایا شہیدوں کے میدان میں جنگ تھی جنگ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے حضرت کے کھانے یا ناشتے میں زہر دلوایا، ایک آدمی کے ذریعہ سے اور زہر نے پورا کام کیا اور میدان جنگ میں غشی آنے لگی اور صاف معلوم ہونے لگا کہ خدا جانے کا حادثہ پیش آئے کہ حضرت شاہ اسماعیل کو شہید کو فوراً احساس ہوا اور انہوں نے اپنے گھوڑے پر بھا کر یا ہاتھی پر فوراً گھر پہنچا دیا اور وہاں جو کچھ ہوسکتا تھا اس زمانے میں وہ کیا گیا اور دعائیں ہوئیں اور زہر کا اثر جاتا رہا اس آدمی کا پتہ چل گیا جس کے ذریعہ سے زہر دیا گیا تھا وہ حضرت سید صاحب کے یہاں آگیا کسی طرح سے، سید صاحب نے اس کو رات بھر رکھا اور رات کو کہا کہ لو یہ روپے لو اور جلدی سے دریا پار کر کے چلے جاؤ ورنہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں، لوگوں کو اس وقت پتہ نہیں چلے گا کہ کہاں ہیں تو پناہ بھی دی اور رات کو رقم دے کر اس کو دریا پار کروا دیا کہ پھر تمہیں چھوڑیں گے نہیں، ماردیں گے نکل جاؤ یہاں سے، ایسے واقعات آپ کو حضرات صوفیاء کرام کے یہاں کثرت سے ملیں گے، ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتے ہیں یہ اس لیے کہ یہ چیزیں قابل تقلید ہیں اللہ اگر توفیق دے۔

لطیفہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں لوگ تحفہ لاتے

تھے جیسے بزرگوں کے یہاں لاتے ہیں، کوئی مٹھائی لایا، کوئی گھر کی پکی ہوئی چیز لایا تو وہ اکثر کسی برتن میں ہوتی تھی، یا ڈبے میں ہوتی تھی یا کسی کاغذ میں بندھی ہوتی تھی، ایک منطقی آدمی تھے، معقولی انہوں نے تو کہا کہ حضرت کو تو اچھا وہ سب جمع ہوجاتا تھا سامنے سب رکھ دیا جاتا تھا (یہ ہم نے ہندوؤں کو بھی سنایا پیام انسانیت کے جلسے میں) دیکھئے ہمارے بزرگوں کا یہ معاملہ تھا تو وہ سب جمع ہوجاتا تھا اور حضرت دائم الصوم تھے سوائے عیدین کے سال بھر روزہ رکھتے تھے تو حضرت کو تو کھانا بھی نہیں ہوتا تھا، افطار بھی برائے نام اور سحری بھی برائے نام، جب سب جمع ہوجاتا تھا مجلس برخاست ہونے لگتی تھی تو خوان اقبال حضرت کے خادم تھے ان سے فرمایا کرتے تھے کہ لو یہ اٹھالے جاؤ اور بچوں میں تقسیم کردو یہ ہماری خانقاہ میں جو لوگ ہیں یا ان کے گھروں میں بھیج دو سب تقسیم ہوجاتا تھا پتہ بھی نہیں چلتا ہوگا کہ کیا آیا کیا نہیں، وہ منطقی صاحب تھے انہوں نے کہا حضرت کو تو پتہ نہیں چلتا کیا ضرورت ہے کہ پیسہ خرچ کرکے آدمی کوئی چیز خرید کر لے جائے اپنے گھر میں مٹی لی اور پیکنگ اس کی بہت عمدہ کی، ذرا دھوکے میں ڈالنے والی کہ اچھے کاغذ میں اس کو اچھی طرح سے باندھا اور کہا کہ ہم سے بھی حضرت خوش ہوں گے، دعادیں گے پتہ بھی نہیں چلے گا کسی کو اتنا سامان ہوتا ہے کہ یہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ کون لایا یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ کون کیا لایا تھا خیر وہ چیز آئی رکھی گئی اس کے اوپر اور چیزیں رکھی گئیں، اچھے اچھے تحفے آنے شروع ہوئے اب جب لے جانا کا وقت ہو ج کسی کو مجلس میں خبر نہیں، حضرت کو کشف ہوتا تھا جب اس کو اٹھانے لگے تو کہا کہ نہیں اس کو مت اٹھاؤ یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے اور کیوں، کیوں نہ اٹھاؤ اس لیے کہ جب کھولیں گے دیکھیں گے کہ مٹی ہے کسی نے کسی کو یاد آجائے گا کہ فلاں آدمی لایا تھا یہ ہوتا ہے بعض دو بین خورد بین ہوتے ہیں اس طرح کا جو پیکٹ تھا اس طرح کی جو پڑیا تھی یہ فلاں آدمی لایا تھا یاد آ گیا تو پھر ان کی خبر لی جاتی، ان کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے اور بلکہ بڑی قدردانی کے طور پر کہا کہ نہیں یہ تو میری آنکھ کا سرمہ ہے یہ رہنے دو پھر اس کو اٹھایا ہوگا خود ہی اپنے ہاتھ سے اور پھینک دیا ہوگا۔

ایسے صدہا واقعات آپ کو صوفیاء کرام کے یہاں ملیں گے کہ جنھوں نے ظلم کیا ان

کے ساتھ ان کی اولاد کے ساتھ یا ان کے تعلق والوں کے ساتھ ان کے ساتھ انہوں نے بڑے کرم کا معاملہ کیا یہ اس سب کا جو ماخذ ہے، بنیاد ہے یا تو وہ واقعہ ہے کہ وہاں مشکل تھا وہاں اتنی بڑی تکلیف پہنچائی اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی ایک شریف آدمی کو اور پھر وہ جو آپ کا مرتبہ تھا صدیقیت کا، صحبت کا لیکن آپ نے کہا نہیں "أحِبُّ أن يَغفِرَ اللّٰهُ لِي" "أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ" کیا تم کو نہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے، کہا نہیں میں چاہتا ہوں، اللہ ہماری مغفرت کرے اور اب سے میں دینا شروع کرتا ہوں اور دینا شروع کر دیا...... بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قربانی تھی۔

یہ ہمیں تعلیم دی جارہی ہے کہ اگر ہمیں کوئی تکلیف پہنچائے آج، مسلمان اگر اس پر عمل کرتے اور یہ عمل لوگوں کے سامنے آتا تو پتہ نہیں کتنے مسلمان ہوجاتے دیکھ دیکھ کر اگر ہمارا تعلق یہاں کی آبادی کے ساتھ کاروباری رہا یا محلے والی رہا یا ہم شہری اور ہم وطنی کا رہا، ہم ان کے سامنے اخلاق کا نمونہ بن کر نہیں آئے، یہ صرف صوفیاء کرام بزرگانِ دین یا خاص خاص مصلحین امت جو ہیں ان کا ہے ان کا اثر پڑا ہندوؤں پر اور بہت واقعات ہیں ایسے کہ غیر مسلم اسلام لے آئے ان چیزوں کو دیکھ کر اور آج پھر اس کی ضرورت ہے کہ اس کو کوشش کر کے دکھائے کہ مسلمان کا کیا ظرف ہوتا ہے، مسلمانوں کو کیا تعلیم دی گئی ہے، مسلمان کے سامنے کون سا اسوہ ہے اسوۂ رسول اور اسوۂ صحابہ، سیرت صحابہ، یہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے عزت کے ساتھ باقی رہنے اور اسلام کی اشاعت اور اسلام کے قدر روانی کے لیے یہ چیزیں جتنی مفید ہوسکتی ہے کہ نہ لیٹریچر ہوسکتا ہے نہ تقریریں ہوسکتی ہیں، سیاسی کوششیں ہوسکتی ہیں..... ہم سے جتنا بھی ہوسکے ایثار سے کام لیں ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی اور ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا۔ [1]

(۱) درس قرآن سورہ نور۔ آیت۔۲۲۔ غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ تحفۂ دین ودانش: ۲۷-۲۸، سے استفادہ کیا گیا ہے۔

استیذان وآداب ملاقات

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰى أَهْلِهَا. ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ أَزْكٰى لَكُمْ. وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ (النور: ۲۷-۲۸)

"اے ایمان والو تم اپنے (خاص رہنے والے) گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو، جب تک تم (ان سے) اجازت حاصل نہ کرلو اور (اجازت لینے سے قبل) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، پھر اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے (اس وقت) اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو"۔

ایک اہم ضروری تمہید

قبل اس کے کہ آیات کا مفہوم بیان کیا جائے اور اس میں جو فقہی احکام آئے ہیں ان کی تشریح کی جائے یہ اس سے پہلے ہم لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے، (ایک تمہید کے طور پر) کہ

کتنے ہی منزل من اللہ، صادق ومصدوق دین کو اول سے آخر تک غیر محرف اور حددرجے کا موثر انقلاب انگیز، عہد آفریں، اور معصیت سوز، طاعات آفریں اور کیسی ہی مخلص، سرفروش، خودسناش، خداپرست اور عارف باللہ امت ہو، جب تک اس کا جس جگہ جو اس دین کے ظہور کی جگہ ہے یا اس کے انتشار واشاعت کی جگہ ہے اور وہ انسانی جماعت جو اس کی حامی اور علمبردار ہے، ذمہ دار ہے، اس میں اگر اس کا معاشرہ صحیح نہیں وہ اس کی جو معاشرتی زندگی ہے سوشل لائف (Social Life) وہ اگر درست نہیں ہے تو وہ نہ دین اپنا پورا اثر دکھا سکے گا نہ وہ امت اپنے پورے فرائض انجام دے سکے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی معاشرہ کا یعنی خاندانی زندگی، مردوعورت کے رشتے ایک دوسرے کے ساتھ ان کا برتاؤ اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے طریقہ عمل کی حیثیت اور ان کے نفوذ کے اندر نفسانیت جو ایک فطری چیز ہے مقدار کا حد ہے نہ بڑھ جانا فطرت انسانی کا ایک مزاج جو ہے کہ اس کے اندر طبقۂ اناث کی طرف انجذانیت پیدا کیا گیا ہے اگر وہ تناسب کے خلاف ہے تو اس کا اثر پڑے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے جو دنیا کی تاریخ سے، قوموں کی تاریخ سے، تہذیبوں کی تاریخ سے، صرف معاشرتوں کی نہیں، تہذیبوں کی تاریخ سے، سیاسی تاریخوں سے بھی بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ سے بھی یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے جن لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ اگر کسی قوم کا معاشرہ بگڑ جائے اس میں مردوعورتوں کے زندگی کے ساتھ رہنے کے حدود اگر قائم نہ رہیں سرحدیں اگر ٹوٹ جائیں اور ان کے معیار بدل جائیں اور ان میں شرافت عدم شرافت اور تہذیب وعدم تہذیب اور اخلاقیت اور غیر اخلاقیت اس کا مفہوم اگر بگڑ جائے، بدل جائے تو پھر اس ماحول میں کہیں باہر اس کے اثرات کو پہنچانا اس کے فیض کو پہنچانا مشکل ہے اس میں دینی زندگی کا قائم رہنا، خالص دینی زندگی کا قائم رہنا مشکل ہے۔

آپ دیکھئے کہ معاشرے کے کرپٹ ہوجانے ان حدود کے ساقط ہوجانے سے، درہم برہم ہوجانے سے ان حدود کے قائم نہ رہنے سے اور انسان کے اندر جو اللہ تعالی نے فطری خواہشات رکھی ہے ان کے اپنے حدود کے اندر نہ رہنے سے اور اس سے تجاوز کرنے

سے کیا اثر پڑتا ہے پوری قوم پر، پورے ملک پر اور ملک کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے اور پھر اس کی خود اپنی زندگی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے کسی پیغام کی حامل نہیں بن سکتی، نمونہ بن سکتی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مسلمانوں کے لیے "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" اور ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ اور اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے، اس لیے بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ معاشرہ صحیح ہو اب اس معاشرہ کے لیے قرآن مجید جیسی آسمانی کتاب جو قیامت تک پڑھی جانے والی ہے ساری دنیا کا اس میں حصہ ہے اور اس کے معانی اس کے نکات اس کے مضمرات کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے اور جس کا ایک ایک لفظ ضرورت کے مطابق ہے اور وہ ساری انسانیت کا سرمایۂ دولت، ساری انسانیت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے اس میں معاشرتی حقوق کو حدود کو معاشرتی زندگی گذارنے کے نظام کو اور آداب کو اور طریقے کو اتنی تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ معاشرہ کی خرابی اور معاشرے کی اچھائی، بہتری اور خرابی دونوں کا بہت شدید اور بہت عمیق اور بہت وسیع اثر پڑتا ہے۔

اور پھر یہ ساری اسلام کی اساس ہے، تمام مسائل اسی سے نکلے ہیں، فقہی استنباطات اسی سے ہیں اور عبادات بھی اسی سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں اسی مضمون کو جگہ دینی چاہیے، اسی تناسب سے جگہ دینی چاہیے، جو تناسب ضروری ہے اس سے بالکل آگے نہیں اس لیے ہم اتنی تفصیل کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ یہ پورا رکوع اس کے بارے میں ہے کہ مسلمان مرد وعورت کس طرح رہیں ایک دوسرے کے تعلقات کے حدود کیا ہوں اور کس طرح ملنا جلنا ہو کس طرح گذارنا ہو اور کہاں تکلیف ہو کہاں بے تکلفی ہو؟ کہاں پردہ ہو، کہاں پردہ نہ ہو؟ اور کیا آداب ہیں اس کے؟ یہ اس لیے اس کو اہمیت دی گئی جو شخص اس کو نہیں جانتا اس کی دنیا کی اخلاقی تاریخ پر نظر نہیں ہے اور وہ معاشرہ کی اہمیت سے واقف نہیں ہے وہ کہے گا کہ یہ کتاب تو عبادت کے لیے تھی یہ کتاب تو ایک ایک حرف کا کتنا ثواب ہے؟ کتنا ثواب ہے؟ کتنا دس دس نیکیاں اور سو سو نیکیاں تک اور اس کا ہر لفظ وظیفہ ہے ہر

لفظ اس کا وحی الٰہی ہے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس میں ان باتوں کو یوں پردہ کریں اور یوں پردہ کریں یوں گھروں میں جائیں اور اس طرح اجازت لیں اور اگر یہ نہ ہو تو نہ جائیں فلاں جگہ نہ جائیں یہ سب اس لیے ہم نے بتایا کہ دنیا کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے انسانی تجربہ تصدیق کرتا ہے کہ اگر معاشرہ بگڑ گیا تو بالکل ہی بنا نہیں سکتی اور پھر وہ جس کا معاشرہ ہے وہ دنیا میں کوئی مفید تعمیری انقلابی اصلاحی ہدایتی کام نہیں کرسکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ عربوں کی زندگی ایک بدویانہ زندگی تھی اس میں تمدن کا حصہ بہت کم تھا تو ان کو اور بھی زیادہ اس کی ضرورت تھی ان کو نمونہ بننا تھا اور دنیا کے سامنے داعی بن کر جانا تھا تو پہلے ان کو بھی ضرورت تھی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

بغیر اجازت کسی گھر میں داخل نہ ہو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ’’يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتاً غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا‘‘ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب ایمان لا چکے ہو تو اب اس کے بعد عبادت کی باتیں بتانی چاہیے کس طرح نماز پڑھو کس طرح اللہ کو یاد کرو، کس طرح دعا کرو، کس طرح حج کرو، کس طرح روزہ رکھو؟ لیکن وہ اللہ تعالیٰ ہی تو دین کا نازل کرنے والا ہے اسے کوئی مشورہ تھوڑے ہی دے سکتا ہے، وہ تو جس تناسب سے جو چیز جس مقام پر جس جگہ کہ وہی ٹھیک ہے اس لیے کہ شارع حقیقی وہی ہے اور خالق حقیقی وہی ہے انسان پیدا کرنے والا وہی ہے انسان کی طبیعت ’’أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ‘‘ کیسی بدیہی بات کہی ’’أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ‘‘ کیا وہ اپنے پیدا کیے ہوئے کو نہیں جانے گا کسی استاد سے کوئی کہے کہ ہم ہی لوگ ہیں، پڑھاتے ہیں، طالب علم آپ جانتے ہیں ہمیں کون بتائے گا وہ تو روز ہمارے درجے میں آتے ہیں وہ پڑھتے ہیں ہم ان کی استعداد سے خود واقف ہیں ہم ان کے اخلاق سے بھی واقف ہیں کوئی نگراں سے کہے تو اللہ تعالیٰ تو آخری درجے کی چیز کہہ دی ’’أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ‘‘ کیا وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیز نہیں جانے گا ’’وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ‘‘ جب لطیف و خبیر کے ساتھ خلق کی صفت بھی لگ جائے کہ ایک

طرف لطیف وخبیر ہوایک طرف خالق ہوتو پھر کون سی چیز ان سے چھپی رہ سکتی ہے۔

یہ ہم نے اس لیے کہہ دیا کہ اگر غیر مسلموں کے سامنے یہ چیز آئے، یا نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے کے ان باتوں کو کہنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو خود ہی سمجھتا ہے، کامن سینس (Common Scence) سے سمجھتا ہے، پھر ایک عرف ہوتا ہے، ہر جگہ کا ایک اخلاقی معیار ہوتا ہے، تہذیب ہوتی ہے یہ بات نہیں صرف معاشرہ کی بڑی فکر کی ضرورت ہے، اس کے پورے احتساب کی ضرورت ہے اور ہر مرتبہ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کو دینی احکام وآداب کے ماتحت رکھنے کی ضرورت ہے۔

ملاقات واستیذان کا مسنون طریقہ

''اے ایمان والوں ''لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِھَا'' مت داخل ہو گھروں میں اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں، جب تک کہ تم اطمینان نہ کرلو، سلام نہ کرلو، ، آہٹ نہ کرلو کہ گھر میں کوئی ہے اور گھر میں صرف عورتیں ہی ہیں یا مرد بھی ہے اور مرد آنے پر رضامند ہیں خوش ہوں گے، بلا رہے ہیں یا نہیں، یا یہ وقت وہاں جانے کا ہے کہ نہیں، یہ سب باتیں کہی گئیں، اس لیے کہ اب آج کل ہمارا جو طرز زندگی دوسرا ہے گھروں کے دروازے ایسے ہوتے ہیں کہ بہت سخت کوئی چیز گھروں میں نہیں جاتی، لیکن یہ بات اس وقت نہیں تھی، اس وقت بے تکلفی تھی، لوگ آتے جاتے تھے، نیتیں بھی اچھی ہیں اور طبائع بھی سلیم تھیں اتنا فساد نہیں پھیلا تھا جیسا کہ مغربی تہذیب نے اس وقت پھیلا دیا ہے۔

اے ایمان والو مت داخل ہو ان گھروں میں جو تمہارے گھروں کے علاوہ ہیں یہاں تک کہ تم اطمنان حاصل کرلو اور انس حاصل کرلو یہ کہ آہٹ پالو یہ اندازہ کرلو کہ وہ لوگ تمہارے آنے سے تمہارا خیر مقدم کریں گے، کررہے ہیں یا نہیں اور تمہارے آنے سے خوش ہوں گے یا نہیں، تمہارے آنے پر رضامند ہیں یا نہیں۔

اب یہ ''استیناس'' کا ترجمہ نہیں ہوسکتا ''استیناس'' میں سب چیزیں آگئیں، یعنی

اطمینان حاصل کرلو کہ اس وقت جانا مناسب ہے اور یہ لوگ خوش ہوں گے اور یہ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

"وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا" اور فرمایا کہ گھر والوں کو سلام کرلو، باہر سے بھی سلام کیا جاتا ہے "السلام علیکم" انہوں نے سن لیا، بڑی بڑی کوٹھیاں تو ہوتی نہیں تھیں کہ وہ تیسری منزل پر بیٹھے ہوئے ہیں، یا بہت دور وہاں سے کمرہ ہے چھوٹے چھوٹے گھر تھے، مکے اور مدینے کے اور یہ ہر جگہ بھی ہوسکتا ہے، "ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ." یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

"فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَا أَحَداً فَلَا تَدْخُلُوْهَا" اگر تم اس میں کسی کو نہ پاؤ تو مت داخل ہو "حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ" یہاں تک کہ تمہیں اجازت دی جائے۔

دو باتیں، اگر مرد نہیں ہیں، عورتیں ہیں، تمہارا اندر جانا بھی شبہ پیدا کرتا ہے اور بہت خرابیاں اس سے بدگمانیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور بدگمانیاں ہی نہیں اس میں کچھ نامناسب باتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اچھایوں بھی اگر عورتوں کا مسئلہ نہیں ہے آپ جائیں اور چلے آئیں کوئی شخص کوئی چیز ڈھونڈے اور نہ ملے تو کہے گا اچھا او ہو بھئی یہاں کوئی آیا تو نہیں تھا تو کہا کہ ہاں فلاں صاحب آئے تھے انہوں نے کہا کہ بس وہی لے گئے ہوں گے اور اس میں خواہ مخواہ شبہ پیدا کرانا ہے اپنے متعلق اب ایک چیز ایک شخص نے ایک جگہ رکھی اور گھر والوں ہی نے اسے اٹھا کر کہیں رکھ دی لیکن معلوم ہوا کہ یہاں کوئی اور آدمی آیا تھا تو پھر اس کے متعلق شبہ ہوسکتا ہے۔

"وَإِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا" اگر کہہ دیا جائے تم سے اور مہذب طریقے پر بھی کہا جاسکتا ہے اور بعض مرتبہ آدمی اپنے لہجے کے مطابق بھی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت آنے کا موقع نہیں، پھر تشریف لائیے گا کہنے کا انداز یہ ہے یا اور کسی طریقے سے ہاتھ کا اشارہ کردیا یہ سب "یرجع" کے معنی میں ہے، یا آوازیں نہیں آرہی ہیں، جواب ہی کوئی نہیں دے رہا ہے، یہ بھی "ارجعوا" کے معنی میں ہے "فارجعوا" تو واپس چلے جاؤ برا نہ مانو کہ ہم کوئی بری نیت سے تھوڑے آرہے تھے ملنے آرہے تھے، ملنے کے شوق میں آرہے

تھے لیکن اس کے ساتھ اور جو نتائج نکل سکتے ہیں اور جو اس سے اور خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کے مقابلے میں یہ واپس جانا یا اس سے بدرجہا آسان اور معقول چیز ہے ﴿هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ﴾ یہ تمہارے لیے بہتر ہے "ازکی" کا لفظ بھی بہت وسیع معنی رکھتا ہے، تمہاری اخلاقی شہرت، اخلاقی حیثیت اور عرف کے لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ تم جس مقام کے آدمی ہو تمہارے لیے یہی مناسب تھا کہ تنہا گھر میں نہ جاؤ یہ بھی ہے کہ کوئی تہمت لگا بھی نہیں سکتا اور یوں بھی ہے کہ کوئی شکایت بھی نہیں کرسکتا بعد میں، "ازکی لکم" میں یہ بھی ہے، خودداری کے خلاف بھی ہو جاتا ہے کہ صاحب آپ خالی گھر میں کیوں گئے تھے، آدمی کو کتنا برا معلوم ہوگا تو یہ "ازکیٰ لکم" میں یہ سب آجاتا ہے، جتنی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں ایک انسان کی اس کی عرفی حیثیت اور اس کی دینی حیثیت اور اس کی خاندانی حیثیت، نسبی حیثیت اور اس کی مشغولیت جس طرح کا وہ کام کرتا ہے اس حیثیت کا آدمی ہے اس کیٹگری کا آدمیا اس اسٹنڈرڈ کا آدمی ہے اس سب کے لحاظ سے "ھوازکی لکم" اس میں سب آجاتا ہے، کسی آدمی کا کام نہیں کہ اس کو ادا کرے "وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ" اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۃ النور: ۲۷-۲۸ (غیر مطبوعہ)

ستر وحجاب اور عفت و پاکبازی

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ. ذٰلِكَ أَزْكٰى لَكُمْ. إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌم بِمَا يَصْنَعُوْنَ. وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا. وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ. وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أٰبَائِهِنَّ أَوْ أٰبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ. وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النور: ۳۰-۳۱)

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں خدا ان سے خبردار ہے اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی آرائش

(یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس سے کھلا ہے
اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور خسر
اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی (ہی
قسم کی) عورتوں اور لونڈی غلاموں کے سوا نیز ان خدام کے جو عورتوں کی
خواہش نہ رکھیں یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف
نہ ہوں (غرض ان لوگوں کے سوا) کسی پر اپنی زینت (اور سنگار کے
مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیں اور اپنے پاؤں (ایسی طور سے زمین پر) نہ
ماریں (کہ جھنکار کی آواز کانوں میں پہونچے اور) ان کا پوشیدہ زیور معلوم
ہو جائے اور مومنو! سب خدا کے آگے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ"۔

عفت و پاکبازی کا ایک واقعہ

دیکھئے.....! اب کوئی کہے کہ قرآن میں تو عقائد کی باتیں ہونی چاہیے، مابعد الطبیعات اللہ کے صفات اور پھر عبادات اور پھر تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور یہ گھروں میں جانا نہ جانا یہ تو ایسی روز مرہ کی باتیں ہیں، سب جانتے ہیں یہ بات نہیں ہے، برے اس سے نتائج زبردست نکلتے ہیں، اب دیکھئے صرف ایک واقعہ آپ کو بتائیں کہ یہاں سے مناسبت رکھتا ہے اس لیے کہتے ہیں، آکسفورڈ میں بھی سنایا اور یورپ میں بھی کئی بار سنایا، واقعی بہت قابل اعتناء ہے وہ کہ حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب پشاور فتح کیا تو کئی ہفتے گذر گئے ہوں گے، کئی دن گذر گئے ہوں گے مہینہ دو مہینہ گذر گیا، سید صاحب کی جو فوج تھی اس میں زیادہ تر یہ پورب کے لوگ تھے نوجوان تھے، جنگ میں تو نوجوان ہی ہوتے ہیں، جہاد کرنا تھا وہاں حج کرنے نہیں جارہے تھے تو نوجوان تھے، اچھے اور تندرست ہوتے ہیں، جہاد کے لیے جنگ کرنے کے لیے نوجوانی بھی چاہیے، یا وہ عمر جس میں جنگ کی جاسکتی ہے اور کسی درجے کی تندرستی اور طاقت بھی چاہیے تو پورے مردانہ صفات تھے اور سپاہیانہ خصوصیات بھی تھیں، تو کئی ہفتے گذر گئے ایک مرتبہ ایک پٹھان نے افغانی نے، ہندوستانی مسلمان پتہ نہیں کہاں کے ہوں، رائے بریلی کے آس پاس

کے ہوں، رام پور کے ہوں، دہلی کے ہوں، سارا علاقہ تھا جہاں سے لوگ گئے تھے، ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا کہا میاں ایک بات تم سے پوچھتے ہیں اس نے پشتو میں پوچھا ہوگا یا فارسی میں یا جس میں وہ سمجھتے ہوں گے کہ ایک بات پوچھتے ہیں، سچ سچ بتانا، کہا ہاں پوچھئے، کہا تم ہندوستانیوں کی دور کی نظر بہت کمزور ہوتی ہے دیکھ نہیں سکتے ہو کہا نہیں خوب دیکھتے ہیں، کہا نہیں نہیں معلوم ہوتا ہے کہ نسلی طور پر پورے ہندوستان کے لوگوں کی قریب کی نظر تو اچھی ہوگی اور سماعت بھی اچھی ہوتی ہوگی یہ ہم کہہ رہے ہیں، سماعت بھی اچھی ہوتی ہے سب چیزیں لیکن دور کی نہیں دیکھ سکتے، انہوں نے کہا نہیں ہم دیکھ سکتے ہیں (دیکھئے وہ فلاں چیز، یہ ہم سب تفسیر بیان کرر ہے ہیں، ضروری نہیں کہ لفظ بلفظ ویسے ہی واقعہ ہو) اس کے بعد پوچھا، اس ہندوستانی نے کہ یہ آپ پوچھ کیوں رہے ہیں؟ یہ پوچھنے کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ لوگ بعض مہینوں سے نکلے ہوئے ہیں گھر سے اور بعض کئی کئی برس سے نکلے ہوئے ہیں اور پھر آپ جوان ہیں اور تندرست ہیں اور پھر آپ گھر بار کو چھوڑ کر آئے ہیں آپ کی بیویاں آپ کے ساتھ نہیں ہیں جہاد میں جنگ میں جب جاتا ہے آدمی تو کوئی اپنے گھر والوں کو ساتھ لے جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آپ نے شہر فتح کر لیا اب گویا ایک طرح سے آپ مالک بن گئے اور آپ کو اب کوئی ٹوک نہیں سکتا روک نہیں سکتا، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اتنے دن میں ہم نے کسی مجاہد کو آپ کے لشکر جہاں دیں میں سے کسی سپاہی کو کسی نامحرم عورت کو نہ دیکھے، تو ہم نے پھر یہی اس کا حل تلاش کیا سمجھا کہ دیکھ ہی نہیں سکتے جب کوئی چیز امکان میں نہ ہو تو بیکار ہے، بہت سے لوگ دور نہیں دیکھ سکتے ہیں نظر کمزور ہے دور کا چشمہ بھی لگانا پڑتا ہے تو جب نہیں دیکھ سکتے اس لیے نہیں دیکھتے ورنہ وہ ضرور دیکھیں تو کیا بات ہے انہوں نے کہا نہیں ہم سب دیکھتے ہیں ہم بتا سکتے ہیں اور یہ کوئی مجبوری کی بات نہیں۔

پردۂ نسواں حفاظت وعصمت کا ایک اہم باب

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ" سورہ نور کی یہ آیت پڑھی کہ یہ تعلیم ہے اسلام کی کہ نگاہیں نیچی رکھیں

اور یہ ہمارے امام امیر المؤمنین کی تربیت کا نتیجہ ہے۔تو ہم نے کہا کہ یورپ وغیرہ میں کہ یہ چیزیں اگر مسلمانوں میں ہوتیں یہ امتیاز ہوتا تو لوگ مسلمان ہوتے اور کہتے کہ کس طرح کی قوم ہے، یہ کسی نامحرم کو کوئی جوان آدمی نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں۔کوئی برا ارادہ نہیں ہوتا کوئی زبان سے فحش لفظ نہیں نکلتا کوئی بداخلاقی کی بات نہیں کرتا تو اس کا اثر پڑتا اور اثر پڑا جو مسلمان فوجیں گئیں مصر، شام، عراق وغیرہ تو واقعات میں ملتا ہے۔

جب قیصر نے پوچھا کیا بات ہے میں فوجوں کو بھیجتا ہوں اور سب ہار ہار کر آتی ہیں، بڑے آزمودہ کار اور مشاق جنرلوں کو بھیجتا ہوں جنہوں نے ایرانیوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور علاقہ واپس لے لیا ان کو شکست دی، لیکن وہ بھی ہار کر آتے ہیں بتاؤ کیا بات ہے تو انہوں نے کہا جس سے پوچھا تھا وہ رومی تھا۔ کہا اگر جاں بخشی ہو، برا نہ مانیں تو میں صاف صاف کہوں، کہا کہ یہ لوگ رات کو اگر آپ دیکھیں، مسجدوں میں تو آپ کہیں کہ لڑنا وغیرہ کچھ نہیں جانتے، "بالليل رهبان" ....اور اگر دن کو دیکھیں تو آپ کہیں کہ یہ لوگ نماز ہی نہیں پڑھتے "بالنهار فرسان" دن میں جب گھوڑے کی پیٹھ پر دیکھیں تو معلوم ہوا کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے اور رات کو اگر مسجدوں میں دیکھیں تو سمجھیں کہ ان کو لڑنے سے کیا کام دوسرے وہاں اتنے مشغول رہتے ہیں کہ "لو حدثک جلیسک ما سمع" اگر آپ قریب والے سے بات کریں تو اتنی آواز قرآن مجید کی گونج رہی ہوتی ہے کہ اس کو کہتے ہیں کہ جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے کہ "کصوت النحل" کہ آپ کا ساتھی بات نہیں سن سکتا اور یہ کہ کسی ملک یا شہر کو فتح کر لیتے ہیں، یا غالب ہوتے ہیں" کسی دکان کا سودا بے قیمت نہیں لیتے ہیں پیسے دیں گے اور پھر لیں گے یہ نہیں کہ اب یہ فتح ہو گیا سب ہمارا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان کے امیر کا لڑکا بھی اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹیں گے، قیصر نے کہا، قیصر روم کا قصہ ہے اس نے کہا کہ تم نے اگر صحیح کہا تو یہاں تک آ کر رہیں گے، "ليملكن موضع قدمي هاتين" جس جگہ میں بیٹھا ہوں یہاں تک ان کا قبضہ ہوگا اس لیے کہ وہ جانتا تھا اس نے آسمانی صحیفے پڑھے تھے اور بائبل وغیرہ سے خوب واقف تھا کہ جس قوم کے یہ اخلاق ہوں گے اس کو کوئی روک نہیں سکتا، کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، انہوں نے

کہا میں فوج پر فوج بھیجتا ہوں، بڑے آزمودہ کار جنرل بھیجتا ہوں وہ سب شکست کھاتے ہیں، چلے آرہے ہیں اور سنتا ہوں فلاں فوج بھی ہاری ہوئی ہے فلاں فوج بھی ہاری ہوئی ہے تو یہ معاشرہ بہت ضروری ہے، آپ لوگوں کو جب اللہ موقع دے درس قرآن کا یا آپ کو داعی بنائے کسی شہر کا عالم دین اور مقتداء اور قابل احترام شخصیت عطا کرے تو معاشرے کی طرف توجہ کرنی ہے کہ معاشرہ درست کو، معاشرہ خراب نہ ہو جس کو کہتے ہیں کرپٹ، نہ ہونے پائے غلط تعلقات، ناجائز تعلقات، نفسانیت اور اس سے بڑھ کر آگے۔

تو اللہ فرماتا ہے "قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ" اس پر نے ابھی واقعہ سنایا اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں "وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ" اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور خاص طور پر عربوں کا لباس ایسا تھا کہ اس میں لنگی وغیرہ زیادہ تر ہوتی تھیں اور بہت سے ملکوں میں اب بھی جنگل میں بھی اس لیے ہوا کا تیز جھونکا آیا اور چادر اڑ گئی لنگی کا کونہ اڑ گیا۔

"ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ" بیشک اللہ تعالیٰ خبردار ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں اگر وہ یہ سمجھیں کہ کون دیکھتا ہے اس کو تو یہ نہ سمجھے ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾

غیر محرم کی طرف نظر کرنے کی ممانعت

"وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ" ایسے ہی ایمان والی عورتوں سے کہیے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ یہ مردوں ہی کا فرض نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دل دونوں کو دیے ہیں اور دونوں کو بشریت کے صفات سے اور اس کے اثرات سے متصف کیا ہے "وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ" اور وہ بھی اپنے ستر کی حفاظت کریں "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ" اور اپنا سنگار یا اپنی زیبائش، زیبائش کبھی لباس کی شکل میں ہوتی ہے یعنی وہ زینت کی کپڑوں کی شکل میں اور کبھی جسمانی ہوتی ہے جسمانی زیبائش بھی ہوتی ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک عضو میں دلکشی رکھی ہے صفائی رکھی ہے اور حسن بھی دیا ہے اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں۔

"إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا" مگر جس کا ظاہر کرنا ضروری ہے ہاتھ ہے آنکھ ہے جب تک کھلی

نہ ہو دیکھ نہیں سکتا آدمی، چہرے سے نقاب ہٹ جائے ہوا کے اثر سے یا اس کے بغیر راستہ نہیں چل سکتے تو اس کو اللہ نے مستثنیٰ کر دیا۔

"وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ" اور وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے جو دو پٹے ہیں اپنے پہلوؤں پر بھی رکھیں "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ" اور پھر زیبائش کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے لیے، یا باپ کے لیے، یا شوہروں کے باپ کے لیے، خسر وغیرہ جو کہلاتے ہیں "اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ" یا اپنے بیٹوں کے لیے "اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ" یا شوہروں کے بیٹوں کے لیے جو دوسری ازواج سے ہیں یا پہلے سے تھے اور "اِخْوَانِهِنَّ" اور اپنے بھائیوں کے لیے ان کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں "اَوْ بَنِيْ اِخْوَانِهِنَّ" اور بھتیجوں کے سامنے "اَوْ بَنِيْ اَخَوٰتِهِنَّ" بھانجوں کے سامنے "اَوْ نِسَآئِهِنَّ" گھر کی لونڈیوں اور کام کاج کرنے والیوں کے سامنے "اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ" خادمات وغیرہ کے سامنے یا جو بنے جلنے آئیں "اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ" یا باندیوں کے سامنے "اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ" یا اس طرح کے مرد جو اتنے بوڑھے ہو چکے ہوں اور اتنے معذور ہوں یا کچھ فطری طور پر کچھ ایسے ہوں کہ ان کو ادھر توجہ ہی نہیں ہوتی۔ یہ ایک صنف ہوتی ہے پانی بھرنے والے ہیں بعض جھاڑو دینے والے ہیں بھنگی ہیں یہ صرف اپنا کام کرتے ہیں پیسے لیتے ہیں وہ کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے ہیں نہ توجہ ہوتی ہے "اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ" یا پھر ایسے بچے کہ جو عورتوں کی جو ستر ہیں جو چیزیں ان کی چھپانے کی ہوں ان کا ان کو کوئی علم نہیں ہوتا ہو چھ برس کا بچہ ہے سال بھر کا جانتا ہی نہیں کچھ۔

"وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ" اور اپنے پاؤں زور سے زمین پر نہ رکھیں اور ایسی چال نہ چلیں کہ معلوم ہو جائے کہ ہاں زینت ان کے پاؤں میں ہے جھنکار ہے زیوروں کی آواز ہے یا پازیب وغیرہ کی آواز آئے۔

"وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" اور اللہ کی طرف رجوع کرو تم سب کے سب اے ایمان والو تا کہ تم کامیاب ہو۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۃ النور: ۳۰-۳۱ (غیر مطبوعہ)

طلباء مدارس کا بہترین تعارف

﴿یٰا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ، وَآتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا. وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ☆ وَکَانَ تَقِیًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّاراً عَصِیًّا﴾ (مریم: ۱۲-۱۴)

''اے یحییٰ اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑو اور ہم نے بچپن ہی میں ان کو حکمت عطا فرمائی، اور شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی اور وہ متقی تھے اور اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار اور وہ نافرمان اور جبر کرنے والے نہیں تھے''۔

کتاب کو مضبوط پکڑنے کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''یَا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ '' اے خدا کے پیغمبر یحییٰ ''کتاب'' کو یعنی کتاب آسمانی کو مضبوط پکڑو، طاقت کے ساتھ تھامو، طاقت کے ساتھ ہاتھ میں لو!

اس میں ایک بات معلوم ہوئی (خاص طور پر طالب علموں کے لیے) کہ ''خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ'' ''کتاب'' کو قوت سے پکڑنے کی ضرورت ہے، مطلب یہ ہے کہ کتاب کو اچھی طرح سے سمجھا جائے، رکھا جائے، پڑھا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور بغیر قوت کے کسی چیز کو لیے ہوئے وہ کام ہوتا نہیں۔ ''خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ'' یہ ''الکتب'' جو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آسمانی کتاب اس کو ''قوت'' سے پکڑو۔ سارے جامعہ کا

ماحصل اس میں آگیا کہ "کتاب" کو "مضبوط" پکڑتا ہے۔آج دنیا میں کیا ہے؟ یا "الکتاب" نہیں ہے،یا"القوۃ" نہیں ہے،یاتو پکڑنے والا ہاتھ ہے یا پکڑنے والی چیز نہیں ہے کہ کس کو پکڑے؟ان صحیفوں کو پکڑے؟ ان کتابوں کو، ان پشتاروں اوران کاغذات کے اوراق کو پکڑے جو ہوا میں پریشان ہیں اوراڑرہے ہیں؟اب "الکتاب" کو پکڑو جواللہ کی آسمانی کتاب ہےاورجس سے انسانوں کو ہدایت ملی اور قیامت تک اسی سے ہدایت ملے گی۔

"وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَا لَهُ مِن نُّوْر" (سورۃ النور: ۴۰)جس کے لیے اللہ ہی روشنی پیدا نہ کرے اس کے لیے پھر کہیں روشنی نہیں ہے،اللہ کی نازل کی ہوئی الکتاب خواہ وہ زمانہ سابق میں توریت اورانجیل کی شکل میں ہو یا اورآسمانی صحیفوں کی شکل میں ہو جن کا ہم کو صحیح طور پر سب کا نام معلوم نہیں اور یا وہ اللہ کی آخری کتاب قرآن شریف ہو،اس کو مضبوط پکڑنا ہے، وہی ہے جس سے ساری دنیا میں صحیح علم پھیلا،لوگوں کو خالق کائنات کی بھی،اس دنیا کے پیدا کرنے والے کے بھی اوراپنی بھی صحیح شناخت ہوئی اوران کو صحیح معرفت حاصل ہوئی،اپنی حقیقت بھی پہچاننا بہت ضروری ہے،اگرآدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا،اپنی زندگی کا صحیح مقصد نہیں جانتا اوراپنے اورخدا کے تعلق کو نہیں جانتا تو وہ کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

"خذ الکتاب بقوۃ" کا صحیح مفہوم

وہ فرماتا ہے"يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ" کہ اے یحیٰ!اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑواوراس طرح پکڑو کہ ہاتھ سے گرنے نہ پائے اورکوئی تم سے چھیننے نہ پائے اوراس طرح پکڑو کہ اس کو پڑھ کر ایک مرتبہ سمجھ کر پھر بھولنے نہ پاؤ۔جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى" (سورۃ الاعلیٰ: ۶)ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ پھر تم کہیں بھولنے نہ پاؤگے۔

کتنے پڑھنے والے جو پڑھ پڑھ کر بھول جاتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ جو کچھ

انہوں نے پڑھا تھا اس کے خلاف ہی کرتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ پڑھا انہوں نے کچھ اور پڑھاتے ہیں کچھ، لیکن جو کچھ پڑھا اس کو یاد رکھے، جو کچھ پڑھا اس پر عمل کرے، جو کچھ پڑھا وہی دوسروں کو دے، جو کچھ صحیح زبان اور صحیح جگہ سے حاصل کیا تھا وہی صحیح طریقہ سے دوسروں تک پہنچائے، یہ سب ''قوت'' کے مفہوم میں شامل ہے۔

''یَا یَحْییٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ'' اے یحییٰ کتاب کو مضبوط تھامو، مضبوط پکڑو، اس طرح کہ پھر تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے جیسے قوموں سے چھوٹ گئی، ملتوں سے چھوٹ گئی، افراد سے چھوٹ گئی، قوموں سے ایسی چھوٹی کہ آج ان قوموں کو ان کتابوں کے نام بھی یاد نہیں اور نہیں بتا سکتے کہ کون سی کتاب ان کو دی گئی تھی، افراد سے اس طرح سے چھوٹی کہ انہوں نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا اس میں کیا لکھا ہے اور اس کو طاق پر سجا کر رکھ دیا، ہم مسلمان بھی اس کے گنہ گار ہیں کہ قرآن مجید ہم دیا گیا تھا عمل کرنے کے لیے لیکن ہم نے اس کو جز دانوں میں سجا کر، اس کو عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنا کر اور طاق پر جو طاق نسیاں ہے، اونچے طاق پر اس کو رکھ دیا (کہ بڑی متبرک کتاب ہے) اور اس کے اوپر گرد جمتی رہی اور ہم نے اس کو کبھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کیا لکھا ہے، ہم نے زندگی میں اس کو منتقل نہیں کیا، ہم نے اپنی زندگی میں اس کا مظاہرہ اور Demonstration نہیں کیا اور ہم نے اپنی زندگی میں اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔

ستارۂ اقبال مندی

''وَآتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا'' '' اور ہم نے بچپن ہی میں ان کو حکمت عطا فرمائی'' ہم نے ان کو حکمت اور قوت فیصلہ عطا فرمائی بچپن ہی میں) جو عام طور پر اس سن میں، اس عمر میں نہیں ملا کرتی، لیکن وہ نبی ہونے والے تھے اور نبی کے بیٹے تھے اور خاندانی ان کی پشتوں میں کتنے نبی ہو چکے تھے۔

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

شاعر کہتا ہے کہ ان کی پیشانی پر ہوشمندی کی وجہ سے بلندی اور اقبال مندی کا ستارہ چمک رہا ہے۔

پاک دل و پاکباز

"وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً" اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ اور حکمت عطا فرمائی اور ایک اشتیاق، ایک شوق کی کیفیت اپنی طرف سے ان کو عطا فرمائی، یہ دعاء اور عبادت کی روح ہے "وزکوۃ" "اور ستھرائی)" یعنی ان کے اخلاق اسی وقت سے مختلف تھے، بچوں کی طرح سے کھیل، تماشہ، یا چلانا، یا زبان سے نامناسب الفاظ نکال دینا، یا مانگنا، یا لالچ، یہ کچھ نہیں، بلکہ بچپن ہی سے ان کے انداز دوسرے تھے۔

فرمایا "وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً" ہاں اپنی طرف سے ہم نے ان کو محبت و شفقت دی، ترس کھانا سکھایا، پاکی اور ستھرائی دی، ان کے اخلاق پاکیزہ، ان کا جسم پاک، ان کے کپڑے پاک، ان کے ارادے پاک، ان کی نیتیں پاک، ان کے کام پاک، یہ لفظ "زکوۃ" سب کو شامل ہے ﴿وَزَكٰوةً﴾ وہ سراپا پاکی تھا، وہ مجسم پاکی تھا۔

"وَكَانَ تَقِيًّا" "اور وہ متقی تھے" یعنی وہ اپنی عمر اور اپنے ماحول، اپنے سن اور ان سب کے لحاظ سے جو "تقویٰ" ہوسکتا ہے، وہ ان کے اندر تھا، ایک بچوں کے اندر تقویٰ ہوتا ہے، ایک بڑوں کا تقویٰ ہوتا ہے ایک انبیاء کا تقویٰ ہوتا ہے، ایک اولیاء کا تقویٰ ہوتا ہے، اسی میں بچوں کا بھی ایک تقویٰ ہے یعنی اس میں احتیاط اور خاموشی اور قناعت "وَكَانَ تَقِيًّا" وہ چالاک نہیں تھے، وہ مال حاصل کرنے اور دولت بڑھانے کے نئے نئے اور ہوشیاری کے طریقے نہیں جانتے تھے بلکہ "وَكَانَ تَقِيًّا" ان کے اندر احتیاط تھی، ان کے اندر ہر ایک کا خیال تھا، کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے اور کسی کا حق نہ مارا جائے۔

"وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ" اور اپنے ماں باپ کے بڑے فرماں بردار اور بڑے سپوت ان کے بڑے خدمت گزار اور اطاعت شعار۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کو اشتیاق دیا اور ستھرائی دی اور اس کے بعد جب بڑے ہوئے تو تقویٰ بھی عطاء فرمایا اور اب اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار "وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا" "اور وہ نافرمان اور جبر کرنے والے نہیں تھے"۔

یعنی یہ "جباریت" جو ہے یہ بھی مختلف زمانوں اور مختلف امکانات اور طاقتوں،

صلاحیتوں اور معیار واقدار کے مطابق جبریت ہوتی ہے، ہر زمانہ کی ایک جبریت اور ہر ماحول کی ایک جبریت اور ہر فرد کے مطابق یہ جبریت ہوتی ہے تو ''وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً'' اللہ تعالیٰ نے نکرہ بول کر کے بالکل سب کی نفی کی، کسی طرح کے جبار، کسی طرح کے وہ جابر نہیں تھے، نافرمان، سرکش، ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور اور بہت سختی کرنے والے نہیں تھے''۔

قرآن کی عملی تفسیر کی ضرورت ہے

اگر آج ہم مسلمان اپنی زندگیوں میں اس کا نمونہ دکھاتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! آج خود ہمارے ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! کیسی محبت ہوتی، کیسی دیانتداری ہوتی، کیسا فرض کا احساس ہوتا، کیسے ملک کی خدمت کا جذبہ ہوتا، کیسے خدا کی معرفت گھر گھر عام ہوتی، سب اس دنیا کے اور اس ملک کے رہنے والے اپنے معبود کو پہچانتے انسان کا مرتبہ پہچانا جاتا، اگر اس کتاب پر اپنی زندگیوں میں عمل کر کے ہم مسلمان دکھاتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ انسان کا کیا مرتبہ ہے، انسان کیسی قیمتی چیز ہے، انسان خدا کا کیسا پیارا ہے، ''وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً'' ''اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں حکمت دی'' اب اگر خدا کسی کو حکمت دیتا ہے اور اس کا سینہ کھولتا ہے، اس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے، تو سبحان اللہ لیکن ہر ایک کی ایسی قسمت کہاں، اس لیے ایسے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، یہاں سے ابتدائی مدرسوں کی بنیاد پڑی، ''وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيّاً''۔

اہل مدارس کا باطن کس طرح ہونا چاہیے

اور پھر اس کے بعد پڑھ لکھ کر بے درد بننا نہیں ہے، ظالم بننا نہیں ہے، انسان کا شکاری بننا نہیں ہے، کام چور، غلہ چور اور دولت چور بننا نہیں ہے، بلکہ پڑھ لکھ کر اور محبت بڑھنی چاہیے، پڑھ لکھ کر دل سے انسانوں کی محبت کے چشمے ابلنے لگیں اور دل کو موم کی طرح پگھلنا چاہیے، دل کو پتھر نہیں ہونا چاہیے بلکہ موم ہونا چاہیے، فولاد نہیں ہونا چاہیے، فولاد ہونے کا موقعہ وہ ہے کہ جب کوئی بہت اہم مقصد ہو ورنہ دل کو تو ریشم بننا چاہیے، دل کو تو بہتے ہوئے

پانی کی طرح ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا" "ہم نے اپنی طرف سے اس کے دل میں محبت کا چشمہ بہایا، محبت کا چشمہ ابلنے لگا، ہر ایک پر ترس کھانا، ہر ایک کے لیے آنسو بہانا ہر ایک کا غم اپنا غم بنالینا، ہر ایک کے لیے تڑپنا، ہر ایک کے لیے پگھلنا اور سلگنا، ہر ایک کے کئے جلنا اور ہر ایک کے غم میں گھلنا، یہ ہر پڑھے لکھے انسان کا شعار اور MOTO ہونا چاہیے کہ وہ جب کسی انسان کی مصیبت دیکھے تو اس کا دل پگھل جائے، اس کی آنکھ سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگے اور وہ تڑپ کر مر جائے، اس کو کھانے میں مزہ نہ آئے، پینے میں مزہ نہ آئے، جیسے حضور ﷺ تھے کہ جب قیدی آئے جنہوں نے آپ کے اوپر تیر چلائے تھے، جنہوں نے آپ پر پتھر برسائے تھے، جنہوں نے آپ کو گالیاں دی تھیں، جنہوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، جنہوں نے آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا تھا جو کوئی کسی خونخوار جانور کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا، جب وہ قید ہوکر آئے تو رات بھر آپ کو نیند نہ آئی کہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، کسی کی کراہ سن لی تو آپ ﷺ بے قرار ہو جاتے تھے اور اگر نماز میں (کہ جس سے بڑھ کر کوئی آپ کے لیے محبوب مشغلہ نہیں تھا، فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے (۱) لیکن) کسی بچہ کا رونا سن لیتے تھے تو جلدی نماز ختم کرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی (۲) وہ نبی رحمت جس کی رحمت ومحبت کا یہ حال تھا اس کے نائبین جو علماء، فضلاء، جامعہ سے نکلنے والے اور مدارس سے فارغ ہونے والے ہیں ان کا دل کیسے سخت ہوسکتا ہے؟ "وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً"۔

مدارس و جامعات کے لیے بہترین چارٹ

یہ جامعہ کے فارغ کا اور اس کے مقاصد کا بہترین سراپا ہے، بہترین حلیہ ہے اور بہترین نقشہ ہے بہترین تعارف اور بہترین چارٹ ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی جامعہ کا صحیح الفاظ میں تعارف اور اس کا مکمل تخیل اور وہاں کے فضلاء وہاں کے اساتذہ، وہاں کے طلباء کے اخلاق کا خلاصہ قرآن مجید جیسی کتاب میں (جو لافانی کتاب ہے، جو

(۱) نسائی: کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۹۳۹ (۲) مسند احمد، ج:۳، ص:۱۹۹-۲۸۵

انسانیت کا صحیفہ ہے۔ جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے اور جس سے ساری دنیا کو پیغام اور رہنمائی ملی ہے)۔

کیا کسی ایسے جامعہ کا تخیل بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے؟ چند لفظوں میں بتادیا گیا ہو کہ جامعہ کس لیے ہوتا ہے؟ اور اس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو کیسا بننا چاہیے؟ ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں۔ تو میں یہ آیت دوں گا۔

"يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ، وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا. وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً. وَكَانَ تَقِيًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا" کہ اس آیت کو بہت سنہرے حروف سے خوشخط لکھ کر اور اس کا ترجمہ کروا کر اس جامعہ کی دیوار پر آویزاں کردو۔

کسی جامعہ کے فارغ اور جامعہ میں داخل ہونے والے کے لیے اس سے بہتر کوئی پیغام اور اس سے بہتر اس کے لیے کوئی خلعت نہیں ہوسکتا جو اس کو پہنایا جائے، اس سے بہتر کوئی تعارف نہیں ہوسکتا جن لفظوں میں خدا کے اس پیغمبر (حضرت یحیٰی علیہ السلام) کا ذکر کیا گیا ہے۔[1]

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از ☆ درس قرآن سورۂ مریم: ۱۲-۱۳ (غیر مطبوعہ) ☆ ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام: ۶۵-۷۰

باب سوم

مواعظ وحکم

..........قرآن حکیم..........

کتاب ہدایت ہے، قیامت تک اس سے ہدایت کے چشمے پھوٹتے رہیں گے، اہل علم ومعرفت علوم قرآن کے ناپید کنار سمندر ہیں، غواصی کر کے آبدار موتی نکالتے رہیں، نہ قرآن حکیم کے علوم ومعارف کا سمندر پایاب ہوگا نہ قرآنی احکام وتعلیمات پر کہیں کی وفرسودگی کا اثر آئے گا، زمانہ گذرنے کے ساتھ قرآن سے استفادہ کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے امت مسلمہ کا رشتہ جس قدر استوار اور مضبوط ہوگا اسی قدر یہ امت فلاح وکامرانی کی راہ پر گامزن ہوگی، عزت واقبال مندی اس کے قدم چومے گی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مقدمہ کتاب: ایمان والوں سے اللہ کا خطاب (الف)

کوہِ صفا پر پہلا اعلانِ حق

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (الحج: ۴۹)

اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو "إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ" میں تمہارے لیے کیا ہوں؟ ایک کھلا ہوا ڈرانے والا، "انما" کے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ میری اصل حیثیت جو ہے، جو مجھے ممتاز کرتی ہے دوسرے انسانوں سے (بہت سی چیزیں مشترک ہوتی ہیں، پیغمبروں میں اور انسانوں میں مثلاً شرافت، شرافتِ نسبی، شرافتِ اخلاقی، حسن صورت، حسن سیرت اور اخلاق اور چیزیں تو "إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ" "انما" اس لیے آتا ہے کہ میری جو اصل حیثیت ہے جو میری امتیازی صورت ہے وہ یہ ہے کہ میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

اور یہ "مبین" کا لفظ بھی یہاں محض ایک لفظ کے طور پر نہیں آیا ہے ڈرانے والے بہت ہوتے ہیں، شاعر بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے، پیشین گوئی کرنے والا بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے اور قیافہ شناس بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے اور جو واقعات سے واقف ہو جاتا ہے، جنگ ہونے والی ہے، فلاں قبیلہ ناراض ہے، فلاں شخص سازش کر رہا ہے، فلاں ملک حملہ کرنے والا ہے، سب ڈرانے والے ہوتے ہیں، لیکن "نَذِيرٌ مُّبِينٌ" جو ہے وہ پیغمبر ہوتا ہے کہ وہ ایک تو اس خطرے کا انتخاب کرتا ہے جو سب سے بڑا خطرہ ہے، حقیقت میں نذیر اسی کو کہنا چاہیے اور "نَذِيرٌ مُّبِينٌ" اس کے ڈرانے میں کسی قسم کا اشتباہ،

التباس اور اشتراک، غلط فہمی وغیرہ نہیں ہوتی، کھل کر کہتا ہے، جیسے کہ آپ نے کوہ صفا کی چوٹی پر تشریف لے جا کر کہا کہ لوگو، اگر میں تم سے یہ کہوں" یہ واقعہ بھی نبوت کی تاریخ میں الحمد للہ دوسری زبانوں میں مطالعہ کیا ہم نے اس سے بہتر نبوت کو سمجھانے کے لیے اس وقت کوئی واقعہ نہیں ملا" آپ اس کو ذہن میں لائیے چونکہ "نَذِيرٌ مُبِينٌ" اس لیے اس مناسبت سے اس واقعے کو ہم بیان کرتے ہیں یہ سیرت کا واقعہ۔

ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں واقعہ

جب آپ کو حکم ہوا اللہ کی طرف سے کہ ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ڈرایئے اپنے قریب کے عزیزوں کو (سب قریب ہی کے تھے، مکہ معظمہ میں جتنے قبائل تھے ان کی آپس میں قرابتیں تھیں، سب قریشی تھے اور پھر ان قریشیوں میں بنی ہاشم آپ اور زیادہ قریب کے تھے، بنی امیہ، بنی ہاشم ان دونوں میں بھائیوں کا فرق تھا) تو آپ خیال کیجیے اپنے ذہن میں نقشہ لائیے کہ مکہ معظمہ بہر حال ایک شہر تھا (یہ ہم سیرت میں جو پڑھتے ہیں تو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی جو جغرافیائی، عرفی، اور اقتصادی اور شہری حیثیت تھی اس پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ الحمد للہ ہمارے انور الجندی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے جو سیرت پر لکھا ہے کہ اس میں شاید پہلی مرتبہ مکہ معظمہ کے متعلق بتایا گیا ہے) کہ وہ قرآن مجید میں تو اس کو قریہ کہا گیا ہے، لیکن وہ عربی کا محاورہ "قرية" کا یہ نہیں ہے کہ گاؤں جیسے ہوتے ہیں اور پھر "ام القریٰ" اس کو کہا گیا ہے تو وہ تمدنی حیثیت سے لسانی حیثیت سے اور ذہنی حیثیت سے اور تاریخی حیثیت سے پورے جزیرۃ العرب میں ممتاز شہر تھا، یہ سیرت کے مطالعہ کرنے والے اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں بعثت ہوئی، ایک شہر تھا ایک گاؤں سا تھا، یہ بات نہیں ہے بلکہ جو لوگ عربی شاعری کا مطالعہ کریں اور محاورات کا مطالعہ کریں اور ٹکسالی زبان کا مطالعہ کریں اور پھر "اعراف" جسے کہتے ہیں یعنی رسوم وعادات، جو چیزیں مان لی جاتی ہیں کہ نہیں یہ تہذیب ہے یہ بد تہذیبی ہے یہ شرافت ہے یہ عدم شرافت ہے تو یہ جو اعراف، آئیڈیل اور Values جسے کہتے ہیں انگریزی میں اقدار و

معیار، ان کا جو مطالعہ کرے، تاریخ عرب ادبی طور پر لسانی طور پر اور جغرافیائی طریقہ پر تمدنی طریقے پر مطالعہ کرے گا اور ویسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، زیادہ تر سمجھتے ہیں کہ عربی سمجھ میں آجائے اور قرآن وحدیث کے معانی سمجھ لیں تو جنہوں نے عرب کا مطالعہ کیا ہے اس کی شاعری کے ذریعہ سے بھی اور اس کے محاورات کے ذریعہ سے بھی اور اس کے اعراف کے ذریعہ سے بھی اور عادات کے ذریعہ سے بھی اور نظریات کے ذریعہ بھی کہ کس نظر سے کس شہر کو دیکھتے تھے اس کو معلوم ہوگا کہ مکہ معظمہ سب سے بڑا مرکزی شہر تھا اس کی بات معیار سمجھی جاتی تھی یہ بات کہاں ہوتی ہے مکہ میں ہوتی ہے لوگ ایک دم سے اس کو تسلیم کر لیتے۔ (۱)

نبوت کی حکیمانہ اور زندۂ جاوید تمثیل

تو اب ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'' یہ آیت نازل ہوئی سب سے رشتہ ہی تھا پریس نہیں ہے کہ ریڈیو نہیں ہے اور یہ بھی طریقہ نہیں ہے ایک شخص گھومتا پھرے شہر میں کہے کہ آج جلسہ ہونے والا ہے، آج جلسہ ہونے والا ہے، فلاں پارک میں جلسہ ہونے والا ہے، فلاں جگہ جلسہ ہونے والا ہے، یہ بھی دستور نہیں تھا تو اب یہ آپ ﷺ کی سلامت فکر اور وہاں کے اعراف سے عادات سے واقفیت کی بات تھی اور یہ نبوت کے معارض نہیں ہے بلکہ نبوت کے محاسن میں سے ہے اس کو اپنی دعوت میں اس سے مدد ملتی ہے کہ وہ زمانہ پورے عرب میں ایک عرف تھا جیسے ایک طے شدہ چیز ہوتی ہے ایک کنونشن ہوتا ہے سمجھوتا

(۱) جیسے مثال کے طور پر (اللہ معاف کرے گا) سمجھانے کے لیے کہتے ہیں، دہلی، لکھنؤ، زبان کے اعتبار سے تہذیب کے اعتبار سے اور کچھ ہو نہ ہو تہذیب کے اعتبار سے یہ کہاں ہوتا ہے وہ کہتا ہے لکھنؤ میں ہوتا ہے، لکھنؤ کی تہذیب مسلم تھی ایسے ہی دہلی کی تہذیب تھی میر تقی میر کا شعر ہے۔

دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

تو وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا جو زمانہ ہے ۱۸۵۷ء کے بعد کا بھی زمانہ بہت سا لیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کا نام لے لینا یہ کافی ہوتا تھا کہ یہ شرفاء کا طریقہ ہے یہ وضعداری کی بات ہے یہ تہذیب کی بات ہے تو اس حیثیت سے ہم نے دیکھا نہیں بعض کتابیں ہیں ان میں آلوسی کی کتاب بڑی اچھی ہے ''العرب قبل الاسلام'' ہمارے پاس تھی ہم نے فائدہ اٹھایا اس سے تو عام طور پر بس لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر تھا مکہ میں بھیج دیا۔

جیسے ہوتا ہے کہ اگر کسی خطرہ کا اعلان کرنا ہے، دشمن چھپا ہوا ہے حملہ کرنے والا ہے تو پہاڑ پر چڑھ کر "واصباحاہ" یہ نعرہ لگایا جاتا تھا "واصباحاہ" بس سارا شہر دوڑ پڑتا تا (عربوں میں جھوٹ بولنے کا رواج نہیں تھا اصل عربی جو فطرت ہے اور عربی نسبی اور قبائلی خون اور متوارث چیز جو ہے وہ جھوٹ بولتا نہیں ہے اگر کبھی جھوٹ بولا تو کسی باہر کے اثر سے یا کسی غلط تربیت کی وجہ سے، اور ان کی شاعری میں بھی آپ دیکھئے اور ان کی گفتگو میں بھی آپ دیکھئے اور پھر سیرت میں بھی جب ان کے واقعات آتے ہیں اور سب کچھ ملتا ہے لیکن وہ جھوٹ بولنا نہیں ملتا ہے بہت کم ہے تو شیطان کا اثر ہے تو جہاں "واصباحاہ" کا نعرہ لگایا جاتا، وہاں سب لوگ دوڑ پڑتے تھے) مطلب یہ ہے کہ دشمن چھپا ہوا ہو سکتا ہے میدان میں کہنے سے اگر دشمن ہوتا تو ہم بھی دیکھتے جس طرح آپ دیکھ رہے ہیں ہم بھی دیکھ رہے ہیں تو آپ کوہ صفا کی چوٹی پر تشریف لے گئے [1] اور آپ نے **"واصباحاہ" "یاصباحاہ"** کا نعرہ لگایا، رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا اور جس حکیمانہ انداز سے اس مسئلہ کو حل کیا وہ آپ کے لافانی معجزات میں سے ایک ہے،

اب دو باتیں تھیں ایک تو جو عرف چلا آ رہا تھا جو متوارث اور متفق علیہ بات تھی کہ آپ الصادق ہیں اور الامین ہیں اچھا الصادق الامین میں ایک خاص رشتہ ہے الصادق ہونا خالی کافی نہیں ہوتا، الامین جب ہوگا تو اس کے اندر ور ضرور بھی ہوگا الصادق وہ ہے جو واقعہ کو بیان کردے صرف، لیکن الامین وہ ہے جو اپنے اوپر حق بھی سمجھے، یہ بہت نازک چیز ہے اور آپ کو دونوں خطاب دینا یہ آپ کی خصوصیت ہے تو الصادق تو دنیا میں بہت ہوتے ہیں، امین بھی ہوتے ہیں لیکن الصادق نہیں ہوتے ہیں، تو اب یہ بھی عربوں کی ذہانت اور قیافہ شناسی اور اخلاقی جرات تھی کہ انہوں نے دونوں لفظ کا انتخاب کیا، الصادق الامین، چنانچہ جب وہ حجر اسود رکھنے کا معاملہ تھا اس وقت بھی کہا الصادق الامین آ گئے، تو الصادق الامین کا لقب

(۱) اب کوہ صفا ویسا نہیں رہا ہم نے تھوڑا سا دیکھا ہے کوہ صفا کی چوٹی تھی اونچا تھا، ہم مطالعہ کرنے جاتے تھے، حاجی عبدالوہاب صاحب مرحوم کا مکان تھا اور کتب خانہ تھا تو ہمارا روزانہ کا معمول تھا کہ ہم صبح چلے جاتے تھے اور ظہر کی نماز کے وقت آتے تھے" ماذا خسر العالم" جب لکھ رہے تھے اس کے عربی مصادر کے لیے تو اس وقت کوہ صفا کی چوٹی اچھی خاصی اونچی تھی۔

خود عربوں نے دیا تھا اب اس میں کیا شبہ ہو سکتا تھا تو ایک تو عرف اور دوسرے اس کے ساتھ پھر ذات کی شمولیت..... اور آپ کی آواز بھی ان کے لیے اجنبی یا ناموس نہیں تھی اس مانوس آواز سے ان کے کان آشنا تھے اور اس آواز کو سننے والوں کا بے مثال اعتماد بھی آپ کو حاصل تھا، یہ کسی عام آدمی کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی معمولی آواز نہیں تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔

جن کو لوگ نبوت سے پہلے ہی صادق اور امین کا لقب دے چکے تھے جب اہل مکہ نے اس صادق اور امین کو یہ آواز دیتے ہوئے سنا اور اس پکار کے بارے میں اور نہ کسی بات کے صرف اعلان یا کسی بات پر آمادہ کرنے یا اس سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ حرکت کی جا سکتی ہے انہوں نے یہی سمجھا کہ کوئی بہت بڑا خطرہ درپیش ہے اور سب کے سب سنتے ہی آپ کی طرف دوڑ پڑے اور وادی مکہ کے بسنے والے پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئے، حیرت و استعجاب سے ان کے سر اٹھے ہوئے تھے اور سب کی نگاہیں قریشی ہاشمی نوجوان محمد بن عبداللہ ﷺ پر مرکوز تھیں لوگ منتظر تھے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی کعب ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہیں اطلاع دوں کہ اسی پہاڑ کے اوٹ میں سواروں کا ایک دستہ چھپا ہوا ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو کیا تم سچ مانو گے؟

عربوں کا ذوق سلیم

رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کو مخاطب کیا تھا اور جن سے یہ سوال کیا تھا وہ ''ناخواندہ'' اور ''غیر ترقی یافتہ'' تھے انہوں نے فلسفہ و منطق نہیں پڑھا تھا نہ بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے بلکہ حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے ان کو اللہ نے سلامت فہم اور عقل عام کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا انہوں نے موقع و محل کا جائزہ لیا اور جس مقام پر یہ خطیب کھڑا تھا اس کی طبعی ساخت کو دیکھا۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص، جس کی سچائی، امانت، اخلاص اور خیر خواہی کا بارہا

تجربہ کر چکے تھے ایک پہاڑ پر کھڑا ہے وہ سامنے بھی دیکھ رہا ہے جس میں اس کے مخاطبین بھی اس کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی وہ پہاڑ کے عقب کی جانب دوسری طرف بھی دیکھ رہا ہے جہاں سامنے پہاڑ کے دامن کھڑے ہونے والوں کی نظر نہیں پہنچتی، لوگ بغیر شک اور ادنیٰ تامل کے سمجھ گئے کہ جو شخص اس پوزیشن میں ہے اس کو حق حاصل ہے کہ پہاڑ کے دوسری طرف چھپے ہوئے دشمن یا خطرے کی خبر دے اور جن لوگوں کے سامنے پہاڑ حائل ہے ان کو یہ حق نہیں کہ اسے جھٹلا دیں اور اس کی خبر صرف اس بنیاد پر رد کر دیں کہ اس مشاہدہ میں وہ لوگ خطیب کے ساتھ شامل نہیں ہیں، کیونکہ بیچ میں حائل ہونے والے پہاڑ نے ان کی حالت اور خطیب کی حالت میں فرق کر دیا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے خطیب کو دوسری طرف دیکھنے اور گواہی دینے کا موقع دیا ہے جو ان لوگوں کو حاصل نہیں، عرب منصف تھے بہادر اور سچے تھے انہوں نے کہہ دیا" ہاں ہم ایسی اطلاع کی تردید نہیں کر سکتے ہمیں اس کو باور کرنا ہوگا۔

دعوت و تربیت کا حکیمانہ انداز

جب یہ فطری، عقلی اور ضروری ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا اور سننے والوں کے اعتماد و یقین کا علم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے پورے عزم و یقین کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور دوسرے اور آخری مرحلہ میں داخل ہوئے اور ارشاد فرمایا "فَاِنِّی نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" تو یہ سمجھو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں جو بالکل تمہارے ہاتھوں کے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصب نبوت کی صحیح تعریف اور نشان وہی تھی اور غیبی حقائق اور وہبی علوم میں نبوت کو جو خصوصیت و انفرادیت حاصل ہے اس کی بڑی حکمت و بلاغت کے ساتھ ترجمانی جس کی نظیر ہم کو مذاہب اور نبوت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مختصر و آسان راستہ اور اس سے زیادہ قابل فہم اور واضح پیرایہ بیان کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی لیکن ابولہب نے کہا جس کی وجہ سے وہ معتوب

ہوا"تباً لک سائر الیوم الھذا جمعتنا" سارے دن تمہارے لیے خرابی ہو کیا صرف یہی کہنے کے لیے تم نے ہمیں بلایا تھا اور ابولہب کا ذہن منکرانہ تھا فطری طور پر بھی۔

یہ جو فرمایا﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ یہ ایک مثال ہے کوہ صفا کی تنبیہ کی اور لوگوں کو آگاہی دینے کی کہ اس کی فکر کرو اپنا عقیدہ درست کرو اپنی زندگی درست کرو یہ دشمن تمہیں بالکل برباد کردے گا تم کہیں کے بھی نہیں رہو گے یہ دشمن تو شہر میں ٹھہر تو سکتا نہیں، جتنی دیر وہ ٹھہر سکتا ہے، اس میں جو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ پہنچائے گا اور باقی پھر تم وہی ہو اور تمہارا شہر وہی ہے لیکن یہ دشمن جو ہے یہ تمہیں کہیں کسی کام کا نہیں رکھے گا ....آپ نے ان کو اس حقیقی اور مستقل خطرہ سے ڈرایا جو ان کے طریق حیات کا جس کے مطابق وہ زندگی گزار رہے تھے ان عقائد کا جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے ان بتوں کا جن کے وہ شیدائی تھے، جاہلی اور فاسد اخلاق و عادات کا جن کو وہ دانتوں سے پکڑے ہوئے تھے اور مختصر الفاظ میں انتہائی جہالت جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے طبعی تقاضا تھا جس میں نہ ایمان تھا نہ علم نہ انصاف تھا نہ خدا ترسی اور اس زندگی کا فطری انجام ہے معاشرہ کی اس ہمہ گیر فساد زندگی میں تنگی اور پریشانی، قلبی اضطراب اور داخلی عذاب اور اس زندگی کے بعد ہمیشہ کا عذاب ہے جس کے سامنے سارے عذاب اور ہر قسم کی تکلیفات ہیچ و بے قیمت ہیں۔

اس لیے ہم بتا رہے ہیں کہ﴿نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ یہ "نذیر" کے ساتھ "مبین" کا محض اس لیے نہیں کہ ایک لفظ کے ساتھ دوسرا لفظ آ گیا ہے "نذیر" کے ساتھ دس لفظ آ سکتے تھے (یعنی ہم جیسے آدمی بھی لا سکتے ہیں، جو متوسط عربی داں ہیں) لیکن "نذیر" کے ساتھ نبوت کا جو انداز ہے اور اس کا جو حامل اور مکلف ہے اس کے لیے "مبین" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہے اچھا "مبین" کے معنی صرف بیان ہی نہ سمجھو بلکہ عربی میں ابانت کے معنی خود بیان کئے ہیں، وہ وضاحت سے کچھ زیادہ ہیں۔ یعنی وضاحت بھی ہو اور دل پر اثر بھی کرے اور ذہن اس کو قبول کرلے (اس لیے "البیــــان والتبیــن" یہ جو نام رکھے گئے ہیں اور البیان) بلاغت کے لیے جو لفظ آتا ہے ان میں ایک بیان کا لفظ ہے اور قرآن مجید میں جا بجا "مبین" کا لفظ آیا ہے تو اس میں نبوت کا پورا امتیاز آ جاتا ہے۔

انبیاء کرام (علیھم الصلوۃ والتسلیم) نبوت کے پہاڑ پر کھڑے ہوتے ہیں اور اس عالم کو بھی دیکھتے ہیں اور عالم غیب کو بھی اور انسانیت اور اس کی تہذیب وتمدن پر مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں شب خون مارنے والوں کی خبر دیتے ہیں، چھپے ہوئے خطرات ونقصانات سے آگاہ کرتے ہیں اور شفقت، محبت، مہربانی اور اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو ڈراتے ہیں اور جب کوئی ان کے اس فطری اور عقلی حق کا انکار کرتا ہے اس بدیہی چیز میں شک کرتا ہے یا ان کی بلند حیثیت اور اعتماد کو چیلنج کرتا ہے تو وہ نصیحت واخلاص اور رنج والم کے ساتھ کہتے ہیں۔

﴿قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْنَ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ. اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (سبا:۴۶)

کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم خدا کے لیے دو دو اکیلے اکیلے کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو تمہارے رفیق کو سودا نہیں وہ تم کو عذاب سخت کے آنے سے پہلے صرف ڈرانے والے ہیں۔ (۱)

ہمارا موجودہ معاشرہ

ہمارے موجودہ معاشرہ کی بھی حالت یہی ہے، رسول خدا ﷺ کی بیان کردہ یہ بلیغ مثال جس کے لیے آپ نے ایسا حکمت آمیز طریقہ اختیار کیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، قریش مکہ کے تنگ اور محدود معاشرہ ہی کے لیے مخصوص نہیں جواب تاریخ کی زینت بن چکا ہے بلکہ وہ ہر زمانہ کے لیے ایک حکیمانہ اور زندہ جاوید مثال ہے، جو ہمارے اوپر بھی پوری طرح منطبق ہو رہی ہے اور ہمارے معاشرہ کی صحیح اور سچی تصویر کشی کر رہی ہے ہم وباؤں سے ڈرتے ہیں امراض سے گھبراتے ہیں، بلاؤں کی دہشت ہمارے دلوں میں سمائی ہوئی ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی احتیاطی تدبیریں عمل میں لاتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی کہہ دے کہ یہاں کالرا کا ایک کیس ہو گیا ہے تو پورے شہر میں دہشت پھیل جاتی

(۱) منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۲۳-۳۰

ہے، ہر شخص پر خوف مسلط ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس وبا کا سب سے پہلا شکار وہی ہوگا لیکن اخلاقی امراض، یہ غلط اخلاق وعادات جن کو اللہ اور رسول ناپسند کرتے ہیں یہ مادہ پرستی، شہوت پرستی، ہر جگہ قوت کے سامنے سرنگوں ہو جانا خواہشات کی بے قید اطاعت، جذبات کی رو میں بہہ جانا لہو ولعب میں انہماک، رقص وسرود، ذہنی تسکین اور آرام طلبی وعیش کوشی کے دیگر وسائل میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی، قیادتوں اور نعروں کی اندھی تقلید، حقائق سے چشم پوشی، بار بار کے تجربات سے عبرت نہ حاصل کرنا، امیدوں اور آرزوؤں کی بے لگامی، انسانوں کا حد سے بڑھا ہوا احترام، سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کی تقدیس اور ان کے بارہ میں غلطیوں اور لغزشوں سے معصومیت کا اعتقاد یہ امراض ہمارے اجسام اور ہمارے معاشرہ کیلیے ہزاروں دشمنوں اور دشمن کے ہزاروں لشکروں سے کہیں زیادہ خطرناک، کہیں زیادہ مہلک اور کہیں زیادہ تشویش ناک ہیں۔

یہی صحیح مفہوم ہے اس حکیمانہ اور بلیغ مثال کا جسے رسول اللہ ﷺ نے ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے بیان فرمایا ہے۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۳۹ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۲۳-۳۰ ☆ عالم عربیہ کا المیہ: ۱۱۰-۱۱۶ ☆ نبی رحمت: ۵۳-۵۴، سے مشترک اخذ وتلخیص ہے۔

سرچشمۂ ہدایت ہے فقط ذاتِ الٰہی

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (القصص: ۵۶)

''اے محمد آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والا کون ہے''۔

دین کی بقا اور تسلسل کے غیبی انتظامات

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ'' اے محمد رسول اللہ ﷺ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے ہیں، یعنی آپ کو مطلق اختیار ہدایت پر نہیں ہے۔ آپ سے ہزاروں لاکھوں کو نفع ہوگا، قیامت تک ہوتا رہے گا، تسلسل باقی رہے گا، آپ ہی ذریعہ ہدایت ہوگی، آپ ہی ذریعہ نجات ہوگی، یہ سب ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ ''إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ'' آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت دینے کے مختار نہیں ہیں، یعنی یہ کلیہ نہیں ہے کہ آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت ضرور ہو جائے، ''وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ'' لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔

اس کے کہنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قدرت مطلقہ اللہ کی معلوم ہو، ہدایت پر قادر ہونا یہ اللہ کا کام ہے، دراصل ہدایت دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے، اب وہ کسی کو ذریعہ بنالیتا ہے،

لیکن ہدایت آتی ہے ادھر ہی سے، تو اگر اُدھر سے نہ آئے سرچشمہ سے اپنے نہ آئے منبع ہدایت سے نہ آئے تو پھر جیسے کوئی چیز آئی ہی نہیں، (مثلاً اگر کوئی خط بھیجے نہیں، اگر خط آئے نہیں، کوئی منی آرڈر بھیجے نہیں اور پیسہ آئے نہیں، کوئی پیغام دے ہی نہیں ٹیلیفون پر، تو وہ آئے ہی نہیں) اس طریقے سے منبع ہدایت تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، ہدایت تو وہاں سے آئے گی، لیکن ہدایت کی نفی نہیں ہے، مگر یہ کہ ہدایت پر پورا اختیار اور یہ کہ ہدایت اختیاری ہو بالکل، آپ جس کی طرف مخاطب ہوں، جس کی طرف توجہ فرمائیں، فوراً اس کو ہدایت ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں۔

اس میں کئی فوائد ہیں، ایک تو یہ کہ حضور ﷺ کو دل شکستگی سے بچاتا ہے کہ اگر آپ کی انتھک کوشش کے باوجود ہدایت نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہدایت کا سرچشمہ دوسرا ہے آپ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تو آپ کی مایوسی اور دل شکستگی اس سے ختم ہو جائے گی۔

اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے بعد جو اصلاح وتجدید کا سلسلہ ہے قیامت تک اس کو باقی رہنا ہے اور یہ منشائے خداوندی ہے۔

پھر اس کے بعد اس کا فائدہ ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ آپ کے بعد جو اصلاح وتجدید کا سلسلہ ہے حدیث میں آتا ہے کہ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے کہ "يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ. وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ. وَتَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ" [1] کہ جو اس دین کو اس کی اپنی شکل پر باقی رکھیں گے اور وہ غلو پسندوں کی تحریف سے اور غلط نسبت کرنے والوں کی اپنی نسبت کرنے سے اور جاہلوں کی تاویل سے اس کو بچائیں گے۔ [2]

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت

---

(۱) مشکوٰۃ۔ کتاب العلم فصل ثانی۔ بروایت بیہقی)۔

(۲) (اس پر اللہ کبھی موقع دے تو ہماری کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کی پہلی جلد کا مقدمہ پڑھ لیں اس میں تقابلی مطالعہ ہے، اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ برابر اس کا سلسلہ جاری رہا) اس لیے کہ وہ درخت جس نے پھلنا چھوڑ دیا، یا بہت دیر میں پھلتا ہے، برسوں گذر جاتے ہیں، تو اس کی طرف سے اعتبار جاتا رہتا ہے۔

ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس ''تریاق'' کی حاجت تھی، وہ امت کو عطا ہوا...... ''جہاد اور تجدید کی تاریخ میں کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا، اصلاح کی مشعلیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور بڑی تیز وتند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا''۔

''اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور اس کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کردیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں، جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات وبدعات کے نرغہ سے نکالے'' خود ان مذاہب کے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں، کہ صدیاں گذر گئیں ہیں اور کوئی تجدید کرنے والا نہیں پیدا ہوا۔

آخری بات

تو ہم یہ کہہ رہے تھے (اس کی طرف بہت کم لوگوں کا ذہن جائے گا، ہم ایک نفسیاتی بات بتارہے ہیں) کہ جب تجدید واصلاح کا سلسلہ قیامت تک جاری رکھنا ہے اللہ کو، ہدایت اور صحیح راستے کی طرف بلانے والے ہمیشہ پیدا ہوں گے۔ تو ان کو اس سے سابقہ پڑے گا، کہ ساری محنت کریں گے اور اثر نہیں ہوگا، ساری خطابت کریں گے اور اثر نہیں کرے گا اور سارا اخلاص اور روحانیت صرف کریں گے، چاہے سیدنا عبدالقادر جیلانی ہوں، چاہے ابن جوزی ہوں، بحیثیت مقرر، ان کے یہاں بھی، یہ کلیہ کسی کے یہاں بھی نہیں ہے، کہ جس کو مخاطب کریں، جس کو صحیح راستہ بتائیں، اس کو ہدایت ضرور ہو، تو وہاں دل شکستگی کا اندیشہ تھا، لیکن جب تک یہ آیت موجود ہے، پڑھی جارہی ہے، کسی کو دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ ''إِنَّكَ لاَ تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ'' تو کوئی تبلیغی جماعت ہو، کوئی

اصلاحی تحریک ہو، کوئی اپنے وقت کا بڑے سے بڑا واعظ وخطیب ہو، کوئی بڑے سے بڑا مصلح ہو، اس کے لیے اس میں تسکین کا سامان ہے، چاہے یعنی دس فیصدی مانیں، چاہے پانچ فیصدی مانیں، جب بھی اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے، جب اللہ نے خاتم الانبیاء، سید المرسلین محبوب رب العالمین، اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے یہ کہہ دیا کہ "اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ" تو بالکل کسی کو بھی اس میں ذرا بھی ناامیدی، دل شکستگی اور یہ کہ بھائی یہ کام چھوڑ دینا چاہیے، جب ہدایت نہیں ہو رہی ہے، (اس میں چار، چھ تجربے بھی ایسے ہوئے) تو اس کا اثر پڑ سکتا تھا، اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کوئی بڑے سے بڑا اللہ کا مقرب بندہ ہو، جیسے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا، ان کا حال یہ تھا کہ ان کا وعظ جب ہوتا تھا تو جنازے نکلتے تھے، یعنی اسی وعظ کے درمیان لوگ دم توڑ دیتے تھے، اپنے گناہوں کو یاد کر کے، اپنے تقصیر وغیرہ کو اس کا اثر پڑتا تھا، (اور آپ پڑھئے ان کے مواعظ جمع کیے ہیں لوگوں نے) معلوم ہوتا ہے کہ بجلی چمک رہی ہے اور بادل گرج رہے ہیں، اب بادل گرا، اب بجلی گری، تو اتنی تاثیر، لیکن پھر بھی ایسی مثالیں، یہ ڈھونڈنے کی چیز ہے نہ جمع کرنے کی، لیکن یقیناً یہ پیش آئی ہوں گی، کہ سینکڑوں آدمی، اسلیے کہ بغداد اتنا بڑا شہر تھا، اس میں سب کے سب کو تو ہدایت نہیں ہوگئی، تو ایسے موقع پر اس واعظ کا، مصلح کا، خطیب کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص مقبول بندے کا بڑا امتحان ہوتا ہے، کہ اتنی ہم نے کوشش کی، اتنی ہم نے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر کے بالکل بتادیا اور پھر ان کو آنکھوں کے سامنے لے آئے اور پھر بھی لوگ نہیں مانتے، وہاں تو یہ آیت سامنے آجاتی ہے، جیسے گویا غیبی منادی ان کے کان میں کہتا ہے ﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ﴾ دیکھو یہ کس سے کہا جا رہا ہے، یہ سید المرسلین محبوب رب العالمین سے کہا جا رہا ہے، تمہیں اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، اس کے علاوہ اور کوئی تسکین کی کوئی سی شکل اختیار کی جاتی تو وہ کافی نہیں تھی۔

﴿وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو، یعنی وہ جانتا ہے کہ کس کو ہدایت ہو، کون ہدایت کا مستحق ہے، اس کا بھی ضابطہ اللہ کے یہاں ہے،

اس ضابطہ کا علم کسی کو نہیں ہے، کہ اس کو کیوں ہدایت ہوئی، اس کو کیوں نہیں ہدایت ہوئی، کوئی اس پر قیاس نہیں کرسکتا، یہ بھی اللہ نے فرمادیا کہ وہی بہتر جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو، کس بنا پر اللہ اس کو ہدایت دیتا ہے، اس کو ہدایت نہیں دیتا، یہ اس کو کوئی نہیں بتا سکتا، کبھی تکبر کبھی کوئی پچھلا کام، کوئی ظلم، کبھی کسی کی بددعا، کبھی یہ ہدایت پاکر ہدایت کا کام نہیں کرے گا بلکہ اضلال کا کام کرے گا، یعنی ہدایت پاکر جب یہ لوگوں کے لیے ایک امتحان بن جائے گا، جب اس کو ہدایت ہوگئی، لوگوں نے ان کو اپنے گروہ میں سمجھ لیا، پھر یہ ضلالت شروع کردے گا، اس لیے اس کو ہدایت نہ دینا ہی مناسب ہے۔

غرض یہ کہ یہ اسرار الٰہی میں سے ہے![1]

---

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۶ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ، مشترک اخذ و تلخیص: ☆ نبی خاتم و دین کامل: ۱۰-۱۵ ☆ تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول): ۲۰-۲۲

اکلِ طیب اور عملِ صالح کا لحاظ رکھنے کی تاکید

﴿یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحاً إِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِیْمٌ﴾ (المؤمنون: ۵۱)

''اے اللہ کے پیغمبرو! پاک صاف چیزیں، حلال طیب چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں جانتا ہوں تم کیا کرتے ہو''۔

دو ستون، معاش اور معاد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً'' دو چیزوں کا یہاں ذکر کیا، ''پاک صاف چیزیں کھاؤ'' تمہارے رزق پر کسی کی کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی، ہم رزاق حقیقی ہیں، تو جہاں تک تعلق ہے معاش کا، تو پاک و صاف چیزیں کھاؤ اور جہاں تک تعلق ہے معاد کا اور یہی دو ستون ہیں، معاش، معاد اور دونوں کا حسن، دونوں کی مقبولیت مطلوب ہے، حسن معاش، حسن معاد، معاش کی سہولت اور معاد کی کامیابی، یہ دو چیزیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی یہی ہیں اور انسانوں کے تعلقات میں بھی۔

فرمایا کہ کیا تمہارا بگاڑیں گے اے پیغمبرو! پاک چیزیں کھاؤ، کوئی تمہیں روک نہیں سکتا، ان کی کوئی راشن نہیں ہے، ''وَاعْمَلُوا صَالِحاً'' ''اور نیک کام کرو'' بس یہ تمہارا کچھ

بگاڑ نہیں سکتے، اگر یہ دونوں کام تم کر سکتے ہو تو ایک سے زندگی قائم ہے اور ایک سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ جو تمہارا معاملہ ہے، عاقبت جسے کہتے ہیں، ایک کے ساتھ تو جو موجودہ حالت ہے، یعنی حاضر، وہ اس سے متاثر نہیں ہے، ایک مستقبل، حاضر و مستقبل، دو ہی چیزیں ہیں اصل، ماضی تو اتنی عام چیز نہیں ہے گزر چکا، لیکن اصل جو فیصلہ کن چیزیں ہیں جس کو لوگ مقیاس بناتے ہیں اور اس کے مطابق وہ اپنے طرز عمل کو بدلتے ہیں، کبھی بگاڑ لیتے ہیں، کبھی بنا لیتے ہیں، وہ دو چیزیں ہیں، حاضر اور مستقبل، مثلاً کسی کا بچپن کس طرح گزرا، کسی کی جوانی، کسی کی بے روزگاری، پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ اب کس طرح ہوگا؟ اور اس کے مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مثلاً آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو فرمایا کہ معاش اور معاد، دونوں چیزیں ہمارے قبضے میں ہیں، اس کا ہم نے تمہارے لیے انتظام کر رکھا ہے اور یہ صرف رسول وانبیاء علیہم السلام ہی نہیں، بلکہ اس کے نائبین۔ داعی۔ دعاۃ جو ہیں، ان کے دین کے حامل، علمبرداران کے دین کے مبلغ، ان کے دین کے شارح ان کے دین کے ترجمان، ان سب کا بھی یہی ”کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحاً“

یہ گویا اللہ تعالیٰ نے پورا زندگی کا نقشہ بتا دیا ہے، کھاؤ تو ذرا اس میں احتیاط رکھو، حرام کمائی کی چیز نہ ہو، ناجائز چیز نہ ہو، کوئی اکل میتہ یا کوئی ایسی چیز نہ ہو، شراب معاذ اللہ شراب، یا اس طرح کی کوئی ایسی چیز نہ ہو، تو یہ معاش تو کھانے میں ”طیبات“ کا لحاظ رکھو، اور عمل میں ”صالحہ“ کا لحاظ رکھو، بس ہمارا تمہارا معاملہ صاف ہے، پھر یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، یہ انبیاء علیہم السلام کو بھی خطاب ہے، قیامت تک ان کے داعیوں کو، جانشینوں کو، ان کے ترجمان جو ان کو اللہ تعالیٰ ترجمانی کا شرف عطا فرماتا ہے اور نیابتِ نبوت کا منصب عطا فرماتا ہے، اپنے زمانے کے مجدد، اپنے اپنے زمانے کے مصلح، اپنے اپنے زمانے کی اصلاحی تحریکوں کے علمبردار اور امت کے تعلق مع اللہ، تعلق مع الرسول، تعلق مع الدین کے لیے کوشش کرنے والے سب کے لیے یہی ہے کہ ”یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً“ یعنی اس میں زندگی کا پورا نقشہ آ گیا ہے۔

”اِنِّی بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِیمٌ“ ”میں تمہارے اعمال سے واقف ہوں“ اور اس کے

بعد آدمی کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اتنی بات تو کافی نہیں کہ ہم "طَيِّبَات" کھا رہے ہیں اور نیک عمل کر رہے ہیں، معلوم نہیں اس کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا، ہمارے اندر کوئی کمی رہ جاتی ہوگی، کوئی چیز ناپسندیدہ ہوگی، اس کی طرف سے اطمنان دلا دیا گیا کہ "اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْم" جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے، معاش و معاد، طیبات کا استعمال زندگی کے بر قرار رکھنے کے لیے، بقاء حیات کے لیے اور عمل صالح پر عمل تعلق مع اللہ کو قائم رکھنے کے لیے امتوں کا رشتہ اپنے معبود کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے اور باقی جب باطن کا خیال بھی گذرتا ہے، تو اس کی طرف سے اطمنان رکھو، "اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْمٌ" تو جو کچھ بھی کر رہے ہو یا کرو گے اس سے میں واقف ہوں، تو اب کیا رہ گیا۔ [1]

(۱) درسِ قرآن، سورۂ مومنون: ۵۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت: ۱۱۸ - ۱۱۹، سے ماخوذ ہے۔

واقعۂ افک و بہتان اور اس پر وعید

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ. لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُبِينٌ﴾

(سورہ نور: ۱۱-۱۲)

''جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم ہی میں سے ایک جماعت ہے اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے ان میں سے جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا وبال ہے اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا، جب تم نے وہ بات سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے''۔

آخری اور عالمی ہدایت نامہ

ہمارا آپ کا سب کا ایمان ہے کہ قرآن مجید آخری کتاب ہے، آخری صحیفہ ہے، جو پیغمبروں پر نازل ہوا، آخری کتاب بھی ہے اور عالمی کتاب بھی ہے۔یعنی اب قیامت تک

کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی اور ہر زمانہ کے لیے ہر ماحول ومعاشرے کے لیے، ہر تہذیبی دور کے لیے، بدلے ہوئے حالات کے لیے یہی کتاب ہدایت نامہ ہے، پوری دنیا کے لیے ہدایت نامہ ہے اعتقادی بھی ایمانی بھی اور عملی بھی، اخلاقی بھی، معاشرتی بھی، اس میں ایسی چیزیں کہ آنحضرت ﷺ چونکہ اللہ کے آخری نبی تھے، آپ کو محفوظ رکھ سکتا تھا اور اللہ کے یہاں حضور ﷺ کا جو مقام تھا اس کے لحاظ سے یہ بات بالکل سمجھ میں آجاتی ہے کہ آپ کو ان حالات سے واسطہ ہی نہ پڑتا، مثلاً جنگیں، غزوات ہیں، لڑائی جو ہے یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس میں بڑے سے بڑا مذہبی روحانی کوئی بڑی بزرگ شخصیت ہو تو اولیاء اللہ ہوں یا چوٹی کے علماء ہوں یا حکام ہوں، اہل اقتدار ہوں ان سب کو ایک ہی طرح کے حالات پیش آتے ہیں، تو ایسا ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بچالیتا آپ کی پوری مبارک زندگی نبوت کے بعد ۲۳ رسال کی وہ بغیر کسی لڑائی کے گذر جاتے تھے، کئی کئی چاند ہم ہم دیکھتے تھے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا ان سب چیزوں سے اللہ تعالیٰ آپ کو بچا سکتا تھا، ویسے ہی ایک چیز خانگی حادثہ ایک ایسی صورتحال کا معاملہ کہ جو آپ کے مقام سے بہت فروتر تھی اور کم درجے کی تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ آپ کو جو تعلق تھا آپ کی جو مشغولیت تھی اور آپ کا جو روحانی مقام تھا اور آپ کا عبادات میں، تہجد میں، استغفار اور دعا میں، جو انہماک تھا، یکسوئی تھی اس میں فرق ڈال سکتی تھی وہ چیزیں۔

لیکن چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کتاب سے کام لینا تھا قیامت تک کے لیے، اس لیے بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے اور ان کا قرآن مجید میں تذکرہ بھی ہے کہ جن سے تسلی ہوسکتی ہے ان لوگوں کو جن کو یہ حالات پیش آئے ہیں، اولیاء کرام میں بھی ہوسکتے ہیں اور بڑے بڑے محدثین وفقہاء میں بھی ہوسکتے ہیں اور بڑے بڑے مجاہدین اور شہداء میں بھی ہوسکتے ہیں، صاحب کرامات بزرگوں میں بھی ہوسکتے ہیں، لیکن جب وہ یہ دیکھیں گے کہ محبوب رب العالمین جو اللہ کا سب سے محبوب بندہ تھا اس کو بھی اس کی حیات طیبہ میں بھی اس کی زندگی میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کا آپ کو کسی صحابی کے متعلق سننا بھی گوارہ نہ ہوتا تو اس کو بڑی تسکین ہوگی کہ ہم کیا چیز ہیں تو وہ آپ کو رفع درجات کے لیے ترقی درجات

کے لیے اس دور سے گذرنا تھا، برداشت کرنا اور سن لینا اور پھر اس کے اوپر مغلوب الغضب نہ ہونا معاذ اللہ یا یہ کہ کوئی ایسی کاروائی نہ کرنا کہ جس سے ذاتی انتقام کا جذبہ ظاہر ہوتا ہو پھر ہم کیا چیز ہیں انہیں میں سے ایک واقعہ یہ ہے۔

واقعہ افک

واقعہ سن لیجئے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کے لیے قرعہ ڈالتے جس کا نام نکلتا ان کو اپنے ہمراہ لے لیتے غزوہ بنی المصطلق میں حضرت عائشہؓ کے نام قرعہ نکلا، غزوات میں ازواج مطہرات بھی جاتی تھیں اور ضروری نہیں تھا لیکن اکثر غزوات میں ازواج مطہرات بھی ساتھ ہوتی تھیں تو عربوں کا معاشرہ ایسا تھا کہ عورتوں میں بھی ہمت، بہادری تھی اور بہت چیزوں میں وہ مدد کر سکتی تھی، مثلاً زخمیوں کی مرہم پٹی میں اور آج بھی نرسوں سے کام لیا جاتا ہے، ہاسپٹل وغیرہ جو ہوتیں ہیں، نرسوں سے کام لیا جاتا ہے بلکہ ان سے جو ہمدردی جو طبقہ اناث کے ساتھ مخصوص ہے ان کو مائیں بننا ہے اور ان کے گھر کے بچوں کی پرورش کرنا ہے تو ان میں جو نرمی ہوتی ہے ان کے ہاتھوں میں جو ایک احتیاط ہوتی ہے اور تکلیف سے جو ان کو خود تکلیف ہوتی ہے اس وجہ سے وہ زیادہ کام آتی ہیں، چنانچہ جنگ احد میں جو آپ کو زخم آئے تھے اس میں حضرت فاطمہ نے مرہم پٹی کی تھی اور وہ زخم کو ٹھیک کیا تھا تو ازواج مطہرات اس لیے بھی جاتی تھیں اور ان کی شجاعت بھی تھی بہادری بھی تھی'' چنانچہ آپ ان کو اپنے ہمراہ لے گئے، واپسی پر (اب یہ سب چیزیں جو ہیں اتفاقی نہیں، اللہ تعالی کے یہاں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہوتی تو ہم آپ کہہ دیتے ہیں اتفاقی ورنہ ہمارے یہاں بھی حقیقتاً اتفاقی کوئی چیز نہیں ہے سب مقدرات ہوتے ہیں، پہلے سے طے شدہ چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ نیا واقعہ پیش آیا) جب مدینہ قریب ہوا تو آپ ؐ نے قیام فرمایا اور رات کو کچھ حصہ وہیں گذارا اس کے بعد آپ نے کوچ کا اعلان کیا حضرت عائشہ صدیقہؓ قضاء حاجت کے لیے گئیں تو ایک ہار جو ان کے گلے میں پڑا ہوا تھا کسی جگہ گر گیا اور ان کو پتہ بھی نہ چل

سکا جب وہ اپنے محمل میں واپس آئیں تو ان کو معلوم ہوا کہ ان کا ہار غائب ہے وہ اس کی تلاش کے لیے پھر وہاں گئیں اسی درمیان میں کوچ کا اعلان ہوگیا، جن حضرات کے ذمہ ان کے سواری تھی وہ معمول کے مطابق آئے اور یہ سمجھ کر کہ حضرت عائشہؓ اندر ہوں گی محمل تھام لیا اور روانہ ہوگئے وہ بہت کمسن اور ہلکی پھلکی تھیں اس لیے انہیں اندازہ نہ ہوسکا اور اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ اس کے اندر تشریف نہیں رکھتی ہیں جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ وہ سنائے بان، جو تھا اونٹ چلانے والا وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس میں سواری نہیں ہے تو اتنا کم فرق ہوتا تھا یعنی سواری کے ساتھ اور بغیر سواری کے وہ سمجھ نہیں سکا (ذرا جلدی بھی ہوتی ہے اور سب موٹر چلانے والوں کو ہر وقت دیکھنا کہ کون پیچھے ہے کتنا ہے آرام کی جگہ بیٹھا ہے یہ بہت خاص لوگ کرتے ہیں) تو اس نے چلا دیا اونٹ کو اب کوئی صورت نہیں تھی اتنا لمبا فاصلہ پیدل طے نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ زیادہ نامناسب اور خطرناک تھا عورت ذات وہ اکیلی سفر کرے انہوں نے اپنی چادر اوڑھی اور وہیں لیٹ گئیں۔

اسی درمیان صفوان بن معطل السلمی جو اپنی ایک ضرورت سے قافلہ سے بچھڑ گئے تھے ادھر آنکلے ان کو دیکھا تو اِنَّا لِلّٰہ پڑھا اور کہنے لگے کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں اس کے بعد انہوں نے اپنا اونٹ ان کے قریب کر دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں سوار ہوگئیں تو انہوں نے اونٹ کی نکیل تھامی اور تیز رفتاری کے ساتھ قافلہ کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور بہت احتیاط کے ساتھ احترام کے ساتھ، احتیاط نہیں بلکہ احترام کے ساتھ اور مدینہ طیبہ پہنچا دیا کا شانِ نبوت میں، لیکن وہاں ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی آپ واقف ہوں گے بہت مشہور ہے اس جماعت کا لقب ہے منافق، عبداللہ بن ابی ان کا سردار تھا تو اس کو موقع مل گیا وہ تاک میں رہتا تھا جس سے کہ احترام نبوت میں اثر پڑے اور اس پر اثر پڑے سے پورے دین پر اثر پڑتا ہے تو اس نے نامناسب کہنی شروع کی اور ایک دو صحابی (بعض طبیعتیں ہوتی ہیں یہ نہیں کہ ایمانی کمزوری ہوتی ہے بلکہ مزاج ہوتے ہیں بعض لوگوں کے مزاج ایسے ہوتے ہیں کہ سنی ہوئی بات کہنے لگتے ہیں ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلنے لگتی ہے تو مجلس میں بیٹھے انہوں نے بھی اس کا ذکر کر دیا تو وہ کوئی بعض

مرتبہ بدنیتی یا نفس کی شرارت نہیں ہوتی بلکہ مزاج ہوتا ہے) تو وہ صحابی اس میں اور شریک ہوگئے کہا کہ کیا بات ہوگئی کہ وہ کیوں پیچھے رہ گئیں تھیں اور پھر وہاں سے اتنا لمبا راستہ وہ لے کر چلے یہ کیسے ہوا؟

گڑھا ہوا افسانہ

غرض کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کی طرف لوگوں کو التفات بھی ہوتا لیکن عبد اللہ بن ابی نے اس کو بالکل اپنا لیا یعنی استحصال کیا ہے اس کا، سیاسی استحصال یعنی ایسے موقعہ کہاں آتے ہیں اگر حضور پاک ﷺ کے بارے میں کاشانۂ نبوت کے بارے میں ایسا خیال مسلمانوں کے دل میں پیدا ہوگیا تو ہر بات کہی جاسکتی اور جب احترام کم ہوگیا تو پھر قانون شریعت پر عمل کرنا، پابندی کرنا اور پھر دیندار رہنا سب مشکوک ہوجاتا ہے۔

اور مدینہ واپس آکر اس کا خوب چرچا کیا، منافقین نے جو اس کے منتظر تھے اس موقع کو غنیمت جانا اس کی اچھی طرح تشہیر کی ان کے نزدیک یہ ایک ایسا حربہ تھا جس سے مسلمان آسانی کے ساتھ فتنہ میں پڑ سکتے تھے اور مقام رسالت اور اہل بیت کے ساتھ ان کی تعظیم اور محبت کا رشتہ کمزور کیا جاسکتا تھا اس سے مسلمانوں کا باہمی اعتماد اور ایک دوسرے پر بھروسہ بھی مجروح ہوتا تھا اس سازش کے کچھ ایسے سادہ دل مسلمان بھی شکار ہوگئے جن کو زیادہ باتیں کرنے کا شوق تھا اور جو بغیر تحقیق کے بات نقل کرنے کے عادی تھے اسی بات کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے "اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ" (سورہ النور۔ ۱۵) (جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تم کو کچھ علم نہ تھا اور تم اس کو ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

سات آسمانوں کے اوپر سے برأت کا اعلان

جب حضرت عائشہؓ کو مدینہ میں اچانک اس کی خبر ہوئی تو وہ سنانے میں آگئیں

اور رنج و غم سے ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسو تھمتے نہ تھے، راتوں کی نیند اڑ گئی، رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ معاملہ بہت سخت اور سنگین تھا آپ کو جب علم ہوا کہ بات کہاں سے چلی تھی تو اس وقت آپ تشریف لائے اور عبداللہ بن ابی کے سلسلہ میں کچھ کہنے کی اجازت لی، آپ ممبر پر تشریف رکھتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا اے مسلمانوں! مجھے کون اس شخص کے معاملے میں کچھ کہنے کی اجازت دیتا ہے جس کی میرے گھر والوں کے بارے میں ایذا رسانی کا مجھے پتہ چلا ہے خدا کی قسم مجھے اپنے اہل خانہ کے بارے میں جو کچھ علم ہے وہ اطمینان بخش ہے۔ لوگوں نے اس معاملہ میں جب صاحب کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی مجھے اچھی ہی بات معلوم ہے وہ جب کبھی میرے گھر آتے تو میرے ہمراہ آتے تھے ''اوس'' کے کچھ لوگ یہ سن کر غیظ و غضب سے بھر گئے اور کہنے لگے کہ جس نے اتنی بڑی بات زبان سے نکالی ہے ہم اس کی گردن اڑا دینے کے لیے تیار ہیں وہ اوس کا آدمی ہو یا خزرج کا، عبداللہ بن ابی کا خزرج سے تعلق تھا اس کی یہ گفتگو سن کر قبائلی حمیت پیدا ہونے لگی اور دونوں قبیلے جوش میں آگئے قریب تھا کہ شیطان کا جادو ان پر چل جائے اور وہ باہم دست و گریباں ہو جائیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے فہم و تدبر اور حلم و بردباری کی برکت سے یہ بات وہیں ختم ہو گئی ادھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین تھا اس لیے ان کے رویہ میں اعتماد خودداری اور عزت نفس کی پوری جھلک نظر آرہی تھی ان کا حال اس بے گناہ اور معصوم صفت ہستی کا تھا جو ہر شک و شبہ اور الزام سے بالاتر ہوتی وہ ان کو پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بالآخر صاف بری کر دے گا اور دامانِ رسالت پر بدگمانی اور تہمت کا یہ داغ ہرگز باقی نہ رہے گا لیکن ان کو یہ خیال نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے خاص طور پر وحی نازل فرمائے گا اور یہ آیتیں قرآن مجید کا جز بن کر قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی۔

ان کو زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا کہ ان کے بارے میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی برأت کا اعلان ہو گیا۔

اس طرح اس زبردست فتنہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور یہ بات اس طرح ختم ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی، مسلمان معمول کے مطابق اسی جوش اور ولولہ کار

کے ساتھ اپنے ان عظیم کاموں کی تکمیل میں مشغول ہو گئے جن پر نہ صرف ان کی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح و کامرانی کا انحصار تھا"۔ (۱)

تسکین و نصیحت کا دائمی سرچشمہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کو اتنی اہمیت دی اور یہ واقعہ بھی جیسے ہم نے کہا کہ اتفاقی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو قیامت تک کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا تھا اگر اللہ کے کسی بندے کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے تو اس کو تسکین ہو اس سے کہ ہم کیا چیز ہیں اللہ کے رسول کے ساتھ یہ بات پیش آچکی ہے کہ کوئی بات بھی کہی جاسکتی ہے یعنی وہ بات کتنی ناممکن ہو کہی جاسکتی ہے سنی جاسکتی ہے جب کہی جائے گی سنی جائے گی دوہرائی جائے گی تو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے یہ دین کے داعیوں کو دین کے جو نمونے ہیں اور مقتدا ہیں ان کو یہ ضروری نہیں کہ بعینہ اس طرح کا لیکن اس سے ملتے جلتے واقعات اتہامات اور بدگمانیاں پیش آسکتی ہیں اللہ نے ان سب کا استیصال کر دیا اور یہ واقعہ ہو سکتا تھا کہ قرآن مجید میں ذکر ہی نہ ہوتا، ہو گیا واقعہ اور بعد میں مسلمان بالکل مطمئن ہو گئے اور اس کا پھر کوئی ذکر کرنے والا ہی نہیں رہا اور وہ لوگ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو قرآن مجید میں ذکر کر کے اس کو عام بنا دیا اور دائمی بنا دیا اور اس کو ایک گویا سرچشمہ بنا دیا، نصیحت حاصل کرنے کا صبر کا تسکین کا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک وہ لوگ جو بہتان لائے جو ایک گڑھا ہوا افسانہ اپنے ساتھ لائے "عُصْبَةٌ مِنْكُمْ" وہ تمہارے اندر ایک ٹولی ہے یہ "عُصْبَةٌ" کا جو لفظ ہے بعض لفظ جو ہے وہ مذموم ہوتے ہیں یعنی مثلاً اردو میں جماعت، جماعت کے لفظ میں ایسی خرابی نہیں لیکن ٹولی جب آپ کہیں تو اس سے ذہن جاتا ہے کہ کوئی مجرمین، جرائم پیشہ لوگ اور ذرا گرے ہوئے لوگ ہیں "عُصْبَةٌ" بھی انہیں لفظوں میں سے ہے وہ ایک ٹولی وہ تم میں سے ایک ٹولی تھی۔

"لَاتَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ" اس کو تم برا نہ سمجھو اپنے لیے "بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" بلکہ تمہارے لیے خیر ہیں وہی جو ہم نے اس کے فوائد بتائے کہ قیامت تک کے لیے اطمینان کی چیز ہوگئی کہ ہم کیا چیز ہیں ورنہ بہت لوگ جان دے دیتے ہیں، بہت لوگ معاذ اللہ خودکشی کر لیتے ہیں ارے یہ بات ہمارے متعلق کہی گئی، مرجانا اچھا ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ اللہ کے محبوب رسول سید المرسلین، خاتم النبیین ان کے متعلق یہ بات کہی گئی اور آپ نے سنی اور برداشت کی اور اس کے بعد اس کی تردید ہوتی اور سب کے دل صاف ہوگئے تو ایسے یہاں بھی ہوگا "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ" ان میں سے ہر آدمی کے لیے وہ ہے جو اس نے گناہ کمایا ہے اس پر اس کا وبال پڑے گا "وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ" اور جس نے کہ اس میں سربراہی کا کام کیا جس نے اس کی ذمہ داری قبول کی "تَوَلّٰى كِبْرَهٗ" اور "کبر" کا لفظ بھی مذموم اس میں آتا ہے "معظمة، اهمه، اعظمه" اور "راسه" یہ سب بہت چیزیں کہی جاسکتی تھیں لیکن "کبر" جس نے اس کا بیڑا اٹھایا تم میں سے اس کے لیے "عذاب اليم" ہے۔

چنانچہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو نفاق کی حالت میں اور وہ محروم رہا۔

دائمی اور اخلاقی تعلیم

"لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ" اب یہاں پر ایک بہت بڑی اخلاقی تعلیم دی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو بہت عمومی وسیع اور دائمی اور بلکہ عالمی ہے وہ یہ کہ واقعہ کی شکل تو آپ جانتے ہیں کہ ایسی تھی کہ تکلیف دہ تھی اس سے اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا اخلاقی اصول اور ایک اخلاقی تعلیم دی ہے، تمام مسلمانوں کو اور قرآن مجید پڑھنے والوں کو کہ "لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا" کیوں نہیں ہوا ایسا کہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں اپنے اوپر قیاس کرتے اور اپنے نفسوں کے ساتھ حسن ظن سے کام لیتے ہم تو نہیں کر سکتے تھے ہمارے ساتھ ہی پیش آتا تو ہم تو ہرگز نہ کرتے بھی یہ کیسے ہوسکتا ہے، ام المومنین اور اہل

بیت رسول اور صفوان بن معطل بھی بڑے صحابی ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے تو تمہیں اپنے پورے "بأنفسهم" اپنی پوری جماعت کے ساتھ حسن ظن سے کام لینا چاہیے تھا ہمیں اس کی تعلیم دی گئی کہ جب کوئی ایسی بات سنیں یہ آپ ریڈیو سے سنیں یا اخبار میں دیکھیں یا جہ چاسنیں سب میں یہی ہونا چاہیے۔

یہ مسلمانوں کی ایک کمزوری ہے کہ کسی کے متعلق کوئی بات سن لیں تو بلا تحقیق اس کو نقل کرنا شروع کردیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِباً أنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ" انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ جو سنے اس کو کہنا شروع کردے۔

تو اصل یہ ہے کہ "لَوْلَا إذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأنْفُسِهِمْ خَيْراً" یہ اسلامی معاشرہ جو دنیا کے لیے نمونہ بنے گا اخلاقی طور پر نمونہ بننا چاہیے اور اس کو داعی ہونا چاہیے، اس کو نجات دہندہ ہونا چاہیے، اس کو معلم اخلاق ہونا چاہیے اس میں یہ صفات ہونی چاہیے کہ یہ جو ایسی گئی گذری جماعتوں میں، یا تنزل اور زوال کی منزلوں سے گذرنے والے ادیان اور ان کے ماننے والوں میں جو کمزوریاں پیدا ہوگئیں اور سیاسی جماعتوں میں ان مزاج اور عملی طریقہ کار سے بچنا چاہیے اس کو آپ ذہن میں رکھئے اس کو آپ اپنے وعظوں میں قرآن مجید کے درسوں میں جمعہ کی تقریروں میں اور جہاں موقع ملے کہئے کہ اعتبار کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے "لَوْلَا إذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأنْفُسِهِمْ خَيْراً"۔

دیکھئے کیا مرتبہ دیا ہے قرآن مجید نے مسلمانوں کو کہ تم معیار ہو، تمہیں اپنوں پر قیاس کرنا چاہیے ہم نہیں کرسکتے، صفوان نے کیسے کیا ہوگا؟ ہم اس کو سوچ نہیں سکتے صفوان کیسے ان کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی؟ تو اس کو معیار بنالیں، جلدی نہ کریں اعتراض کرنے میں الزام دینے میں اور الزام قبول کرنے میں اور الزام کا چرچا کرنے میں اس کی وجہ سے تمام ملی کام اس وقت بڑے آزمائش میں ہیں کہ فوراً الزام لگ جاتا ہے کہ وہ روپیہ کہاں گیا؟ وہ روپیہ کہاں گیا؟ حالانکہ ہمارے علماء نے اور قائدین نے اس امانت کا دیانت کا اور

احتیاط کا ثبوت دیا ہے، جو سیاسی لوگوں کے ذہن سے بالاتر ہے سمجھ نہیں سکتے کہ ایسا ہو سکتا ہے اس کے تذکرہ کا موقع بھی نہیں ہے، مناسب بھی نہیں ہے۔

دیکھیے! ہمیں تعلیم دی جا رہی ہے اس ٹکڑے کو ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں شامل نہ کرتا اور خیر یہ تو ممکن نہیں کہ وحی نازل ہونے کے بعد حروف شامل نہ کرتے لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ ذکر ہی نہ کرتا تو آج زیادہ تر لوگوں کو معلوم ہی نہ ہوتا یہ قصہ، کتنے آدمی ہیں سیرت میں پڑھتے ہیں یہ قصہ سیرت میں اس واقعے پر بھی نظر پڑتی ہے اور سیرت والے لکھتے بھی ہیں تو اس کی جو کچھ شہرت ہے وہ بھی اسی ٹکڑے کی وجہ سے قرآن مجید کی وجہ سے ہے۔

یہ ہمیں قیامت تک کے لیے تعلیم دی گئی ہے اور ایسے منازل اور درجے کے فرق کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے ملی کاموں میں کہ عصمت کا مسئلہ نہ سہی لیکن تقوے کا مسئلہ امانت کا مسئلہ، احتیاط کا مسئلہ، جانبداری اور خویش پروری کا مسئلہ اور اپنے عزیزوں کو ترجیح دینے کا مسئلہ یہ مسئلہ پیش آئیں گے ملی کاموں میں، ملت وسیع ہے ایسے کام کا میدان بھی وسیع ہے۔ (۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص: ☆ درس قرآن، سورۂ نور: ۱۱-۱۲ (غیر مطبوعہ) ☆ نبی رحمت: ۳۵۲-۳۵۶

شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ وَمَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ فَإِنَّهُ یَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَداً. وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یُزَکِّی مَنْ یَشَاءُ. وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (النور: ۲۱)

''اے ایمان والو شیطان کے قدموں پر نہ چلو اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو شیطان تو بے حیائی (کی باتیں) اور برے کام ہی بتائے گا اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو تم میں ایک شخص بھی پاک نہ ہوسکتا، مگر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے پاک کردیتا ہے اور اللہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے''۔

ایمان کی بنیاد پر خطاب

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا'' (اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو) جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو ایسی بات کہنی ہوتی ہے، جس کے لیے قوت ایمانی کی ضرورت ہے اور جو ایمان کی بنیاد ہی پر کہی جاسکتی ہے، ایمان کی بنیاد ہی پر مانی جاسکتی ہے، اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، تو خطاب ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا﴾ سے کیا جاتا ہے، یہ ایسے رسمی الفاظ نہیں، قرآن مجید میں کوئی چیز رسمی اور خانہ پری کے لیے نہیں ہوتی، آپ کو مثلاً کوئی اہم بات

کہنی ہو، اگر وہ مثلاً بات ہے نیکی اور تقوے کی، تو آپ کہیں گے: اے مسلمانو! اے دیندارو! اے وہ لوگو! جنہوں نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے، جو اللہ کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اگر آپ کو کوئی بات بہادری کی کہنی ہوگی، آپ کو جہاد اور خدا کے راستے میں قربانی کرنے اور تکلیف اٹھانے کی دعوت دینی ہو تو آپ کہیں کہ، اے مجاہدوں کی اولاد......
اے آخرت کو اصل سمجھنے والو......اور دنیا کو آخرت کے مقابلے میں ہیچ سمجھنے والو۔

تو اب یہاں جو بات آگے کہی جارہی ہے، وہ بھی اسی طرح کی ہے، تو فرماتا ہے کہ ''اے وہ لوگو..! جو ایمان لائے ہو'' ایمان لاچکے ہو اور اب اس کی ذمہ داریاں تم پہلے قبول کر چکے ہو، اس کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں تم پر!

شیطان کے نقوش قدم

''لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ'' ''شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو'' شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، شریعت کے خلاف جو چیزیں ہیں، نفس انسانی، نفسانیت جن کا سرچشمہ ہے، یا خواہش نفس، یا لذت نفس، یا حب جاہ، یا مال کی محبت، یہ ساری چیزیں جو ہیں، یہ سب ''خطوات الشیطان'' میں شامل ہیں۔

اے ایمان والو! جب تم ایمان لاچکے ہو، اللہ تبارک تعالیٰ کو رب حقیقی سمجھتے ہو، الٰہ حقیقی سمجھتے ہو، معبود حقیقی سمجھتے ہو، حاکم مطلق سمجھتے ہو، محبوب حقیقی بھی سمجھتے ہو، تو تمہیں شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اب یہ ''خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ'' شیطان کے نقش قدم دیکھیے یہاں واحد نہیں استعمال کیا گیا بلکہ ''خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ'' جمع کا صیغہ لایا گیا، یہ اتنا جامع اور اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ پوری جاہلی زندگی پر حاوی ہے، یعنی اس کے اندر عقائد بھی ہیں، اس کے اندر رسوم بھی ہیں، اس کے اندر عبادات بھی ہیں، خواہشات بھی ہیں، نقالیاں بھی ہیں، جاہلیت کی پوری زندگی اس کے اندر آجاتی ہیں، ''لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ'' تم شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔

معلوم ہوا کہ اس کے بہت سے نقش قدم ہیں، اس میں وسعت آگئی، خواہ اعتقادی

چیزیں ہوں، خواہ عملی چیزیں ہوں، خواہ اخلاقی چیزیں ہوں، خواہ تہذیبی چیزیں ہوں، خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب اس میں شامل ہیں۔

"وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" اور اگر کوئی شیطان کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ ہی کر لے اور وہ چلنا شروع کر دے، تو پھر اس کو معلوم ہونا چاہیے "فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" کہ شیطان تو فحشاء اور منکر کی تلقین کرتا ہے، یعنی بے حیائی کے کام کا حکم دیگا، اور نا معقول اور غیر منصفانہ بات کا حکم دے گا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے

"وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ" اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی "مَا زَكَىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا" تو تم میں سے کوئی شخص بھی پاکیزہ زندگی نہ گذار سکتا اور پاک صاف نہ ہو سکتا۔ یہ ایک بہت بڑی یہ تاریخی حقیقت بھی ہے، سیر و سوانح کی اور خاندانوں کی، نسلوں کی، عہدوں کی، کہ سارے اسباب موجود ہونے کے باوجود، سارے دواعی اور جو روایات ہوتی ہیں، جن کی آدمی پیروی کرتا ہے، بھائی ہمارے یہاں خاندان کی روایات یہ ہیں، ان سب کے ہونے کے باوجود، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل شامل حال نہیں ہوتا اور اللہ کی تائید نہیں ہوتی، تو ولی کے گھر میں ایک (بہت بڑے صالح نہیں بلکہ مصلح کے گھر میں) ایک غیر صالح پیدا ہو جاتا ہے، خاندانوں کی تاریخ آپ پڑھیں، نسلوں کی تاریخ آپ پڑھیں، مسلمانوں کی عہدوں کی تاریخ آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہے، محض رحمت الٰہی پر موقوف ہے، یہ نہیں کہ ولی کا بیٹا ولی ہو اور نیک صالح کا بیٹا صالح ہو۔

یہ ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں، جو تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہیں، جن کی تاریخ پر نظر ہے، ایک خاندان چل رہا ہے، مسلسل اولیاء پیدا ہو رہے ہیں، ایکدم سے ایک آدمی ایسا پیدا ہو جاتا ہے اس خاندان میں جو ننگ و عار کا باعث بن جاتا ہے، ان کے لیے اور لوگوں کے دلوں میں شک اور سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ایسے گھرانے میں جہاں اللہ کے نام کے سوا کوئی اور

نام نہیں لیا جاتا اور جہاں کسی معصیت کا خیال بھی نہیں پیدا ہوسکتا، وہاں ایسا آدمی پیدا ہوگیا، بہت سے خاندانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں، جنہوں نے اسلامی حکومت کے ساتھ بے وفائی کی، جو دوسروں سے مل گئے، یا مال کے لالچ میں انہوں نے کوئی ناشائستہ حرکت کی، تو اللہ نے بالکل کلیے کے طور پر بتادیا ہے اور بلکہ ڈرادیا ہے کہ ''وَلَوْلاَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ'' کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو، ''مَا زَكَىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا'' تم میں سے کوئی بھی صالح نیک اور خداترس نہیں ہوسکتا؟ تو کوئی آدمی اپنے اعمال پر اول تو اپنے نسب اور اپنی نسبت پر اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر اور اپنے ماحول پر جہاں پر وہ تعلیم پا رہا ہے، جہاں پر وہ رہ رہا ہے، کسی پر وہ اعتماد نہ کرے، خالص اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے، کہ وہی مدد کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا ہے، کوئی آدمی نہ اپنے میراث، ترکہ سے جو نسلی اثرات ہیں، اس سے اور نہ اپنی تعلیم سے، نہ اپنی ذہانت سے اور نہ ماحول، کسی چیز سے بھی آدمی نیک نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ نہ ہو اور وہ اس کو توفیق نہ دے۔

''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ'' لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، اس کو شائستہ بناتا ہے، اس کو خداترس بناتا ہے۔ ''وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ'' اگر کوئی مثلاً یہ کہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ خاندان تو یوں چلا آرہا تھا، یہ روایت یوں تھیں، یہ تو کوششیں یوں ہوئیں تھیں، یہ تو ایسے ذہین تھے، یہ تو ایسے عالم تھے، تو اللہ ان سب کے جواب میں کہتا ہے، ''وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ'' اللہ تعالیٰ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے، تو جو چیزیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں وہ اللہ کو معلوم ہے، کوئی اور سنے نہ سنے، وہ سن لیتا ہے اور مثلاً غرور کا دعویٰ کردیا، کسی نے سنا نہیں، لیکن آدمی نے کہہ دیا کہیں چھپکے بیٹھ کر کے، ہم تو کس کی اولاد میں ہیں، ہمارے باپ دادا ایسے ہیں، ہم سے کہیں گناہ ہوسکتا ہے، کسی نے نہیں سنا، اللہ نے سن لیا کہ وہ ''سمیع'' ہے اور یہ کہ وہ ''علیم'' بھی ہے کہ آدمی باہر کیا کرتا ہے اور اندر کیا کرتا ہے، یہ بھی جانتا ہے، اس لیے ''وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ'' یہ دو اللہ کی صفات ہیں، یہ اس موقع پر بڑی برمحل اور ڈرانے والی ہیں کہ آدمی یہ سمجھے کہ اپنی ذہانت سے اور اپنے وسائل

سے اور اپنے علم سے اور اپنی روایات سے اس سے کچھ کام نہیں چلتا، اس میں اللہ ہی سے توفیق مانگنی چاہیے۔ ''وَمَا تَوْفِيْقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ''

جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا (حالانکہ تفسیر دونوں ہیں کہ امرأة العزیز نے کہا حافظ ابن تیمیہ نے بھی لکھا ہے لیکن الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ ہیں) اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب بادشاہ نے خواب دیکھا تو معبرین نے یہ کہہ کر پلہ جھاڑ لیا ''وَمَا نَحْنُ بِتَاوِيْلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِيْنَ'' اسی درمیان وہاں وہ آدمی بھی موجود تھا جو جیل سے چھوٹ کر آ گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر سن چکا تھا (دو آدمیوں نے خواب دیکھا تھا، تو اس سے حضرت یوسف نے کہا تھا کہ اگر موقع ہو تو ہمارا حوالہ دینا تو) اس نے کہا کہ ہم بتا سکتے ہیں، اس کی تاویل لینے آپ ہمیں جیل خانہ بھیج دیجیے، وہاں ایک اللہ کا بندہ ہے، جو وہ تعبیر دے سکتا ہے، اس نے تعبیر دی اور وہ تعبیر صحیح نکلی، تو بادشاہ نے بھیج دیا، حضرت یوسف نے کہا کہ پہلے مقدمے کی تحقیق ہونی چاہیے، یہ ثابت ہو جائے کہ میں بالکل بری الذمہ تھا، اس لیے کہ ایسا ہوتا ہے کہ باہر نکلنے کے بعد پھر چرچا ہوتا کہ دیکھو بادشاہ نے رعایت کی ورنہ یہ ابھی جیل میں ہوتے، تو سب عورتوں نے بالاتفاق کہا کہ ''مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ'' (یوسف:۵۱) کوئی کمزوری ہم نے ان میں نہیں دیکھی، کوئی ہمیں خرابی نظر نہیں آئی، یہ سب ہماری غلطی ہے، تو حضرت یوسفؑ نے جب یہ تحقیق کروا لیا اور کہلوا لیا، اب ان کی نبوت کا تقاضا تھا، نبوت کا مقام تھا کہ انہوں نے اس سے تو ان کی تعریف نکلی تھی، اس کے باوجود وہ بالکل بری الذمہ نکل گئے، بے گناہ ثابت ہوئے، کہ بات تو ثابت ہو گئی، لیکن میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا۔ ''إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ'' (یوسف:۵۳) تو سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی نسبت سے کہا کہ جو کچھ فضل ہوا مجھ پر میں بچا رہا اس کے بعد میری برأت بھی ظاہر ہو گئی، یہ سب خدا کا فضل ہے، تو ''إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' ہے، اس میں دونوں باتیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے، کہیں سماعت کافی ہوتی ہے، کہیں سماعت کافی نہیں ہوتی ہے، علم بھی ضروری ہوتا ہے اور

کبھی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں، مجھ سے گناہ نہیں ہوسکتا، میرے دل میں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں آسکتا، تو خواب میں بھی یہ بات نظر نہیں آسکتی، یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، یوسف بالکل بری الذمہ ہونے کے باوجود بھی کہتے ہیں، ''وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِی اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّی'' لفظ بتا تے ہیں، پیغمبر کی زبان سے نکلا۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ نور: ۲۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ قرآن کا مطالبہ: ۳۰-۳۱

فریضۂ اقامتِ دین

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ (الحج: ۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور اللہ ہی کے ہاتھ میں انجام کار ہے''۔

اسلام کو غلبہ واقتدار کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ'' ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے''۔ ان کے قدم کہیں جمائیں گے، تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عیش و عشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں گے، ان کا تمدن ایک حسین گلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں حسن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر ہما کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے دسترخوانوں پر الوان نعمت چنے ہوئے ہوں گے نہیں بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشورکشائی کی تاریخ، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا حال یہ ہوگا یہ ''اَقَامُوا

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" "تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں"۔

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ" اگر ہم ان کو زمین میں "تمکین واقتدار" عطا کریں گے، تو نماز کو برپا کریں گے، میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ "صَلُّوْا" نہیں ہے، بلکہ "اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" ہے یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے، اس کا انتظام واہتمام کریں گے، اس کے لیے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے، (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے، "اقاموا الصلوٰۃ"۔ "اقاموا" کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔ "وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ" زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، زکوٰۃ کو عام کریں گے۔ معروف ومنکر کے لیے امرونہی "وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے"۔

آپ خیال کیجیے کہ معروف ومنکر کے لیے قرآن مجید میں اور حدیث میں امرونہی (حکم وممانعت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت ودعوت، ترغیب ومہائش کے الفاظ سے مختلف ہیں، استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں، عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امرونہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اس کے لیے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، امرونہی کے ہیں "یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ" (آل عمران:۱۰۴) "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ" (آل عمران:۱۱۴)

اور امرونہی طاقت چاہتے ہیں، امرونہی وہ مقام چاہتے ہیں، جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے، امر میں اور نہی میں ایک استعلاء ہے، امرونہی درخواست کے معنی میں نہیں، امرونہی حکم دینا اور روکنا، اس کا منصب ادا کرنے کے لیے اس کو کسی قدر طاقت وبالاتری حاصل ہو اور عزت واحترام کے نگاہ سے

دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت ونقصان کا خوف ہو اور اس کے لیے آدمی کے اندر قوت چاہیے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہیے، ایسا اعتماد چاہیے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے اور نہی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے، اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ ''اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا''۔ ''ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں'' ''ہم تبلیغ کرتے ہیں'' اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن قرآن جو معیار ومیزان ہے، اس میں الفاظ امر ونہی کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہیے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں، اس لیے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے، لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح، مکمل اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، جس کے نتیجے میں ''اَقَامُوا الصَّلوٰۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکوٰۃَ'' اور ''اَمَرُوْ بِالْمَعْرُوْفِ'' اور ''نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ'' کے الفاظ آئے ہیں''۔

ایمان تو بے کاوش تسخیر نہیں ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ نماز کا چرچا ہو، نماز کا رواج ہو، مسجدیں آباد ہوں، گھر گھر نماز پڑھی جائے اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا جائے اور زکوٰۃ دی جائے اور نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے، بغیر حکومت وطاقت کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہو سکتا اور تو یہ مسلمانوں کے ذمہ ہے، ہر زمانے میں کہ وہ مسلمانوں کی طاقت مہیا کرنے اور اس طاقت کو منظم کرنے اور طاقت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں، اس سے بالکل دستبردار ہو جانا، بلکہ بیزار ہو جانا اور اس کا انکار کرنا اور تحقیر کرنا اور نفی کرنا نہیں نہیں حکومت وکومت ہم کو کچھ نہیں چاہیے، ہمیں تو صرف بس عبدیت چاہیے، اس میں ہمارے داعی قسم کے لوگ ذرا غلو کرنے لگتے ہیں، یعنی وہ صرف اس پر زور دینے کے بجائے اثبات کے ساتھ نفی بھی لے آتے ہیں، یا نفی نہیں لاتے تو کم سے کم وہ استخفاف لے آتے ہیں، جس سے اہمیت کم ہو، کہ نہیں حکومت وغیرہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کے لیے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی، نہ پیغمبر آتے تھے، اصل تو عبودیت ہے، خدا سے دعا کی جائے، مانگا جائے، نیکی اختیار کی جائے، اعمال صالحہ کئے جائیں، آخرت کی تیاری کی جائے بس یہی لیکن ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی طاقت ضرور مسلمانوں کو پیدا کرنی چاہیے کہ وہ "اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" کرسکیں اور اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا کام ہو سکے۔ یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع معنی خیز اور فکر انگیز ہیں اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۴۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مشترک اخذ و تلخیص: ☆ تحفۂ پاکستان: ۴۶-۴۷ ☆ دعوت فکر و عمل: ۶۲-۶۳

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَ لَا بَنُوْنَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾
(الشعراء: ۸۹-۹۰)

''جس دن مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا)''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَ لَا بَنُوْنَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ'' جس دن مال کام آئے گا اور نہ اولاد کام آئے گی سوائے اس کے جو اللہ کے پاس ''قلب سلیم'' لے کر آئے گا۔

قول وعمل کا سب سے بڑا محرک

''ہم داعی و مبلغ ہوں، یا دین کے ترجمان یا شارح، ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے اخذ کی ہے، اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی...... اس لیے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کے لیے محرک کیا چیز ہوتی ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ نبی کی دعوت، جدوجہد اور قول وعمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی، کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یا وہ

ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے، بس مجھے سب کچھ مل گیا، طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور ﷺ بڑی امیدوں اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گذار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہ) آپ وہاں پہنچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداروں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کر دیا اور انہوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہو گئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے اور کیا ہوا، یہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں اسی حالت میں آپ نے یہ دعا فرمائی، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ، وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ، رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ"[1] (میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں) فرماتے ہیں کہ "اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں، اپنی کمزوری کا اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی، بے بسی و بے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے؟ ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالہ کرتا ہے؟ کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میری زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معاً فرماتے ہیں۔

"اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ غَیْرَ اَنَّ عَافِیَتَکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ"[2] اگر تو ناراض نہیں ہے، تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ

(۱-۲) کنز الاعمال

انسان ہوں تیری عافیت کا طالب ہوں، تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیاد ہوتی ہے، وہ رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہنچاتے ہیں اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہنچا دیا اور ہمارا رب ہم سے راضی ہوگیا، تو پھر ان کو بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا؟۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ "لَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا" "پچاس برس کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے" اور انہوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کر دیے، سورۂ نوح کی آیات پڑھیے "قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَارًا" "کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا" "ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا" "پھر میں نے انہیں اعلانیہ بھی کہا، اور مخفی طور پر بھی کہا"۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ "وَمَا آمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِیْلٌ" "ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے" جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، لیکن "وہ اس پر شاکی یا افسردہ خاطر نظر نہیں آتے اور اپنی محنت رائیگاں نہیں سمجھتے اور نہ اس سے خدا کے یہاں ان کے مقام، درجہ، قرب اور اولوالعزم پیغمبر ہونے میں کچھ فرق آتا ہے، خدا ان سے راضی تھا اور وہ اپنے خدا سے راضی تھے، خدا کا پیغام انہوں نے بندوں تک پہنچا دیا تھا اور راہِ خدا میں وہ کوشش کا حق ادا کر چکے تھے" ان کو اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا، وہ میں نے کر دیا، میں نے اپنے رب کو راضی کر دیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو

انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لیے سربلندی اور عزت وغلبہ کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن اس شرط پر کہ وہ ایمانی صفات سے متصف ہوں اور ان کا مقصد عمل صرف رضائے خداوندی ہو، نہ کہ عزت واقتدار کا حصول اور اس کے لیے کوشش کیونکہ سربلندی اور اقتدار اور حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں،

اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ "تِلْکَ الدَّارُ الآخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَایُرِیْدُوْنَ عُلُوّاً فِیْ الأرْضِ وَلاَ فَسَاداً. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ" (القصص:۸۳)'' یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے، جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں اور اچھا انجام متقین کے لیے ہے'' لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے'' وَلاَ تَھِنُوْا وَلاَ تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الأَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤمِنِیْنَ" (آل عمران:۱۳۹)'' ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تمہیں اعلیٰ ہو، تمہیں کو علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو'' اب دونوں میں تطبیق کس طرح دیں گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علو (سربلندی) چاہو، ہم علو دیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا اور تواضع اور ایثار اور قربانی سے کام لیا، اللہ تعالیٰ نے جتنا منظور تھا، ان کو علو عطا فرمایا۔

تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو اور رضائے الٰہی کے ساتھ اگر ساری دنیا کے فوائد اور ساری دنیا کے مفادات سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کامیابی ہے، اور رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلف کے اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارے لیے کافی ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہم السلام کے اس قول کا مطالعہ کریں، جس کو قرآن نے نقل کیا ہے، جس وقت آپ نے آخرت کا ذکر کیا ہے اور اس کی ہیبت وخوف کا تصور ذہن میں آیا ہے، قلبی جوش اور جذبات کا سیلاب رواں ہوگیا ہے، وہ فرماتے ہیں:'' وَلاَ تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ لاَ یَنْفَعُ مَالٌ وَلاَ بَنُوْنَ اِلاَّ مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" اور مجھے رسوا نہ کیجیے جس دن لوگ اٹھا کھڑے کیے جائیں گے، جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا وہ بچ جائے گا)

قلب سلیم جتانے کی ضرورت

اب اس'' قلب سلیم'' میں عقیدۂ توحید بھی آگیا کہ وہ شرک سے پاک ہوگا، زل و

بست سے پاک ہوگا، حسد اور بغض وکینہ سے پاک ہوگا اور تحقیر اور تکبر سے پاک ہوگا اس ''سلیم'' میں (اسکا ترجمہ مشکل ہے ایک لفظ میں) ''سلیم'' میں ساری چیزیں آگئیں "بقلب سلیم" یعنی عربیت کے لحاظ سے کہہ رہے ہیں کہ (جولوگ عربی الفاظ کے درجے سمجھتے ہیں، ان کے درجۂ حرارت کو سمجھتے ہیں) کہ ''سلیم'' سے بہتر یہاں پر ایک مفرد لفظ لانا مشکل ہے، لیکن اللہ کے لیے آسان ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف انہی لفظوں میں کی گئی ہے، "اِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ" (الصافات:۸۴) (جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے)

قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ رہنی چاہیے، ''اس لیے ہر اس چیز سے جو ''قلب سلیم'' کے منافی ہو اور جس کے صنم ومعبود بن جانے کا خطرہ ہو اور جو خدائے عز وجل کی محبت میں شریک وسہیم ہو، اس سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور اس سے ہر قیمت پر بچنا لازمی ہے''.... اس میں غیر اللہ کے مقابلے میں کوئی اور محرک، کوئی اور طاقت، کوئی اور خواہش نہ ہو اور برابر اپنے قلب کا احتساب جاری رہنا چاہیے کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادی مفادات، علو اور سربلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے، اقبال نے صحیح کہا ہے

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں (۱)

---

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء: ۸۹-۹۰ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ تحفۂ کشمیر: ۴۱-۴۶، سے تلخیص کی گئی ہے ☆ منصب نبوت: ۸۲ ☆ دستور حیات: ۲۹-۳۲، سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اپنے ایمان کا تحفظ ہے فریضہ اپنا

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر. اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ. وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا. وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾(الحج: ۳۹-۴۰)

’’جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے، ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دئے گئے، (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا، تو (راہبوں کے) صوامع اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں) کی مسجدیں، جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے، ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے، خدا اس کی مدد کرتا ہے، بے شک خدا توانا اور غالب ہے‘‘۔

کفار کے ساتھ جہاد وقتال کا پہلا حکم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ’’اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا‘‘ جب مسلمان

ہجرت کر کے مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ آئے، تھوڑی تعداد تھی اور جو وہاں کے رہنے والے اسلام لا چکے تھے، یا ان حضرات کے آنے کے بعد اسلام لائے، ان کو انصار کہا گیا، ان کی تعداد بھی تھوڑی تھی اور اس کے بعد اس میں بہت آہستگی سے اضافہ ہوتا رہا، اس وقت تک جو ظلم ہو رہے تھے مسلمانوں پر، اس کا اجتماعی طور پر مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، اس لیے کہ یہ حالات کے، مصلحت کے خلاف تھا اور یہ ایک طرح کی اجتماعی خودکشی ہوتی (ایک انفرادی خودکشی ہوتی ہے، ایک اجتماعی خودکشی ہوتی ہے کہ یہ چار یا پانچ سو آدمیوں کو، سات آٹھ سو آدمیوں کو حکم دے دیا جاتا کہ تم مقابلہ کرو) برابر وہ ظلم سہتے رہے ان واقعات کو سنتے رہے کہ مکہ معظمہ میں ہمارے ایمان لانے والے جو وہاں سے ابھی منتقل نہیں ہو سکے، ان کے ساتھ کیا زیادتیاں ہو رہی ہیں۔

تو ایک مدت تک جنگ کی اجازت نہیں دی گئی اور ہم نے کہا کہ دو وجہ سے، ایک تو ظاہری بات ہے، کہ اتنے اسلحہ بھی نہیں تھے، اتنی تعداد نہیں تھی اور تناسب ہونا چاہیے، حریفوں میں ایک تناسب ہونا ضروری ہے، وہ آدھے صحیح، لیکن آدھے تو ہوں، تو آدھے بھی نہیں تھے، تہائی بھی نہیں تھے اور دوسری یہ کہ جنگ، شہادت فی سبیل اللہ کا شوق کتنا ہے اور اس کو کتنی بڑی سعادت سمجھتے ہیں؟ اور اس کے لیے کس طرح جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) یہاں تک کہ ایک صاحبزادہ (جن کا نام رافع بن خدیج تھا اور جن کی عمر پندرہ سال تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی) وہ ذرا قد کے اچھے تھے، دوسرے صاحبزادے (سمرہ بن جندب) آئے، انہوں نے کہا، یا رسول اللہ ہمیں بھی اجازت دیجیے آپ۔ یہ کہاں جا رہے ہیں؟ ٹورنامنٹ میں جا رہے ہیں...؟ (معاذ اللہ مسجد میں کہنا بے ادبی ہے) سنیما جا رہے ہیں،؟ تفریح میں جا رہے ہیں؟ پکنک میں جا رہے ہیں؟ سمجھ رہے ہیں اور عرب، ہم آپ نہیں سمجھتے اتنا، جتنا عرب کے لڑکے سمجھتے تھے، فرق ہوتا ہے روایات کا، ماحول کا، اتنے دنوں سے یہاں کوئی جنگ نہیں ہوئی، جنگ عظیم اول میں تو آپ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، اکثر آپ میں سے اور جنگ عظیم ثانی بھی کچھ آپ کو یاد نہیں ہوگی اور ہوئی تو اس کا مرکز ہندوستان سے باہر تھا، لیکن عرب، عربوں کے بچے بھی، ذرا جن میں شعور پیدا ہوا وہ بھی جنگ کے معنی سمجھتے تھے۔ جنگ کے معنی یہ نہیں ہوتے لڑائی ''حرب'' کے معنی ہیں، کم سے کم زخمی ہونا، اس کے آگے بہت زیادہ زخمی ہو جانا، چور چور ہو جانا، اس کے آگے شہادت پانا، مر جانا اور باپ کا غم اور ماں کا رونا اور یہ سب جو اس کے لوازم ہیں، وہ ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ہمارے سامنے ہندوستان میں چیزیں پائی جاتی ہیں، آم کی فصل آ گئی، ہم خوب سمجھتے ہیں کہ آم کی فصل کس طرح آتی ہے؟ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فردوس تو میدانِ شہادت کے قرین ہے

لیکن اس کے بعد پھر جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ، جو خبیر و علیم ہے، وہ علیم وخبیر صرف ظاہری حالات کا، تعداد کا اور اسلحہ کا، جنگی طاقت کا نہیں، بلکہ قلوبی کیفیت کا بھی ہے، یعنی ان لوگوں میں جہاد کی صلاحیت پیدا ہوئی یا نہیں، جہاد کیلیے اللہ تعالیٰ کے نام پر، اللہ کے راستے میں جنگ کرنے کے لیے صرف مسلح ہونا، طاقت ور ہونا، منظم ہونا کافی نہیں، بلکہ شوقِ شہادت کا ہونا بھی ضروری ہے، شوقِ شہادت یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھائی جائے اور اس کو ثواب سمجھا جائے۔ یہ بات مسلمانوں میں ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ اگر آپ جنگِ بدر کے حالات سیرت کی کسی کتابوں میں پڑھیں، پھر جنگ احد کے حالات پڑھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا، یہ بھی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے فرمایا کہ تم چھوٹے ہو، انہوں نے عرض کیا کہ حضور آپ نے رافع کو اجازت دیدی اور مجھے واپس فرمادیا، حالانکہ اگر میری ان سے کشتی ہو تو میں ان کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہوں، آپ کشتی کرا کر دیکھیے دونوں میں، کشتی ہوئی، تو واقعی سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور اس طرح ان کو بھی غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔

جنگ کی تاریخ میں ایسے واقعات ملنے مشکل ہوں گے اور بڑی خوشامدوں سے بعض لوگوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت کی، اس لیے کہ آپ جانتے تھے، آپ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی اطلاع ہو کہ انشاء اللہ بچ کر آجائے گا، یہ بھی آپ کو اندازہ ہو، ہوسکتا ہے کہ خدا کے بتانے سے، کوئی علم غیب سے نہیں اور دوسرے یہ کہ اس کو اتنا شوق ہے کہ اس کو روکنا نہیں چاہیے اور اس کے ماں باپ کے لے بڑی سعادت کی بات ہے کہ اگر ایک شخص

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا) معلوم ہوا کہ فساد ہوگیا، چھوڑیے آم کو، یہ بہت دور کی چیز ہے، فساد ہوگیا، ہندو مسلم فساد ہوگیا، تو ہم سمجھے، کچھ جانتے ہیں کہ ہندوؤں نے زیادتی کی ہوگی، چند درجن آدمی مارے گئے ہوں گے۔ لیکن عرب کا بچہ ہوش سنبھالتے ہی جنگ کی صرف لوازم جو اس کے ہیں نتائج، بلکہ جنگ کے اشعار بھی اس کو یاد ہو جاتے ہوں گے، کتنے "مَلْحَمَة" جسے کہتے ہیں، شاہنامے کی طرح، جنگ کی جو بھی نظم کہی جاتی ہے، اس کو عربی میں "مَلْحَمَة" کہتے ہیں، کتنے "کتنے" ان کو یاد ہوں گے، جو ہمارے اچھے اچھے ادیبوں کو یاد نہیں۔

خاندان میں شہید ہو، پتہ نہیں کتنی پشتوں تک اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

سید احمد شہیدؒ کا بچپن میں شوقِ شہادت اور والدہ کی اجازت کے بارے میں ''منظورہ'' میں (یہ واقعہ) لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہندو مسلمانوں میں جنگ ہوگئی، سید صاحبؒ نے جانے کی آمادگی ظاہر کی، لیکن ایسی مائیں دنیا میں بہت کم ہوں گی، جو بیٹے کی جان کے امتحان میں پوری اتریں اور اس کو مرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے رخصت کریں، سید صاحب کو اللہ نے والدہ بھی ایسی دی تھیں، جو حضرت اسماء کا نمونہ تھیں! وہ تو صلح ہوگئی نوبت نہیں آئی ورنہ ماں کی طرف سے اجازت تھی کہ جائے اور یہاں بھی مشقیں کرتے تھے، جہاد ہی کے نام سے، اسی تکیے پر، کہ لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے، جیسے کہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے، میچ ہوتا ہے، تقسیم کر دیا کہ یہ حملہ کرے گا اور یہ ایک فریق اور یہ ایک فریق اور دونوں، ایک دوسرے سے جنگ کر رہے ہوں، معمولی ہتھیار، تلوار تو نہیں استعمال کر سکتے تھے، لکڑی وکڑی کہ اگر جہاد کا موقع ہوا تو تھوڑی بہت اس سے واقفیت ہونی چاہیے، تو یہ ذہن میں رہے۔

جہاد وقتال کی روح

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' ''اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے'' ایک بات تو یہ ہے کہ اس میں اذنِ الٰہی شامل ہونا چاہیے، یہ جنگ محض فتوحات کے لیے اور مالِ غنیمت کے لیے اور شہرت کے لیے اور عزت واختیار کے لیے اور انتقامی جذبہ سے نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی روح یہ ہے کہ ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ'' دیکھیے قرآن مجید کا کوئی لفظ نہ زائد ہے، نہ کم ہے، یہ اعجاز ایسا ہے (کہ کوئی شخص اس پر کام کرے، اس پر کام نہیں ہوا) کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اس کے تحت اور اس کے پیچھے معانی کا ایک لشکر ہے اور اتنے نکات ہیں کہ آدمی اس کا استقصاء کر ہی نہیں سکتا ہے، تو اس کو شروع اس (اذن) سے کیا ہے، تاکہ یہ ہمیشہ ذہن میں رہے کہ قیامت تک مسلمانوں کی حالت، ان کی جنگی طاقت، ان کا جہاد کا جذبہ، ان کے فتح حاصل کرنے کے مواقع کم ہوں، زیادہ ہوں، کچھ ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے حکم سے لڑ رہے ہیں۔

اس لیے شروع ہی اس سے کیا اور یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں قرآن مجید میں آئی ہے، ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' ''اجازت دی گئی'' معلوم ہوا کہ اجازت پر موقوف تھی یہ بات (اب آج کل کیا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں کن کن مصالح سے، اور کن کن مطلبوں سے اور مادی فوائد کے لیے، شہرت کے لیے اور پارٹی وسیاست کے لیے لڑائیاں ہوتی ہیں)۔

اب دوسری بات سوچنے کی ہے کہ قتال کی، جنگ کی ابتداء وہاں کفار کی طرف سے ہوئی تھی، یہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی، یہ جو الزام لگاتے ہیں مستشرقین اور متشککین وغیرہ کہ مسلمانوں کو شوق تھا لڑنے کا اور انہوں نے دروازہ کھولا لڑائی کا، حالانکہ اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء وہاں سے ہوئی تھی اور ہو رہی تھی، جنگ ہو رہی تھی، اس لیے کہ ''يُقَاتَلُوْنَ'' یہ مضارع کا صیغہ ہے، یہ نہیں ہے کہ ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ قُوْتِلُوْا'' اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی گئی ہے، نہیں ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ'' اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے برابر جنگ ہو رہی ہے، جن سے جنگیں کی جاتی ہیں ''بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' اس بنا پر کہ وہ مظلوم ہیں، معلوم ہوا کہ اس اجازت کی وجہ یہ تھی کہ یہ مظلوم تھے، جن کی طرف سے ابتداء نہیں تھی اور یہ بے قصور تھے اور انہوں نے کوئی فساد نہیں کیا تھا اور جنگ کے مستحق نہیں ہوئے تھے۔

''وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ'' اور اسی اجازت کے ساتھ یہ بھی کہا گیا، یہ بھی ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ''اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ'' سن لینا چاہیے.....لوگوں کو..کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قدرت رکھتا ہے، تو اب جو مدد ہوگی، وہ اللہ کی قدرت سے ہوگی، ان کی بہادری سے، ان کے جنگ کی مشق سے اور ان کے اسلحہ سے نہیں ہوگی۔

جہاد وقتال کی ضرورت

آگے فرماتا ہے کہ ''اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ'' ''وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ناحق''۔ جو مہاجرین نکلے تھے مکہ معظمہ سے، یہ کوئی مدینہ طیبہ کی سیر کے شوق میں نہیں نکلے تھے اور نہ وہاں معاشی مقاصد کے لیے، بلکہ بعض حیثیتوں سے

مکہ معظمہ فائق تھا، بعض حیثیتوں سے مدینہ، یا مکہ معظمہ ہی کے قافلے جاتے تھے، "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ" کہا گیا ہے، ایک شام جاتا تھا، ایک یمن جاتا تھا تو "اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ" "جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر کسی حق کے"

جرم ان کا کیا تھا "اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" بس صرف اس جرم میں "وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے" وہی ہماری پرورش کرتا ہے، اسی نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں پالتا ہے تو یہاں پر بتادیا کہ جہاد کی اجازت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مظلوم ہیں۔

جہاد کی حکمت ومصلحت

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ" اور یہ سلسلہ جہاد کا یعنی جنگ کی اجازت دینے کا سلسلہ جو قدیم سے چلا آرہا ہے کہ داعیانِ حق کو اور اہل ایمان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ مدافعت کریں، نہ کبھی ضرورت ہو تو حملہ بھی کریں، یہ بھی یاد رکھو..! کہ (ہمارے استشراقی مزاج مسلمانوں نے جہاد کو بالکل مدافعت کی جنگ ثابت کیا ہے، یہ بات نہیں ہے) جہاد جہاں بھی ہوا ہے، وہ ضرورتاً، اضطراراً ہوا ہے، یہ بات نہیں ہے، اب روم پر جو حملہ ہوا، شام پر حملہ ہوا، ایران پر حملہ ہوا، عراق پر حملہ ہوا، یہ سب وہاں کے نظام کو بدلنے کے لیے اور وہاں دین کی دعوت کو آسان بنانے کے لیے اور اس کے لیے زمین تیار کرنے کے لیے اور ظالموں کے ظلم سے وہاں کی رعیت کو چھڑانے کے لیے، یہ جنگیں ہوئی تھیں، تو یہ مدافعت تھی اس میں اقدام بھی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا" اور اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو عبادت گاہوں کی حفاظت بھی نہیں ہو سکتی تھی "اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کو نہ روکتا بعض کو بعض کے ذریعہ سے تو نہ خانقاہیں رہتیں اور نہ سجدہ گاہیں رہتیں اور نہ مسجدیں رہتیں "صَوَامِعُ، بِيَعٌ، صَلَوٰتٌ، مَسَاجِدُ" یہ مختلف فرقوں اور مذاہب کے اصطلاحی نام ہیں (ہم لوگ تو مساجد صرف کہتے ہیں اور مامور ہیں اس پر کہ صرف مسجد کہیں، کوئی لفظ اس کے علاوہ صحیح نہیں ہے، یہاں تک کہ عبادت گاہ بھی کہنا صحیح

نہیں ہے، یہ ہندو تخیل ہے) مگر کسی کے یہاں "صوامع" کا لفظ ہے، کسی کے یہاں "بیع" کا لفظ ہے، کسی کے یہاں "صَلَوَاتٌ" یہ بڑی تفسیروں میں دیکھنے کی چیز ہے (اور قرآن مجید کی لغت، مثلاً راغب کی "مُفْرَدَاتُ غَرِیْبِ الْقُرْآنِ" بہت ہی مستند اور فاضلانہ ہے) اگر اللہ تعالیٰ پہلے سے لوگوں کو اس طرح نہ روکتا ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے تو عبادت گاہیں، جو مختلف ناموں کی تھیں، مختلف مذاہب کی تھیں، کوئی باقی نہیں رہتی، جن میں کہ اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، بہر حال نام تو صرف اللہ کا لیا جاتا تھا۔

مدد کب اور کیسے آئے گی.....؟

"وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" اور اللہ تعالیٰ ضرور بضرور مدد کرے گا اس کی، جو اس کی مدد کرتا ہے، دیکھئے اللہ کی مدد کا استحقاق پیدا کرنے کے لیے اللہ کی مدد کے لیے کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ" اور وہ کیسے مدد کر سکتا ہے بڑے قوی مقابل کے مقابلے میں اس کے لیے فرماتا ہے اور وہ اس کی وجہ بیان کرتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ" "بیشک اللہ تعالیٰ قوی اور عزیز ہے" دیکھو اس میں دونوں یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اور صفات ہیں، لیکن یہاں پر قریب ترین اور مناسب ترین اسماء کا انتخاب کیا گیا، ﴿قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ حکیم، علیم، خبیر، سب کچھ کہا جا سکتا ہے، رحیم، مگر یہاں پر ضرورت ہے "قوی" و "عزیز" کی، یہاں وہ طاقت مدد کر سکتی ہے جو قوت رکھتی ہو، وہ مدد کر سکتی ہے جو صاحب قوت ہو اور صاحب غلبہ ہو اور "قوی" کے ساتھ "عزیز" بھی لگا دیا، صرف "قوی" ہونا کافی نہیں ہوتا، کتنے قوی ہیں جو شکست کھاتے ہیں یا بیٹھ رہتے ہیں، یا پیچھے ہٹ جاتے ہیں، تو "قوی" کے ساتھ "عزیز" بھی ضروری ہے، عجیب اس میں تلازم ہے، وہ "قوی" ہی نہیں صرف بلکہ "عزیز" غالب ہونے والا ہے، ایسا "قوی" ہے کہ اس کو غلبہ ہی حاصل ہوتا ہے۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۳۹-۴۰ (غیر مطبوعہ)

حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں حاجت روا

﴿وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰)
''اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، وہی نام لے کر اس کو پکارو''

اسمائے حسنیٰ

اللہ کے وہ اچھے اچھے نام (اسمائے حسنیٰ) جن میں سے بہت سے قرآن شریف میں آئے ہیں اور بہت سے اللہ کے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں فرمایا ہے: ''وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا'' ''اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، وہی نام لے کر اس کو پکارو''

یہ نام گنتی میں ننانوے کی تعداد کو پہنچتے ہیں، قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارہ میں ایک جگہ ان میں سے چودہ نام اس طرح لیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو وجد سا آنے لگتا ہے اور وہ پڑھتے ہوئے جھوم اٹھتا ہے، یہاں وہ آیات نقل کی جاتی ہیں

''هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ. سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ

الْحُسْنٰى. يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" (الحشر: ۲۲-۲۴)

''وہ اللہ ایسا (پاک ذات) ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا وہی مہربان (اور) رحم والا ہے، وہ اللہ ایسا (پاک) ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (تمام جہاں کا) بادشاہ ہے، پاک ذات ہے، (تمام) عیبوں سے بری ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، زبردست ہے، بڑا دباؤ والا ہے، بڑی عظمت رکھتا ہے، یہ لوگ جیسے جیسے شرک کرتے ہیں، اللہ (کی ذات) اس سے پاک ہے، وہی اللہ (ہر چیز کا) خالق (ہر چیز کا) موجد (مخلوقات کی طرح طرح کی) صورتیں بنانے والا ہے، (اس کی اچھی اچھی صفتیں ہیں اور اسی سبب سے) اس کے اچھے اچھے نام ہیں، جو (مخلوقات) آسمان وزمین میں ہے، (سب ہی تو) اس کی تسبیح (وتقدیس) کرتے ہیں، وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔''

یہ نام برائے نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ''جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے، جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، جنت اس کا انعام ہے اور دوزخ اس کی سزا، جس کے لیے چاہتا ہے، رزق میں کشائش کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، آسمان وزمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے، آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار خوب جانتا ہے، جو سراپا جمال، سراپا جلال، سراپا کمال اور محبت ورحمت ہے''۔ (۱)

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خوبیوں، قدرتوں، کمالات اور اوصاف کا مالک ہے، اس کو اپنی مخلوق سے کیسا تعلق ہے، وہ ان پر کتنا مہربان ہے،.........وہ کتنا قابلِ محبت، مستحقِ اطاعت وعبادت اور تعظیم واحترام ہے، کیا چیز ہے جو اس کے پاس نہیں اور اس کے

(۱) عروج وزوال کا اثر: ۱۰۴

احاطۂ قدرت میں داخل نہیں؟ کائنات میں اس سے زیادہ محبت کرنے والا، اچھائی کی قدر کرنے والا، رحم کرنے والا، انصاف کرنے والا، چھوٹی بڑی چیز کا جاننے والا اور بڑی سے بڑی چیز اور مشکل سے مشکل کام کو نیست سے ہست میں لانے والا اور ناممکن کو ممکن بنادینے والا، اس کے علاوہ کون ہے؟ پھر کیوں نہ اس سے محبت کی جائے، اس کے سہارے جیا جائے، زندگی بھر اس کا دم بھرا جائے اور اس کے منشا پر چلا جائے، اپنی جان، اپنے ماں باپ اور اولاد اور پیاری سے پیاری چیز سے زیادہ اس سے محبت کی جائے، پھر اس سب کے ہوتے ہوئے اس کے سوا کسی کی بندگی کرنے کسی سے دعا و التجا کرنے اور کسی کو کارساز و مشکل کشا سمجھنے کا کیا جواز ہے؟

خدا کی صفات سے واقفیت ضروری ہے

رب اور بندہ کے تعلق کو سمجھنے کے لیے بھی خدا کی صفات (Attributes) سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے کہ تعلقات ہمیشہ صفات کے تابع ہوتے ہیں، صفات ہی سے ان کی نمود ہے، اگر ہم کو کسی دو ہستیوں یا دو شخصیتوں کے صفات کا علم نہیں ہے اور ہم حسن سلوک اور احسان مندی کے اس رشتہ سے واقف نہیں، جو ان دونوں کے درمیان قائم ہے، تو ہم ان تعلقات کی صحیح نوعیت کبھی نہیں سمجھ سکتے، وہ تمام تعلقات جن کو ہم زندگی میں برتتے ہیں جن سے قانون کی تشکیل ہوتی ہے اور جو کسی تہذیب و معاشرہ کو وجود میں لاتے ہیں، وہ سب درحقیقت ان ہی صفات کے تابع ہیں، جن کی کارفرمائی انسانی معاشرہ پر ہم کو نظر آرہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفے اور تمام مذہبوں اور شریعتوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ زور خدا کی صفات پر دیا ہے، اس کے بعد عبادات، طاعات اور فرائض و معاملات کی تفصیل بیان کی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفات کریمہ، اسمائے حسنیٰ، اس کے افعال و تصرفات، اس کی قوت و قدرت، اس کی صنعت و خلاقی، اس کے لطف و رحمت، اس کی محبت و رافت،

اس کے جُود وکرم، اس کے عفو ودرگذر، اس کے عطاء ومنع، اس کے نفع وضرر، اس کے علم و معرفت اس کے قُرب ومعیت، اس کی اِحاطۂ قدرت اور اس کے قبول ونوازش کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جمال وجلال، کمال ونوال اور حسن واحسان کی آخری مثال بندہ کے سامنے آجاتی ہے۔ "وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الاَعْلیٰ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" (النحل:۶۰) اللہ کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے، "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ ۔ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" (الشوریٰ:۱۱) "کوئی چیز اس کے مثل نہیں، اور وہی ہر بات کا سننے والا ہے، (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے"۔

محبت وشوق کا سرچشمہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفات وافعال اور اس کے انعامات کا اتنی کثرت سے ذکر اور اعادہ وتکرار اور اس قدر شرح وبسط کے ساتھ بیان کا اصل راز یہی ہے، اس لیے کہ صفات ہی محبت وشوق کا سرچشمہ ہیں، یہی اثبات ہے (Assertion) (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کریمہ کا بیان اور اس کے دلائل وشواہد کا ذکر) جس سے انسان کے ذوق وشوق کو غذا ملتی ہے اور محبت جوش مارنے لگتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی یہ صفات عالیہ اور اسمائے حسنیٰ ہمارے سامنے نہ ہوں (جن سے قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں اور جن پر عشاق و محبین ہمیشہ سر دُھنتے رہے، عارفین ان کے ترانے گاتے رہے، ذاکرین ان کی تسبیح میں مشغول رہے اور ان کا کلمہ پڑھتے رہے اور اہلِ معرفت وحقیقت زندگی بھر اس سمندر کے تہ نشین موتی چنتے رہے) تو ان کا دین ایک چوبی اور آہنی نظام کی طرح ہو جاتا، جس کی دلوں میں کوئی جگہ نہ ہوتی، یہ نہ اُن میں کوئی جذبہ اور گرم جوشی پیدا کرسکتا، نہ ان کے دلوں کو گرم اور نہ آنکھوں کو نم کرنے کی صلاحیت رکھتا، نہ اس سے دعا میں انابت ورقت کی کیفیت ہوتی، نہ دل میں سرفروشی کا جوش۔

نہ سر میں اس کا سودا، اس کے بغیر خدا اور بندہ کا تعلق ایک مردہ اور محدود تعلق ہے، اس میں نہ کوئی زندگی ہے، نہ روح، نہ لچک نہ وسعت، زندگی ایک ایسی خشک سخت اور

بے جان چیز ہے۔[1]

جو لذتِ آرزو، متاعِ شوق، جنون وشوریدگی کی دولت سے بالکل تہی دامن اور محروم ہے پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانی خدا کو مانتے ہیں مگر اس سے ان کو کوئی قلبی لگاؤ، گہرا تعلق اور وابستگی نہ تھی، خشوع وخضوع کی کیفیت بالکل نہیں تھی۔ میں خشوع وخضوع کی کمی تھی اور ان کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے اور یہ کہ وہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے، تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں صناعوں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے، لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع وخضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خدا کو اس کائنات میں ابدی طور پر اور اب بھی متصرف اور کارفرما اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے۔ یونان اور بعض دوسرے ایشیائی ملکوں میں اسی پر بس نہیں کیا گیا کہ خدا کو اس کی صفات (تعریفوں اور خصوصیتوں) سے الگ کر کے ایک مجرد (تنہائی اور خیالی)(Abstract)۔

ہستی کی طرح مانا گیا، بلکہ اُس کی ہر صفت کے لیے (جو زندگی کی ایک ضرورت ہے اور انسان اس کا محتاج ہے) ایک الگ خیالی وجود اور پیکر (Imaginary but perfect being) تجویز کر لیا گیا، مثلاً رحم وشفقت کا فلاں دیوتا ہے، محبت کا فلاں، پانی برسانے والا اور کھیتی سرسبز کرنے والا فلاں، دشمن پر فتح دینے والا اور کامیاب کرنے والا فلاں، اولاد عطا کرنے والا اور قسمت بنانے اور بگاڑنے والا فلاں، یہاں تک کہ بعض بعض بیماریوں (چیچک وغیرہ) کو اور رب العالمین (سب جانوں کا پالنے والا اور اُن کو اُن کی ضروریات مہیا

(1) اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُن کا سارا زور اس پر تھا کہ خدا یہ نہیں ہے، خدا یہ نہیں ہے، مگر خدا کیا ہے؟ اس کے کیا صفات و کمالات ہیں؟ اس کا ان کے یہاں بہت کم ذکر آتا ہے، اُن کا سارا زور نفی (Negation) (نہیں) پر تھا، اثبات (Assertion) (ہے) پر نہیں، ماہرینِ نفسیات اور فلسفہ و اخلاق اور مذہب و روحانیت کے واقفین جانتے ہیں کہ ایک ہزار "نہیں" ایک "ہاں" کے برابر نہیں، عظمت واحترام، جذب وشوق، امید ورجا اور طلب وسوال کے لیے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے، کہ خدا ایسا ہے، ایسا ہے، اس کی صفات وقدرت، محبت رحمت کے علم کی ضرورت ہے۔

کرنے والا) خدا ایک خیالی ہستی اور معطل و جود بن کر رہ گیا۔

اسلام نے اس کے برخلاف ساری تعریفوں اور خوبیوں کا مستحق، ہر طرح کی قدرت کا مالک، نفع و ضرر، موت و حیات، رزق، صحت و مرض، فقر غناء اور فتح و شکست کا دینے والا اسی کو قرار دیا اور مختصر ترین، لیکن جامع ترین الفاظ میں قرآن میں کہہ دیا گیا "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (الاعراف: ۵۴) "یاد رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا، اسی کا کام ہے اس کارخانہ عالم کا چلانا اور اس کا انتظام کرنا" اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اسمائے مبارکہ کے فیوض و برکات، انوار و اسرار، اخلاق و آثار نصیب فرمائے۔ (آمین)[(۱)(۲)]

(۱) اسمائے حسنیٰ: ۳-۱۱

(۲) مزید تفصیل کے لیے مطبوعہ کتابچہ "اسمائے حسنیٰ" ملاحظہ ہو: اخذ و تلخیص: ☆ عروج و زوال کا اثر: ۱۰۴ ☆ اسمائے حسنیٰ: ۳-۱۱

واقعۂ اسراء ومعراج

﴿مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی. لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی﴾

(النجم: ۱۷-۱۸)

''ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی، انہوں نے اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی، راتوں رات آپ کو قدرتِ غیبی کے ساتھ مسجد حرام لے جایا گیا، وہاں سے مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا، اس کے بعد ان مقاماتِ قُرب واختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیاء کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی"۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت وعزت افزائی تھی، جو آپ کی دل داری ودل نوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین وناقدری اور بے گانگی وبیوفائی کی تلافی کے لیے تھی، جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گزرے تھے۔

جب صبح ہوئی تو آپؐ نے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر دی، قریش نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا، اس کو ایک محال اور ناممکن امر قرار دیا اور آپ جھٹلایا اور مذاق اڑایا، حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر کہا کہ اگر آپؐ نے ایسی بات کہی ہے تو سچ کہی ہے، تم کو اس پر تعجب کیوں ہے؟

خدا کی قسم آپ مجھے یہ خبر دیتے ہیں کہ وحی آپ کے پاس دن رات کے کسی حصہ میں آسمان سے زمین تک آجاتی ہے، تو میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، جو اس سے بھی مشکل اور بعید ہے جس پر تم لوگ تعجب کرر ہے ہو۔

معراج کے بلند و لطیف مطالب و معانی

واقعۂ معراج محض ایک جزئی و ضمنی واقعہ نہ تھا، جس میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالی نے بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپ کے سامنے آگئی، نبوت کے اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں اور اس میں بہت دور رس اشارات کئے گئے ہیں، یہ دونوں سورتیں، سورۂ اسراء اور سورۂ نجم، جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں قبلوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق و مغرب کے امام اور اپنے پیش رو تمام انبیاء کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانی کے رہبر و رہنما ہیں، آپ کی شخصیت اور آپ کے سفر معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجدِ حرام مسجدِ اقصیٰ سے ہم آغوش ہوگئی، آپ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپ کی امامت کی ابدیت اور ہر طبقۂ انسانی کیلیے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشاندہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی اس امت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیتِ عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے، جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔

واقعۂ معراج دراصل ایک محدود، مقامی اور عارضی نوعیت اور نبوت کی ابدی اور عالمگیر شخصیت کے درمیان خطِ فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر رسول اللہ ﷺ،

کوئی قومی یا مقامی لیڈر، کوئی ملکی ووطنی رہنما، کسی خاص نسل کے نجات دہندہ اور کسی نئی شوکت وعظمت کے بانی ہوتے تو آپ کو اس معراجِ آسمانی کی ضرورت نہ تھی، اس کے لیے آپ کو نہ آسمان وزمین کی وسیع بادشاہت کے سیر ومشاہدہ کی حاجت تھی، نہ اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے ذریعہ آسمان وزمین کا یہ نیا تعلق قائم ہو، اس وقت آپ کی یہ سرزمین، یہ ماحول اور یہ سوسائٹی آپ کیلیے کافی ہوتی، اس کو چھوڑ کر آپ کو کسی اور خطۂ زمین کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، نہ کہ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی یا مسجدِ اقصیٰ تشریف لے جانے کی جو آپ کے شہر سے بہت دور اور عیسائی مذہب اور طاقتور رومن شہنشاہی کے زیر اقتدار تھا۔

واقعہ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور کوششوں کا دائرہ ان کے ملک یا ان کی قوم تک محدود رہتا ہے اور ان سے صرف انہیں نسلوں اور قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے، جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور اسی ماحول تک ان کا اثر باقی رہتا ہے، جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں، آپ جس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہنچاتے ہیں اور ان سے پوری نوعِ انسانی (زمانہ وتاریخ، رنگ ونسل اور ملک وقوم سے قطع نظر) سرفراز وسربلندی ہوتی ہے، اور اس کی قسمت جاگتی ہے''۔(۱)

(۱) نبی رحمت: ۱۸۹-۱۹۲

ختمِ نبوت

انعامِ خداوندی اور امتِ اسلامیہ کا امتیاز

﴿وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ . وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (الاحزاب: ۴۰)

''محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کردینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے''۔

وہ صفات جو دائمی نبی اور آخری رسول کے ہو سکتے ہیں

''قرآن مجید نے سلسلۂ نبوت کے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہونے اور آپ کے بعد کسی نبی کی بعثت کی عملاً ضرورت نہ ہونے کے اظہار کے لیے گوناگوں اور نہایت بلیغ اسالیب بیان اختیار کیے ہیں، جو بیک وقت قلب و دماغ کو پورے طور پر اپیل کرنے والے ہیں، اس کے لیے کبھی تو قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کے خصائص و اوصاف ایسے انداز میں بیان کیے ہیں، جن سے عقل سلیم رکھنے والا ہر انسان بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ آپ ایک زندۂ جاوید پیغمبر اور قیامت تک کے لیے قابل تقلید نمونہ اور مثالی

شخصیت ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ. وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" "محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کردینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے"۔

اس آیت کا آخری جزء "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نمونہ ہے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ ایک پیغمبر قیامت تک کے لیے کیسے کافی اور مختلف انسانی نسلوں کے لیے رہنما اور اسوۂ کامل ہو سکتا ہے اور اس کی شریعت و تعلیمات کس طرح تمام انسانی ضروریات، نئے نئے تقاضوں اور عہد بعہد کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب اس مختصر لفظوں میں دے دیا گیا کہ "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا"

قرآن نے آپ کے آخری نبی ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے اس قوم کی زبان اور تعبیرات سے کام لیا ہے، جن کی زبان میں وہ اترا ہے اور جو اس کے اولین مخاطب اور اس کے سمجھنے اور پھر دنیا کو سمجھانے اور بتانے پر مامور تھے، یہ زبان ان کے درمیان رابطے، بول چال اور ادائے مطلب کی زبان تھی، لیکن اس زبان کی محیر العقول وسعت وصلاحیت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس میں کمال وانتہا بتانے والا کوئی لفظ "خاتم" سے بہتر موجود نہیں اور اس مطلب کے لیے یہی لفظ گفتگوؤں اور شعروادب میں ان کی نوک زبان رہتا تھا، اسی لیے ان کی زبان میں خاتم، ختام اور ختم کے وہی معنی پائے جاتے ہیں، جو قرآن مراد لیتا ہے، یعنی یہ کہ رسول اللہ ﷺ آخری رسول اور خاتم الانبیاء ہیں، جن کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں"۔ (۱)

عقیدۂ ختم نبوت کا فیض

"یہ عقیدہ کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں اور یہ کہ اسلام خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے، ایک انعام

(۱) منصب نبوت: ۲۰۵-۲۰۶

خداوندی اور موہبتِ الٰہی تھا، جس کو خدا نے اس امت کے ساتھ مخصوص کیا، اسی لیے ایک یہودی عالم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس پر بڑے رشک اور حسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ قرآن میں ایک آیت ہے جس کو آپ لوگ پڑھتے رہتے ہیں، اگر وہ ہم یہودیوں کی کتاب میں نازل ہوتی اور ہم سے متعلق ہوتی تو ہم اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اپنا قومی تہوار اور یوم جشن بنا لیتے، اس کی مراد سورۂ مائدہ کی اسی آیت ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:۳) سے تھی، جس میں ختم نبوت اور تکمیل نعمت کا اعلان کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نعمت کی جلالت و عظمت سے اس اعلان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا، صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں کسی نئے یوم مسرت اور تہوار کی ضرورت نہیں، یہ آیت خود ایسے موقع پر نازل ہوئی ہے، جو اسلام میں ایک عظیم الشان اجتماع اور عبادت کا دن ہے، اس موقع پر دو دو عیدین جمع تھیں، یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور روز جمعہ۔

اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو تاریخ اسلام کی طویل مدت اور عالم اسلام کے وسیع ترین رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہیں، اسی عقیدہ کا فیض تھا کہ اسلام ان مدعیانِ نبوت اور محرفین اسلام کا بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا، جو تاریخ کے مختلف وقفوں اور عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے، ''ختم نبوت'' کے اسی حصار کے اندر یہ ملت ان مدعیوں سے دستبرد اور یورش سے محفوظ رہی، جو اس کے ڈھانچے کو بدل کر ایک نیا ڈھانچہ بنانا چاہتے تھے اور وہ ان تمام سازشوں اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کر سکی، جن سے کسی پیغمبر کی امت اس سے پہلے محفوظ نہیں رہی اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی دینی اور اعتقادی وحدت اور یکسانی قائم رہی، اگر یہ عقیدہ اور یہ حصار نہ ہوتا تو یہ امتِ واحدہ ایسی مختلف اور متعدد امتوں میں تقسیم ہو جاتی، جن میں سے ہر امت کا روحانی مرکز الگ ہوتا، علمی و تہذیبی سرچشمہ الگ ہوتا، ہر ایک کی الگ تاریخ ہوتی، ہر ایک کے الگ اسلام اور مذہبی پیشوا اور مقتدا ہوتے، ہر ایک کا الگ ماضی ہوتا۔

ختم نبوت کا زندگی اور تمدن پر احسان

عقیدۂ ختم نبوت درحقیقت نوع انسانی کے لیے ایک شرف و امتیاز ہے، وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوع انسانی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے، اب انسانی معاشرے کو کسی نئی وحی، کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں، اس عقیدے سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے اور اب دنیا کو اس سے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں، اب دنیا کوئی وحی کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے اور خدا کے نازل کیے ہوئے دین و اخلاق کے بنیادی اصولوں پر زندگی کی تنظیم کے لیے زمین کی طرف اور اپنی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے، عقیدۂ ختم نبوت انسان کو پیچھے کی طرف لے جانے کے بجائے آگے کی طرف لے جاتا ہے، وہ انسان کے سامنے اپنی طاقتوں کو صرف کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ انسان ہمیشہ تذبذب و بے اعتمادی کے عالم میں رہے گا، وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھے گا، وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن اور متشکک رہے گا، اس کو ہر مرتبہ ہر نیا شخص یہ بتلائے گا کہ گلشنِ انسانیت اور روضۂ آدم ابھی تک نامکمل تھا، اب وہ برگ و بار سے مکمل ہوا ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ جب اس وقت تک یہ نامکمل رہا تو آئندہ کی کیا ضمانت ہے؟ اس طرح وہ بجائے اس کی آبیاری اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے متمتع ہونے کے نئے باغبان کا منتظر رہے گا، جو اس کو برگ و بار سے مکمل کرے۔" (۱)(۲)

---

(۱) قادیانیت: ۱۵۱-۱۵۳

(۲) اخذ و تلخیص: ☆ منصب نبوت: ۲۰۵-۲۰۶ ☆ قادیانیت: ۱۵۱-۱۵۳

باب چہارم

حقائق وعبر

اللہ کی کتاب قرآن مجید

وحی کا وہ تنہا مجموعہ ہے، جو اس وقت پوری اصلیت کے ساتھ انسانوں کے ہاتھ میں ہے اور جو ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، جس کی طاقت اب بھی........ پوری دنیا کے دلوں کو گرما سکتی ہے، جس کے مضامین وعلوم کی وسعت اب بھی وقت کی ضروریات ومسائل پر حاوی ہے، جو انتہائی بلند اور خدائی علم کے شایانِ شان ہونے کے باوجود عام فہم اور ہر وقت قابل عمل ہے، جس کی زبان ابھی دنیا میں زندہ ہے اور جس کے الفاظ کی تشریح کے لیے کسی قیاسی اور تاریخی اکتشاف کی ضرورت نہیں"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں: ۱۱۴)

وہ خدا کی ذات ہے ہر شئی ہے جس کے ہاتھ میں

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ. وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران. ۲۶-۲۷)

''کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے (اور) بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو رات کو دن میں داخل کرتا اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بیجان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے''۔

اللہ تبارک وتعالی کی کارسازی کہ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جب یہ اندازہ ہوا کہ ناطقہ سربہ گریباں ہے اور عقل انگشت بدنداں ہے، وہاں قرآن نے مشکل کشائی کی، اس موقع پر بھی قرآن ہی نے دستگیری کی، خدا اس پڑھنے والے کو جزائے خیر دے کہ جس نے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں پڑھیں، مجھے درد کی دوا مل گئی، مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا، مجھے

ہر مایوسی کا ازالہ، ہر مایوسی کا تریاق مہیا ہوگیا، اس کے بعد نہ مایوسی کی ضرورت، اس کے بعد نہ اس کی ضرورت کہ دل کے سو ٹکڑے ہوں، اللہ نے اس آیت میں، درد بھی دیا اور دوا بھی دی، سوال بھی ہے اور جواب بھی ہے۔

خوشا بخت شور ید گان غمش
اگر ریش بینند د گر مرہمش

جہاں زخم ہے، وہاں مرہم بھی ہے اور وہ مرہم غالب ہے، درد سے بڑھ کر دوا ہے اور مرض سے بڑھ کر علاج ہے، امتوں کے لیے اور قوموں کے لیے تہذیبوں کے لیے، صلاحیتوں کے لیے صلاحیت رکھنے والے انسانوں کے لے خاص طور پر دعوت و پیغام رکھنے والے انسانوں کیلیے خاص طور پر دعوت و پیغام رکھنے والی ملتوں کے لیے اس میں سب کچھ موجود ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے "قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی اتنا بلند ہوتا ہے کہ فلاں قوم اس صلاحیت کی، اس معیار کی وہ برسر عروج تھی، ایک دوسری قوم آئی جو وہ صلاحیت نہیں رکھتی تھی، اس کو کہاں سے یہ استحقاق تھا اور اس نے یہ کیسے، یہ انقلاب لے آئی اور کس طریقہ سے وراثت بن گئی اور یہ تخت سلطنت کس نے بچھایا تھا اور کون اس پر بیٹھ گیا، سب کا جواب دیدیا" قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" کوئی ہے ہی نہیں، کہاں کا، کس کے ہاتھ سے کس ہاتھ کی طرف گیا، نہ کسی ہاتھ نے دیا، نہ کسی ہاتھ نے لیا۔

کار زلف تست مشک افشاں اما عاشقاں
مصلحت را بر آہو چنیں بستہ اند

یہ تو اسی قدرت کے کھیل ہیں، اس میں کسی کی کوئی خوبی ہے اور نہ اس میں کسی کمال و قابلیت کو دخل ہے یہ تو وہ دینے والا اور وہ دلانے والا ہے، اس نے ایک ہاتھ سے لیا اور دوسرے ہاتھ کو دے دیا، اس میں بڑی تسکین کی چیز ہے کہ جب دو بچے بیٹھے ہوں تو ان میں کوئی بڑا ایک بچے کے سر سے اتار کر ٹوپی دوسرے کے سر پر رکھ دے، تو اس میں حیرت

کی کوئی بات نہیں، نہ بچے کی شکایت کرنی چاہیے، نہ اس کو فخر کرنا چاہیے کہ اس کے سر پر ٹوپی آئی اور جو ہاتھ اس سر سے اتار کر اس سر پر رکھ سکتا ہے، وہ اس سر پر بھی اتار کر دوسرے سر پر رکھ سکتا ہے، تو فرمادیا "قُلِ "اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" اے اللہ، اے سلطنتوں کے حقیقی مالک، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آذری

"تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ" تیرے اختیار میں ہے، تو جس کو چاہے سلطنت سے نوازے" یہ نہیں کہا کہ یہ لیتا ہے اور وہ دیتا ہے، وہ ہارا اور وہ جیتا، نہ کسی کی ہار نہ کسی کی جیت، "تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ" تو جس کو چاہے سلطنت عطا فرمادے اور "من تشاء" مطلب یہ کہ اس میں اس کی قابلیت ہی کو دخل نہیں ہے کہ یہ سمجھے کوئی بڑی قابلیت کی قوم ہے کہ فلاں قوم دیکھئے صدیوں سے حکومت کر رہی تھی اور کیسا بے دخل کر دیا تو فرمایا "قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" اے سلطنت کے حقیقی مالک "تؤتی الملک من تشاء" جس کو تو چاہے سلطنت دیدے۔"وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ" اور جس سے چاہے ان کی آن میں، پلک جھپکاتے میں سلطنت چھین لے"۔

"اور تاریخ بتاتی ہے کہ ہزاروں برس کی شہنشاہیاں جن کا ڈنکا بج رہا تھا دنیا میں، جن کا طوطی بول رہا تھا، جن کے والیانِ سلطنت کی ایک نگاہ پڑ جانا سمجھا جاتا تھا کہ گویا "ہُما" اس کے سر پر بیٹھ گئی اور وہ جس کے سر پر سے ہو کر اڑ گئی، اس کی تقدیر بدل جاتی تھی، مٹی پر ہاتھ رکھ دیں تو سونا ہو جائے، پلک جھپکاتے میں اللہ نے ان کی سلطنتوں کا آفتاب غروب کر دیا اور ایسا غروب کیا کہ اس کے بعد کبھی طلوع نہیں ہوا، رومۃ الکبریٰ کی تاریخ بتاتی ہے، گبن (GIBBON) کی کتاب زوال وسقوط روما (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) آپ پڑھ لیجئے کہ وہ کیا سلطنت تھی، کیا شہنشاہیت تھی، کس طرح اس کو زوال ہوا، ساسانی سلطنت کی تاریخ پڑھئے کہ کیسا اس کا ڈنکا بجتا تھا، اس کا درفش کاویانی اور اس کی آتشِ مقدس، ہندوستان کی سرحدوں تک اس کی

سلطنت پہونچی ہوئی تھی، اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ" (سبا:۱۹) ہم نے اس کو افسانۂ پارینہ بنادیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے"۔(۱)

"وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے، دیکھئے "مَن تشاء" ہر ایک کے ساتھ لگ رہا ہے، تاکہ کہیں شک کی بو نہ آجائے، اس کے خیال میں یہ آئے کہ اس کا کمال، اس کا عیش، یا اس کی شامت اعمال تو بیشک اس کا بھی ایک اصول ہے خدا کے یہاں، لیکن کوئی حقیقی کرنے والا ہے، فاعل حقیقی کوئی اور ہے "وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" پھر اس کے بعد اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ بس ایک مرتبہ یہ الٹ پھیر ہوگیا اب کیا ہوگا، اب قسمتوں پر مہر لگ گئی تو جواب ملتا ہے "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" تیرے ہاتھ میں مستقل خیر ہے، ایک دن دو دن کی خیر نہیں، سو پچاس کی خیر نہیں "الخیر" جس کا نام ہے، "جنس خیر" تیرے ہاتھ میں ہے، "خیر" جس پر خیر کا اطلاق ہوتا ہے، وہ "الخیر" کل کا کل تیرے ہاتھ میں ہے

"اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" اگر کوئی یہ کہے کہ ایک ہی بار ہوا تو غلط۔ "اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" تو ہر چیز پر قادر ہے، اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ صدیوں میں یہ انقلاب ہوا کرتا ہے، تو اب صدیوں میں ہی یہ انقلاب ہوگا، تو فرماتا ہے "تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" "تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے" کھیل تو یہ روز ہوتے ہیں۔ "وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ" اور کوئی یہ سمجھے کہ اب زوال پذیر قوم سے کوئی اقبال مند قوم ظاہر نہیں ہوسکتی اور صاحب اقبال قوم میں اب کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تو فرماتا ہے نہیں "تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ" "مردے سے زندہ کو نکالے اور زندہ سے مردہ کو برآمد کرے"۔

"اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کو ہر وقت اختیار ہے، اس کو غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرتے کچھ دیر نہیں لگتی،

(۱) قرآن کا مطالعہ: ۱۴۳-۱۴۴

اس کیلیے کسی وقت کی کوئی قید اور ساز گار حالات کا انتظار نہیں وہ دن رات ایسے تصرفات کیا کرتا ہے"۔[1]

"وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" جس کو تو چاہے بے حساب دیدے، وہاں راشن تنگ نہیں ہے کہ بس صاحب اتنا، اتنا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، دینے پر آئے تو جھولی بھر دے اور نہ دینے پر آئے تو دانہ دانہ کو ترسائے۔

یہ آیت ہے جس نے مجھے سہارا دیا اور ہمت پیدا ہوئی کہ آپ کے سامنے کچھ کہوں، بس اس سے زیادہ کوئی مکمل اور جامع پیغام نہیں ہوسکتا تو بھائی اللہ تعالیٰ ہر خیر کا مرکز ہے، خیر کا خالق بھی ہے اور خیر کا مخزن بھی ہے، "اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ" اور اسی سے ابتدا ہے اور اسی پر انتہا ہے، اور اصل میں یہ سب اسی کے ارادہ کے تابع ہیں"۔[2][3]

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۸۹
(۲) خطبات مفکر اسلام (جلد سوم): ۱۷۷-۱۸۳
(۳) مشترک اخذ وتلخیص: ☆ قرآن کا مطالبہ: ۱۳-۱۴ ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۸۹ ☆ خطبات مفکر اسلام (جلد سوم): ۱۷۷-۱۸۳

فکر وعمل کے دو نظام

نفس پرستی اور خدا پرستی

﴿ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(التوبة: ۱۰۹)

”بھلا وہ کہ جس نے اپنی امارت کی بنیاد رکھی اللہ کے خوف ورضا پر، زیادہ بہتر ہے یا وہ کہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے بودے اور ڈھے جانے والے گڑھے کے کنارے رکھی اور اس کو لے کر گر گیا اور ڈھیر ہو گیا جہنم کی آگ میں اور اللہ تعالیٰ غلط اور بے محل کام کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا“۔

دو عملی مثالیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو عمارتوں کی مثال دی ہے اور دونوں کا مقابلہ کیا ہے، ایک وہ عمارت جس کی بنیاد سنگین، غیر معمولی، مستحکم اور غیر متزلزل پتھروں پر رکھی گئی ہو، جو بڑے بڑے طوفان سے بھی ہل نہ سکے، وہ بنیادی پتھر اور اندر کی نیو اللہ کا خوف ولحاظ اس کی شرم اور اس کی رضا اور خوشی کی طلب ہے، ”اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ

وَرِضْوَان" ان بنیادوں پر جو عمارت بھی اٹھائی جائے گی، وہ ایک سنگین حصار ہوگی، جس کو کہیں سے جنبش نہیں دی جاسکتی۔

"أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ" اس کے بالمقابل وہ عمارت ہے، جس کی بنیاد نہایت بودے اور ڈھے جانے والے گڑھے کے کنارے اور ایسی ریتیلی اور نرم زمین پر رکھی گئی ہو کہ ذرا بھی بوجھ پڑے تو وہ عمارت خود ہی نہیں بلکہ اپنے مکینوں کو لے کر بیٹھ جائے۔

یہ دو ایسی عملی مثالیں ہیں، جس کے سمجھنے کے لیے کسی بڑی ذہانت کی ضرورت نہیں، ہم کو آپ کو رات دن ایسی عمارتوں سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے اور خاص طور پر شہر تو نام ہی ہے سنگین اور مستحکم عمارتوں کا جس کی بنیاد کو پتھروں اور زنجیروں سے مستحکم کیا گیا ہو، آپ اس پر دو منزل، تین منزل کی بھاری عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں اور جہاں تک چاہیں اس کو بلند کر سکتے ہیں، پھر کتنی ہوا چلے، طوفان آئے، وہ اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمی رہتی ہے اور ٹس سے مس ہونے کا نام نہیں لیتی، اس کے بالمقابل شہر سے قریب دیہاتوں میں چلے جایئے، وہاں آپ کو ایسی عمارتوں سے واسطہ پڑے گا، جو غیر مستحکم اور نرم زمین پر تعمیر کی جاتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

نہایت پختہ عقیدہ

یہ دراصل زندگی کے دو نظام ہیں زندگی ہی کے نہیں، فکر و عمل کے دو نظام ہیں، ایک وہ جس کی بنیاد "عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ" خدا کے خوف و رضا عقیدہ و خلوص اور علم و عمل کی مطابقت پر ہے، اس کائنات کو کس نے پیدا کیا، کون سیاہ و سپید کا مالک ہے، کون دولت دیتا ہے؟ کون افلاس و فقر میں مبتلا کرتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ہماری جان ہے؟ اور کون ہماری قسمت کا مالک ہے؟ ایک نہایت پختہ عقیدہ پر اس کی بنیاد ہوتی ہے اور جو اس عقیدہ کو قبول کرتا ہے، اس کی زندگی از اول تا آخر اس کے مطابق ہوتی ہے، وہ زندگی کا ہر لمحہ خدا کی نگرانی میں گذارتا ہے اور روز و شب، روشنی و تاریکی، شہر و جنگل خلوت و جلوت ہر حالت میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید اور

اسرار کو بھی جانتا ہے "یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْیُنِ وَمَا تُخْفِیْ الصُّدُوْرِ (المؤمن: ۱۹) "مَایَکُوْنُ مِنْ نَجْوَیٰ ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلاَ خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلاَ اَدْنیٰ مِنْ ذٰلِکَ وَلاَ اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَمَا کَانُوْا" (المجادلة۔ ۷) وہ اس کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر وہ کوئی کام کرے گا چاہے اس کو کوئی دوسرا دیکھے یا نہ دیکھے، آخرت میں اس کا بدلہ مل کر رہے گا، اس لیے کہ وہ یہ کام جس کے لیے کرتا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے، چنانچہ مسلمان جو کام کرتا ہے، اس میں وہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو، حدیث شریف میں صدقہ کو چھپا کر دینے والوں کے سلسلہ میں آتا ہے کہ "حَتّٰی لاَ تَعْلَمُ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهُ" اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان بڑے بڑے امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے وہ اس کو امانت کے ساتھ پہنچا دیتا ہے، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرتا اور نہ اس کا تصور تک کرتا ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے۔

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ جو جس کے ہاتھ لگتا ہے، وہ اس کو نہ صرف چھپا لیتا ہے، بلکہ شیر مادر کی طرح اس کو ہضم کر لیتا ہے، اس میں افسر اپنے ماتحت سے اور ماتحت اپنے افسر سے، بڑا اپنے چھوٹے اور چھوٹا اپنے بڑے سے چھپا لیتا ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو اور مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ میدان جنگ میں ان کے ہاتھ لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کا تاج آجاتا ہے اور وہ اس کو چھپا کر امیر کے خیمے میں لے جاتا ہے، وہ اس لیے نہیں چھپا رہا ہے کہ اس نے چوری کی ہے، بلکہ اس لیے چھپاتا ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ دے کہ کتنا بڑا شیر مرد ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا سامان لے کر امیر کو دینے جا رہا ہے، اس لیے وہ چھپا کر امیر کو دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مال میرے ہاتھ آیا تھا، یہ مسلمانوں کا مال ہے، امیر حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور ان سے پوچھتا ہے کہ آپ کا نام کیا ہے، آپ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ میں نے جس کے لیے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام بھی جانتا ہے اور قبیلہ کو بھی جانتا ہے، پھر وہ چھپ کر چلا جاتا ہے، چوروں کی طرح، لیکن شاہوں کا بادشاہ بن کر تا کہ کوئی اس کے کام سے

واقف نہ ہوجائے، آخر امیر اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کو بھیجتے ہیں تب جا کر پتہ چلتا ہے، یہ اس علم اور اس نظام تعلیم کا نتیجہ تھا کہ دل میں گناہ کی کھٹک ہوتی تھی تو ان کے لیے زندگی کا گذارنا مشکل ہوجاتا تھا اور راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی، کھانا پینا حرام ہوجاتا تھا، گناہ کے بعد وہ عذاب آخرت کا تصور کر کے کانپ جاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر عرض کرتے تھے کہ یارسول اللہ "طَهِّرْنِی" یہ پاک کرنا پانی سے نہیں ہوتا تھا، بلکہ سنگساری کر کے ایسی سنگساری جس میں موت ہوجاتی تھی، اس سخت سزا کے باوجود وہ اصرار کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ ان کو مہلت دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جاؤ فلاں مرحلہ بھی پورا کرلو، اس کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آتی تھی اور کہتی تھی، کہ یارسول اللہ "طَهِّرْنِی"

یہ نتیجہ اس علم کا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعلان کرتے ہیں کہ دودھ میں کوئی ملاوٹ نہ کرے، "ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات میں گشت پر نکلتے ہیں تو ایک گھر سے آواز آتی ہے کہ بیٹی دودھ میں پانی ملادو، بیٹی جواب دیتی ہے کہ ماں جان! آپ نے امیر المؤمنین کا اعلان نہیں سنا؟ ماں نے کہا کہ رات کا وقت ہے، اس وقت کون دیکھتا ہے؟ وہ بیٹی جواب دیتی ہے کہ جس نے عمرؓ کے عہد مبارک میں آنکھ کھولی تھی کہ اگر امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہے ہیں تو کیا ہوا، خدا تو دیکھ رہا ہے" (آج تو خالص دودھ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، اب تو ڈیری کا دودھ بھی خالص نہیں ہوتا ہے، اس میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں سے کریم نکال دی گئی ہے)۔

جو کچھ خدا کے رسولؐ نے بتایا اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا کہا یہ کفر ہے، اس سے ساری عمر بچتے رہے، کہا یہ گناہ ہے، اس سے بھاگتے رہے، جنت کا یقین، جہنم کے عذاب کا تصور آخرت کی زندگی پر یقین، خلوص، صداقت، امانت و دیانت خدا کا خوف اور اس کی رضا کا حصول یہ ان کی زندگی کا مقصد تھا، خدا کا خوف ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا، اللہ کے لیے علم سیکھتے تھے اور اللہ ہی کے لیے سکھاتے بھی تھے، وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر علم حاصل کرتے تھے اور اسی طرح سکھاتے تھے، وہ کوئی معاوضہ یا بدلہ

لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ (۱)

نفس پرستی آج کے نظام تعلیم کی بنیاد

آج کا حال یہ ہے کہ جتنا پڑھا لکھا انسان ہے، اتنا ہی وہ ڈرنے کے قابل ہے، آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے بھیڑیوں کا راج ہے، ایسے بھیڑیوں کا جو دوسرے کے جسموں سے کپڑے اتار لیتے ہیں، تاکہ اپنی دیوار کو پہنائیں، جو دوسروں کے بچوں اور یتیموں کے بچوں کے آگے سے کھانا اس لیے چھین لیتے ہیں۔

کہ ان کے کتوں کا پیٹ بھر سکے، بددیانتی، خودغرضی مطلب پرستی، نفس پرستی پر آج کے پورے نظام تعلیم کی بنیاد ہے،

آج کے نظام تعلیم کا نتیجہ ہمارے کارپوریشن کے ممبران اور حکومت کے کارندے ہیں، اس نظام تعلیم نے یہ نہیں سکھایا کہ خدا کیا ہے، جس نے یہ سکھایا ہے کہ جہاں اپنی عزت کا سوال ہو، جہاں تم کو ذاتی نفع ہو رہا ہو، وہاں اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن اور اپنی عزت کو نیلام کردو، اسی وجہ سے آج انسان انسان کا سودا کر رہا ہے، آج انسان بک رہا ہے، پارٹیاں بک رہی ہیں، تیس چالیس برس کی وفاداریاں بک رہی ہیں، آج ہماری پارلیامنٹ اور اسمبلیاں نخاس کی طرح ہوگئی ہیں، جہاں خلیج بنگال سے لے کر پنجاب تک لوگ بھیڑ، بکریوں اور خربوزوں کی طرح بک رہے ہیں، یہ سب اسی نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ

(۱) ایک دمشقی عالم درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی، اس لیے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے کہ خدیو مصر کے صاحب زادے محمد علی (جو اپنے زمانے کا ظالم وجابر اور سخت گیر فرمانروائے شام تھا) اچانک ان بزرگ کے پاس آیا، مگر ان بزرگ نے پاؤں نہیں سمیٹے اور وہ اسی حال میں قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند کرتے رہے، ان کے شاگردوں نے خوف کے مارے کپڑے سمیٹنے شروع کردیئے کہ اب خدا جانے کیا حکم نازل ہوگا اور ہم سب کی گردنیں اڑادی جائیں گی، مگر وہ بزرگ سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے، محمد علی دیر تک کھڑا رہا، پھر وہاں سے چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد اپنے خادم کے ہاتھ اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی اور درخواست کی کہ اس کو قبول فرمالیا جائے، ان بزرگ نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "آقا سے سلام کہنا اور کہنا کہ جو شخص اپنا پاؤں پھیلاتا ہے وہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلا سکتا"۔

ہے، جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کی ہے ﴿ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ﴾ جس کی بنیاد ہی عناد وسازش اور ضمیر فروشی اور خودغرضی پر پڑی ہے۔

اور دوسرا وہ نظام تعلیم ہے، جس کی بنیاد "عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ" پر ڈالی گئی ہے، آج بھی اسی طرح کی دو عمارت اور دو عبادت گاہیں جہاں دو طرز فکر کام کر رہے ہیں، ایک عبادت گاہ میں خدا کی صفات کا پرتو پیدا کیا جاتا ہے، مثلاً اللہ کی ذات غنی ہے، تو انسان کو مستغنی ہونا چاہیے، اسی طرح اللہ کی صفت شفقت ورافت ہے، تو انسان کو بھی شفیق ورحم دل ہونا چاہیے، اس کے اندر استغناء خلوص ومحبت جرأت وہمت، حق گوئی و بے باکی، نزاہت وپاکیزگی کی اعلیٰ صفات ہونی چاہئیں اور یہی اس نظام تعلیم کی روح اور اس کا جوہر ہے"۔[1]

(۱) تلخیص از: تکبیر مسلسل: ۳۰۷-۳۱۴۔

رسوا کیا ہر دور کو جلوت کی ہوس نے

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾

(القصص: ۵۸)

"اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے جو سامانِ عیش پر نازاں تھیں، سو ان کے یہ گھر ہیں کہ ان کے بعد آبادی نہیں ہوئے، مگر تھوڑی دیر کے لیے اور آخر کار ہم ہی مالک رہے"۔

ملکوں اور قوموں کی تباہی کا سبب

کسی معاشرے، ملت یا ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جائے جو ہر چیز میں عوام سے الگ ہو، وہ اپنی دنیا خود بنائے اور اسی دنیا میں عمر بسر کر دے، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا معیار عوام سے بلند ہو، جہاں ایک روپے سے کام چلتا ہو، وہاں سو روپے سے کام چلائے، جو کام سادہ طریقے پر ہوتا ہو، وہ دھوم دھام اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ انجام دیا جائے، ہر چیز میں نام و نمود اور عزت و وجاہت پیش نظر ہو، جب مسرتوں اور شادیوں کا موقع آئے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیے جائیں اور دولت پانی کی طرح بہائی جائے اور اس میں ایسی شان و شوکت کا اظہار ہو کہ شہر میں ہفتوں اور مہینوں اس کے چرچے رہیں اور اپنی خیالی دنیا میں پوری عمر گذار دی جائے اور عوام پر جو کچھ گزرتی ہے اور جن

مصائب و مشکلات سے دن رات ان کا سامنا ہے، ان کی اس طبقہ کو ہوا بھی نہ لگے، کسی دینی تحریک اور کسی اصلاحی کوشش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ ہو، ساری دلچسپیاں اپنے، اپنی اولاد اور اپنے ذاتی مفادات تک محدود ہوں، جس کام سے شہرت عزت حاصل ہوتی ہو اور حکومت و سوسائٹی کی نگاہ میں وقعت بڑھ سکے، اس کیلیے اشرفیوں کی لوٹ ہو اور جس کام سے یہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس کے لیے کوڑیوں پر مہر ہو، اخلاقیات میں جو بات عوام کے لیے ناجائز ہے، اس طبقہ کے لیے جائز، جو بات ان کے حق میں عیب، اس کے حق میں ہنر ہے،... اس طبقہ کا عروج، اس کی بے عنوانیاں، اس کی اخلاقی انارکی، اس کا آزادانہ طریقے سے داد عیش دینا اور ہر قسم کے حدود و قیود کو پھلانگ جانا، اور اس کی خرمستی، ملکوں اور قوموں، شہروں اور بستیوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی بستی کی تباہی کے دن آتے ہیں، اور اس کا پیمانہ حیات لبریز ہو جاتا ہے، تو پہلے اسی طبقے میں بگاڑ آتا ہے اور وہ اپنے اعمال و اخلاق سے عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے اور پوری پوری آبادی پر مصیبت لے آتا ہے، قرآن مجید اپنے خاص اسلوب میں فرماتا ہے "وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا" اور ہم نے کتنی بستیاں ایسی ہلاک کر دیں، جو اپنی گذران پر، اپنے وسائل زندگی پر، اپنی معیار زندگی پر اترا گئی تھیں، اترانے لگی تھی، مست تھی اور تکبر ان میں پیدا ہو گیا تھا، "بطرت" کا لفظ بھی ایسا ہے کہ جس کا ترجمہ اردو میں مشکل ہے، وہ لفظ کی قوت ہوتی ہے، ٹمپریچر ہوتا ہے، "بطر" کا لفظ ایسا ہے کہ بہت مشکل ہے کہ اردو میں ترجمہ کیا جائے، اترانے لگی تھیں اور پھولے نہیں سماتی تھی اور دعوے کرنے لگی تھی، "بطرت معیشتھا" اپنی زندگی پر وہ اب اترانے لگی تھی، ان کو اب کسی اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی، کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی، کسی پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی اور کوئی ڈر ان کو نہیں معلوم ہوتا تھا یہی ہوتا ہے، جب تمدن ترقی کر جاتا ہے، جیسے جو سرمایہ دار ملک ہیں، جہاں بڑی صنعتیں ہیں اور جہاں تمام دنیا کو مال جاتا ہے اور دنیا پر ان کی تجارتی حکمرانی ہے، وہاں بھی حالت یہی ہے کہ "بطرت معیشتھا" وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کوئی

کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ جب یہاں پر ہندوستان میں بائیکاٹ کیا گیا ودیشی مال کا، تو ذرا سا ان کو خیال آیا کہ اچھا یہ بھی ہو سکتا ہے نقصان محسوس ہوا۔

ترقی وزوال کا ابدی قانون

''تاریخ بھی بتاتی ہے کہ دنیا میں کئی ایسی مستحکم سلطنتیں اور ترقی یافتہ تہذیبیں گذری ہیں جن کا دنیا میں طوطی بولتا اور ڈنکا بجتا تھا، لیکن ان میں مرور زمانہ سے ذہنی انتشار، اخلاقی زوال وانحطاط رونما ہوا، نفس پرستی، دولت پرستی کا لاوا پھوٹ پڑا، انسانی حقوق پامال اور عزت وآبرو خاک میں ملائی جانے لگی، خواہشات نفس کی تسکین اور ذاتی مفادات کی تکمیل پر ذہانتیں اور عملی طاقتیں صرف کی جانے لگیں، مذہبی تعلیمات اور اخلاقی قدروں سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی، بلکہ ان کا مذاق اڑایا جانے لگا، محلوں اور کوٹھیوں میں دادِ عیش دی جارہی تھی اور انگریزی مثال کے مطابق ''روم جل رہا تھا'' اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے تھینکر، فلاسفر، ادیب وشاعر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے، وہ اپنے جوہر دکھا رہے تھے اور لوگوں کو اپنی فنی مہارت اور ادبی کمالات سے مسحور کر رہے تھے، لیکن معاشرہ بگڑا ہوا تھا، بازاروں میں فساد تھا، سڑکوں پر فساد تھا، خاندانوں میں فساد تھا، مختلف طبقوں میں فساد تھا، جب فساد کی یہ آندھی چلی تو رومن ایمپائر بھی جو اپنے قانون ROMAN LAW اپنے نظم ونسق ADMINISTRATION اپنی وسیع فتوحات اور شاندار نو آبادیاں اور ترقی یافتہ تہذیب اور بلندی معیار زندگی کی بنا پر دنیا میں ضرب المثل تھا، اس سب کے باوجود خالق کائنات کے مقرر کردہ ترقی وزوال اور موت وحیات کے ازلی وابدی قانون سے بچ نہیں سکا، (۱) جس کی قرآن کریم نے تصویر کھینچی ہے۔

''وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا'' ''اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھیں'' جن کو بڑے بڑے دعوے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم لازوال ہیں، ہماری عیش وعشرت لازوال ہے، ہمارا اطمینان لازوال ہے، ہمارا امن وامان لازوال ہے، ہمارا معیار زندگی لازوال ہے۔

(۱) ۱۱/۹ کے حادثہ میں بھی اس کی عبرتناک مثال ہے۔ (مرتب)

کارِ جہاں بے ثبات

"فَتِلْکَ مَسَاکِنُهُمْ لَمْ تُسْکَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِیْلاً" دیکھ لو یہ ان کے مساکن ہیں "لَمْ تُسْکَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِیْلاً" اس کے بعد برائے نام وہاں آبادی کی نوبت آئی، کچھ لوگ رہنے لگے، یہ مدین کے راستے میں پڑتا ہے، جب شام سے چلا جائے اور عراق کی طرف ہو یا جائے، تو قوم ثمود کے، حضرت صالح علیہ السلام کے اگر ادھر سے آئے، نجد کی طرف رخ ہو اس کا اور شام سے چلے، تو ثمود کی بستی پڑے گی، قوم لوط کی، تو اس طرح اکثر قرآن مجید میں ان قوموں کا انتخاب کیا گیا ہے عبرت کے لیے کہ جو جزیرۃ العرب سے نسبتاً قریب تھی اور جن سے واقفیت تھی اور یہ سب شام و فلسطین کا علاقہ ہے، یا پھر الربع الخالی جو عاد کی جگہ تھی، وہ جزیرۃ العرب میں ہے۔

"وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ" "اور ہم ہی وارث تھے" ہم جو چاہتے اس کو کرتے، یعنی ہم ہی مالک تھے، ہم جس کو چاہیں بسائیں، جتنی دیر تک چاہیں بسائیں اور جب چاہیں اجاڑ لیں۔[1]

---

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۸ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ ملت میں ان کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں: ۵-۹ ☆ ملک کی نازک صورتحال اور محبان وطن کی ذمہ داری: ۸-۹، سے مشترک طور پر اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا یہ شور کیوں مچا ہے....؟

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (الروم: ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں''۔

عالمگیر فساد

اس وقت تمام دنیا میں سخت اختلاف ہے، روزمرہ کی جو حقیقتیں سورج کی طرح روشن ہیں اور جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی دعویٰ ایسا نہیں جس کی ہر جگہ سے، ہر ادارہ سے اور ہر مکتب خیال سے تائید ہو۔ ایسی کوئی حقیقت نہیں جس پر سب کے سب متفق ہوں، لیکن ایک بات ایسی ہے ہر طرف سے اس کی آپ تائید سنیں گے، اور جہاں جائیں گے، آپ اس کی صدائے بازگشت پائیں گے وہ یہ ہے ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ'' اس وقت دنیا میں ایک عالمگیر فساد برپا ہے اور ایسا بگاڑ ہے جس سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے' یہاں تک کہ جو ملک اپنی مادی ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے ہیں، وہاں بھی اگر آپ جائیں گے تو یہی کارونا پائیں گے، کوئی مجلس، کوئی جلسہ، کوئی کتاب، کوئی مباحثہ؟ کوئی مذاکرہ، کوئی غور وفکر کا حلقہ اس سے خالی نہیں، دنیا کے ایک سرے

سے دوسرے سرے تک سفر کر جائیے، ہر جگہ آپ اسی کا شکوہ پائیں گے کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ"۔ "بگاڑ بہت پھیل گیا ہے اور دنیا میں ایک عالمگیر فساد برپا ہے"۔

وہ حقیقت ہے جس پر قریب قریب اس وقت دنیا کے تمام سوچنے اور سمجھنے والے، یہاں تک کہ جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بھی متفق ہیں، جو کتابوں کے پڑھنے والے ہیں، وہ کتابوں کے واسطہ سے جانتے ہیں، جن لوگوں کو اس کا اتفاق نہیں ہوتا، یا اس کی فرصت نہیں ملتی، ان کے کانوں میں بھی یہ بات پڑتی رہتی ہے، ہمارا ملک ہو یا کوئی باہر کا ملک، یورپ ہو یا امریکہ، افریقہ ہو یا ایشیاء، اور یہاں تک کہ وہ سرزمین جو خیر و برکت کی سر زمین ہے، وہاں بھی اگر آپ جائیں گے تو اس کا احساس عام پائیں گے کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ"

یہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے جس کا سرا کسی کو نہیں ملتا، بگاڑ تو ضرور ہے، لیکن بگاڑ کا سبب کیا ہے اور جس قدر اس ڈور کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ الجھتی ہی چلی جارہی ہے، اس لیے کہ سرا ہاتھ میں لینے اور سرا تلاش کرنے کا جو فطری طریقہ ہے اور جو خدا نے بیان کیا ہے وہ کھو گیا ہے اور اس کی کسی کو خبر نہیں۔

دنیا کی سعادت و ہلاکت انسان کے ساتھ وابستہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اور ان سب لوگوں کے عقیدہ کے مطابق جو خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں اور خدا کی صفات کا کوئی نہ کوئی تصور ان کے اندر پایا جاتا ہے، وہ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی اصلاح اور اس دنیا کا فساد، اس دنیا کی سعادت اور اس دنیا کی شقاوت اور اس کا بناؤ بگاڑ، اس کی خوش حالی اور اس کی بربادی سب کو وابستہ کیا ہے، انسان کے ساتھ، انسان اگر اچھا ہے تو یہ دنیا اچھی ہے اور اگر انسان بگڑا ہوا ہے، راستہ چھوڑ چکا ہے، خودکشی پر آمادہ ہے، تباہی و بربادی پر کمربستہ ہے، اس کو اپنی قیمت معلوم نہیں، وہ خدا کو بھول چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنے کو بھی بھول چکا ہے، اس کو اپنے آغاز و انجام کی خبر نہیں یا فکر نہیں، تو پھر اس دنیا کے بگاڑ کو کوئی

روک نہیں سکتا اور اس بگڑی ہوئی دنیا کو بنا نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے، اپنے ارادہ و اختیار سے، اپنی قدرت سے دنیا کی سعادت و شقاوت کو انسان کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، خدا کا یہ قانون ہے کہ یہ دنیا انسان کے دم سے ہے، انسان اچھا ہے تو یہ دنیا اچھی ہے، انسان اگر برا ہے، تو یہ دنیا فساد کا گہوارہ ہے، آپ اگر تاریخ میں اس کا سراغ لگائیں گے اور تاریخ کی تاریکیوں میں دور تک جائیں گے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کا بگاڑ "بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" "انسان کی وجہ سے ہے" انسان سرچشمہ ہے دنیا کی فلاح و سعادت کا اور انسان سرچشمہ ہے دنیا کی تباہی و ہلاکت کا"

فساد کا گہوارہ

اس وقت دنیا کے اندر جو انقلاب آیا ہوا ہے اس کو خواہ کسی عنوان سے بیان کیا جائے وہ یہ ہے کہ انسان کا رخ خیر سے شر کی طرف مڑ گیا ہے، ساری طاقتیں ہیں، لیکن اس کی منزل غلط ہو گئی ہے، وہ چل رہا ہے، چلنا ہرگز بند نہیں ہوا، بلکہ پہلے چلتا تھا، پھر دوڑنے لگا اور اب اڑنے لگا ہے، لیکن کس طرف اڑ رہا ہے، وہ ایک شر کی منزل ہے، انسانیت کشی کی منزل ہے، انسان کو برباد کرنے کی منزل ہے، سب نے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جاہ طلبی میں، اقتدار پسندی میں، حکومت کی کرسی حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا ہے، انسانیت کا سارا اثاثہ داؤں پر لگا رکھا ہے، انسانیت کی ساری متاع داؤں پر لگا رکھا ہے، ساری تاریخ داؤں پر لگا رکھی ہے، ساری تہذیب داؤں پر لگا رکھی ہے، انسانیت کی قسمت داؤں پر لگا رکھی ہے اور انسانیت کے ملبہ پر حکومت کی کرسی اگر بچھ سکتی ہے، تو انسان اس کے لیے بھی تیار ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انسانیت کی لاشوں پر اگر انسان کھڑا ہو کر "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہہ سکتا ہے تو درجنوں کی تعداد میں نہیں سینکڑوں کی تعداد میں نہیں ہزاروں انسان اس کے لیے تیار ہیں، ان اللہ کے بندوں سے عقل کے دشمنوں سے پوچھا جائے کہ حکومت کا مزہ کیا، کس پر تم حکومت کرو گے، پتھروں پر حکومت کرو گے، پہاڑوں اور ٹیلوں پر

حکومت کروگے، ریت کے ذروں پر حکومت کروگے؟ وہ انسان ہی نہ رہے جن پر حکومت کرنے کا مزہ تھا، جن کو تم حکم دیتے اور وہ تمہارے لیے خون پسینہ ایک کردیتے، لیکن آج کے انسان کو ان سوالات سے کوئی دلچسپی نہیں، اب تو صرف حکومت مقصود بن گئی ہے اور دماغوں پر مستولی ہوگئی ہے کہ محکوم کی بھی فکر نہیں، یورپ سے امریکا اور امریکا سے ایشیا اور دنیا کے کونہ کونہ میں پھیلا ہوا ہے، جس کے لیے فرعون قرآن میں معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دولت کی ہوس جس کے لیے قانون معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، امارت کا شوق جس کے لیے ہامان معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تین زندہ جاوید کردار ہیں، فرعون، ہامان قارون، ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ۔

نفس مارا کمتر از فرعون نیست
لیک اور عون مارا عون نیست

فرق ہے کہ فرعون کے پاس سارا ساز و سامان تھا اور ہم میں سے کتنے آدمی ہیں جن کے اندر فرعون بول رہا ہے، لیکن ان کے پاس اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ساز و سامان نہیں آج ساری دنیا اس راستہ کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلی جارہی ہے، جیسے کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ انسان خربوزوں اور تربوزوں کی طرح منڈی میں بک رہے ہیں، پارٹیاں بدلی جارہی ہیں، عقیدے بدلے جارہے ہیں، زندگی بھر کے کردار پر، زندگی بھر کی تاریخ پر پانی پھیرا جارہا ہے، ایک کیمپ سے نکل کر دوسرے کیمپ میں جانے کے لیے تیار ہے، جس سے ساری عمر دوستی رہی اس سے دوستی ختم کر کے ان سے دشمنی کرنے کے لیے تیار ہے، جن سے ساری عمر دشمنی رہی، جن کو ساری عمر برا کہتے تھے ان کو اچھا کہنے کے لیے تیار ہے، جن کو پاؤں تلے روندنے اور مسلنے کے لیے تیار تھے سب کچھ انسان کرنے کے لیے تیار ہے اور جس سے آپ پوچھیں گے اگر وہ صحیح بات کہنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، منافق نہ ہو تو آپ سنیں گے کہ سب کے دل میں وہی فرعون بیٹھا ہوا ہے اور ساری دنیا کے فساد کا باعث یہی ہے۔ (۱)

---

(۱) اصلاحیات (تلخیص): ۱۵۳-۱۷۰

روشن ہے ہوس، آئینۂ دِل ہے مکدر

﴿ اَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ. اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ. اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ﴾ (الفرقان: ۴۳-۴۴)

''کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جس نے اپنی من چاہی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، کیا تم ایسے کسی آدمی کا کام بنانے کی ذمہ داری لے سکو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟ نہیں نہیں، بلکہ یہ لوگ چوپائے جیسے ہیں، بلکہ راستہ پانے میں جانوروں سے بھی زیادہ ناکام ہیں''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ'' بھلا آپ نے دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔

''خواہشِ نفس'' کی پیروی کے لیے ''خواہشِ نفس'' کی اندھادھند پیروی کے لیے اور غیر مشروط اس کی تکمیل کے لیے۔ اس کو پورا کرنے کیلیے، اس سے زیادہ زوردار الفاظ نہیں ہوسکتے۔ کہ: اَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ ''بھلا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنا معبود کس کو بنایا۔؟ خدا کو نہیں بنایا۔ جو نفس کہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ محسوس ہو، جس سے عزت ملے، شہرت ملے، حکومت ملے، وہ کرنا چاہیے،!

تو جس نے اپنی ہوائے نفسانی کو جزئی طور پر نہیں اپنا مطاع اور اپنا معبود بنایا بلکہ کلی

طور پر بنایا، جیسے خدا ہوتا ہے، خدا کے سامنے بندگی کا تعلق دائمی اور کلی ہوتا ہے، وہ اس کے اوامر کی بھی تعمیل کرتا ہے، اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے امید بھی رکھتا ہے۔

تو "اِتِّخَاذِ اِلٰهَهٗ" کی جو صفت ہے وہ انہوں نے اپنی ہوائے نفسانی میں پیدا کر لی (یہ قرآن کی بلاغت ہے) واقعی جو لوگ نفس کے پرستار اور نفس کے پجاری ہوتے ہیں، خواہشات کے پجاری ہوتے ہیں۔ اور جاہلیت جن کا مذہب ہوتا ہے۔ وہ جزئی طور پر نہیں اپنی خواہش پر چلتے، بلکہ کلی طور پر انہوں اس جاہلی زندگی کو اور خواہشات کی تکمیل کو اور لذتِ نفس کو اور حظِ نفس کو مستقل معبود بنا لیا ہے کہ جو کام کرتے ہیں۔ پہلے اس میں دیکھتے ہیں... مزہ آئے گا کہ نہیں..... تعریف ہوگی کہ نہیں... فائدہ ہوگا کہ نہیں.... تو وہ بالکل "اتخاذ الٰہہ" کے قائم مقام ہے۔ اس کے لیے "اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" کے سوا اور کوئی الفاظ بولے نہیں جا سکتے۔

انہوں نے ان کو گویا معبود بنا لیا، (جیسے مسلمانوں کا معبود اور جو اللہ نے ان کو دولت ایمان عطا فرمائی صحیح معنوں میں) ان کا معبود خدا ہے کہ وہ ہر کام اس کے راضی کرنے کے لیے کرتے ہیں اور گویا اس کے منشا کو معلوم کر کے کرتے ہیں، ویسے ہی جو ان کا معاملہ ہے وہ اس کے برعکس ہے، وہ اپنے نفس کی پرستش کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ تو "اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" یہ جزئی اتباع نہیں ہے خواہش کا، بلکہ کلی اتباع ہے اور نفسیاتی طریقہ پر اعتقادی طور پر، عملی طور پر اور اخلاقی طور پر ہر طرح سے وہ دین بن جاتا ہے، یعنی اتباع نفس جو ہے اور نفس پرستی جو ہے اور خواہش پر آنکھ بند کر کے چلنا جو ہے، وہ مستقل دین بن جاتا ہے۔

آج کل دیکھ لو۔ یورپ کو دیکھ لو، امریکہ کو دیکھ لو۔ یہ کہنا کہ ہاں اس سے کچھ غلطیاں ہوئیں ہیں، زندگی میں کچھ خلا ہیں، کچھ عیب اور کچھ شگاف ہیں اور معیاری زندگی.... نہیں۔ یہ نہیں.... بلکہ "مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" وہاں تو مادی زندگی اور مادہ پرستی اور نفس پرستی پورا دین بن چکی ہے، اس میں عقائد بھی شامل ہیں، اس میں عمل بھی شامل ہے اور تصرفات بھی ہیں اور ترجیح اور اختیار اور اس کا پورا فلسفہ!

مسرفانہ تقریبات

''لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں یہ مرض داخل ہو گیا ہے اور مسلمان اس کو دینداری بلکہ انسانیت وشرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے ،......حالانکہ شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی واخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا، اہل ثروت تجاراور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں، یا اپنے ذاتی معاملات اور اپنی دلچسپی کے دائرے میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول، رسومات کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں۔

زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم وترقی کے باوجود مسرفانہ اور ''شاہانہ'' شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا۔

آج بھی ہماری بہت سے برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا، دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں، مگر انہوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ ان آیات کا مصداق ہیں ''اَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ'' ''آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا، اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے'' یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لیے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لیے وبال وادبار کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحیم وحکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام ونمود اور اس عارضی رونق وزینت یا کام ودہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سینکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی''۔ (۱)

''اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا'' ''کیا آپ اس پر ان کے ذمہ دار ہو جائیں گے؟ وہ تو چوبیس گھنٹے کی زندگی ہے، آپ کہاں تک اس کا تتبع کریں گے، کہاں تک آپ اس کو

---

(۱) مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۲۵ - ۲۸

روکیں گے؟ یہ تو انہوں نے اس کو دین بنالیا ہے اور اس کو معبود بنالیا ہے!

انسانی انحطاط کی وجہ

"اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ، اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا" "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، نہیں نہیں، بلکہ یہ لوگ چوپائے جیسے ہیں، بلکہ راستہ پانے میں جانوروں سے بھی زیادہ ناکام ہیں"۔

بالکل صحیح تصویر ہے:۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں" "اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ" بالکل چوپاؤں کی طرح ہیں،" بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا"۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ گمراہ ہیں، چوپایوں سے بھی گمراہی میں بڑھے ہوئے ہیں!

چوپایوں کی گمراہی تو بہت محدود ہوتی ہے اور حیوانی حدود کے اندر محدود ہوتی ہے، ایک چوپایہ جو غلطی کرے گا وہ کیا ہوگا؟۔ کہیں منہ ماردے گا.... پھر اس کے بعد اس کو بھی مارا جائے گا!۔ یا کسی کھیت میں گھس جائے گا.... نکالا جائے گا!۔

لیکن جب انسان چوپایہ بن جاتا ہے... اس پر ضلالت کا پورا قبضہ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ اَنْعَام (چوپایوں) سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ پھر وہ بعض اوقات تو شہروں کو ختم کر دیتا ہے، ملکوں کو تباہ کر دیتا ہے!

اب یہ جو تیاریاں ہیں امریکہ وغیرہ میں اٹا نومکیل جی........ وغیرہ اور جو دوسرے ممالک ہیں اسلحہ ہیں.... پھر ان کے اندر کی جو زندگی ہے جو لوگ ان سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ وہ گراوٹ کے، اخلاقی انحطاط کے آخری درجے تک پہونچی ہوئی ہے، اس درجہ تک کہ کہا نہیں جاسکتا اور اس پر بہت کچھ تبصرے شائع ہوئے ہیں، مضامین نکلتے ہیں اور تنقیدیں بھی ہوتی ہیں.... اور اخباروں میں بعض مرتبہ وہ چیز آجاتی ہے... ذرائع ابلاغ میں آتی ہے اور کسی وقت کسی کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے.... وہ تحقیق کرنے والا یا لکھنے والا ہوتا ہے، لیکن جب تک آدمی ان میں کچھ عرصہ رہے نہیں... وہ کچھ وقت نہ گذارے تو وہ اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ہم جن ملکوں کو ترقی یافتہ سمجھ رہے ہیں، وہ گراوٹ کے، اخلاقی، انسانی انحطاط کے

اس درجہ تک پہونچے ہوئے ہیں کہ تصور نہیں ہوسکتا۔

اگر کہا جائے کہ یہ چیز ہے۔ آپ سوچئے!۔ ہم آپ کو ایک گھنٹہ دیتے ہیں، سوچئے کہ آدمی وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا جہاں تک وہ عملاً پہنچے ہوئے ہیں!

امریکہ میں بکثرت یہ چیزیں ہیں! اب تو لوگ اس کو محسوس کرنے لگے ہیں کتابوں اور رسائل و مجلات میں بھی یہ چیزیں آنے لگی ہیں!

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، نہیں نہیں "اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا" "تو بالکل چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ گمراہ ہیں!"۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۃ الفرقان: ۴۳-۴۴ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ اقتباس: ☆ اصلاحیات: ۹۷ ☆ مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۲۵-۲۸، سے باختصار ماخوذ ہے۔

ظاہر میں تجارت حقیقت میں جُوا ہے

﴿اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَاتَكُوْنُوا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ. وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ .وَلَا تَبْخَسُوْا النَّاسَ اَشْيَائَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ وَاتَّقُوْا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِيْنَ﴾

(الشعراء: ۱۸۱-۱۸۴)

’’(دیکھو) تم لوگ پیمانہ پورا بھرا کرو، اور (صاحب حق کا) نقصان نہ کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو، اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو، اور اس سے ڈرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلی مخلوقات کو پیدا کیا‘‘۔

ایک مرض ناپ تول میں کمی کرنا

قرآن مجید چونکہ قیامت تک کے لیے باقی رہنے والی کتاب ہے اور آخری کتاب ہے اور پوری انسانیت کی کتاب ہے۔

اس میں ان قوموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں نیا مرض پیدا ہوا ہے، مشترک چیز تو مثلاً شرک ہے، بت پرستی ہے، جہالت ہے، یہ تو تھی، لیکن جو قوم جس چیز میں فائق ہوگی اس کا ذکر کیا ہے قرآن مجید میں!

کوئی ایسی چیز آپ نہیں پائیں گے (تلاش کے بعد بھی) کہ کسی قوم کا کوئی ایسا مرض بیان کیا ہو، اب جو نہ پایا جاتا ہو، یا ان کے زمانے کے بعد نہ پایا جاتا ہو، یا ان کے زمانے بعد نہ پایا جاتا ہو، یا اس کی کوئی مناسبت نہ ہو نسلِ انسانی سے، انسانی تمدن سے! قوم نوح کو لے لیجئے اور قومِ ثمود اور قومِ عاد کو لیجئے اور یہ اصحاب ایکہ کو لیجئے، قوم لوط کو لیجئے، کوئی بھی ایسا نہیں کہ فرضی یا خیالی ہو (جیسے شعراء کے یہاں چیزیں ہوتی ہیں تخیل سے وہ پیدا کر لیتے ہیں) کوئی سا بھی یعنی قومِ نوح سے لے کر حضرت ابراہیمؑ تک اور حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک جتنے امراض اور قرآن مجید میں جن امراض کی ادوار میں بار بار پیدا ہوتے رہے اور اب بھی پائے جاتے ہیں اور قیامت تک بھی یہ پائے جاتے رہیں گے! اُن میں سے ایک یہ ہے تطفیف کیل یعنی ناپ تول میں کمی کرنا۔

اب دیکھئے ایک ایسی کتاب کہ جس کا مقصد نزول اور جس کی غرض وغایت وہ زیادہ تر تعلق مع اللہ ہے توحید ہے، اخلاص ہے اور طلب خداوندی ہے اور آخرت کی تیاری۔ تو اس میں ''ناپ تول کی کمی'' کا ذکر آنے کا کوئی آدمی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا کیا تعلق وحی وتنزیل سے؟ یہ تو ایسی بیماریاں ہیں جیسے بخار آ گیا مثلاً یا کسی میں کوئی وار بیماری ہوگئی اس طرح، لیکن قرآن مجید نے اس کو اتنی اہمیت دی ہے اور اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ درحقیقت اس کے ضوء میں جو چیز ہے، وہ خدا سے بے خوفی اور مال سے حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے جو سب کچھ کراتی ہے۔

اس لیے یہ مرض اتنا نہیں ہے کہ مثلاً ہلکے طریقے پر مارکٹنگ میں، تجارت میں آج کل بزنس میں کچھ چیزیں ہیں، امریکہ اور یورپ میں ہیں اور یہاں بھی ہوں گی کہ اس میں مال کی خرابی نہیں بتائی یا کوئی چیز وقت سے پہلے فروخت کرنی شروع کر دی ہے، ایسی بہت ترکیبیں ہوتی ہیں اور اس وقت یہ ایک بہت بڑا فن بن گیا ہے، اقتصادیات کا (ایکنومکس) کا اور بزنس کا اور ٹریڈ یہ سب چیزیں فن بن گئی ہیں۔

یہ بھی خدا فراموشی کا نتیجہ ہے

تو اب یہ قوم شعیبؑ جو ہے اس کو مرض یہ تھا کہ ناپ تول میں کمی کرنا اس کو دولت کی

ہوس تھی اوراس سے پہلے جوقومیں تھیں ان میں یہ مرض شاید اس درجہ میں نہیں تھا۔[1]

غور سے دیکھا جائے تو رشوت ستانی، چور بازاری، حد سے زیادہ نفع خوری اور اخلاقی جرائم پیچیدگیاں نہیں ہیں، اصل پیچیدگی وہ ذہنیت اور مزاج ہے، جوان بداخلاقیوں اور بے اصولیوں پر آمادہ کرتا ہے، اگر ایک دروازہ بند کیا جائے گا تو دس دروازے کھل جائیں گے، انسانی ذہن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بہت سے چور دروازے رکھتا ہے، اگر اس میں کوئی گہری تبدیلی نہ ہوتو اس کا راستہ روک کر کوئی عاجز نہیں کرسکتا، اس کو اپنی مطلب برآری کے لیے بہت سی تدبیریں اور حیلے آتے ہیں، وہ ان سے اپنا مطلب نکال لے گا۔

پھراس خودغرضی نے ساری دنیا میں اور ملک کے تمام طبقوں میں ایک مخصوص مزاج پیدا کردیا ہے۔

جس کا خاصہ ہے کہ انسان اپنے حقوق کے مطالبہ میں بڑا مستعد ہے اور فرائض وحقوق کے ادا کرنے میں سخت کوتاہ اور حیلہ جو اس ذہنیت اور سیرت نے ساری دنیا میں انفرادی، جماعتی اور طبقاتی کشمکش برپا کردی ہے، ہر شخص اپنا حق مانگتا ہے اور دوسرے کا حق ادا کرنے سے گریز کرتا ہے، اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو ساری دنیا حقوق طلبوں کی ایک آبادی نظر آئے گی، جس میں حق طلبی کا نعرہ تو ہر زبان پر ہے، لیکن ادائے فرض کا احساس کسی کے دل

---

(۱) یہ اصحاب الایکہ تھے یہ کھلے میدان میں رہتے ہیں اور یہ خلیج عقبہ کہلاتی ہے، حجاز و فلسطین کے درمیان یہ ایک خلیج عقبہ پڑتی ہے، اب وہ اردن کے علاقہ میں ہے (اور اس کے لیے ہم آپ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ: ارض القرآن: سید سلیمان ندویؒ کی کبھی پڑھئے، بہت معرکۃ الآراء کتاب ہے، ان سے پہلے کم از کم علمائے ہند میں کسی نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا، اب تو مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کی تفسیر ماجدی میں خاص طور پر جو انگریزی تفسیر ہے، اس میں تفصیلات زیادہ ہوتی ہیں تو سید صاحبؒ نے اس زمانہ میں وہ کتاب لکھی جب اس کا مواد بھی کم تھا، ماخذ بھی کم تھے اور پھر زیادہ تر انگریزی میں تھے تو اس میں دیکھئے) یہ اصحاب الأیکہ کہاں تھے؟ تو جغرافیہ کے معلوم کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ خارجی محرکات بھی معلوم ہوجاتے ہیں، مثلاً کوئی ایسی جگہ ہے کہ آمدنی کے متعدد ذرائع نہیں ہیں کہ اگر اس سے کم آمدنی ہو رہی ہے، ویسے ہوگی، تو اس سے حاصل کرلے، اس سے نہیں، اُس سے حاصل کرلے، تو وہاں پر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ذریعہ آمدنی ہے صرف!۔ اسی میں کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ اپنا تو دینا کم ہو اور لینا زیادہ ہو۔ تو وہ ناپ تول کی کمی ہے، تطفیف کیل کی! یہ ایک قوم شعیب کا مرض ہے۔

میں نہیں، جس آبادی میں ہر شخص حق طلب ہو، لیکن فرض شناس کوئی نہ ہو وہاں کی زندگی کی الجھنوں اور دقتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہاں کی کشمکش کو کوئی انسانی تدبیر یا تنظیم دور نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ، وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ، وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ" اور تولا کرو صحیح ترازو سے اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کیا کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھیلا کرو اور نہ گردش کیا کرو اور نہ گشت کیا کرو کہ دوسروں کو بھی تلقین، یعنی یہ قاعدہ ہے کہ جس آدمی میں مرض ہوتا ہے، جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے، بلا ارادہ اور بالارادہ اس کی تلقین کرتا ہے، کبھی زبان حال سے، کہیں گیا تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب ہیں، یہ کام کرتے ہیں، پوچھنے کی بھی لوگوں کو جرأت نہیں ہوتی اور کبھی زبانِ قال سے! تو یہ بالکل فطرتِ انسانی ہے کہ "وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ" زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھیلو، نہ گشت کرو اور اس سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۃ الشعراء: ۱۸۱-۱۸۴ (غیر مطبوعہ) کے اخذ و تلخیص از: ☆ اصلاحیات: ۹۷-۱۰۳

ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی اور اس کا انجام

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِىْ أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا. وَقَدِمْنَا إِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

(الفرقان: ۲۱-۲۳)

''اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کیے گئے؟ یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں، یہ اپنے خیال میں بڑائی رکھتے ہیں اور (اسی بنا پر) بڑی سرکش ہو رہے ہیں، جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے، یہ اس دن گنہ گاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی اور کہیں گے (خدا کرے تم) روک لیے (اور) بند کر دیے جاؤ اور جو انہوں نے عمل کیے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے، تو ان کو اڑتی ہوئی خاک کر دیں گے''۔

ذوقِ خدا طلبی کا فقدان

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا'' اور کہا ان لوگوں نے

جو ہماری ملاقات کی، ہمارا سامنا ہونے کی امید نہیں رکھتے۔

یہ جو عنوان ہے: "قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" (ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے) یہ بہت وسیع اور عمیق اور زمان ومکان سے مستغنی، زمان ومکان کے اختلافات سے مستغنی ایک صفت بیان کی ہے!

بہت سی چیزوں کا سبب اگر نفسیاتی تحقیق کی جائے اور تجزیہ کیا جائے اور حالات پر غور ہو تو بہت سے معاصی کی وجہ نافرمانیوں کی وجہ، سرکشی کی وجہ، حد سے تجاوز کی وجہ، جرأت کی وجہ اور گستاخی کی وجہ ہوتی ہے اندر سے، "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" "کہ ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے"۔

دیکھنے میں تو یہ الفاظ بہت ہلکے اور عام فہم ہیں، لیکن بہت بڑی گہرائی رکھتے ہیں اور یہ بہت بڑی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے، ایک عمومی اور بہت دوررس اس کو عربی میں "اعماق" کہتے ہیں۔ اعماق رکھنے والی کہ:۔ "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا"

"جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں" وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں، تو بہت سی چیزوں کی جڑ ہوتی ہے کہ وہ "اللہ سے ملاقات کی امید کا نہ ہوتا" یعنی خدا کے سامنے پیش ہونے اور خدا کو منہ دکھانے اور خدا کے سامنے حشر ہونے کا انکار بہت سی چیزوں کا محرک ہوتا ہے، وہ ابھارتا ہے!

اب آپ دیکھئے گا: جو اخلاقی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں، جو تعدیاں ہیں، حدود سے تجاوز ہے... ظلم ہے... اور نفس پرستی ہے.... ان سب میں، ان کی جڑ میں جو چیز کام کر رہی ہے۔ وہ بہت کوئی فلسفہ یا کوئی علمی حقیقت نہیں ہے... بلکہ یہ ایک "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے کی امید نہیں ہے، یہ سب کر گذرتے ہیں، ڈر کس بات کا!

اس سے بہت ڈرنا چاہیے کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا یقین دل میں بیٹھا ہونا چاہیے، سب سے زیادہ جو چیز روک سکتی ہے اور ہر وقت روک سکتی ہے اور ہر جگہ روک سکتی ہے، ہر قضیہ اور ہر معاملہ میں روک سکتی ہے وہ... لمبے چوڑے وعظ نہیں (ان کا موقع کبھی کبھی آتا ہے)... وہ بہت بڑے وسیع علوم وفنون نہیں،.... وہ کتاب وسنت کا بہت

گہرا علم نہیں، ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا..! وہ سیدھی سی بات ہے: "یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا" خدا سے سامنے جانے کا خیال... یقین..!

اور یہی وہ چیز تھی جو صحابہ کرام میں... اولیاء عظام میں.. اور مصلحین کبار میں اور نامور داعیوں میں جو چیز پائی گئی... اور ان کے وعظ میں جو اثر آیا، یعنی یہاں تک سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا وعظ ہوتا تھا، لوگ بے ہوش ہو ہو کر گر جاتے تھے... بہت سے لوگوں کے جنازے اٹھے تھے... ان کے وہاں سے جنازے اٹھتے تھے، یہ ان کے مواعظ میں جو تاثیر ہے، ان کو پڑھیے "تاریخ دعوت وعزیمت" میں یا کسی اور کتاب میں!

تو کیا چیز تھی؟ "یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا" جن لوگوں کو اللہ سے ملنے کی امید ہے، ان کے مواعظ میں یہ بات پیدا ہو جاتی تھی کہ "ہمیں خدا کے سامنے جانا ہے۔

تو یہ لفظ جو بہت سادگی کے ساتھ فرمائے گئے ہیں اور آیت ان سے شروع ہوئی ہے، کوئی عنوان نہیں ہے، ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے! اتنی بڑی بات جو انہوں نے کہی کہ "لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَةُ" ...... "ہمارے پاس فرشتے کیوں نہ نازل ہوئے" براہ راست فرشتے ہمارے پاس آئے ہوتے "اَوْ نَرٰی رَبَّنَا" "یا خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے!"

یہ گستاخی کا جملہ، یہ جرأت ان کو اس لیے ہوئی کہ۔ "لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا!"

زمان ومکان کے اختلاف سے مستغنی ایک صفت

"لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ" "انہوں نے بڑے استکبار کے، بڑے تکبر سے کام لیا اپنے دل میں" اپنے دلوں میں تکبر اور فخر اور ضرورت سے زائد اور بے محل اعتماد کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات کہی۔ "وَعَتَوْ عُتُوًّا کَبِیْرًا" اور انہوں نے سرکشی اختیار کی بہت بڑی سرکشی۔

"انبیاء کرام کی تعلیم کے برکات ونتائج اور ان کی پیروی کی سعادت سے محرومی کا بڑا سبب اکثر تکبر، جھوٹی عزتِ نفس اور خودداری کا جاہلی جذبہ ہوتا ہے،........ کیونکہ اس کی وجہ سے اپنے جاہ واقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، جاہلی عادات ورسومات چھوڑنے

پڑتے ہیں، بہت سے فوائد سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے، آزادی اور خود سری کی زندگی کے بجائے پابندی اور قانون کی زندگی گذارنی پڑتی ہے، بہت سے لوگوں پر یہ انقلاب حال بہت شاق گذرتا ہے اوران کا تکبر قرآن کے انکار پر ان کو آمادہ کرتا ہے"۔ (۱)

"یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا" یہ جو کہتے ہیں کہ "ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں نازل ہوئے...اور خدا کو کیوں نہیں دیکھتے... ہم براہ راست دیکھ لیں...تو ان کا حال یہ ہے کہ...اگر یہ فرشتوں کو دیکھ لیں "یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ" جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے... "لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ". "تو اس وقت مجرموں کے لیے کوئی اچھی ساعت نہیں ہوگی"! کوئی ان کو خوش خبری سنانے والی..بشارت دینے والی چیز نہیں ہوگی!

"وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا" اور وہ بلبلا کر اور پریشان ہو کر کہیں گے "حِجْرًا مَّحْجُوْرًا"... "حِجْرًا مَّحْجُوْرًا"... یہ محاورہ ہے، دور ہو... دور ہو... آڑ ہو... آڑ ہو.. "حِجْرًا مَّحْجُوْرًا" یعنی آڑ پر آڑ ہو...ایک ہی آڑ کافی نہیں بلکہ "جو "حِجْر" ہو وہ بھی "مَحْجُوْر" ہو۔ وہ "حِجْر". ایک دوسرے "حِجْر" سے محفوظ ہو اور محبوس ہو۔

تو جن کا حال ہے کہ فرشتوں کو دیکھ کر یہ پکارنے لگیں کہ "ارے کہاں سے یہ چیز آ گئی...خدا کی پناہ! یہ جس طرح بھی وہ اس سے بچنے کے الفاظ کہے ہیں بے قراری میں، وہ اتنی بڑی فرمائش کرتے ہیں کہ۔

"لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ" اوراس سے بڑھ کر۔ "اَوْ نَرٰی رَبَّنَا" !حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر فرشتے آجائیں، کوئی ایک فرشتہ بھی آجائے، بلکہ یہ تو خیالی چیزوں سے بھی ڈرتے ہیں، سایہ دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور بھاگنے لگتے ہیں، کسی ایسے مہیب جانور کا سایہ اگر دیکھ لیں سانپ کا سایہ بھی دیکھ لیں تو بھاگیں سر پر پاؤں رکھ کر۔

لیکن یہ سب باتیں بنانے کی بات ہے، یوں کیوں نہیں ہوتا... وہ کیوں نہیں ہوتا! رسول ﷺ کی موعظت سے فائدہ نہ اٹھانے کے عذر میں اور اپنے کو نا قابلِ ملامت سمجھانے میں

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۴۹-۱۵۰

وہ اپنی فرمائشیں کرتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا، حالانکہ اگر اس سے ہلکی سی بات بھی ہوگی تو یہ برداشت نہیں کرسکیں گے!

حاسۂ مذہبی سے محرومی

مغربی تہذیب کے اس عروج کے زمانہ میں ہر قوم میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے، جس کی دنیاوی مشغولیت وانہماک یا دنیا کی محبت وحرص نے ان کی زندگی میں مذہب کے لیے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، بڑی تلاش وجستجو کے بعد بھی مذہب کی دعوت دینے والے کو ان کے دل ودماغ میں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا منفذ نہیں ملتا، جس سے دینی اور اخلاقی دعوت ان میں نفوذ کرسکے۔

جن لوگوں کو اس طبقہ سے خطاب کرنے اور اس کو دین واخلاق کی دعوت دینے کا بھی موقع ملا ہے، ان کو قرآن مجید کی بہت سی آیات کے معنی سمجھ میں آگئے ہوں گے اور وہ تمام کلامی اشکالات جو عملی زندگی اور میدان دعوت سے علیحدہ بیٹھ کر "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ. وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" اور اس کے ہم معنی آیات کے متعلق پیش آتے ہیں، خود بخود حل ہوگئے ہوں گے اور یہ حقیقتِ قرآنی مجسم نظر آئی ہوگی، "وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً. صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ"۔ (البقرۃ:۱۷۱)

اس زمانہ کا اصلی مرض دراصل دین کے بارہ میں بےحسی وبےطلبی اور مذہبی سوالات کے بارہ میں کامل بےتعلقی کارگر نہیں ہوسکتی، مذہب واخلاق کی دعوت کو فسق وفجور اور معصیت وغفلت کے تاریک دور اور انکار ومخالفت کے پرشور سے پرشور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو مذہب سے بےتعلقی وبےنیازی کے اس خاموش وپرسکون دور میں پیش آرہے ہیں جہاں سرے سے پیاس اور پانی طلب ہی نہ ہو وہاں پانی کا اہتمام اور خضر کی رہنمائی سب بےضرورت ہے۔[1] آگے فرماتا ہے: "وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ

(۱) عروج وزوال کا اثر: ۲۷۹-۲۸۰

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا"۔

"اور بڑھے ہم ان کے عملوں کی طرف جو انہوں نے عمل کیے ہیں بغیر ایمان کے"۔ اللہ ورسولؐ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے بغیر اجر وثواب کے لالچ کے بغیر جو عمل کیے ہیں تو۔ "فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا"۔ ہم نے ان کو اڑتا ہوا غبار بنا دیا"!

"هَبَآءً مَّنْثُوْرًا"۔ "هَبَآءً" کے معنی اول تو خود "غبار" ہے، کافی ہے، لیکن اس کے بعد اور شدت پیدا کرنے کے لیے فرمایا: "مَّنْثُوْرًا" وہ غبار ہوا کی طرح اڑ جانے والا۔ "غبار"! یعنی ہم نے ان کے اعمال پر پانی پھیر دیا، ان کے اعمال بے حقیقت ہو گئے، اس لیے کہ اس کے ساتھ ایمان نہیں تھا!

اور یہی اس وقت ہو رہا ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ جو ہے: دین سے دوری اور خدا ناشناسی اور خدا فراموشی، اس کی وجہ سے اچھے سے اچھا عمل کرتا ہے آدمی، لیکن کوئی نیت نہیں ہوتی نہ ثواب کی نیت ہوتی ہے، نہ اس سے فائدہ پہونچانے کی نیت ہوتی ہے، یا تو شہرت کی نیت ہوتی ہے "رِیَاء"۔ اور "سُمْعَة" دکھاوا اور شہرت طلبی اور یا پھر کوئی اپنی نفسانی غرض، یا کوئی دور کا مقصد کہ یہ ہوگا آج ہم اس کی تائید شروع کرتے ہیں، تو اس سے فائدہ اٹھالیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ایسے اعمال کی کوئی قیمت نہیں ہمارے یہاں "فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا" قیامت کے دن ہم ان کو بالکل گرد وغبار بنا دیں گے" کوئی کام آنے والی چیز نہیں!

اس لیے اس پر بہت نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف عمل کا صالح ہونا کافی نہیں، بلکہ نیت ہونی چاہیے خدا کی رضا کی۔(۱)

(۱) درس قرآن، سورۃ الفرقان: ۲۱-۲۳ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ، مندرجہ اقتباس: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۴۹-۱۵۰ ☆ عروج وزوال کا اثر: ۲۷۹-۲۸۰، سے اخذ وتلخیص کیے گئے ہیں۔

رسول اللہ کے حریفوں کا عبرت ناک انجام

﴿ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴾ (الکوثر: ۳)

''بیشک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے''۔

محمد ﷺ کے پیغام کی مخالفت کرنے والوں، آپ کی عالمی اور ابدی قیادت کو چیلنج کرنے والوں اور نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کا ہمیشہ یہی انجام ہوا ہے، قرآن کی آیت کریمہ ﴿ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴾ ''بیشک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے'' کو میں رسول اللہ ﷺ سے بغض وحسد رکھنے والے اور آپ کی قیادت سے اختلاف کرنے والے قریش کے کسی اجڈ اور اکھڑ شخص کے لیے مخصوص نہیں مانتا، اسی طرح ''ابتر'' میرے خیال میں صرف نسلی اور نسبی انقطاع ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ:

''اے محمد (ﷺ) جو بھی آپ کا مخالف ہو، آپ سے دشمنی رکھے، آپ کی عالم گیر قیادت کو چیلنج کرے، آپ کی قیادت سے قوم کا تعلق منقطع کرکے ان کی گردنوں پر خود مسلط ہو جائے اور قوم کے ذہن ودماغ سے روحانیت کے مبارک عنصر کو خارج کرنا چاہے، اس کا انجام ہے بدتوفیقی، ناکامی، ذلت، گمنامی اور بے نشانی''۔

یہ انجام ہوا مسیلمہ کذاب کا، اسود عنسی کا، طلیحہ اسدی کا، سجاح کا، ابوطاہر جنابی کا، عبید بن میمون کا، حسن بن صالح کا، بہاء اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی کا......... اور اسلام سے

بغض وعداوت رکھنے والے انتہا پسند قوم پرست لیڈروں کا بھی ہر زمانہ میں یہی انجام ہوا ہے اور جو شخص بھی اس امت پر ناجائز طور سے اور زبردستی غلبہ حاصل کرے گا اور امت کو محمد ﷺ کی ابدی قیادت سے الگ کرنے کی کوشش کرے گا، اس کا انجام بھی وہی ہوگا، قرآن نے جس کی خبر دی ہے اور تاریخ سے جس کی ابدیت ثابت ہے۔

مفسرین کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے اس آیت کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے اعتراف واحترام کے ساتھ میں یہ آیت اعلان کرتی ہے کہ "محمد ﷺ کے ہر حریف ورقیب اور آپ کی قیادت کو چیلنج کرنے والے ہر بدنصیب کا یہی انجام ہوگا"۔ (۱)

(۱) عالم عربی کا المیہ: ۱۳۶-۱۳۷

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو...

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۲۳)

"آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا، حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گذار ہوگے"۔

اس آیت کریمہ میں معرکۂ بدر کا ذکر ہے، مختصر سی آیت ہے، لیکن اس کے اندر ہمارے لیے بہت سامانِ عبرت ہے، یہ ایک ایسا سبق ہے، جو ہمیشہ کے لیے ہماری فکر کو جلا بخشتا رہے گا اور عزائم کو سینوں میں بیدار رکھے گا، یہی نہیں بلکہ اس آیت میں ہماری حیثیت کا تعین بھی ہے، اقوام عالم میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہیے، اس کی طرف واضح رہنمائی ہے۔

دعاء کا پاسنگ

معرکۂ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں، ہم میں مختلف رنگ ونسل کی مسلمان قومیں، یہ سب بدر کی پروردہ ہیں اور بدر اس دعوت وپیام کا رہین منت ہے، جسے آنحضرت ﷺ لائے تھے، بدر میں دو مقابل لشکر نہیں

تھے، بلکہ دونوں عدد، اسباب و وسائل میں عدم تناسب کے اعتبار سے گویا دو مختلف پلڑے تھے، ایک پلڑا اپنے بوجھ کی وجہ سے زمین کو چھو رہا تھا، یہ کفار و مشرکین کا پلڑا تھا، دوسرا اپنی بے وزنی کی وجہ سے فضا میں معلق تھا، یہ اہل ایمان کا پلڑا تھا، آنحضرت ﷺ نے اپنی دعاؤں اور نصرت الٰہی کا پاسنگ مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔

آپ نے زمین پر اپنی پیشانی رکھی اور وہ جملہ فرمایا جو بلا شبہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کی بقا، بلکہ امت کی بقا کا حقیقی سبب تھا، آپ نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَنْ تُعْبَدْ"۔ "اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت (جو مسلمانوں کی یہاں جمع ہے) ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی"۔

یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، کس کی مجال تھی کہ ایسی بات اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہے کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایسا ہوگا اور ایسا کیا تو یہ ہوگا، پھر پیغمبر بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر چنا ہوا محبوب، باوقار، باوجاہت ہے، ایسا رسولؑ جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب ہی اس لیے کیا تھا کہ اس کے پیغام اور لائے ہوئے دین کو قیامت تک باقی رکھے گا اور ہمیشہ اس کا ناصر و مددگار رہوگا وہ کہے "اگر تو نے مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہوگی" یعنی اے اللہ اگر تو نے اس جماعتِ مختصر کی شکست کرا دی تو دنیا کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا، انسانیت کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، دنیا کی حکومتیں اور دنیا کے ملک اسی طرح رہیں گے، جس طرح آج ہیں، دنیا کے خزانوں میں کمی نہیں آئے گی، دنیا میں کمانے کھانے کے جو کام ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ہوتے رہیں گے، بڑے دانشور، حکمت و دانائی میں ممتاز افراد جس طرح ہوتے آئے ہیں، اسی طرح پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے، لیکن صرف ایک بات جو نہیں ہوگی، وہ ہے خالص تیری ذات پاک کی عبادت، تیرے احکام کا دنیا میں نفاذ اور تیرے دین حنیف کی بقاء یہ کام نہیں ہوگا اور سب کچھ ہوگا، کیوں کہ اپنی تعداد میں کمی اور دفاعی اسلحہ میں ناقص ہونے کے باوجود روئے زمین پر تنہا یہی جماعت ہے جو توحید کی داعی اور تیری عبادت گزار ہے، جس کا بھروسہ صرف تجھ پر اور جس کا اعتماد تیری ذات پاک پر ہے، جس کی عبادت صرف تیری ذات پاک کے لیے ہے اور

جس کو یقین ہے کہ کائنات پر صرف تیرا تصرف ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، تو ہی قادر مطلق، حاکم مطلق اور مالک الملک ہے، عبادت و طاعت کا تنہا سزاوار ہے، صرف تیرے احکام اور صرف تیری شریعت کا یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر نافذ ہو اور بے چون وچرا اس کی فرمانبرداری کی جائے" اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی نصرت فرما کر اس کی تصدیق کی۔

امت اسلامیہ کا مقام اور پیغام

"اگر کہیں اس جنگ میں مسلمان ناکام ہو جاتے تو صاف سن لیجئے کہ عالم اسلامی نام کی کوئی چیز اس آسمان کے نیچے نہ دکھائی دیتی، اسلامی دعوت و تبلیغ کو دنیا میں اپنی راہ نکالنے کا کوئی راستہ نہ ہوتا، دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت، ملکوں کو فتح کرنے کی قوت، اس کے نام پر حکومتیں بنانے کا حوصلہ، اداروں، مدرسوں اور کتب خانوں کی یہ چمک دمک، یہ سرگرمیاں اور نشاط وقوت کے مظاہر سب ناپید ہوتے، نہ اس قوم میں کوئی نادرۂ روزگار عالم وصاحب فن نہ ہوتا نہ اولیاء وصالحین کی کوئی جماعت ہوتی اور نہ آوازۂ حق کہیں سنائی دیتا"۔

"لہٰذا وہ چیز جس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جس کے لیے ان کے اندر غیرت وحمیت ہونا چاہیے اور جس کو وہ اپنی جان سے، صحت سے، اپنی دانائی وہوشمندی سے زیادہ عزیز رکھیں اور جس کو دولت وحکومت پر ترجیح دیں، اپنی شہرت وناموری کے پروپیگنڈے اور اپنی سیاسی تنگ ودو سے زیادہ اہمیت دیں اور جذبۂ حکمرانی اور اپنے حدود سلطنت کو وسیع کرنے کی تمنائیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا داعی ومبلغ سمجھیں، علم توحید کو سربلند اور اللہ کے دین کو سرسبز وشاداب رکھنے کی آرزو ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں پر غالب آجائے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، اللہ کی رضا اور اس کے احکام کے اجراء کو ہر مقصد اور ہر نسبت پر قربان کرنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار کریں، ان کے بقاء کی ضمانت اسی میں ہے کیوں کہ ان کا وجود ملی اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے"۔ (۱)

مشترک اخذ وتلخیص، از: ☆ اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۷-۱۹ ☆ عالم عربی کا المیہ: ۷۰-۷۳ ☆ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں: ۷۶

قیامت کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ، مَايَاتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ، لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ﴾
(الانبیاء: ۱—۲)

''لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں اعراض کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی نصیحت نہیں آئی ان کے رب کی طرف سے نئی مگر وہ اس کو سن لیتے ہیں اور اپنی تفریحات میں مشغول ہوتے ہیں دل ان کے غافل ہیں۔''

یہ سترھویں پارے کی سورہ انبیاء کی آیات ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'' لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب ہو گیا ہے، لیکن وہ غفلت کے مارے، غفلت کے اندر منہ پھیرے ہوئے ہیں، اور اس سے بے تعلق اور بے خبر ہیں۔

قیامت عامہ اور حشر عام ہے

جب کوئی چیز بہت بڑی ہوتی ہے تو خواہ اس کا زمانہ کتنا دور ہو اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے وہ حقیقت میں قریب ہی ہوتا ہے (ایک اچھا طالب علم، فرض شناس اور کامیابی کا

شائق، اس کا امتحان چاہے اس میں ایک سال باقی ہو، چاہے اس کا درجہ ابھی شروع ہوا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ کل کی بات ہے، کل ہی ہونے والی چیز ہے) تو کسی چیز کا قرب وبعد اس چیز کی اہمیت وعظمت کے حساب سے ہوتا ہے، مثلاً اس میں ایک موت ہی کا معاملہ ہے۔ موت یقینی ہے، وہ خواہ کتنی دور کا ہے، لیکن سمجھنا چاہیے کہ قریب ہے، ویسے ہی قیامت کا معاملہ ہے کہ قیامت کو ہزاروں برس ہو سکتے ہیں اور اس سے کم اور زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے، وہ تو قیامت عامہ ہے اور حشر عام ہے، لیکن ہر شخص کو جو اپنا حساب دینا ہے۔ وہ تو ہر وقت ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کا جو قانون مکافات ہے، اللہ تعالیٰ جو عمل پر بدلہ دیا کرتا ہے اور عمل کی کوتاہی پر یا گناہ ومعصیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ملتی ہے اور اس کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، وہ تو ہر وقت ممکن ہے اور روزانہ، روزانہ نہیں بلکہ ہر گھڑی اس کا سلسلہ جاری ہے، تو اگر اس سب کو سامنے رکھیں، عالمی موت کو آپ سامنے رکھیں اس کا نام قیامت ہے اور اپنی موت کو سامنے رکھیں جس کا وقت اور زمانہ معلوم نہیں اور اس کے بعد اعمال پر جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے معاملہ ہوتا ہے، جزا ملتی ہے اچھے عمل پر، سزا ملتی ہے برے عمل پر، اور جو ہر چیز میں اللہ نے تاثیر رکھی ہے، اعمال میں تاثیر ہے، طاعت ومعصیت میں تاثیر ہے، محنت میں تاثیر ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کے خوف میں تاثیر ہے، لوگوں کی خدمت اور اللہ کی عبادت میں جو تاثیر ہے اس سب کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ حساب ہر وقت قریب ہے اور وہ بالکل پیش نظر ہے اور وہ ہمارے سامنے ہے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سارے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، اللہ عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ اس کلام کا نازل کرنے والا ہے اور یہ کلام تمام عالم پر محیط ہے، پوری زندگی پر محیط ہے، اور پورے زمانے اور تاریخ پر محیط ہے۔ اس سب کو سامنے رکھتے ہوئے بالکل یہ آیت بذات خود اپنی جگہ پر ایک معجزہ ہے۔ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" "لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آگیا ہے اور وہ "غفلت" میں "اعراض" کیے ہوئے ہیں۔

دین الٰہی سے انحراف کا سبب

دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے اللہ سے بے تعلقی اور اس کے احکام وفرائض کی طرف سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت وکفر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے عزت وجاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سرتاپا انہماک آدمی کو معاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے، مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہیکہ سرے سے نجاب کا خیال رضائے الٰہی کے حصول کا شوق اور اس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے اور کھانے پینے اور پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے، نیک وبد اور حلال وحرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق واعمال سیرت وکردار، معاشرت وآداب اور وضع وصورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے، شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات ومحرکات کا آزادی سے ارتکاب کیا جاتا ہے، جرائم اور فسق وفجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اور ان میں ایسی ذہانت اور ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں، شرع ودین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسی خدا فرموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔ (۱)

اللہ تعالی فرمارہا ہے "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" لوگوں کے ان کا حساب قریب آگیا ہے" پوری دنیا کی تصویر ہے کہ حقیقتاً دنیا کے فرد فرد کا الگ اور افراد کے مجموعے جو جماعتیں ہیں اور قومیں ہیں اور زمانہ ہے اور جس کو عہد کہتے ہیں پورے عہد کا حال یہ ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ" سب کا حساب قریب ہے، کسی وقت اللہ تعالی لے سکتا ہے، کسی وقت کوئی بلا نازل ہو سکتی ہے، کسی وقت کوئی طوفان آسکتا ہے، کسی وقت کوئی انقلاب آسکتا ہے، کسی وقت خون کے دریا بہہ سکتے ہیں (اور ابھی آپ نے دیکھا قریب کے فسادات میں کہ کیا کچھ نہیں ہوا) " حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے لیے

(۱) اسلام کے قلع ص: ۵۸-۵۹

ان کا حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں اعراض کیے ہوئے ہیں" "وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں اور یہ منہ پھیرنا جو ہوتا ہے جسمانی طور پر ضروری نہیں ہے کہ آدمی منہ پھیر لے۔ عربی میں ''اعراض'' کے معنی بے رخی، بے تعلقی کے بھی ہیں ''اعراض'' جسمانی بھی ہوتا ہے اعراض قلبی بھی اور اعراض فکری بھی لیکن اعراض فکری اور اعراض معنوی، اعراض جسمانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے"۔ (۱)

ایک بہت بڑی انسانی کمزوری

"مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ، لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ" پھر اس میں ایک بڑی انسانی کمزوری، انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں کمزوریوں پر اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے، اشارہ کیا ہے اس کی طرف کہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ "مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ" ان کے پاس کوئی نصیحت نہیں آتی ان کے رب کی طرف سے نئی اور یہ ''محدث'' ''نئی'' کا لفظ اس لیے کہا کہ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جو چیز بالکل نئی ہوتی ہے اس کی طرف توجہ خود ہوتی ہے، اخبار کیوں دیکھا جاتا ہے؟ دنیا وہی ہے جو کل تھی، لیکن آپ اخبار کیوں دیکھتے ہیں؟ ہم نے آج صبح اخبار دیکھا نئی چیز کی تلاش میں، نئی چیز کے علم کے لیے، اس نئی چیز کا جو تقاضا ہے اس کا سامان کرنے کے لیے تو یہ لفظ ''محدث'' یونہی نہیں کہہ دیا گیا کہ ''ان کے پاس کوئی نیا ذکر، کوئی نئی نصیحت نہیں آتی مگر وہ اعراض کرتے ہیں، اس لیے کہ نئی چیز کی فطرت میں اللہ نے یہ مادہ رکھا ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور وہ آدمی کو بیدار کردے اور ہوشیار کردے ورنہ زمانے کا جو تسلسل ہے، یہ دریا جو بہہ رہا ہے زمانے کا، یہ تو اسی طرح سے بہہ رہا ہے، جیسے آپ ندی کو دیکھ رہے ہیں، ''محدث'' ''نئی'' کی کیا حقیقت ہے؟ زمانے کا دریا اسی طرح سے بہہ رہا ہے، لیکن جب اس میں کوئی نئی موج اٹھتی ہے، جب اس میں کوئی نیا موتی سامنے آتا ہے، یا کوئی نیا جانور سر اٹھاتا ہے، یا اس میں ایک سیلابی کیفیت ہوتی ہے اور اس میں

(۱) تحفۂ دین و دانش ص: ۸۷

ٹکراؤ ہوتا ہے تو آدمی دیکھنے لگتا ہے، ورنہ یہ تو دریا اسی طرح سے ہے۔

غفلت کی آخری شکل

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے باوجود بھی نہیں دیکھتے یہ، مقصود یہ کہنا ہے کہ صرف ''غفلت'' ہی نہیں بلکہ ''غفلت'' کی آخری شکل کہ نئی چیز جو آتی ہے نئے خطرات لاتی ہے اپنے ساتھ اور وہ نئی آگاہی نئی خبرداری لاتی ہے، توجہ کی دعوت دیتی ہے، اس کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے لوگ اور اگر آپ دنیا کے حالات پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہی دنیا میں ہو رہا ہے، یہی امریکہ میں ہو رہا ہے یہی یورپ میں ہو رہا ہے، یہی عجم میں ہو رہا ہے، یہی مشرق میں ہو رہا ہے، یہی عرب میں ہو رہا ہے، ''مَايَاتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَّبِّهِمْ مُحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ'' کیا ہو رہا ہے ان ملکوں میں؟ کیا خرابی نہیں ہو رہی ہے، کیا خطرے کی بات نہیں پیدا ہو رہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ سے کون سی سرکشی کا کام نہیں ہو رہا ہے، لیکن لوگ گھبرا نہیں رہے ہیں، لوگ اسی طریقے سے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، اسی طریقے سے عیش کر رہے ہیں، اسی طریقے سے کھانے کمانے میں مصروف ہیں، یہ نہیں کہ جو نیا واقعہ آج پیش آیا ہے ہمارے ملک میں یا زمانے میں، وہ ان کو جھنجھوڑ دے، وہ ان کو جگا دے، وہ ان کو پریشان کردے کہ خدا خیر کرے کیا ہونے والا ہے اس وقت کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے، آنے والی نسلوں کا حال کیا ہوگا، ہم پر کیا ذمہ داری ہے۔ اب روز اخبار میں ہم پڑھتے ہیں وہ باتیں ہوتی ہیں، جن پر اللہ کا غضب نازل ہونا چاہیے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی آسمانی کتابوں میں خاص طور پر قرآن مجید میں ان لوگوں کے اعمال ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ'' (الروم: ۴۱) یہ اس میں بتا دیا گیا کہ پورے کی تو برداشت نہیں ''لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا'' ان کے بعض اعمال کا مزہ اللہ چکھاتا ہے کہ وہ لوٹیں حقیقت کی طرف آئیں مگر وہ نہیں آتے، تو یہ انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ صرف اتنا ہی نہیں کہ ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'' لوگوں کا حساب ان کے قریب آگیا ہے اور اب بھی غفلت میں وہ منہ پھیرے

ہوئے ہیں، روگرداں ہیں، غافل ہیں بلکہ "**مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ**" "**محدث**" نئی چیز بھی جو کوئی پیش آتی ہے، نیا عبرت کا سامان جو ان کے سامنے آتا ہے "**الا استمعوه**" اس پر بھی وہ اس کو سن لیتے ہیں دیکھ لیتے ہیں اور اپنی تفریحات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ "**هم يلعبون**" کا مطلب یہ نہیں کہ ہاکی کھیلتے ہیں، کرکٹ کھیلتے ہیں، ٹینس کھیلتے ہیں، یا اور کوئی اس طرح کا کھیل کھیلتے ہیں شطرنج کھیلتے ہیں۔

"**يلعبون**" میں سب آگیا اور "**يلعبون**" میں جو چیز جو اس کی اصل روح ہے اور جو قدر مشترک ہے ان سب چیزوں میں وہ ہے "غفلت" وہ ہے انہماک، انہماک اور یکسوئی اور کھیل جب کھیل ہوتا ہے، جب آدمی اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل غافل ہیں اور اپنی تفریح میں پڑے ہوئے ہیں۔ "**لاهية قلوبهم**" "دل ان کے غافل ہیں، دل ان کے تفریحی سامان میں مشغول ہیں" اس وقت آپ اگر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیں مغرب سے لے کر مشرق تک اور متمدن اور ترقی یافتہ دنیا سے لے کر کے پسماندہ اور پست حال دنیا تک اور ان میں سے بھی اہل ثروت سے لے کر فقراء تک، اہل علم سے لے کر جہلاء تک اہل عقل سے لے کر بے شعور لوگوں تک اور حاکم سے لے کر محکوم تک اور محکوموں کے بھی جو طبقات ہیں، ان میں بڑے اور چھوٹے سب کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ بالکل دنیا کا نقشہ ہے کہ "**اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُعْرِضُونَ**" معلوم نہیں کس وقت کس عمل کی کیا سزا ملنے والی ہے، یہ جنگیں جو پیش آتی ہیں یہ زلزلے جو پیش آتے ہیں، یہ فصل کی خرابی اور گرانی اور پھر اس کے بعد فسادات اور تصادم اور اس میں حق تلفی اور ظلم اور سفاکی یہ ساری چیزیں لوگوں کے عمل کا نتیجہ ہیں، اس لیے (کہنا چاہیے) کہ بہت دور ہے وہ حساب جو قیامت میں ہوگا۔

یہ آیت پیش نظر رکھنے کی ہے اس میں صرف قیامت کی خبر نہیں دی گئی ہے بلکہ اعمال کے نتائج کی طرف اور اپنے اور اپنی زندگی کے محاسبے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ (1)

---

(1) درس قرآن سورہ انبیاء:۱-۲ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ بالا اقتباسات بالترتیب مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں: ☆ اسلام کے قلعے ص:۵۸-۵۹ ☆ تحفۂ دین و دانش ص:۸۷

بلاغت واعجاز

قــرآن ....

صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلوماتِ غیبی اور حقائقِ ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلاب میں بھی، اپنی پیشنگوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۴۵

قرآن مجید کی ایک امتیازی اور مرکزی صفت

''الفرقان''

﴿تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾

(الفرقان: ۱)

یہ سورہ ''الفرقان'' کی پہلی آیت ہے، اس سورہ کا جو مرکزی مضمون ہے اور اس کا جو خاص پیغام اور مقصد ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین دینا ہے اور کفار آپ پر جو اعتراضات کر رہے تھے، اور اس میں جو شبہات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور ذات نبوی پر حملے کر رہے تھے، ان سب کا اللہ کی طرف سے جواب ہے اور اس میں کلام الٰہی کی حقیقت، کلام الٰہی کا امتیاز جو ہوتا ہے، وہ بیان کیا گیا ہے، اسی لیے اس سورہ کا نام ''الفرقان'' رکھا گیا ہے، یہ بہت ہی برموقع اور مناسب حال ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ''تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا'' (بڑی برکت والی ذات ہے اللہ کی، جس نے کہ الفرقان نازل کیا اپنے بندے پر، تاکہ وہ اہل عالم کے لیے، دنیا کے لیے ڈرانے والا بنے)۔

''الفرقان'' دیکھنے کو تو ایک کلمہ ہے، اس کے حروف آپ گن سکتے ہیں، مفرد لفظ ہے،

لیکن بڑا وسیع المعانی، عمیق المعانی، حسب حال اور بہت بڑی امتیازی چیز ہے۔

قرآن مجید کی جہاں اور صفات اور امتیازات ہیں، ان میں ایک بڑی صفت اور مرکزی صفت جو ہے، وہ ہے ''الفرقان''! فاروق اور ممیز ہے۔

یعنی عبودیت و معصیت، ہدایت و ضلالت اور توحید و شرک اور ایمان و کفر اور معصیت و غیر معصیت، انسان اور غیر انسان، کلام الٰہی اور کلام انسانی، ان سب کے درمیان وہ امتیاز پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ جن کو توفیق دے اور اللہ نے ان کو ذہن رسا عطا فرمایا ہو، بلکہ ذہن رسا سے بھی آگے بڑھ کر قلب کی بیداری عطا کی ہو۔ وہ اس لفظ کی وسعت کو اور اس کے انطباق کو اور اس کے امتیازات کو سمجھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے الفرقان نازل کیا'' ایک ایسا کلام نازل کیا کہ جو حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

سب سے پہلا اس کا کام یہ ہے کہ حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے درمیان امتیاز پیدا کرے بشر اور خالق بشر کے درمیان امتیاز پیدا کرے اور یہ وہ گمراہیاں تھیں، مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف دوروں میں ہزاروں برس سے چلی آرہی ہے، کبھی انسان اور خالق انسان کے درمیان فرق نہ کرنا، کبھی خالق کائنات اور قادر مطلق کے درمیان اور جس کو ایک محدود استطاعت دی گئی ہے، کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے، تھوڑا سا (Risk) دیا گیا ہے، یا تھوڑی حکمت دی گئی ہے، یا تھوڑا سا حکم چلانے کا موقع دیا گیا، ان دونوں کے درمیان فرق نہ کرنا۔

تو زیادہ تر گمراہیاں اس خلطِ مبحث سے پیدا ہوئی ہیں، جو مذاہب کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے اور زیادہ سے زیادہ جو قدر مشترک پائیں گے، وہ ہے خلط مبحث یعنی یہ کہ دو ممیز و ممتاز بلکہ متضاد چیزوں میں فرق نہ کرنا اور ان کو ایک دوسرے سے ملا دینا، اس کو تلبیس بھی کہتے ہیں۔ اس تلبیس کا شکار ہوئی ہیں امتیں اور حاملینِ کتاب، یہودی بھی اسی تلبیس کا شکار ہوئے ہیں، اپنے انبیاء کے بارے میں اور انبیاء کی نسل کے بارے میں جس میں خود یہود ہیں، ان کے بارے میں اور انسانوں کے بارے میں جو فرق ہے، اسی لیے یہ قرآن کا

معجزہ ہے کہ نصاریٰ کے لیے اس نے "ضَآلِّین" کا وصف بیان کیا ہے، اور یہود کے متعلق "المَغضُوبِ عَلَیھِم"!!!

اس چھوٹے سے ٹکڑے کو پڑھ کر اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے، کوئی غیر مسلم جس کی تاریخ پر گہری نظر ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ اصل میں "ضلالت" کے لفظ کو ہم اچھی طرح سمجھتے نہیں، جو لفظ عربی کے اردو میں خود عربی میں موقع پر استعمال ہوتے ہیں، چھوٹے محمل پر بھی استعمال ہوتے ہیں، بڑے محمل پر بھی استعمال ہوتے ہیں، ان میں وہ اثر باقی نہیں رہتا، ان سے آدمی وہ فائدہ نہیں اٹھاتا اور اکثر مغالطہ میں پڑ جاتا ہے، ہم معمولی سی چیز کو یہاں ضلالت کہہ دیتے ہیں۔

اصل میں عربی زبان میں ضلالت کے معنی ہیں، غلط راستے پر پڑ جانا، ہمارے یہاں کوئی ذرا سی غلطی کرے تو کہیں گے ضلالت ہے، کوئی اگر حد سے زیادہ تجاوز کرے تو کہدیں گے ضلالت ہے، کوئی کوتاہی ہو جائے تو کہدیں گے ضلالت ہے۔

اصل معنی ہیں ضلالت کے "غلط راستہ اختیار کر لینا" راستہ مشرق کو جانے والا ہے تو مغرب کی طرف جانے والے راستہ پر پڑ جائے!

عیسائیوں کے ساتھ یہی ہوا کہ ۶۰ برس مشکل سے گذرے ہوں گے حضرت مسیحؑ کو دنیا سے تشریف لے جائے ہوئے کہ ایک شخص سینٹ پال (۱۰ء-۶۵ء) پیدا ہوا، جو رومی تھا، اور اس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ رومی سلطنت کی ایک سازش تھی!

تاریخ مذاہب کا بہت گہرا مطالعہ کیا جائے، اور اس کا جو پس منظر (Back Ground) ہے، اس کو دیکھا جائے۔ انگریزی کتابوں میں، رومن امپائر کی تاریخ میں اور عیسائیت پر بھی جو ناقدانہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تو معلوم ہوگا کہ، عیسائی مذہب جتنی جلدی تحریف کا شکار ہوا، بہت کم مذاہب اتنی جلدی کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں اور تحریف کے۔

"ضَــآلِّیــن" کے معنی کیا ہیں؟ کسی شخص کو مثلاً کلکتہ جانا ہو، لکھنؤ کی طرف سے راستہ ہے اس کے لیے وہ دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائے، یہ ہے "ضلال"! اب گاڑی جتنی تیز چلے گی، جتنی دیر تک چلے گی وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جائے گا، اس کو کہتے ہیں راستہ

بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے، اتنا ہی وہ منزلِ مقصود سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

عیسائیت کا حال یہی ہے کہ وہ اپنی منزل سے دور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ عیسائی ہے لکھنے والا، وہ لکھتا ہے کہ یہ عیسائیت کسی معنی میں بھی حضرت عیسیٰ کی سکھائی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ سینٹ پال کی سازش ہے اور اس کی تحریف ہے، سینٹ پال کا بنایا ہوا ایک چکر ہے اور ایک جعل سازی ہے!!

تو اللہ فرماتا ہے "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ" "بڑا برکت والا ہے وہ جس نے الفرقان کو نازل کیا" یہاں "الفرقان" کی بلاغت، اس کی وسعت اور اس کا انطباق، اس کی صحتِ انطباق اور اس کلمہ کی اصل جو طاقت ہے، اس وقت تک سمجھ میں نہیں آئے گی، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف منسوب کیے ہوئے کلام اور کتابیں مثلاً تورات کے صحیفے اور پھر اس سے بڑھ کر یہاں وید کا جو ایک دفتر ہے، وہ جب تک نہ پڑھے گا آدمی، قرآن مجید کی صفت "الفرقان" اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اس کو "الفرقان" کہا گیا۔ یہ فارق بین الحق والباطل ہے، وہاں حق وباطل ممزوج ہیں، وہاں ہدایت وضلالت ممزوج ہیں، وہاں توحید وشرک بلکہ شرک غالب ہے توحید پر!

اگر آپ وید وغیرہ پڑھیں تو اس میں فلاں میں یہ خاصیت، فلاں میں یہ خاصیت، فلاں یہ کرسکتا ہے، کرشن یہ کرسکتے ہیں، گنیش یہ کرسکتے ہیں، رام یہ کرسکتے ہیں اور سارا ہندو مذہب سب اسی سے ماخوذ ہے اور وہ سب ایک آمیزہ ہے، ایک معجون مرکب ہے۔

تھوڑی سی توحید کہیں کہ اللہ کی کہیں شان آگئی اور باقی یہ بڑے بڑے کام دنیا کے جو ہیں، زندگی دینا، مرتے ہوئے کو جلا دینا اور ہارے ہوئے کو اختیار دینا، یہ سارے کام کوئی ایسا کام خارقِ عادت نہیں جو کسی دیوتا کی طرف منسوب نہ کیا گیا ہو!

"لیکن اسلام میں دین کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے، جو بہت سے اہل مذاہب نے اپنے مذہب کا قائم کرلیا ہے، یہاں انسان کے متعلق اصولی تخیل یہ ہے کہ وہ "عبد" (خدا کا بندہ ہے) اور وہ اپنی زندگی کے کسی شعبہ اور گوشہ میں بھی اس دائمی غلامی سے آزاد نہیں ہے، اس

کا ہر کام، یہاں تک کہ اس کی بادشاہی (جو بظاہر غلامی کے منافی معلوم ہوتی ہے) اس کی عبدیت ہی کا ایک مظہر ہے، اس تخیل کے مطابق مذہب وسیاست کی تفریق کی بحث یہاں پیدا ہی نہیں ہوتی، اس "عبد" کو اس کے "مولیٰ" کی طرف سے قرآن کی صورت میں ایک کلی اور اصولی مکمل دستور العمل دے دیا گیا ہے، اس دستور العمل کی ہدایت میں "عبدیت" کی پوری زندگی کامیابی کے ساتھ گذاری جاسکتی ہے، اس کتاب کو کسی سیاسی ضمیمہ کی ضرورت نہیں"۔ (۱)

"تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا" (اس نے اپنے بندے پر الفرقان کو نازل کیا، تاکہ وہ اہلِ عالم کو ڈرانے والا بنے) اب دیکھئے اس میں خاص بات ہے کہ "الفرقان" اور "نـذیـر" دونوں میں خاص مناسبت ہے، قرآن کی کوئی صفت بیان کی جائے سب صحیح ہے، لیکن "نـذیـر" کا جہاں تک تعلق ہے، یعنی عملِ انذار کا اس کے لیے "الفرقان" ہی سب سے مناسب ہے! جو چیز "الفرقان" کہلانے کی مستحق ہے، فارق بین الحق والباطل ہے، وہی "انذار" کا کام کرسکتی ہے!

آپ تھرمامیٹر رکھیں جو بتاتا ہے کہ اتنی گرمی اتنی سردی، وہی بتائے گا، اسی طریقہ سے آپ کوئی تولنے والی چیز، دودھ اور پانی کو الگ الگ کردینے والی چیز اور جو مختلف مواد ہیں، جو ان کا امتزاج ہوجاتا ہے، ان میں فرق کرنے والے چیز کوئی ہو، اس سے وہ کام لیا جاسکتا ہے!

تو چونکہ یہ "الفرقان" ہے اس لیے "العالمین" کے لیے "نذیر" ہے! یہ حق وباطل کے درمیان صرف فرق ہی نہیں کرتا بلکہ ڈراتا بھی ہے کہ باطل کے اختیار کرنے سے یہ ہوگا، حق کو چھوڑ دینے سے یہ ہوگا!

"قرآن "فرقان" (فاروق اور ممیز) ہے اور یہ اس کی ایسی امتیازی صفت ہے، جو اس کے نام کے قائم مقام ہوگئی ہے، "تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا" "بڑی عالیشان ذات والا ہے، جس نے یہ فیصلہ کی کتاب

(۱) درس قرآن، سورۃ الفرقان: ۱(غیر مطبوعہ)

اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی، تاکہ وہ تمام دنیا جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

قرآن مجید نے ہدایت و گمراہی میں، ایمان و کفر میں، اسلام اور جاہلیت میں، خدا کی رضا وعدم رضا میں، یقین وظن میں، حلال وحرام میں، قیامت تک کے لیے جو فصل و امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس کی نظیر سے مذہبی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں کی تاریخ خالی ہے، مثال کے طور پر توحید وشرک میں اس نے جو عظیم الشان تفریق پیدا کر دی ہے اور اس بارے میں ادنیٰ احتمال اور ضعیف سے ضعیف اشتباہ کو اس نے جس طرح دور کیا، وہ اس کا اعجاز ہے"۔ (۱)(۲)

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۲۶-۲۷

(۲) درس قرآن، سورۂ الفرقان: ۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۲۶-۲۷، سے ماخوذ ہیں۔

غلبۂ روم کی پیشین گوئی

﴿الٓمٓ. غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِی اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ. فِی بِضْعِ سِنِیْنَ. لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ. وَیَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَشَاءُ. وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ. وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ. وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ. یَعْلَمُوْنَ ظَاھِراً مِنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ھُمْ غَافِلُوْنَ﴾ (الروم: ۱-۷)

''اہل روم مغلوب ہوگئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے، (یعنی) چند ہی سال میں پہلے بھی اور پیچھے بھی، خدا ہی کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہوجائیں گے (یعنی) خدا کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے، وہ غالب (اور) مہربان ہے (یہ) خدا کا وعدہ (ہے) خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یہ تو دنیا کی ظاہر زندگی ہی کو جانتے اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں''۔

قرآن مجید کا ایک اعجاز اس کی پیش گوئیاں ہیں، معجزہ اسی چیز کو کہتے ہیں، جو خارق عادت طریقہ پر محض خدا کی قدرت سے کسی پیغمبر کی تصدیق کے لیے ظاہر ہو اور انسانی عقل اس کی ظاہری توجیہ و تعلیل سے قاصر ہوں، جن حالات میں یہ پیش گوئیاں کی گئی ہیں، اور

جس طرح ان کا ظہور ہوا وہ ایک معجزہ ہے، ان پیشگوئیوں میں اعجاز کے دو پہلو جمع ہیں، ایک ان (بظاہر) ناموافق حالات میں ان کا بعید از قیاس اور اہم واقعات کا محض علم واطلاع دوسرے اس اطلاع کے عین مطابق ان کا ظہور ووقوع۔

ان سب پیشن گوئیوں میں سب سے زیادہ صاف اور محیر العقول پیشن گوئی غلبۂ روم کی پیشن گوئی ہے، یہ پیشن گوئی ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔"غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ. وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِي بِضْعِ سِنِيْنَ" (اہل روم مغلوب ہوگئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے، (یعنی) چندہی سال میں۔

اس پیشن گوئی کا اسلوب اور سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس کو قرآن مجید اور آنحضرت ﷺ کے ایک معجزہ اور ان دونوں کی صداقت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہ بالکل غیر معمولی اور غیر عادی واقعہ ہے، اس لیے کہ رومیوں کا یہ غلبہ ان کی انتہائی مغلوبیت کے بعد ہوا ہے، اس لیے آیت کی ابتداء میں دوجگہ ان کی مغلوبیت کا ذکر کیا گیا ہے، "فِي بِضْعِ سِنِيْنَ" "یعنی چندہی سال میں"۔

اس واقعہ غرابت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ واقعہ نو سال کے اندر اندر پیش آئے گا، جو ایک برباد شدہ سلطنت اور ایک زوال پذیر قوم کے ابھرنے اور فاتح کو مفتوح بنالینے کے لیے ناکافی مدت ہے، "بِضْعِ سِنِيْنَ" .... کوئی بات اتنی خلاف قیاس اور اتنی ناقابل قیاس اور اتنی بعید از امکان نہیں تھی، جتنا اس زمانے میں یہ کہنا کہ "بضع سنین" چند سال کے اندر (نو تک غالباً "بضع" کا اطلاق ہوتا ہے،) کہ اتنے سال میں رومی غالب آجائیں گے۔

جب سورہ روم کی یہ ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور کفار مکہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو بالکل مستبعد واقعہ سمجھ کر مسلمانوں کے ساتھ شرط کی کہ اگر رومی واقعی غالب آگئے تو وہ مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے، حضرت ابوبکرؓ نے جو شرط میں شریک تھے، اس کے لیے پانچ سال کی مدت

مقرر کی، آنحضرت ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا "بضع" کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے، اس لیے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے نو سال کی شرط کی۔

انگریز مؤرخ وادیب ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) کی تاریخ "زوال روما" (Decline fall of theRoman Empire) ہے، وہ لکھتا ہے:

"محمد ﷺ نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشن گوئی کی، کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے، جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنتِ روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے"۔[1]

گبن کہتا ہے کہ: رومیوں کی شکست اس درجہ کو پہنچ گئی تھی، ایرانی بازنطینی سلطنت کے مرکز میں اور صلیب مقدس (TRUE CROSS) اس کو وہاں سے لے گئے تھے اور پھر اس کے بعد وہ عراق میں بھی گھس گئے تھے، جہاں جہاں رومی مملکات تھے۔

تو یورپین مؤرخین نے اس کو مانا ہے، کہ رومیوں کی شکست کہاں تک پہنچ گئی تھی اور اس حالت میں رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کرنا کتنا بعید از قیاس تھا۔؟ وہ کہتے ہیں کہ "اس سے زیادہ بعید از قیاس بات کہی ہی نہیں جا سکتی تھی!

یہ بات قیاس میں آئی ہی نہیں سکتی تھی، بالکل انہونی بات تھی، جیسے امر مستحیل جس کو کہتے ہیں، ایک مستحیل امر تھا۔ لیکن پورے وثوق کے ساتھ کہا گیا "غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ، وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِي بِضْعِ سِنِيْنَ" "اہلِ روم مغلوب ہو گئے، نزدیک کے ملک میں، اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے، (یعنی) چند ہی سال میں۔

اور ۶۲۵ء میں یعنی ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر کے موقعہ پر ٹھیک نو برس کے اندر) قرآن مجید کی یہ عظیم الشان پیشین گوئی پوری ہوئی، جس کی تکمیل کے کوئی ظاہری آثار

(۱) مطالعۂ قرآن کا اصول ومبادی: ۸۷-۱۰۰

وقرائن نہ تھے، یہ بالکل ایک اعجاز کی بات ہے، اس کو یورپین مؤرخین نے مانا ہے۔

آیات کے دوسرے حصے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ واقعہ خارق عادت طریقہ پر ظاہری آثار وقرائن کے بالکل خلاف اور عام انسانی قیاسات وتوقعات کے برعکس ظہور پذیر ہوگا، چنانچہ پہلے فرمایا "لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ" "پہلے بھی اور پیچھے بھی اللہ ہی کا حکم ہے،" جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کو ہر وقت اختیار ہے، اس کو غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرتے کچھ دیر نہیں لگتی، اس کے لیے کسی وقت کی کوئی قید اور سازگار حالات کا انتظار نہیں، وہ دن رات ایسے تصرفات کیا کرتا ہے: "قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ. إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (آل عمران: ع-۳) "کہو کہ (اے) خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے (اور) بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے"۔

پھر آگے چل کر فرمایا کہ یہ واقعہ محض خدا کی مدد کا نتیجہ ہوگا اور مسلمان ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں سے قریب تر ہونے اور کفار کے طنز وتعریض کی وجہ سے اسی درجہ بلکہ اس سے زیادہ مسرور ہوں گے، جتنے رومیوں کی شکست سے وہ محزون ہوئے، "وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ. بِنَصْرِ اللّٰهِ" "اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے، یعنی خدا کی مدد سے"۔ ممکن ہے کہ اس سے خود مسلمانوں کی اس عظیم الشان اور فیصلہ کن فتح کی طرف اشارہ ہو، جو بدر کے میدان میں ٹھیک اسی دن پیش آئی، جس دن رومی ایرانیوں پر غالب ہوئے۔

اس پر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رومی عیسائیوں کی مدد کیوں کرے گا، فرمایا "یَنْصُرُ مَنْ یَشَاءُ" "جس کی وہ چاہے مدد کرے" اور اپنی ان صفتوں کا ذکر کیا، جن کا اس محیر العقول واقعہ سے خاص تعلق ہے اور اس کے امکان وظہور کے لیے ایک دلیل کے طور پر ہیں، "وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ" "اور وہ غالب اور رحیم ہے"۔

"یہاں صفات میں سے انتخاب کیا "غالب" اور "رحیم" کا.........کہ ایسا "غالب" ہے جو "رحیم" بھی ہے، صرف "غالب" ہوتا تو ان کا بالکل خاتمہ کر دیتا اور ان کا بالکل دم ہی باقی نہ رہتا، لیکن وہ "رحیم" بھی ہے۔

تو "عزیز" اور "رحیم" کے مل جانے نے "عزت" اور "رحمت" کے مل جانے نے ایسی صفت جامعہ پیدا کی کہ جس میں "غلبہ" کے ساتھ "رحمت" ہے اور "رحمت" کے ساتھ "غلبہ" ہے، بعض "رحمتیں" ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں "غلبہ" نہیں ہوتا ہے، لوگ کہتے کہ یہ تو یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ معاف نہ کرتے تو کیا کر سکتے تھے؟ تو صرف "رحمت" میں یہ بات ہوسکتی ہے اور "غالب" میں یہ ہوسکتی ہے کہ "غالب" ہے اس لیے "رحم" نہیں آتا۔

لیکن جب وہ "العزیز الرحیم" ہے تو پھر اس کے بعد جہاں وہ مناسب سمجھتا ہے رحمت کا معاملہ کرتا ہے اور جہاں مناسب سمجھتا ہے "عزت" کا معاملہ کرتا ہے......اور اس کے سارے افعال اور دنیا میں، پچھلی تاریخ میں اور اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر۔ ان سب میں آپ دیکھئے کہ اعمال کے جو نتائج نکل رہے ہیں، ان میں کہیں "عزت" کا ظہور ہو رہا ہے، اور کہیں "رحمت" کا ظہور ہو رہا ہے"۔[1]

اس واقعہ کے وقوع میں ان دونوں صفتوں کا ظہور ہوا، ایرانیوں کے لیے جو اپنی فتح کے نشہ میں سرشار تھے، عزت وغلبۂ خداوندی کا اور رومیوں کے لیے جن کا جسم اور قلب زخموں سے چور چور تھا اور ان کی سلطنت عالم سکرات میں موت کی سسکیاں لے رہی تھی، ان کے پچاس ہزار آدمی قید اور ان کی قوم طرح طرح سے ذلیل کی جارہی تھی، رحمتِ الٰہی کا ظہور تھا، پھر ان مسلمانوں کے لیے جن کو ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست سے

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء:۱ (غیر مطبوعہ)

طبعی طور پر رنج پہنچا تھا، شادمانی کا پیام تھا اور خود ان سے آئندہ غلبہ کی پیشین گوئی اور اس کا اشارہ تھا، پھر اس کی مزید تاکید فرمائی کہ اس میں تخلف نہیں ہوسکتا۔ ''لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ'' (روم:۳۰) ''اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا''۔

پھر آخری طور پر بتادیا کہ یہ واقعہ انسان کی ظاہری معلومات اور روزمرہ کے تجربات کے خلاف پیش آئے گا، اس لیے بہت سے لوگ اس کے وقوع سے پہلے اس کی تصدیق کرنے سے عاجز ہوں گے اور اپنے ظاہری عالم سے اس کا قیاس نہ کرسکیں گے "وَلٰکِنَّ النَّاسَ لَا یَعْلَمُوْنَ" (النمل:۳۸) ''لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' "یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ" (یونس:۹۲) ''یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں''۔[1]

(۱) مشترک اخذ تلخیص-از: (الف) درس قرآن، سورۂ فرقان: ع-۱ (غیر مطبوعہ) (ب) مطالعۂ قرآن کا اصول ومبادی: ۸۷-۱۰۰، نیز ان آیات کا تاریخی پس منظر، رومیوں کی مشکلات اور پیشین گوئی کی تکمیل تفصیلات جاننے کے لیے مذکورہ کتاب صفحہ: ۹۲-۱۰۷، ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

نور ایک ہے اور ظلمتیں بے شمار

﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهِ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ﴾

(المائدہ: ۱۶)

''خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کے راستے کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے انہیں تاریکیوں سے نکالتا روشنی میں لاتا اور سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ''۔ ''خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کے راستے کھول دیتا ہے''۔

''قرآن مجید زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں جو ہموار و مستقیم اور تمام بے اعتدالیوں سے پاک اور بے خطر راہیں کھولتا ہے، ان کے لیے''سبل السلام'' (سلامتی کے راستے) سے بہتر تعبیر ہو ہی نہیں سکتی اور یہ انہیں جملوں میں ہے، جن کی تشریح ان کے الفاظ سے زیادہ ممکن نہیں، یہ سب (سبل) درحقیقت ایک ہی شاہ راہ (صراط) کی گلیاں ہیں، جن کی طرف پیغمبر اشارہ کر کے کہتا ہے''وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ'' (الانعام: ۱۵۴)''اور اس نے بتلایا کہ یہی میری سیدھی راہ ہے، سو اسی پر چلو''۔

''وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهِ'' ''اور وہ اپنے حکم سے ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے''۔

''اس موقع پر قرآن کی بلاغت کا یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ اس نے ''نور'' کے مقابلہ میں ''ظلمت'' کے لیے ہمیشہ واحد کے بجائے جمع کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے کہ حقیقت میں اگر وحی کی روشنی نہ ہو تو پھر زندگی کی ظلمتوں کا کوئی حدو حساب نہیں ہے اور انسانی زندگی کے راستے کی ہر گلی اور ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے، صحیح مذہب کی روشنی کو علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو اس دنیا میں ''ظلمت'' کے سوا کچھ نہیں بچتا اور یہ ایک ''ظلمت'' نہیں، بلکہ بے شمار ظلمتیں ہیں، زندگی کا جائزہ لیجئے، خدارسی کی تمام راہیں گم، مذہب تمامتر رسم پرستی اور تقلید، اعتقادات تمامتر حماقت و جہالت، خیالات تمامتر اوہام اور مفروضات، علوم تمامتر قیاس وظن معاشرت ومعاملات تمامتر بے اعتدالی و ناانصافی، قانون وسیاست تمامتر آزمائش وتجربہ، حکومت تمامتر جبری وتعدی ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا'' (النور: ۴۰) ''غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، ایک پر ایک (چھایا ہوا) ایسی حالت ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا''۔

زندگی کے اس ''بحر ظلمات'' میں روشنی کا مینار صرف خدا کا نور ہے، جس سے زمین و آسمان روشن ہیں ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ'' اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' اسی لیے ''ظلمات'' کے مقابلہ میں اس کو واحد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے...... حالانکہ عربی زبان میں اس کی جمع اور اس کے ہم معنی الفاظ موجود ہیں، یہ صحیح نہیں کہ اس کی جمع غیر فصیح ہے، قرآن مجید کے استعمال کے بعد اس کی فصاحت میں کیا شبہ رہ جاتا؟ لیکن قرآن ایک کو ہمیشہ مفرد کے لفظ سے اور دوسرے کو جمع کے لفظ سے ادا کرنے کے ذریعہ ایک بڑی حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ''نور'' ایک ہے اور ''ظلمات'' کا کوئی حساب وشمار نہیں، ''ظلمات'' ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہیں، لیکن ''نور'' ایک ہوگا، جب اس سرچشمہ سے ''نور'' کا افاضہ ہی نہ ہو، تو روشنی کہاں سے آئے؟ ''وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَا لَهُ مِنْ نُوْرٍ'' (النور: ۴۰) ''اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی، اس کے واسطے

کہیں روشنی نہیں''، ''جس کے لیے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے اس کے لیے نور کا کوئی اور ذریعہ اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ نور وایمان کے حدود متعین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں ہے''۔

''وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ''۔ ''اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے''۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ و تلخیص، از: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۳۰-۳۲ ☆ دعوت فکر و عمل: ۱۳۱-۱۳۲

سلسلۂ انقلابات کی بلیغ تصویر

"اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" (الانعام: ۱۲۲)

"بھلا جو پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کردی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے"۔

روح حیوانی اور روح ایمانی

اللہ نے درحقیقت ہمارے جسم کے اندر دو روحیں پیدا کی ہیں، ایک روح حیوانی، اور ایک روح ایمانی، روح حیوانی کا مخزن تو ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا وہ خزانہ غیب، جہاں سے روح آتی ہے اور روح ایمانی کا مخزن ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم، ہم پہلی مرتبہ تو اس حیوانی روح سے زندہ ہوئے اور دوسری مرتبہ اس ایمانی روح سے زندہ ہوئے، اگر اللہ تعالیٰ ہمارے جسم میں صرف جسمانی روح ڈالتا یہ بھی اس کا بڑا فضل تھا، بڑی مہربانی تھی، دنیا میں کروڑوں، اربوں انسانوں میں اس نے وہ روح پیدا کی، آج وہ دنیا میں اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، زندگی کا ثبوت دیتے ہیں، ہواؤں میں وہ پرواز کرتے ہیں، سمندروں پر دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، اپنی طاقت کا، اپنی حرکت کا، اپنی زندگی کا، اپنی ذہانت کا انہوں نے دنیا میں ثبوت دیدیا، اور جگہ جگہ انہوں نے اپنی زندگی کا نقش قائم کردیا۔

زندہ مگر مردہ!

یہ بھی اس کا بڑا فضل تھا، لیکن اللہ کا یہ احسان تکمیل کے اس درجہ کو نہ پہنچتا اگر وہ اپنے فضل سے ہمارے اندر روح ایمانی نہ ڈالتا۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے صاف صاف یوں بیان کیا ہے۔

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" بھلا وہ جو مردہ تھا باوجود روح کے مردہ تھا ایسا بھی ہوتا ہے روح اندر موجود ہے، کھانے کے لیے زندہ، پینے کے لیے زندہ، بولنے کے لیے زندہ، تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ، اپنی قوت کا ثبوت دینے کے لیے زندہ، ظلم کرنے کے لیے زندہ، اپنے نفس کی خواہشوں اور شہوتوں کو پورا کرنے کے لیے زندہ، دوسروں کو مغلوب کرنے کے لیے زندہ، مظلوم پر ظلم کرنے کے لیے زندہ، بیکسوں پر ظلم وستم کرنے کے لیے زندہ، دوسرے انسانوں کو پامال کرنے اور روندنے کے لیے زندہ، ملکوں کو تاراج کرنے کے لیے زندہ، ہزاروں گھروں کے چراغ گل کرنے کے لیے زندہ، ہزاروں تو دوں کو ان کے چولھے پر سے اتارنے کے لیے زندہ، لاکھوں انسانوں کا پیٹ پھاڑتے اور کاٹنے کے لیے زندہ، تمام دنیا کو آگ سے اور خون سے بھر دینے کے لیے زندہ، مگر خدا کی معرفت کے لیے مردہ، خدا کے علم صحیح کرنے کے لیے مردہ، عدل وانصاف کے لیے مردہ، اپنی انسانیت کو پہچاننے کے لیے مردہ، اپنی زندگی کے مقصد کو جاننے کے لیے مردہ، اللہ کے سامنے ایک مرتبہ سر جھکانے کے لیے مردہ اور پکار، اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لیے مردہ اللہ کے سامنے وہ حرف اپنی التجا کے، مناجات کے، بھیک اور سوال کے کہنے کے لیے مردہ۔

حقیقت میں زندہ

تو ایک زندگی کی قسم یہ بھی ہے، محدود زندگی، فانی زندگی، دیکھنے بھر کی زندگی، کہ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں کے اعتبار سے زندہ اور ایسا زندہ کہ لاکھوں انسانوں کو اس کی زندگی کے لیے قربان ہوجانا پڑتا ہے، اس کی زندگی کے بھینٹ چڑھ جانا پڑتا ہے، اس کی زندگی کی

قیمت ادا کرنے کے لیے قوموں اور ملکوں کو تیار رہنا پڑتا ہے، ایسی زندگی کہ اس پر لاکھوں کروڑوں لعنتیں فرشتوں کی لعنتیں، ارواح مقدسہ کی لعنتیں، اس کے لیے انسان زندہ ہے، ایک غریب اور یتیم کے منھ پر طمانچہ مارنے کے لیے زندہ، اور ایک بیوہ کے سر کا آنچل چھیننے کے لیے اور اس کو بے ستر کرنے کے لیے زندہ، ایک آدمی جس کے پاس ایک دانہ ہے، ایک لقمہ ہے، اس کا وہ لقمہ بھی چھین لینے کے لیے زندہ، لیکن عدل وانصاف کے لیے اس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے، اس کی حرکت ختم ہوجاتی ہے، اس کے اعضاء جواب دے جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ" بھلا وہ جو اگرچہ زندہ تھا پھر بھی مردہ تھا، دیکھنے میں زندہ تھا لیکن حقیقت میں مردہ تھا، اومن کان میتا ہمارے لیے وہ مردہ تھا، اپنی روح کے لیے مردہ تھا، اپنے انجام کے لیے وہ مردہ تھا، یوں پیٹ بھر کر جانوروں کی طرح کھانے کے لیے وہ زندہ تھا اور اپنی شہوت رانی اور اپنی نفس پرستی کے لیے وہ زندہ تھا، فاحییناہ ہم نے اس کو زندہ کردیا، ہم نے اس کی زندگی مکمل کردی ہم نے اس کو حقیقی معنوں میں زندہ کردیا، اب وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے۔

زندگی کے بعد روشنی

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" ہم نے اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے سہارے وہ لوگ کے درمیان چلتا پھرتا ہے، جس طرح تم دیکھتے ہو کہ بازاروں میں موٹریں ٹکرا جاتی ہیں، اگر ٹریفک کنٹرول نہ کیا جائے، اگر سپاہی کھڑا نہ ہو، تو موٹر، موٹر سے ٹکرا جائے، ہوائی جہاز سے ٹکرا جائے، کشتی کشتی سے ٹکرا جائے، اور ایک انسان اندھیرے میں دوسرے انسان سے ٹکرا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے اگر اللہ کی روشنی نہ ہو، اللہ کسی کو روشنی عطا نہ فرمائے، تو انسان انسان سے ٹکرائے، اور ایک انسان اندھیرے میں دوسرے انسان سے ٹکر جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے اگر اللہ کی روشنی نہ ہو، اللہ کسی کو روشنی عطا نہ فرمائے، تو انسان انسان سے ٹکرائے، قوم قوم سے ٹکرائے، ملک ملک سے ٹکرائے، تمدن تمدن سے ٹکرائے، تہذیب تہذیب سے ٹکرائے، طاقت طاقت سے ٹکرائے، ایک شخص کا مقصد دوسرے شخص کے مقصد سے ٹکرائے، اغراض میں تصادم ہو، مفادات میں

تصادم ہو، انسانیت، انسانیت سے ٹکرائے، انسان انسان سے ٹکرائے، ایک باپ کا بیٹا، باپ سے ٹکرائے، مرد عورت سے ٹکرائے، عورت مرد سے ٹکرائے، فرماتا ہے "وجعلنا لہ نورا" ہم نے اس کو روشنی بھی عطا کی، انسانوں کے جنگل میں چلنے کے لیے ان راستوں میں ان تنگ و تاریک گلیوں میں گزرنے کے لیے اس کو چراغ بھی اور مشعل کی بھی ضرورت ہے تو ہم نے اس کو زندگی بھی عطا کی اور روشنی بھی بخشی، وجعلنا لہ نورا ہم نے اس کو ایسی روشنی دی، جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، ٹکراتا نہیں ہے، بھلے مانسوں کی طرح۔ (۱)

ٹارچ کی قیمت اس کے سیلز سے ہے

اس کی موٹی سی مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ یہ ٹارچ ہے، اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیے گئے اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے، زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اجالا کردے گی، روشنی کا ایک تیز دھارا اس میں سے نکلے گی۔ یہ ہاتھ میں ہوگی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرانے سے بچے گا، کسی سوتے ہوئے بچہ پر پاؤں رکھ کر چلنے سے بچے گا۔ اور معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کر کے بتاتا ہے) ہجے کر کے بتایا ہے اور دو دو، دو چار اس طرح سے سمجھایا ہے، "او من کان میتا" "بھلا جو مردہ تھا" "فاحیینہ" ہم نے اس کو زندہ کیا اور اتنا ہی نہیں، "وجعلنا لہ نوارا یمشی بہ فی الناس" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ (۲)

اسلامی انقلاب بلکہ مجموعۂ انقلابات اور سلسلۂ انقلابات کی اگر تصویر کھینچنا ہو تو اس کے لیے "فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" سے زیادہ بلیغ لفظ نہیں مل سکتے"۔ (۳)(۴)

(۱) تحفۂ برما: ۲۹-۳۲ (۲) تحفۂ دین و دانش: ۶۵-۶۶

(۳) مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۱۲۲ (۴) بالترتیب مندرجہ بالا کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

پیغمبر آخر الزماں اور کلامِ الٰہی

﴿وَ اِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ، عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ﴾

(الشعراء: ۱۹۲–۱۹۵)

"اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرانے والے ہوں"۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

"قرآن کی سب سے بڑی اور معجزانہ اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم یقینی ہوتا ہے، "ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْہِ" یہ کتاب الٰہی ہے جس میں شک کا کوئی گزر نہیں"۔

قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس لیے کہ قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ "علم الٰہی" ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ "وحی الٰہی" ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان، شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے، اس میں جو کچھ ہے، وہ یقینی اور قطعی ہے، مشاہد اور مرئی ہے، یکساں اور آخری ہے، اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے، اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے"۔

فرماتا ہے: "وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" یہ "رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" یہاں اللہ تعالیٰ کوئی صفت اپنی بیان کر سکتا تھا، لیکن اضافت "رب العالمین" کی طرف کی۔۔!

اس سے معلوم ہوا کہ اس "تَنْزِيْلُ" میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا ظہور ہے، یعنی اس میں مصالحِ بشری کا، مصالحِ انسانی کا اور انسانوں کی پرورش کا اور انسانوں کے صحیح طریقے پر، راحت کے ساتھ اور امن کے ساتھ رہنے کا اس میں سامان ہے!

"وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"۔۔ "لَتَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ" یہ کہا جا سکتا تھا اور "لَتَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" کیا جا سکتا تھا، لیکن "لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"!

تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ ربوبیت میں ایک رابطہ ہے! اس میں وہ سب چیزیں بیان کی گئی ہیں، جن کے بغیر نسلِ انسانی اچھے طریقے سے رہ ہی نہیں سکتی! اس کے تعلقات خراب ہو جائیں گے، وہ ایک دوسرے کے قاتل بن جائیں گی، یا اس کی جو بشری ضرورتیں ہیں وہ مسدود ہو جائیں گی!

"نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک تو ماٰخذ یعنی مبتداء، جہاں سے چیز شروع ہوتی ہے اور ایک ذریعہ! دونوں کا عالی ہونا، دونوں کا عظیم ہونا، دونوں کا امین ہونا، یہ بھی ضرور ہے! مثلاً آپ نے بہت اچھا خط لکھا، بہت اچھا پیغام دیا، لیکن اس کو حوالے کیا پہنچانے کے لیے وہ خائن ہے! اس کے اور دوسرے مصالح ہیں! تو ہو سکتا ہے کہ پیغام پورے طور پر نہیں پہنچے گا تو "کسی علم واطلاع کا منبع اصلی تو پورے طور پر صاف اور محفوظ ہو، لیکن کسی شخص کے لیے اس کا ذریعہ اطلاع پورے طور پر قابلِ وثوق نہ ہو، اپنے اصلی سرچشمہ سے کوئی چیز صحیح اور محفوظ نہ ہوئی ہو، لیکن اپنے منتہیٰ تک پہنچتے پہنچتے وہ محفوظ نہ رہ سکی ہو، قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا ذریعہ علم صرف وحی ہے اور وہ پورے طور پر محفوظ اور مامون ہے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت کا امکان نہیں" تو جہاں فرمایا کہ ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ وہاں فرمایا "نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" وہ "رب العالمین" کی تنزیل ہے، اور "روح الأمین" اس کو لے کر آئے! اس لیے اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں!

"عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ" اور پھر کس کا محل! ایک جہاں سے چیز چلی ایک جو لے کر آیا، جس کو پہنچایا! "رب العالمین" سے چلتی ہے وہ چیز اور "روح الامین" لے کر آتے ہیں اور "قلب نبوی" پر! جس سے زیادہ پاک، جس سے زیادہ امین، جس سے زیادہ خیرخواہ، جس سے زیادہ حافظ اور محافظ کوئی نہیں ہوسکتا، اس پر وہ نازل ہوئی!

تو اب تینوں چیزیں بالکل مامون ہوگئیں! "عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ" آپ کے قلب پر وہ چیز وارد ہوئی! روح الامین نے اس کو اس پر ڈالا، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں!

"بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" زبان عربی میں! عربی ایسی زبان جو واضح ہے اور واضح کرنے والی ہے مطالب کو، خوب سمجھ میں آنے والی ہے! "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" کی صفت بتاتی ہے کہ اس پیغام کے الفاظ بھی اتارنے والے ہی کے ہیں، اس لیے کہ زبان کا تصور الفاظ کے بغیر نہیں ہوسکتا"۔

اب یہ اللہ تعالیٰ عربوں کو اس میں متوجہ کرتا ہے کہ اگر کسی عجمی زبان میں قرآن نازل ہوتا، اور پھر تمہاری طرف منتقل کیا جاتا، ترجمہ ہوتا، تم شک کرسکتے تھے۔

عربوں کا انتخاب کیوں ہوا....؟

ایک بات یہ سمجھنے کی ہے اس میں۔ کہ عربوں کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ آخری پیغام کے لیے اور اتمام حجت کے لیے اور دنیا میں تعلق مع اللہ کے صحیح سلسلہ اور عبودیت کے صحیح سلسلہ کے قیام کے لیے عربوں کا انتخاب کیوں ہوا؟ (1)

اس لیے کہ عرب اپنی اصل فطرت پر تھے، مضبوط اور آہنی ارادہ کے مالک تھے، اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہ آتی ہو وہ اس کے خلاف شمشیر تک اٹھانے میں کوئی تکلف نہ کرتے اور اگر حق کھل کر سامنے آجاتا تو وہ اس سے دل و جان سے زیادہ محبت کرتے، اس کو گلے سے

(1) ہم نے بہت سی چیزیں لکھی ہیں، اور یہ سیرۃ النبی علامہ شبلی کی، اس میں اس پر کلام ہے، لیکن کچھ چیزیں اور بھی اس کے بعد اضافہ کیا گیا ان پر۔

لگاتے اور اس کے لیے جان تک دینے میں پس وپیش نہ کرتے تھے۔ تو ان کی قوتِ عمل بھی سب سے بڑھی ہوئی تھی اور وہ جہلِ مرکب میں مبتلا نہیں تھے!

تو اور خدا کی کتاب خدا کے علم سے ماخوذ ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں............اس لیے اس کتاب میں تعارض واختلاف نہیں ہے، کیونکہ تعارض و اختلاف جہل وناواقفیت، یا علم کی کمی بیشی، یا اس کی تدریجی ترقی، یا ظن وقیاس، یا نسیان و غفلت، یا کذب وافتراء کی وجہ سے ہوتا ہے اور وہ ان تمام نقائص سے پاک ہے، اس لیے اس کا کلام بھی ہر قسم کے تعارض واختلاف سے محفوظ ہے''۔ [1]

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء: ۱۹۲-۱۹۵، کے علاوہ مشترک اخذ وتلخیص: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۱۵-۲۰ ☆ نبی رحمت: ۲۰

اعجازِ قرآن کا دائرہ

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (ھود: ع–۲)

''یہ کیا کہتے ہیں کہ اس نے قرآن از خود بنالیا ہے؟ کہہ دو اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنالاؤ اور خدا کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو بلا بھی لو، اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں، تو جان لو کہ وہ خدا کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تمہیں بھی اسلام لے آنا چاہیے''۔

مندرجہ بالا آیت میں متشککین کو قرآن کا (مطلق) مثل لانے کی دعوت دی گئی ہے اور کوئی کلام اور کتاب قرآن کی اس وقت تک مثل نہیں ہو سکتی جب اس کے اعجاز کے تمام شعبوں میں اور اس کی تمام خصوصیات میں مماثل نہ ہو اور قرآن صرف اپنے الفاظ و ترکیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی و مضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم و معارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی و اخلاقی و معاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات و انقلاب میں بھی، اپنی پیشنگوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف

ایک پہلو اور گوشہ ہے، کوئی مقابلہ نہیں ہوسکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟

سورہ ہود کی مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا امتیاز خصوصی اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے، اس لیے اس میں انسان اپنے ظنی و مشتبہ، ناقص و محدود اور خود خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کرسکتا ہے؟ جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ کر نہیں کرسکتا۔

"فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ" "اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ خدا کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تمہیں بھی اسلام لے آنا چاہیے"۔

"أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ" کا نکتہ بتاتا ہے کہ اللہ جس طرح تمام صفات الوہیت میں یکتا ہے، اسی طرح اپنے علم میں بھی اور جب اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، تو کتاب الٰہی کا جواب کیا ہوسکتا ہے"۔

علم اللہ کا تعلق صرف الفاظ وترکیب سے نہیں بلکہ معانی وحقائق سے بھی ہے، لفظی فصاحت کے لیے قرآن نے جابجا اپنے کو "قُرْآنًا عَرَبِيًّا . كِتَابٌ مُبِينٌ" اور "لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ" کہا ہے، جس میں اس کے لفظی محاسن اور لسانی تفوق کی طرف اشارہ ہے"۔

پس قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اس کا لفظی اعجاز درحقیقت قرآن کے اعجاز کا ایک گوشہ ہے اور قرآن کا اعجاز اس میں منحصر نہیں، علمائے متقدمین نے جب قرآن کے اعجاز پر غور کیا، یا اس موضوع پر قلم اٹھایا تو زمانہ کے رجحان عام اور عربوں کے ادبی ذوق اور زبان کی اہمیت کی وجہ سے ان کی نظر کے سامنے زیادہ تر قرآن کے اعجاز کا یہی گوشہ رہا اور کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اس دائرہ کے اندر کمال نکتہ دانی اور حسنِ مذاق کا ثبوت دیا اور بڑی دماغ سوزی سے کام لے کر اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کردیا، اس علمی ذخیرے میں اضافہ مشکل ہے، اس لیے اس بات میں انہیں تالیفات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔[1]

(۱) (تلخیص) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۴۴-۴۸

ہدایت ربانی کا تسلسل

﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾ (القصص: ۵۱)

''اور ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کے لیے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا، تا کہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ" ''اور ہم نے ان کے لیے قول کو مسلسل جاری رکھا'' یعنی اس کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ، یعنی مکانی اور زمانی فرقوں کے ساتھ جاری رہا، اگر دیکھا جائے اور اس میں معنوی اتصال بھی ہے اور کبھی کبھی زمانی اتصال بھی ہے، کبھی کبھی مکانی اتصال بھی ہے اور ایک چیز جو مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات میں پیش کی جائے، اس کے اندر اختلاف وتفاوت اور اس میں بہت سی چیزیں کہ جن میں جس کو عربی کے وسیع معنی میں اضطراب کہتے ہیں، اس کا اندیشہ ہوتا ہے، لیکن اس میں کتب سماوی کے اتصال معنوی اور اتصال رائی، اتصال مقصدی اور وہ اس میں ہدایت کا ہونا اور اس میں رہنمائی کے سامان کا ہونا، اس میں عقائد صحیحہ کا اس کے ذریعہ سے معلوم ہونا، عقائد صحیحہ کا بھی اور حقائق صحیحہ کا بھی، یہ سب کے لیے ایک لفظ "تَـوْصِيْـل" کا لفظ، (جس کا ترجمہ کسی زبان میں ذرا مشکل ہے) کہ اس میں یہ ایک طرح کا تواتر ہے، ایک تواتر تو ہوتا ہے کہ حدیث کی اصطلاح ہے اور ایک تواتر یہ ہے کہ معنوی تواتر اور مقصدی تواتر، یہ تمام کتب سماویہ میں ہے، ورنہ جب کسی ایک مقصد کے لیے کچھ چیزیں ہوتی ہیں، تو ان میں

بہت تفاوت ہوجاتا ہے، بعض مرتبہ تضاد بھی ہوجاتا ہے، لیکن اس تضاد کی بھی نفی ہے اور انتشار کی بھی نفی ہے اور اضطراب کی نفی ہے۔

"وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ" "ہم نے ان کے لیے سلسلہ جاری رکھا" اور مسلسل رکھا، وحی الٰہی کا اور ہدایت ربانی کا، "لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ" "تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں"۔

ہر کتاب سماوی میں یہی ہے، ہر پیغمبر یہی کہتا رہا ہے، ہر پیغمبر نے توحید خالص کی دعوت دی، ہر پیغمبر نے آخرت کو یاد دلایا اور اس کا یقینی ہونا بیان کیا اور ہر پیغمبر نے عدل وظلم کے درمیان فرق کیا، حق وباطل کے درمیان فرق کیا، طاعت ومعصیت کے درمیان فرق کیا، تو جو اصول ہیں، وہ سب کے سب سب میں مشترک ہیں، یہ خود ایک بات اللہ کی، من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل، (اور قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارے آئے ہیں اور تجربہ بھی ہے) کہ انسانی تصنیفات اور انسانی بیانات اور انسانی تحقیقات تک، ان سب میں نہ صرف تفاوت ہوتا ہے، بلکہ اکثر تضاد بھی ہوجاتا ہے اور شاید کوئی علم ایسا ہو، جس میں بالکل کسی قسم کا کوئی تفاوت نہ ہو، تضاد نہ ہو، یہاں تک کہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد تحقیق ہوتی ہے کہ وہ بات صحیح نہیں تھی، یا تھی اور یا جتنی تھی، اتنی صحیح نہیں تھی، اس سے کم یا زیادہ، یا تو مقدار میں فرق ہوجاتا ہے اور یا اس کی نوعیت میں فرق ہوجاتا ہے، حقیقت میں فرق ہوجاتا ہے، یہ فرق جو ہے یہ انسانی اس کو اگر لیڑیچر کہا جائے، یا فکر انسانی کہا جائے، یا اس کو انسان کی علم کی رسائی کہا جائے، تحقیقات علمی کہا جائے، یہاںتک کہ جو خالص تحقیقات علمی ہے، ان میں بھی اتنا بڑا فرق ہے کہ آدمی کا پھر اعتبار جاتا رہتا ہے، یعنی آدمی اگر صرف اس کو موضوع بنالے کہ محققین کی تحقیقات میں اور مفکرین کے افکار میں اور ادباء کی تحریروں میں اور شعراء کی شاعری میں کتنا تفاوت ہے، زمان ومکان کے اختلاف کے ساتھ، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی ملک میں، مکان سے مراد یہ نہیں کہ کوئی محلہ ہو، ایک ہی ملک میں، ایک ہی شہر میں، اتنا تفاوت ہوتا ہے، ہمارا پورا انسانی لٹریچر تفاوت سے، بلکہ تضاد سے بھرا ہوا ہے اور خود سائنس کی جتنی ترقی ہوئی، اس نے ثابت کیا

کہ اس سے پہلے کے کتنے نظریات غلط تھے، ہم نے جیسے آپ کو بتایا کہ منطق قیاسی جو ساری دنیا میں رائج تھی، وہ بالکل معلوم ہوا کہ بہت ہی کمزور ہے اور اس سے ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے، پھر منطق استقرائی آئی، اس کے متعلق یہ تسلیم ہے، مغربی محققین کو بھی ''گستاؤلبان'' (Gustav Lebon) اس میں پیش پیش ہے کہ وہ اندلس سے آئی ہے اور اس میں اسلامی فیض بھی شامل ہوگیا کہ اندلس سے جو چیز آئے گی، وہ اسلامی فیض سے خالی نہیں ہوسکتی، ضرور اس میں قرآن مجید سے کوئی رہنمائی حاصل کی گئی، یا پھر اللہ کی طرف سے مدد ہوئی اور اس کو الہام بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کو توفیق بھی کہہ سکتے ہیں۔

تو قرآن مجید کا یہ ایک اشارہ ہے، یہ چند لفظ ہیں، ''وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ'' یہ صرف اسی بات پر موقوف نہیں ہے، محدود نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آئی، اس میں اتفاق بھی تھا، تسلسل بھی تھا اور توافق بھی تھا، بلکہ اگر آدمی اس کو سامنے رکھ کر کے مقابلہ کرے، ''وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ'' اضداد سے پھر قدر آتی ہے، جب اضداد دیکھیے، جب اس کے اضداد انسانی لیٹریچر میں اور فکر میں دیکھے گا، تب اس کی قدر آئے گی، ''لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ'' اور یہ صحف سماوی اگر یہ تحریف سے خالی ہوتے تو آپ دیکھتے کہ زمانوں کے فرق کے ساتھ، صدیوں کے نہیں اور بعض مرتبہ ایک ہزار، یا اس کے کم یا زائد کا فرق ہو، ان صحف میں ایک ہی بات پیش ہونا، ایک ہی چیز کی طرف دعوت دینا، زمانے کے فرق کے ساتھ اور مکان کے فرق کے ساتھ، جغرافیائی فرق کے ساتھ، تاریخی فرق کے ساتھ، اذہان انسانی کے فرق کے ساتھ، رغبات انسانی کے فرق کے ساتھ اور اقتناع جسے کہتے ہیں عربی میں اقتناع کی صلاحیت، اس کے فرق کے ساتھ ایک ہی بات کہی، اللہ کے ذات وصفات کو ہر صحیفے میں، ہر پیغمبر نے، خواہ اس کا زمانہ کوئی ہو، اس کا ماحول کوئی ہو، اس کا پس منظر کوئی ہو، اس میں جو بات کہی، یہ تنہا صداقت کے لیے کافی ہے کہ حالانکہ کوئی مشورہ نہیں، مشورہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، زمانہ کا فرق، مقامات کا فرق، تو یہ گویا اعجاز کی ایک دلیل ہے۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۱ (غیر مطبوعہ)

بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

﴿ بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ بل هم فی شک منها بل هم منها عمون﴾ (النمل: ۶۶)

"بلکہ تھک کر گر گیا ان کا علم آخرت کے بارے میں، بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں"۔

"قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کے ایسے عجیب صنائع، معجزات اور خارق عادات افعال سے بھری ہوئی ہیں کہ ایمان بالغیب اللہ کی بے مثل قدرت اور مشیت قاہرہ پر یقین اور ان کتابوں کی صحت اور ان رسولوں کی سچائی (جن پر یہ کتابیں نازل کی گئیں اور انہوں نے لوگوں کو ان سے باخبر کیا) پر کامل اعتماد ہی ان کا متحمل ہوسکتا ہے اور ان کی تصدیق وتائید کرسکتا ہے، لیکن وہ ایمان جس کی بنیاد محسوسات مانوس حوادث، ظاہری عقل کی مطابقت اور کتابی علوم پر استوار ہوتی ہے، وہ یا تو ان کو قبول کرنے اور ان کی تصدیق کرنے سے بالکل انکار کردے گا، یا ان پر یقین کرنے میں تذبذب کا شکار ہوگا، اور ٹھوکر کھائے گا، یا ان کی ایسی تاویل کرے گا، جس سے وہ اس کی معلومات ومحسوسات کے مطابق ہوجائیں، اسی لیے اللہ نے فرمایا "بَلِ اِدّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ" "بلکہ تھک کر گر گیا ان کا علم آخرت کے بارے میں"۔ (۱)

(۱) منصب نبوت: ۹۴

یہ "اِدّٰارَکَ" ایک بڑا معجزانہ لفظ اس موقع سے ہے، "بلکہ ان کا علم تھک کر گر گیا آخرت کے بارے میں" یعنی علم چلتے چلتے، کوئی چیز چلتے چلتے گر جائے، کام آتے آتے بیکار ہو گیا، علوم میں بھی یہی حال ہے، ایک شخص جس نے فلسفہ نہیں پڑھا، وہی ہوشیاری کی باتیں کر رہا ہے، بڑا وہ خطابت دکھا رہا ہے، اپنی ادبیت چھانٹ رہا ہے شعر پڑھ رہا ہے، لیکن فلسفہ کا جہاں موضوع شروع ہوا، وہاں "بَلِ ادّٰارَکَ عِلْمُهُمْ" وہاں بالکل ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔

اسی طریقے سے کوئی شخص ہے، وہ کسی فن کا آدمی ہے، میڈیسن کی بات شروع ہوگئی، طب کی، اس سے وہ ایسا بن جائے جیسے گونگا، بہرا ہے اور یا یہ کہ بالکل غبی ہے، یا یہ کہ سائنس کی بات شروع ہوگئی، تو یہ علوم انسانی کے اندر یہ حال ہے کہ ان علوم کے دائرہ ہیں، ان کی سرحدیں ہیں، تو پھر وہ غیب جو اللہ تعالیٰ کا علم ہے، ان کا علم چلتے چلتے وہاں جا کر ایسا بیکار ہو جاتا ہے، اب "ادّٰارَکَ" کا لفظ جو ہے اس کا بدل نہیں لایا جا سکتا ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ اس کا ترجمہ بھی مشکل ہے۔

"میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، منزل قرآن اور صاحب قرآن سے تو معذرت کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن قرآن کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں "بل ادارک علمهم في الآخرة" کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ان کا علم پنکچر ہو گیا آخرت کے بارہ میں اور مجھے مغرب کی صورتحال اور اس کے علمی واختراعی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے لیے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم خاصا چل رہا تھا، اطمینان سے سفر طے کر کے آیا تھا، جس نے عقلیات پر، طبعیات پر، ریاضیات پر اور مابعد الطبیعات تک میں اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات وصفات تک پہنچا اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہنچا تو "اِدّٰارَکَ عِلْمُهُمْ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی، اس آیت کے بعد کے الفاظ میں مغرب کی مختلف ذہنی کیفیات یا مختلف طبقات

کی تصویر نظر آتی ہے کہ "بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِنْهَا" وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں، "بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ" بلکہ وہ اس کے معاملہ میں بالکل بے بصیرت ہیں"۔

کیونکہ جس ایمان کی بنیادیں صرف محسوسات اور تجربات پر استوار ہوئی ہوں، جو مشہور اور مانوس چیزوں کا ہی ساتھ دے سکتا ہو، جو تکوینی طریقوں، طبعی اصولوں اور محسوسات کے دامن میں پناہ لیتا ہو، وہ ایمان محبوس اور مقید ایمان ہے، محدود اور مشروط ایمان ہے، وہ اعتماد کے قابل نہیں ہو سکتا، نہ ادیان کا ساتھ دے سکتا ہے، نہ انبیائے کرام کی دعوت، ان کی مطلوبہ تصدیق مطلق، دائمی اعتماد، فوری اطاعت واتباع اور جہاد وقربانی کی راہ میں فنائیت سے کوئی مناسبت رکھتا ہے، درحقیقت اس کا ایمان نام رکھنا ہی درست نہیں، وہ تو صرف علم وتحقیق ہے، منطقی قوانین کے سامنے سپر اندازی ہے، حواس وتجربات کی بے قید اطاعت ہے، اس میں کوئی فضیلت وامتیاز نہیں اور نہ وہ دین کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ہر عقلمند انسان اپنی زندگی میں اپنے تجربات، اپنی معلومات کے نتائج اپنی محسوسات اور اپنی عقل کے اشاروں پر اعتماد ویقین رکھتا ہے۔

اور اس "طبیعاتی" یا "منطقی" ایمان والے شخص کو آسمانی کتابوں اور الٰہی مذاہب کے سامنے قدم قدم پہ دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ دین کی روح اور اس کے حقائق کے بارے میں مستقل کشمکش میں گرفتار رہتا ہے، جیسا کہ ایک عارف نے کہا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

اور "پائے چوبیں" تیز چلنے، آزادی کے ساتھ قدم اٹھانے اور اِدھر اُدھر مڑنے میں انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا، یہی وجہ ہے کہ خالص استدلالی ذہن کا انسان رسولوں کی لائی ہوئی اور آسمانی کتابوں کے بیان کئے ہوئے حقائق اور اس علم جدید، اپنی یقین کی ہوئی محسوسات، بادیات اور محدود معلومات پر مبنی اصولوں کے درمیان حائل وسیع خلیج کی وجہ سے یا تو تحریفات اور دور از کار تاویلات کا سہارا لیتا ہے، یا الحاد پر مجبور ہوتا ہے، "بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ" "حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ

قابو نہیں پا سکے، اس کو نادانی سے جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت اُن پر کھلی ہی نہیں''۔ (۲)

''میں سمجھتا ہوں کہ مغربی افکار و نظریات اور اسلامی حقائق و عقائد کے درمیان جب بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے، اس کے بغیر وہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا، جس سے ہم اصل حقیقت تک پہنچ سکیں''۔ (۳)

---

(۱) منصب نبوت: ۹۶-۹۷　　(۲) کاروانِ زندگی (سوم): ۲۲۳-۲۲۵

(۳) درسِ قرآن، سورۂ نمل: ۶۲ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ اقتباسات: ☆ منصب نبوت: ۹۴ ☆ منصب نبوت: ۹۶-۹۷ ☆ کاروانِ زندگی (سوم): ۲۲۳-۲۲۵، سے ماخوذ ہیں۔

ماتھے پہ داغِ سجدہ، دل میں ہے داغِ عصیاں

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ، فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهِ، خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ يَدْعُوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنْفَعُهُ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيْدُ. يَدْعُوْ لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ﴾ (الحج: ۱۱-۱۳)

''اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں، جو کنارے پر (کھڑے) ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں، (یعنی پھر کافر ہو جائیں) انہوں نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے، یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے، جو نہ اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے، یہی تو پرے درجہ کے گمراہی ہے، بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے، جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے، ایسا دوست بھی برا اور ایسا ہم صحبت بھی برا''۔

قرآن مجید کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ

یوں تو قرآن مجید سارا کا سارا معجزہ ہے اور معجزات کا مجموعہ ہے اور حقائق ایسے حقائق کہ جو جلی ہیں، ان کا مجموعہ ہے، لیکن بعض بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ہم مشاہدہ کر سکتے

ہیں، اس دنیا میں تجربہ کر سکتے ہیں، ہمارے سامنے اس کے نمونے آتے ہیں ہم غور نہیں کرتے اور آ سکتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے، ان میں سے یہ ایک آیت بھی ہے اور یہ آیت قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ آیت کیا ہے؟ ایک مستقل معجزہ، یہ فرد کی بھی تصویر ہے اور جماعتوں کی بھی، قوموں اور ملتوں کی بھی"۔

تردد وتذبذب کا انجام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس کے احکام پر چلتے ہیں سرحد پر کھڑے ہوکر، ڈیک پر کھڑے ہوکر، (ہمارے یہاں کی زبان میں ڈیک کہتے ہیں، رائے بریلی اور اودھ کی زبان میں،) یعنی کوئی ایسا کنارہ کہ آدمی چاہے تو نیچے اتر جائے، چاہے تو اس پار چلا جائے، "عربی میں "مَنْ" کا اطلاق فرد اور جماعت سب پر ہوتا ہے، لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں، جو خدا کی بندگی کرتے ہیں، بالکل کنارے پر کھڑے ہوکر" بندگی کرتے ہیں" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خالی نماز پڑھتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اور اسلامی احکام کی پابندی عین سرحدی لکیر پر کھڑے ہوکر کرتے ہیں، جو اسلام وجاہلیت اور کفر وایمان کے درمیان کھینچی گئی ہے"۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" "عَلٰى حَرْفٍ" کی بلاغت ملاحظہ ہو اس صورت حال کی اگر کیمرے سے بھی تصویر لی جائے اور بڑے سے بڑا مصور اور نقاش بھی اس کی تصویر کشی کرے تو ایسی بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا، ان کی دوربینی اور احتیاط کی پوری تصویر اس چھوٹے سے جملے میں آ گئی، بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اپنے کو اللہ کا عابد پرستار سمجھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس دین میں داخل ہوتے ہیں اور اس دین کے ماننے والوں میں شمار بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں، اس کی پوری فکر رکھتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ کھڑے ہوں جہاں سے ان کے لیے منتقل ہونا، ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں، ایک محاذ سے دوسرے محاذ میں، ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں، ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونا آسان ہو جائے۔

وہ ایسی سرحد پر کھڑے ہوتے ہیں، یعنی اپنے بارے میں ایسے مسلک زندگی کے اختیار کرنے اور ایسے طرز زندگی اور اصول زندگی کے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے ترک میں ان کو کوئی بڑی قربانی نہ کرنی پڑے، جس کی تبدیلی میں اس کو کوئی بہت بڑا مجاہدہ نہ کرنا پڑے، ان کا ہاتھ زمانے کی نبض پر رہتا ہے اور ان کی دور بین نگاہیں حکومت، سوسائٹی اور وقت کے اقتدار کے چشم ابرو کے اشارے کو دیکھتی رہتی ہیں، ان کا دماغ سود وزیاں اور نفع نقصان کے موازنے سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہوتا، اگر زمانہ ان کے موقف ومسلک اور ان کے مقام ومحل کے مطابق ہوتا ہے تو ان سے بڑھ کر اپنے مسلک کا پرجوش وکیل اور اس کی خدمت میں منہمک کوئی نظر نہیں آتا اور وہ پورے سکون قلب اور اعتماد نفس کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں''۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں، (اب اس کو آپ اخلاق ومعاشرت میں دیکھئے) کہ وہ عام طور پر جھوٹ نہیں بولتے، عام طور پر کوئی خلاف واقعہ نہیں کرتے، لیکن جب دیکھ لیتے ہیں، کبھی کوئی ایسا موقع خلاف واقعہ آتا ہے کہ ذرا سا ضمیر کے خلاف اور واقعہ کے خلاف کہہ دینے میں، کر دینے میں شہادت دینے میں، یا اس گروہ میں شامل ہوجانے میں جو بے اصول ہے، کوئی بہت بڑا فائدہ ہے تو وہ فوراً ادھر منتقل ہوجاتے ہیں، وہ اس سرحد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ (1)

(۱) اور اگر ہم غور کریں سرسری طور پر جو اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی، لیکن ہم لوگ غور نہیں کرتے، لیکن اگر ہم بڑی بڑی مشہور شخصیتیں جو ہیں ان کے حالات پر غور کریں، (ہم ان کے نام نہیں لیں گے، غیبت بھی ہوجائے گی، قرآن مجید کا معاملہ ہے اور پردہ بھی ورنہ ہم نام لیتے بعض بعض بہت نامور شخصیتوں کا) کہ انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا لیکن وہاں انہیں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، وہ اعتماد حاصل نہیں ہوا جو ہندوستان میں اعتماد حاصل تھا، وہاں بھی ان کا زوال آگیا، یہاں تک کہ بعض مرتبہ ان کو شہید کر دیا گیا، قتل کر دیا گیا، ایک نام ہمارے ذہن میں ایسا بھی ہے کہ جو پاکستان کے لیے بہت موزوں تھے، پاکستان کی تحریک کے علمبردار تھے، بڑا فائدہ اٹھایا اور ان کو جلسۂ عام میں قتل کر دیا گیا، شہید کر دیا گیا اور ایک دو واقعات ایسے پیش آئے ہیں، پھر ایسے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے کہ آدمی یہاں کے فسادات سے بچنے کے لیے کہ بھائی یہاں ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں (Communal Rights) کمیونل رائٹس ہوتے ہیں اور مسلمان ہونا یہ ایک معنی بن جاتا ہے، انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر ان کو پریشانیاں پیش آئیں، خطوط آتے ہیں وہاں سے اور جب وہاں جانا ہوتا ہے تو زبانی سننے میں یہ سب باتیں آتی ہیں کہ ہم تو یہاں یہ سمجھ کر آئے تھے، یہ سمجھ کر آئے تھے، ہمیں یہاں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

یہ زندگی میں ہماری رہنمائی کرنے کے لیے کہ "ومِنَ النَّاسِ مَنْ یَعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ" لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں، اس کے دین پر چلتے ہیں، اس کے احکام کو مانتے ہیں، یہاں "یَعْبُدُ اللّٰہَ" کے معنی خالی نماز پڑھنے کے نہیں ہیں خالی، یہ عبد، یعبد، کے معنی عربی میں "صَلّٰی، یُصَلِّیْ" کے نہیں ہیں "یَصُوْمُ" کے نہیں ہیں "یَحُجُّ" کے نہیں ہیں خالی، یہ سب چیزیں اس میں آتی ہیں، اللہ کی بندگی، اللہ تعالیٰ کے سامنے سر اطاعت خم کرنا اور اپنے کو اس کے حوالے اسلام جس کا نام ہے، اپنے کو حوالے کر دینا یہ عبادت ہے۔

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں، جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یعنی اللہ کے دین کو انہوں نے قبول کیا ہے مانتے ہیں اور بہت سے دین کے جو فرائض اور شعائر ہیں وہ ان کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور جو دیکھے گا کہے گا ہوں یہ مسلمان ہے۔ لیکن وہ کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ کے دین پر چلتے ہیں، اللہ کے دین کو مانتے ہیں کہ اگر فائدہ اس میں دیکھا کہ پیچھے ہٹ جائیں، تو پیچھے ہٹ جائیں، یا اسی جگہ کھڑے رہیں، یا اگر فائدہ آگے بڑھنے میں دیکھا وہاں کچھ مل رہا ہے، وہاں عہدہ مل رہا ہے، وہاں حکومت مل رہی ہے، وہاں عزت مل رہی ہے، وہاں دولت مل رہی ہے، کمیٹی مل رہی ہے، فوراً بس ایک قدم آگے بڑھا، بس وہاں پہنچ گئے۔

"فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ" سرحد پر اگر اس کو کوئی خیر پہنچی، "اِطْمَأَنَّ بِہٖ" مطمئن ہو گیا، کہ بہت اچھا فیصلہ کیا کہ ٹھیک ہے، میں صحیح جگہ پر کھڑا ہوں اور مجھے یہیں رہنا چاہیے تھا، "وَ اِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃٌ" اگر اس کو کوئی آزمائش پیش آئی، وہاں اس کو کوئی اس کی قیمت ادا کرنے کا معاملہ آیا تو یہاں کھڑے ہونے سے یہ کرنا پڑے گا اور پیچھے ہٹنے سے یہ کرنا پڑے گا تو آگے بڑھ گیا، آگے بڑھنے سے یہ قربانی دینی ہوگی، یہ آزمائش پیش آئے گی، "اِنْقَلَبَ عَلٰی وَجْھِہٖ" تو وہ اپنے چہرہ پر الٹ گیا، یعنی پیچھے کو ہٹ گیا،...... "یعنی اگر حالات ذرا بھی سازگار ہوتے ہیں اور وہ حکومت کے سوسائٹی اور عوام کے تیور بدلے ہوئے دیکھتے ہیں، تو وہ فوراً اپنا مسلک تبدیل کر دیتے ہیں اور پہلے مسلک کی "تہمت" سے بھی بچتے ہیں،

ان کو اپنی وضع قطع، اپنے عقائد و خیالات اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنی زبان و کلچر بلکہ اپنی قومیت کو بھی تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی"۔

"خَسِرَ الدُّنیَا وَ الآخِرَةَ" اس کا انجام حقیقی جو ہے وہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کا نقصان اس کو ہوتا ہے، با اصول لوگوں کا دونوں جگہ فائدہ ہوتا ہے اور وہ بالکل ایک حقیقت ظاہرہ باہرہ اور مشاہدہ، مشاہدہ نہیں ایک بدیہی چیز ہے، لاکھوں کروروں مشاہدات ہیں، لیکن ہے ذرا کام مشکل "ذٰلِکَ هُوَ الخُسرَانُ المُبِین" یہ بڑا کھلا ہوا نقصان ہے۔

ضمیر فروشی کا انجام

"یَدْعُو مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالا یَضُرُّہ وَمَالا یَنْفَعُہ" ایسے لوگ بھی ہیں وہ شخص جو "یَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ" کا مصداق ہے وہ بھی اللہ کے سوا اسکو پکارتا ہے کہ جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور جو نہ اس کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ نقصان پہنچانے والا یا فائدہ پہنچانے والا یہ ہمیشہ شخصی شکل میں نہیں ہوتا، بلکہ یہ اصولوں کی شکل میں بھی مل سکتا ہے، یہ کلام کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور رشوتوں کی شکل میں ہو سکتا ہے اور خوشامدوں کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے، یہ آیت حاوی ہے، اس سب پر کہ وہ ایسے کو پکارتا ہے، جو نہ نقصان پہنچا سکتی ہے، وہ چیز اور نہ نفع پہنچا سکتی ہے، کوئی رشوت دے کر کام نکالنا چاہتا ہے، کوئی خوشامد کرکے کام نکالنا چاہتا ہے، کوئی بداخلاقی کا کوئی عمل کرکے کام نکالنا چاہتا ہے، لیکن اخیر میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فائدہ نہیں ہے، "ذٰلِکَ هُوَ الضَّلٰلُ البَعِید" یہ سب کھلی ہوئی گمراہی ہے، بہت دور کی گمراہی ہے، "یَدْعُو لَمَنْ ضَرُّہ اَقْرَبُ مِن نَفْعِه" وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کو بلاتا ہے اپنی مدد کے لیے، جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، یعنی وہ نقصان پہنچانے پر زیادہ قادر ہے، اس کو نقصان پہنچانا زیادہ سہل ہے اور نفع پہنچانا اس کے مقابلے میں دشوار ہے، اس لیے کہ نفع پہنچانے میں کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے، کچھ ایثار کرنا پڑتا ہے اور نقصان پہنچانے میں کچھ نہیں ہے، تو نقصان کو ترجیح دیتا ہے، بجائے نفع پہنچانے کے، چاہے اس کے ساتھ معاملہ ہو، جو اس کا دوست ہو، جس نے اس کے لیے ضمیر فروشی سے کام لیا ہے، بے اصولی سے کام لیا ہے، لیکن وہ آدمی خدا سے ڈرنے والا تو ہے نہیں،

وہ دیکھتا ہے، اس کی میں مدد کرتا ہوں تو کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس کا کوئی مقام نہیں ہے، اس کا کوئی حلقہ نہیں ہے، تو میں ایسے شخص کی مدد کروں جس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ تو اس امید پر اس کی خوشامد کر رہا تھا اور اس کو اس کے لیے بے اصولی برت رہا تھا، کہ اس سے فائدہ پہنچے گا، اور وہ اس کو نقصان پہنچا دیتا ہے، "لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْر" برا مددگار سرپرست وہ برا عزیز ہے برا ساتھی۔

"اس ابن الوقت گروہ کو دیکھیے کہ یہ آیت جس طرح سمجھ میں آتی ہے اور اس کی بلاغت و اعجاز جس طرح نمایاں ہوتا ہے، وہ بڑی بڑی تفسیر سے اس طرح نمایاں نہیں ہوتا، خطرے اور شبہ سے بچنے کے لیے اس ابن الوقت گروہ کے انتظامات اور اس کی احتیاط دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ" (العنکبوت: ۱۱) "اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے، جب ان کو خدا کے راستے میں کوئی ایذا پہنچتی ہے، تو لوگوں کی ایذا کو یوں سمجھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب ہے"۔

اگر وہ نسبت سرخروئی اور سرفرازی کا باعث ہوتی ہے، تو اپنی قدیم تاریخ اپنے اسلاف اور اپنے دورِ ماضی کو دیا دلاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے وہ اپنا تعلق نکال لیتے ہیں "وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ" (العنکبوت:۱۱) (اور اگر وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے) لیکن اللہ تعالیٰ کو حقیقت حال معلوم ہے۔ "أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ" (العنکبوت: ۱۱) (کیا جو اہل عالم کے سینے میں ہے خدا اس سے واقف نہیں؟) عام طور پر ان زمانہ سازوں کا انجام برا ہوتا ہے اور کسی گروہ میں ان کی وقعت نہیں ہوتی، اسی لیے فرمایا گیا ہے "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ. ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ" شاعر نے اسی موقع کے لیے کہا ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے[1]

(۱) مشترک اخذ و تلخیص۔ از: ☆ درس قرآن، سورہ حج: ۱۱ (غیر مطبوعہ) ☆ دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں: ۲۰-۲۳

ذی روح شہیدوں کی جگہ خلدِ بریں ہے

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا أَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً. وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ. لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلاً يَّرْضَوْنَهٗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ. ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ. إِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ. ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ. ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾(الحج: ۵۸-۶۲)

"اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی، پھر مارے گئے، یا مر گئے، ان کو خدا اچھی روزی دیگا، اور بیشک خدا سب سے بہتر رزق دینے والا ہے، وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کرے گا، جسے وہ پسند کریں گے، اور خدا تو جاننے والا (اور) بردبار ہے، یہ (بات خدا کے ہاں ٹھہر چکی ہے) اور جو شخص (کسی کو) اتنی ہی ایذا دے جتنی ایذا اس کو دی گئی، پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے، تو خدا اس کی مدد کرے گا، بیشک خدا معاف کرنے والا (اور) بخشنے والا ہے، یہ اس لیے کہ خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور خدا تو سننے والا دیکھنے والا ہے، یہ اس لیے کہ خدا ہی برحق ہے، اور جس

چیز کو (کافر) خدا کے سوا پکارتے ہیں، وہ باطل ہے، اور اس لیے کہ خدا رفیع الشان اور بڑا ہے"۔

یہ حکمتِ الٰہی اور اعجازِ قرآنی ہے

دیکھیے! ان آیت میں، اس رکوع میں ہر آیت کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے یا اس کی صفت میں سے کسی صفت کا ذکر ہے، یعنی آیت کو ختم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت اور اس کی شان پر، اس کے فعل پر یا اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے کسی اسم پر، اس میں اگر غور کریں گے آپ تو یہ اعجاز قرآنی ہے، حکمت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اسمائے حسنیٰ ہیں "وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا" (الاعراف:۱۸۰) (اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں) اور کسی صفت کا بھی انتخاب ہو سکتا تھا اور عام طور سے ادبی کتابوں میں، شاعری میں، نظموں میں، مقفیٰ عبارتوں میں کوئی ایسا لفظ، جوڑ یا مناسبت ہوتی ہے، وہ آجاتی ہے اگر آپ غور کریں (ہمیں قرآن مجید میں تدبر کرنے کا موقع نہیں ملتا اور اچھے اچھے لوگوں کو موقع نہیں ملا اور حق تو کسی سے ادا نہیں ہو سکا، اگر یہ کہا جائے کہ آج تک قرآن مجید کے اعجاز کے بیان کا اور قرآن مجید کی تفسیر کا، اس کے لطائف اور مضمرات کے اظہار کا، پورا اظہار تو ناممکن ہے، لیکن کسی درجہ میں اس کا حق ادا کرنا، یا یہ کہ سامعین، پڑھنے والوں کے علم میں ہمیشہ اضافہ کرنا، یہ نہیں ہو سکا اور یہ اعجاز قرآنی ہی کی ایک دلیل ہے) کہ قرآن مجید معجزہ ہے، قرآن مجید اعجاز ہے، یہ اعجاز معنوی طور پر بھی اعجاز ہے اور لغوی طور پر بھی اعجاز ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ دیسا کلام کوئی نہیں کہہ سکتا، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کلام کے بیان کا حق بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، اس اعجاز قرآنی، اس بلاغت قرآنی کا حق بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، یہ ہم نے پہلے سے متوجہ کیا، تا کہ آپ غور کریں اس پر۔

جہاد فی سبیل اللہ پر جو بھی نکلتا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا اَوْ مَاتُوْا" "اور وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اللہ کے راستے میں، پھر وہ شہید کیے گئے یا مارے گئے"

یعنی اس راہِ ہجرت میں، سفر ہجرت میں اور ترک وطن کے سفر میں اور کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہونے میں، ان مراحل سے گذرنے میں، اگر ان کا وقت موعود آگیا، جو وقت مقرر ہے، وہ تو دوسرے کے مارنے سے بھی آسکتا ہے، آسکتا کیا ہے، آتا ہے، یا یہ کہ وہ قتل نہ ہو، کوئی دوسرا یہ ظلم نہ کرنے، ناانصافی نہ کرے، تو اپنے وقت پر موت یوں بھی آتی ہے، تو جو لوگ مارے گئے، یا مرے خود اپنی موت سے تو ''لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً'' اللہ تعالیٰ ان کو ضرور رزق حسن عطا فرمائے گا''۔

قبولِ اسلام کا ایک واقعہ

دیکھئے! موت یا شہادت سے، سب سے پہلے، جو ذہن منتقل ہوتا ہے، یہ فطرت انسانی کی بات ہے، وہ یہ کہ اب سب کچھ گیا، چنانچہ ایک مکی (جبار بن سلمٰی) نے جو بہت غلیظ القلب تھے، بہت سخت تھے، اسلام سے ان کو بڑی نفرت تھی انہوں نے ایک صحابی (حرام بن ملحان) کو شہید کیا اور شہید کرنے کے بعد وہ خود مسلمان ہو گئے، لوگوں نے کہا، بات کیا ہوئی متضاد؟ آپ نے مسلمان کو تو شہید کر دیا، خود مسلمان ہو گئے، آپ نے کیا دیکھا؟ اتنے دن سے آپ سن رہے تھے، آپ کے سامنے اسلام کی دعوت آرہی تھی، آپ مسلمان نہیں ہوئے تھے، اب کیا چیز دیکھی؟ کہنے لگے کہ بات یہ ہوئی کہ.... میں نے اس کو نیزہ مارا، وہ سینہ کے پار نکل گیا اور تڑپ کر وہ گرے اور انہوں نے کہا ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا،...... میں سوچنے لگا۔ کیسی کامیابی ہے؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا؟ (ایک تو پہلی بات ذہن میں رکھیں کہ عرب جھوٹ نہیں بولتا، دوسری بات یہ کہ مرتے وقت کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ دونوں باتیں جمع ہو گئیں) تو میں سوچنے لگا کہ آخر کیا دیکھا اس نے جو کہا میں کامیاب ہو گیا؟ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تڑپ کر گرا اور آخری وقت آگیا، انتقال ہو گیا، بیوی بچوں کا ساتھ چھوٹا، کھانے پینے کا کوئی موقع نہیں رہا، کسی نعمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا، آئندہ کے جو ترقی کے امکانات تھے، یا کمائیاں تھیں، یا دولت کا پیدا کرنا تھا، یا عزت کا حاصل کرنا تھا، یا زندگی سے لطف اٹھانا تھا، سبھی کا

سلسلہ ختم ہوا پھر اس نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہوا، "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" اور پھر کعبہ کے رب کی قسم کھا کر، کیا مسلمان ہی تھے، تو میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا، کسی نے جیسے دل پر نشتر سا لگایا، تو میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر انہوں نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہوگیا؟ انہوں نے کہا کہ تم نہیں جانتے ہو، وہ مسلمان تھے، وہ شہادت پر خوش ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ کیا نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملیں گی، اس پر ایمان تھا ان کا اور ان کے لیے وہ سلسلہ شروع ہوگیا، تو میں ایمان لے آیا۔

اجل اس کو حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

اب یہاں پر دیکھئے یہی بات ہے کہ "وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا اَوْ مَاتُوْا" جب وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید کئے گئے، یا وہ طبعی موت سے مرے، تو اب رزق کا سارا سلسلہ ختم ہوگیا، جتنے تمتعات تھے، جتنے استفادے تھے، جتنی لطف کی چیزیں تھیں، جتنی لطف اندوزیاں تھیں اور بہرہ مندیاں تھیں، کامیابیاں تھیں، ترقیاں تھیں، سب کا سلسلہ ختم ہوگیا، یہ موت کے ساتھ اس کا ضرور تخیل آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسکے جواب میں یہ کہتا ہے کہ "لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا" "اللہ ان کو ضرور رزق حسن عطا فرمائے گا" کوئی نقصان نہیں ہوا، اب یہاں پر یہی کہنے کا موقع تھا، جنت ان کو ملی، جنت ان کو ملے گی، یہ سب ایمان بالغیب کی باتیں تھیں، لیکن پہلا خیال جو آتا ہے کسی کی موت پر، یا کسی کی شہادت پر، وہ یہ کہ دنیا سے گیا، اب نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے، نہ بیوی بچوں میں بیٹھنا ہے، نہ بچوں کو دیکھ کر خوش ہونا ہے، نہ گھر کی آسائشیں ہیں اور سکون ہے، نہ لوگوں کی تعریفیں ہیں، نہ سیر ہے، کچھ بھی نہیں ہے، تو "لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا"۔

"وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ" اور یہ کیوں نہ ہو، کیسے نہ ہو، رزق حسن کیوں نہ ملے؟ اس لیے کہ صاحب رزق، رزق کا جود دینے والا ہے، وہ "خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ" ہے، اب اس "خیر الرازقین" میں پورا ایک کتاب کا مضمون ہے، کہ وہ تو بے استحقاق بھی رزق دیتا ہے، تو بااستحقاق کیوں نہ دے گا اور استحقاق بھی کیسا؟ شہادت کا استحقاق، جس اللہ کے

بندے نے اللہ کے راستے میں جان دی اور سب کچھ لٹا دیا، تو جو شریف آدمی ہے وہ اس کا صلہ دیتا ہے، مانتا ہے، اعتراف کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفت تو شکور بھی ہے، ''وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ'' ''اور یقیناً اللہ سب دینے والوں میں اچھا (دینے والا) ہے''

قرآن مجید کا کوئی لفظ نہ زائد ہے، نہ کم ہے، نہ بے محل ہے، مگر ابھی تک کام قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ (۱)

شہیدراہِ خدا کونئی حیات ملی

''لَیُدْخِلَنَّھُمْ مُدْخَلاً یَرْضَوْنَہٗ'' ''ان کو ضرور داخل کرے گا، ایسے داخل ہونے کی جگہ پر، جس سے وہ خود بھی خوش ہوں گے'' ایسی جگہ کا انتخاب کیسے ہو سکے گا اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ خوش ہوں گے، ''وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ'' دیکھو...! یہ دونوں صفتیں یہاں کے لیے مناسب ترین ہیں، یعنی ان کے مناسب کون سا مقام ہے، اس کے لیے تو ''علیم'' کی ضرورت ہے اور اس کے اندر جو تھوڑی سی بشریت کی کمزوریاں تھیں اور کبھی کبھی ان سے کوتاہی ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت عمدہ جگہ نہ دی جائے، جب حساب کیا جاتا ہے، بڑے سے بڑا استاد ممتحن ہوتا ہے، یا بادشاہ ہوتا ہے اور بڑا محسن اور اپنے زمانے کا فیاض وہ بھی دونوں باتوں کا لحاظ رکھتا ہے، تو اس میں اس کا یہ خیال کرنا ہے، کہ اس نے کیا

(۱) قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتے ہیں، عربی زبان کے بھی، عربی ادب کے بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتے ہیں اور اللہ کے فضل وکرم سے، یہ محض اللہ کا فضل ہے، ہم بھی اس قابل نہیں تھے، کہ ہمیں دونوں سلسلوں میں بہترین استاد ملے، جہاں تک عربی ادب کا تعلق ہے، اس میں ہمیں عرب کے استاد ملے اور مولانا خلیل عرب کے جیسا استاد تو ہم نے بلاد عربیہ میں بھی نہیں دیکھا، ایسا صاحب ذوق اور قرآن مجید کے سلسلے میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، جو گویا امام تفسیر تھے، وہ ملے اور پھر اس کے بعد دوسرے اساتذہ بھی ان سے ہم نے پڑھا، تو یہ قرآن مجید ہمیشہ غور کرنے کے لیے، اس کے اندر گنجائش کا لفظ بے ادبی کا ہے، لیکن اس کے اندر ایک وسیع میدان کیا ایک عالم رہے گا، کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کسی نے تفسیر ختم کردی، تفسیر کا حق ادا کردیا، کسی کی تنقیص نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب کے درجہ بلند فرمائے، امام رازیؒ ہوں یا ابن کثیرؒ ہوں، یا طبریؒ ہوں، یا بعد کے لوگ ہوں، صاحب روح المعانی ہوں، یا آلوسیؒ ہوں، لیکن یہ کہ ابھی تک باقی ہے قرآن مجید پر غور کرنا۔

کارنامہ انجام دیا، اس کا بھی خیال کرنا ہے، کہ اس میں اس سے کچھ کوتاہیاں ہوئیں، تو سب سے اونچے درجے کی چیز نہ دی جائے، تو پہلے تو "اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ" اس کے لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کو بہترین مقام دے گا، اس لیے کہ وہ "علیم" ہے اور اگر کمزوریاں ہوئیں، تو وہ "حلیم" بھی ہے۔

"ذٰلِکَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ" اور یہ بات اس لیے ہے کہ جس شخص نے وہ معاملہ کیا اپنے حریف کے ساتھ کہ جو اس حریف نے معاملہ کیا تھا اس کے ساتھ، جس نے اس کے حملہ کا جواب دیا، اس کے مناسب "ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْهِ" "پھر اس کے بعد اس پر زیادتی کی گئی"، یعنی وہ جواب تو جواب ہو گیا، لیکن اس کے بعد اضافہ کیا اس نے جس کا حق نہیں تھا تو "لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ" وہاں پر اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا، یعنی جب مقابل کے دو لوگ ہیں اور جنگ تُرکی بہ تُرکی ہوئی ہے، تو اب ہو گیا معاملہ صاف کہ اس نے تلوار کا وار کیا، اس نے بھی کیا، لیکن اس کے بعد اس نے دوسرا وار کیا بلا استحقاق، تو پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "لَیَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ" اب اللہ تعالیٰ یہاں پر اس کی مدد کرے گا۔

"وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ" بیشک اللہ تعالیٰ "عفوٌ" بھی ہے، "غفورٌ" بھی ہے، یہ بھی اس لیے کہ جس کو جزا دے رہا ہے، سزا دے رہا ہے، اس سے بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں، معلوم نہیں کس جذبہ سے اس نے مقابلہ کیا، کوئی ضروری نہیں ہے کہ آدمی میں ایمان و احتساب ہی ہو، شہادت کا شوق ہی ہو، جنت میں جانے کا شوق ہی ہو، رضائے الٰہی کے لیے کیا ہو، ممکن ہے غصہ بھی ہو اس میں، ممکن ہے کسی زمانے کی کوئی شکایت ہو، رنج ہو تو "اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ" یہ اللہ تعالیٰ نے "عفوٌ وغفورٌ" ہونے کے اسم کا محل جو ہے، بہرحال ہر ایک کے ساتھ، ہر ایک اس کا محتاج ہے، مطلب اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ "عفو وغفور" ہے، ہر ایک اس کا محتاج ہے اور یہ الفاظ ہر ایک کے لیے برمحل ہیں، "اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ" ایسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بے نیاز ہے، اس کی ذات بے نیاز ہے، جو اللہ کے راستے میں لڑے گا، شہادت پائے گا اور مظلوم ہوگا، وہ بھی کوئی احسان نہیں کریگا اللہ پر اس کو بھی ضرورت ہے اس کی کہ وہ اللہ کو "عفوٌ" اور "غفورٌ" مانے اور یاد کرے۔

دلیلِ قدرتِ پروردگار ہے گردشِ لیل ونہار

"ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ" اور یہ کہ ایک کمزور کو غالب کردیا طاقتور پر، قلیل کو کثیر پر فتح دی اور فقیر کو غنی پر فتح دی، یہ ایسا معاملہ ہے جو بالکل خلاف قیاس ہے، فرماتا ہے، اس کے لیے کیا خلاف قیاس بات ہے۔
"وہ تو رات کو داخل کرتا ہے دن میں" کہ دن ہوتا ہے اور رات آجاتی ہے اور "دن کو داخل کرتا ہے رات میں" کہ رات کا اندھیرا ہوتا ہے چاروں طرف، اس کی تاریکی چھائی ہوتی ہے اور صبح کی روشنی طلوع ہوتی ہے "وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ" اور یہ کہ اللہ تعالیٰ "سمیع" اور "بصیر" ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے فریقین کے درمیان اور اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے، یہ کوئی بعید بات نہیں، یہ تو روز ہوتا رہتا ہے، یہ انقلاب تو روز ہوتا ہے، حتی کہ روز دن میں سے رات نکلتی ہے اور رات میں سے دن نکلتا ہے اور یہ قلیل و کثیر یہ جو اللہ نے رات اور دن کا ذکر کیا ہے، اس میں افراد کی آپس کی جنگ اور تقابل بھی آجاتا ہے اور قوموں کے اور ملکوں کے اور طاقتوں کے کہ دن تو بہت بڑا ہوتا ہے، کہاں تک پھیلا ہوا ہے (ہم نہیں کہتے جہاں دن نہیں ہے آج، اس وقت یورپ میں نہیں ہوگا دن، لیکن جتنے رقبے میں، جتنے حلقے میں دن پھیلا ہوا ہے، کتنا رقبہ بڑا ہے اور اس میں رات آجاتی ہے اور رات جب آتی ہے تو کتنے بڑے رقبہ پر چھا جاتی ہے، لیکن دن آجاتا ہے) تو افراد کے معاملے میں بھی یہی اللہ اپنی قدرت دکھاتا ہے، قوموں کے معاملے میں بھی، عرب کے لوگ جو مٹھی بھر لوگ تھے، یہ جو نکلے جہاد کے لیے اور دعوت ایمانی کیلیے، روم و شام سا سانی امپائر تھے، ان کے مقابلے میں، ان کی کیا حیثیت تھی؟ "ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ" کچھ تعجب نہ کرو، اللہ دن میں سے رات نکالتا ہے، اور رات میں سے دن نکالتا ہے۔

"ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ" بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، "وَاَنَّمَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ" اور یہ جس کو پکارتے ہیں، جس کی عبادت کرتے ہیں، اور جس سے دعا کرتے ہیں وہ باطل ہیں۔

"وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ" اور بیشک اللہ تعالیٰ "العلی" ہے، اور "الکبیر" ہے، وہ بلند بھی ہے، اور بڑا بھی ہے، اب "العلی الکبیر" میں وہ استحقاق سارا آجاتا ہے، جس کی وجہ سے کوئی کسی سے مانگتا ہے، کوئی کسی کا اپنے کو محتاج سمجھتا ہے اور کوئی سمجھتا ہے کہ وہ ہمیں سب کچھ دے سکتا ہے، تو "العلی الکبیر" کی صفت ان سب پر حاوی ہے، بعض چیز میں "العلی" ہے، لیکن وہ بڑا نہیں ہے، یعنی وہ اونچا ہو گیا، کسی پر چڑھ کر اونچا ہو گیا، لیکن اللہ ایسا اونچا نہیں کہ کسی چیز پر چڑھ کر اونچا ہوا ہو، وہ "الکبیر" ہے، وہ بڑا ہونے کی وجہ سے "العلی" ہے اور بلند ہونے کی وجہ سے "کبیر" ہے، بعض ایسے "کبیر" ہوتے ہیں، جو بلا استحقاق اور بلا قد وقامت، بلا کسی بلندی کے وہ بڑے ہو جاتے ہیں، دولت یا وراثت کی وجہ سے تو "العلی الکبیر" کا خاص جوڑ ہے، کہ "کبیر" ہو اور "علی" نہ ہو، نقص ہے، "علی" ہو اور "کبیر" نہ ہو، تو وہ بڑا نہیں ہے، "علی" ہونے کے قابل ہی نہیں ہے، اتفاق سے اس کو موقع مل گیا کسی طرح سے وہ بلند ہو گیا، تو "العلی الکبیر" جب چڑھ جائیں، تو پھر پورے طور پر وہ مکمل "علو" ہے، مکمل "کبیر" ہے۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۵۸-۶۲ (غیر مطبوعہ)

گردوپیش کے واقعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے

﴿سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾(حٰمٓ سجدہ: ۵۳)

''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے، کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے''۔

یہ آیت بھی بڑی چشم کشا اور فکر کی دعوت دینے والی ہے اور قرآنی اعجاز میں اس کو کہا گیا ہے، مضمون کو بیان کیا گیا ہے، "سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ" یہ ہماری بیسویں صدی کا زمانہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ زمانہ ہو سکتا ہے، اس وقت تک بیسویں صدی کا زمانہ جتنی تاریخ محفوظ ہے، اس میں اس کی روشنی میں یہ سائنس، ٹکنالوجی اور میڈیسن وغیرہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ زمانہ ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی زمانہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، لیکن اس کی اس زمانہ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں کی طرف بھی اشارہ ہے، اگر ابھی اللہ کا فیصلہ ہے دنیا کو باقی رکھنے کا ہے، تو اس سے بھی زیادہ ترقی ہوگی، اب یہ کسی کے تصور میں ابھی نہیں ایک ایسی تھوڑی مقدار میں ایک چیز ایسی ہے جو ملک کے ملک فنا کر سکتا ہے، آپ ہیروشیما، ناگاساکی کے قصے پڑھیں، جہاں امریکہ نے بم گرایا تھا، جاپان کے علاقہ میں، تو حیرت ہو

جائے گی کہ ایسی چھوٹی چیز میں اتنی طاقت ہے، اتنی وسعت ہے اور تدمیر کا اتنا بڑا مادہ ہے، اگر وہ صحیح روایات سے اور ذرائع ابلاغ سے نہ پہنچے اور لوگ وہاں گئے ہیں اور دیکھا ہے لوگوں نے اب تو وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، زمانہ ہوگیا کہ جو صرف ایٹمک انرجی کو سمجھ لے، تو وہ اس کے بعد کسی چیز میں شک نہیں کرسکتا، قرآن مجید میں جو کچھ ہے، صحف سماوی میں جو کچھ آیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ بیان کیا ہے، کتنی ہی قیاس کے خلاف ہو تجربہ کے خلاف ہو، بالکل مستحیل معلوم ہو وہ بھی اس کے نزدیک مستحیل نہیں ہے۔

اب آفاق کا جو لوگ عربی زبان اور اس کے الفاظ اور اس کی قوت وطاقت سے واقف ہیں، یہاں پر آفاق کا لفظ ایسا مناسب آیا ہے، چہار دانگ عالم میں اور پوری کائنات میں افق میں بلند سے بلند جگہ پر اور نشیب سے نشیب کی جگہ پر اور موبق فی الشمال اور موبق فی الجنوب، جو شمال انتہائی شمال میں ہے اور جو انتہائی جنوب میں ہے، انتہائی مشرق میں ہے، سب آفاق کے اندر آتا ہے۔

"سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا" اور پھر یہاں "آيَاتِنَا" کہا، دو باتیں ایک تو جمع کا صیغہ لایا گیا، پھر اضافت اپنی ذات عالی کی طرف کی گئی، ہم اپنی نشانیاں دکھائیں گے، تو اس سے نشانیوں کی عظمت اور ان نشانیوں کی دقت ان کا کسی کے بس کا نہ ہونا اور مشکل سمجھ میں آنا سب آجاتا ہے، "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ" اور ان کی ذات میں بھی ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں، "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ .... إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ"۔

تو یہ اس وقت کی جو علمی ترقیاں ہیں، وہ بالکل انسان کو اس کے لیے تیار کر رہی ہیں، اگر توفیق الٰہی نہ ہو، بے توفیقی ہو تو الگ بات ہے، یا مہر لگ گئی ہو، ورنہ انسان کو تیار کر رہی ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کو جس کو پہلے لوگوں نے جس کا انکار کیا تھا، پہلے خود آدمی انکار کر رہے تھے، ہم نے آپ کے سامنے کہا تھا کہ سرسید نے تفسیر لکھی اور ان کی تفسیر میں بڑی قابل اعتراض چیزیں ہیں اور وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اس وقت تک کی معلومات کو معیار بنایا اور اس وقت تک کے مطالعہ کو انہوں نے بنیاد قرار دیا اور جب وہ یورپ گئے اور وہاں

یورپ کی ترقیاں دیکھی، تو وہ بہت متاثر ہوئے، انہوں نے یہ چاہا کہ اب پڑھے لکھے طبقہ، اس میں کوئی ایسی چیز نہ آئے، جس سے پڑھا لکھا طبقہ شک میں پڑ جائے، یا انکار کرنے پر آمادہ ہو جائے، وہ خود بھی یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ممکن ہے کہ اس کو بھی انہوں نے اس میں تھوڑی سی ان سے تساہل ہوا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ قرآن مجید عقل کے خلاف ہے، تو اصل میں بنیاد انہوں نے اس کو بنایا جو اس کی مرکزی کمزوری ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن مجید عقل کے خلاف نہیں ہے، عقل و تجربہ کے خلاف نہیں ہے، لیکن یہ کہ عقل اور تجربہ دونوں محدود ہیں اور اتنے محدود بھی نہیں ہیں، عقل و تجربہ سے بھی ان باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے اور آئندہ یہ عقل و تجربہ جو ہیں ایک جگہ منزل پر جا کر ختم نہیں ہو گئے، چل رہے ہیں، ان کا سفر جاری ہے، اس لیے کم سے کم یہ کرنا چاہئے تھا ممکن ہے، ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے اور خواہ اس وقت سمجھ میں نہ آئے، کبھی سمجھ میں آئے گا۔

تو حضرت سلیمانؑ کے متعلق کہا گیا، "غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ" اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی ہوائیں عطا فرمائی تھیں، ہواؤں میں یہ طاقت رکھی تھی کہ جو منزل ایک مہینہ میں طے ہو سکتی ہے، جو مسافت وہ خود ہوا کے ذریعہ وہ صبح میں طے کر لیتے تھے اور "رَوَاحُهَا شَهْرٌ" اس طریقے سے تو اس میں انہوں نے تاویلیں کی ہیں، اس کی اور کوشش یہ کی ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ اس کو پڑھ کر شک میں نہ پڑے، اس وقت تک ہوائی جہاز چالو نہیں ہوا تھا، یعنی یہ ہوائی پرواز شروع نہیں ہوئی تھی، جب ہوائی جہاز نکلا، تو ان کے دوستوں نے کہا کہ سید صاحب کاش کہ ان کے زمانے میں ہوائی جہاز چل جاتا تو دیکھتے، ہوائی جہاز سے آدمی کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے اور ہم دمشق گئے بمبئی سے سوار ہوئے، پہلا سفر ہمارے ہوائی راستے میں صبح صادق ہو گئی، ہم نے نماز پڑھ لی، جب دمشق پہنچے، تو ابھی صبح ہی نہیں ہوئی تھی، رات کے وقت مغرب کی طرف جا رہے تھے اور اب کتنی بڑی مسافت کتنی جلدی طے ہوتی ہے، آپ میں ایسے لوگ ہوں گے، جو سفر نہیں کئے ہوں گے، آئندہ ان شاء اللہ کریں گے۔ (۱)

---

(۱) درس قرآن (غیر مطبوعہ) سورہ حم سجدہ: ۵۳

ایک مکالمہ (۱)

یہ مکالمہ حکمت و بلاغت کا آئینہ اور موقع شناسی کا اعلیٰ نمونہ ہے:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِيٓ أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُۥٓ ۖ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي ٱلْأَرْضِ ٱلْفَسَادَ. وَقَالَ مُوسَىٰٓ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ ٱلْحِسَابِ. وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَٰنَهُۥٓ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ ٱللَّهُ وَقَدْ جَآءَكُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ مِن رَّبِّكُمْ ۖ وَإِن يَكُ كَٰذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُۥ ۖ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ ٱلَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ. يَٰقَوْمِ لَكُمُ ٱلْمُلْكُ ٱلْيَوْمَ ظَٰهِرِينَ فِي ٱلْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِنۢ بَأْسِ ٱللَّهِ إِن جَآءَنَا ۚ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ أُرِيكُمْ إِلَّا مَآ أَرَىٰ وَمَآ أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ ٱلرَّشَادِ. وَقَالَ ٱلَّذِيٓ ءَامَنَ يَٰقَوْمِ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُم مِّثْلَ يَوْمِ ٱلْأَحْزَابِ. مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَٱلَّذِينَ مِنۢ بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا ٱللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ. وَيَٰقَوْمِ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ ٱلتَّنَادِ. يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ ٱللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ وَمَن يُضْلِلِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِنْ هَادٍ. وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُم بِهِۦ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا

هٰلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا. كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ. الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا. كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (المومن: ۲۶-۳۴)

ایک مومن جو اپنا ایمان پوشیدہ رکھے ہوئے تھا

یہ وہ مکالمہ ہے جو فرعون اور اس شخص کے درمیان ہوا جو منصب پیغمبری پر فائز نہیں تھا، اللہ نے اس کے دل کو اپنے دین کی سمجھ کے لیے کھول دیا تھا اور اسلام کی دولت سے اس کو نوازا تھا وہ اپنے وقت کے نبی برحق یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہدایت ودین حق سے مشرف ہوا تھا۔ وہ قوم فرعون کا ایک فرد تھا، جو صاحب ایمان تھا، مگر اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا یہ مکالمہ بلاشبہ حکمت وبلاغت کا آئینہ ہے اور مردم شناسی، انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اس پر عبور کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ بلیغ مثال ایک ایسے مکالمہ کی ہے جو بادشاہ وقت اور اس کے حاشیہ نشینوں سے ایک ایسے شخص نے کیا جو ہدایت یافتہ تھا اور اللہ پر ایمان رکھتا تھا، میں جب بھی اس مکالمہ کو پڑھتا ہوں تو اس پُرشکوہ انداز بیان کا دل پر اثر ہوتا ہے، درحقیقت اس مکالمہ کی ادبی حیثیت اور بلاغت اور اس کا حکیمانہ اسلوب، ادبی ذوق کے لیے بڑا سرمایہ ہے، اس کے اندر انسانی نفسیات کا گہرا علم جھلکتا ہے، ذہنی کیفیات کا اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے اور مزید یہ کہ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا "**واتوا البیوت من ابوابھا**" یعنی گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، اس کی بھی بڑی حسین رعایت ملتی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی حکایت ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ اس کی علمی سطح کیا تھی وہ کہاں پلا اور بڑھا کس طرح اس کی علمی وذہنی تربیت ہوئی اور اس نے کیسے حکمت وبلاغت میں اس درجہ کمال حاصل کیا یہاں یہ معلوم ہوا کہ ایمان ایک ایسی دولت ہے جس سے عجائب وغرائب کا ظہور ہوتا ہے ایمان ایک گونگے کو انداز تکلم کا ماہر بنا دیتا ہے اس کے طفیل بہرا دور کی بات سننے لگتا ہے ایک مفلوج اور اپاہج بھی اپنے اندر نہ

صرف چلنے بلکہ دوڑنے کی ہمت پاتا ہے اور بے تیغ بھی سپاہی بن کر لڑنے والا بن جاتا ہے۔

حکمرانوں کی مورچہ بندی

فرعون نے کہا" ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ". "إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ" "مجھے موسیٰ کو قتل کر لینے دو، وہ چاہے اپنے رب کو بلا لے مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ تمہارے دین کو بدل نہ دے اور ملک میں فتنہ فساد نہ پیدا کر دے" حکمرانوں کی ہمیشہ سے یہی منطق رہی ہے وہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں کو یہی کہہ کر دبا دیا کرتے ہیں، دراصل یہ ان کی سیاسی مورچہ بندی ہوتی ہے لوگوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کریں اور نفس انسانی کے اندر چھپی ہوئی نخوت وغیرت کو ابھاریں اب فرعون کی اسی بات کو لیجئے، اس نے کس طرح چالاکی کے ساتھ ایسی بات کہی جس کے دو رخ ہیں، ایک رخ تو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے اور مذہب وعقیدہ ہر زمانہ اور ہر نسل میں انسانوں کو عزیز رہا ہے خواہ وہ مذہب وعقیدہ غلو ہو یا حق وصداقت پر مبنی ہو خواہ اس کی بنیاد وحی ورسالت پر ہو، یا عقل ونظر کی کوتاہ بینی اور جہالت پر لیکن عقیدہ بہرحال عقیدہ ہی ہے ہر ایک کو عزیز اور اس کے نزدیک جان ومال سے زیادہ گراں قدر لوگ اس کے لیے اپنا تن، من، دھن، سب قربان کر دیتے ہیں، لہذا فرعون نے "إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ" (مجھے ڈر ہے کہیں یہ شخص تمہارے دین کو بدل نہ دے) کہہ کر اپنی قوم کی مذہبی نخوت کو ابھارا۔

پھر کہا "أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ" (یا ملک میں (نقض امن) فساد پیدا کر دے) اس سے ان لوگوں کے کان کھڑے کئے جو محب وطن قسم کے لوگ تھے ممکن ہے شاہی دربار میں ایسے لوگ بھی رہے ہوں گے جن کو دین ومذہب سے کم دلچسپی رہی ہوگی، مگر وہ وطن وملک کی سالمیت اور ملک کے امن کے بارے میں زیادہ حساس رہے ہوں گے، ان کو ابھارنے اور حضرت موسیٰ کے خلاف بھڑکانے کے لیے فرعون کا یہ جملہ کہ "کہیں ملک میں نقض امن اور فساد پیدا کر دے" کافی تھا۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کی متکبرانہ بات سنی جو ہٹ دھرمی، غرور اور لہجہ کی کرختگی میں آپ اپنی مثال تھی اور وہ فرعون کو جانتے تھے جو ایک موقع پر کہہ چکا تھا: "یَا قَوْمِ أَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْأَنْھَارُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" (الزخرف:۵۱)

"(اور فرعون نے پکار کر کہا) اے میری قوم! کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے محلوں کے نیچے بہہ رہی ہیں۔ (میری نہیں ہیں؟)

اس لیے جب فرعون سے اس کی متکبرانہ بات دوبارہ سنی تو انہوں نے صرف اس قدر فرمایا: "إِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ" (المومن:۲۷) میں ہر متکبر سے جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں"۔

ایک نرم اور دل پر اثر کرنے والی بات

اس موقع پر ایک شریف انسان اٹھتا ہے جو فرعون ہی کی جماعت میں سے تھا لیکن صاحب ایمان تھا، اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اس کے اندر انسانیت کا شعور بیدار تھا، انسان کی عزت نفس اور مقصد کی بلندی کا اس کو احساس تھا اس نے کہا "أَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا أَنْ یَقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ" "کیا تم صرف اس لیے ایک انسان کو قتل کردو گے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟

اس کا صرف یہی جرم ہے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے؟ اگر کوئی کہے کہ فرعون میرا رب ہے تو اس کو قتل نہ کرو گے اور فرعون تو اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہا ہی تھا: "أَنَا رَبُّکُمُ الْأَعْلٰی"۔

تو کیا وہ قتل کا مستحق نہیں ہے؟ لوگو! کیا تمہارے اندر انصاف وعدل کا کوئی ذریعہ نہیں ہے؟ کیا تم بالکل نہیں سمجھتے؟ ایک شخص اگر اپنا رب اس ذات کو مانتا ہے جو اس کا خالق ہے جو اس کو عدم سے وجود میں لایا جس نے اس کو نیست سے ہست کیا اس کی پرورش کی اس کو رزق دیتا رہا اگر اس کو وہ اپنا رب کہتا ہے تو تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو اور وہ شخص جو ہمیشہ کا

محتاج مخلوق، اپنی ایک ایک سانس کے لیے رب حقیقی کا محتاج، اپنی پیدائش اور پیدائش سے پہلے جب وہ اپنے باپ کے صلب میں تھا اس وقت سے لے کر اپنی نشو ونما آخر تک ہر بات میں محتاج وہ اپنے لیے خدائی کا دعوی کرے اس کو کچھ نہ کہا جائے، آخر یہ کیا ظلم ہے، کیا اندھیرا ہے؟ اس شریف انسان نے یہ بات کہہ کر فرعون اور اس کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں کے اندر سے عدل وانصاف کے جذبہ کو ابھارنا چاہا اور دیکھنا چاہا کہ آیا ان کے اندر شرافت اور انصاف کا کوئی شمہ باقی ہے یا نہیں اور ان کے اندر خیر وشر کے درمیان تمیز کی قوت کو ابھارنا چاہا کہ وہ کھرے کھوٹے، اعلیٰ وادنیٰ کے درمیان تمیز کر سکیں، مالک اور غاصب کے فرق کو سمجھنے کی اگر ان میں کوئی صلاحیت ہے تو اس کو کام میں لائیں، یہ بات ان سب لوگوں کو چیلنج کر رہی تھی جو اس وقت فرعون کے دربار میں موجود تھے اور جنہوں نے اس مومن باللہ کی بات سنی۔

مقصد برآری کے لیے عیاں حقیقت سے استدلال

اس مرد مومن نے اپنی بات کو دلیل کے ذریعہ تقویت دی "وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَبِّكُمْ" (اور یہ شخص یعنی موسیٰ تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل لے کر آیا ہے) اس جملہ سے اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے معجزہ عطا فرمائے تھے "فَأَلْقٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ. وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنّٰظِرِيْنَ" (الاعراف: ۱۰۷-۱۰۸) "اپنا ڈنڈا ڈال دیا تو اچانک وہ ایک کھلا ہوا اژدھا تھا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمکدار تھا" یہ وہ کھلے ہوئے مشاہدات تھے جن سے کوئی شخص اختلاف نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انسان ان باتوں میں مباحثہ ومناظرہ کر سکتا ہے جو عقلی اور فکری ہوں لیکن جو بات کہ اس کے مشاہدہ میں ہو اور جس کو وہ اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہو اس کے ہونے یا نہ ہونے میں مناظرہ کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس مرد مومن نے انسانی نفسیات کے عین مطابق ایک ایسی جچی تلی بات کہی کہ اس کو ہر انسان سمجھ سکتا تھا اور حق وانصاف کی بات کہہ سکتا تھا اس نے ان کو اس زبان میں مخاطب کیا جسے وہ

خوب سمجھتے تھے بالکل منطقی اور اصولی بات "اِنْ یَکُ کَاذِباً فَعَلَیهِ کَذِبُهٗ. وَاِنْ یَکُ صَادِقاً یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ. اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ" اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا اور اگر وہ سچا ہے تو کوئی سا عذاب جس کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے تم پر واقع ہو کر رہے گا بیشک خدا اس کو ہدایت نہیں دیتا جو بے لحاظ اور جھوٹا ہو"۔ گویا اس نے کہا اے لوگو اپنے آپ کو ایسی مشکل میں نہ ڈالو جس سے نکل نہ سکو یہ آدمی جو اپنے آپ کو نبی برحق کہہ رہا ہے اور وہ آسمان سے اس کام پر مامور ہے اگر تم اس کو اپنی گرفت میں لے کر عبرت کا سامان بناتے ہو تو اس میں سنگین خطرہ ہے کیونکہ اگر یہ سچا نکلا تو جس قدر عذاب خداوندی کی یہ دھمکی دے رہا ہے اس میں کچھ تو تم پر عذاب آئے گا ہی اور اگر وہ جھوٹا ہے .... پناہ بخدا.... تو اس کا جھوٹ اس کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے تم اس کے ذمہ دار کسی حال میں نہ ہوگے۔

غیر متغیر سنت اللہ سے استدلال

تیسری چیز جس سے اس مرد مومن نے مدد لی وہ یہ کہ اللہ کی سنت جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور آج تک اس میں تغیر نہیں دیکھا گیا اس کی طرف توجہ مبذول کرائی "یَا قَوْمِ لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ظَاهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ" "اے میری قوم! آج تمہاری بادشاہت ہے اور تم ہی ملک پر غالب ہو"۔

اس طرح اس نے فرعون کے وزیروں کو سمجھایا کہ بھائیو! تم اس وسیع شہنشاہی اور اس چندروزہ عزت سے دھوکہ میں نہ پڑو بلاشبہ آج تم جس سرزمین پر حکمراں ہو وہ ایک بڑی مملکت ہے دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، تمہارے پاس زر و جواہر کے ڈھیر ہیں ہر قسم کے وسائل اور سامان عشرت موجود ہیں، تمہاری ہر طرح سے بادشاہت ہے اور تم ملک پر قابض ہو بلاشبہ اقتدار اعلی تمہارے پاس ہے اور تم ہی حکومت کی کنجیوں اور خزانوں کے مالک ہو تمہارے پاس دفینوں کی بھی طاقت ہے اور حملہ کرنے کی بھی قوت ہے لیکن اگر اللہ کا عذاب آگیا تو کون ہمیں اس سے بچا سکے گا اس داعی مومن نے دراصل ان لوگوں کی نظر سنت الٰہی

کی طرف مبذول کرائی جو کبھی بدلا نہیں کرتی "فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ إِنْ جَاءَنَا" "لیکن ہم پر اگر عذاب آگیا تو کون ہماری مدد کرے گا اس کو دور کرنے کے لیے"۔

تمہارا خیال ہے کہ تم اس وقت سب سے بلند ہو، کوئی شی تم سے اوپر نہیں ہے، کوئی ذات تمہارے اوپر حکمراں نہیں ہے، تم ہر چیز کے مرجع ہو، قوت میں، حکمرانی میں، حکم دینے اور روکنے میں تمہارا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا، لیکن تم بھول گئے ہو کہ ایک قوت اور ہے جس پر امر واقعہ کے لحاظ سے تو تمہارا ایمان ہے مگر اس کی چند صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو، اس موقعہ پر فرعون نے کہا "مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ" "میں تمہیں وہی بات سمجھاتا ہوں جو مجھے سوجھی ہے اور وہی راہ بتاتا ہوں، جس میں بھلائی ہے" اس فرعونی قول میں کوئی دلیل نہیں ہے "جو مجھے سوجھی ہے وہ تمہیں سمجھاتا ہوں" یہ تو اعتراف شکست ہے، فرعون کو ضرورت تھی کہ آسمانی صحیفوں کی کوئی دلیل پیش کرتا، کوئی منطقی دلیل لاتا مگر وہ ایسا نہ کرسکا اور اپنے عجز کا گویا اعتراف کرنے لگا کہ "مجھے جو سوجھی ہے وہی بات سمجھاتا ہوں" یہ کوئی دلیل نہیں ہے یہ تو ہر کند ذہن اور گمراہ ہر جاہل وعامی کہہ سکتا ہے اور اس کا یہ کہنا "وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ" (میں وہی راستہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے) صرف زبانی دعوی ہے اس کا کوئی ثبوت وہ نہیں پیش کرسکا۔

ماضی میں فنا ہونے والی قوموں اور تاریخ سے عبرت دلانا

اس مرد مومن نے فرعون کی بات کاٹتے ہوئے مزید کہا۔ "إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ. مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ. وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ" "مجھے تمہاری نسبت خوف ہے کہ (مبادا) تم پر بھی اور امتوں کی طرح کا عذاب نہ آجائے (یعنی) نوح کی قوم، عاد وثمود اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ان کے حال کی طرح تمہارا حال نہ ہو جائے اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا"۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین وزراء وغیرہ ان قوموں کے انجام سے واقف تھے اور انہیں کسی قدر تاریخ امم کا علم تھا جو عاد وثمود کے بعد دنیا میں آئیں اور اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

ایک مکالمہ (۲)

آخرت کے عذاب سے آگاہی

اس کے بعد اس مومن نے کہا: ﴿وَيٰقَوْمِ اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ﴾ ''اے میری قوم! مجھے تمہاری نسبت پکار کے دن (یعنی قیامت) کا خوف ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی ملک یا کوئی بادشاہت ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہوتی تو آج عاد وثمود کی سلطنت بھی قائم رہتی ان کو بھی زوال نہ آتا اور جب ان کی حکومتیں فنا ہوگئیں تو پھر تمہاری سلطنت کی کس نے ضمانت لی ہے کہ ہمیشہ قائم رہے گی جب ان کے ملکوں اور ان کی بادشاہوں کی بساط الٹ دی گئی تو پھر تمہاری کیا خصوصیت ہے جس کی بناء پر تم کو ہمیشہ باقی رکھا جائے گا اگر تم میں اور ان میں اخلاقی قدروں کا فرق ہوتا تم ہدایت یافتہ ہوتے تو شاید کہ گمان ہوتا کہ تم زیادہ عرصہ چل جاؤ مگر یہ بات بھی تمہارے اندر نہیں ہے۔ تمہارا طریقۂ عمل اور طرزِ حکومت ہے تو وہی ہے جو ان فنا ہونے والی قوموں اور ان کی بادشاہتوں کا تھا لہذا جیسے وہ فنا ہوگئے ناپید ہوگئے تمہارا انجام بھی یہی ہوگا آخر تمہارے اور ان کے درمیان خطِ فاصل کیا ہے؟ اس کے بعد اس مردِ مومن نے کہا ''اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ'' (یعنی مجھے تمہارے بارے میں پکار کے دن یعنی عذاب کے دن کا خوف ہے) پکار کا دن قیامت کا دن ہوگا جس روز ایک دوسرے کو پکاریں گے ایک

دوسرے کو پکارنے، شوروشغب، چیخ و پکار کی صورت حال فرعون کے ہالی موالی کے لیے نئی نہیں تھی ان کے جلوس نکلا کرتے تھے، میلے ٹھیلے ہوتے تھے اوہ جانتے تھے کہ ان مواقع پر کیا ہوتا ہے، اس لیے قیامت کے دن کا اشارہ "یَوْمَ التَّنَادِ" سے کیا اور اس روز قیامت کی ایک اور صفت بیان کی "یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ" جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے"۔

اس لفظ کا بوجھ فرعون کے ذہن پر سخت پڑا ہوگا کیونکہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ قسم اس کے نزدیک (شکست کی) تھی، جس میں فوج پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑی ہو وہ شکست و فرار اور میدان چھوڑ کر بھاگنے کا تصور نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی فوج تعداد اور ہتھیار میں سب پر فوقیت رکھتی تھی، لہذا پیٹھ پھیر کر بھاگنے کا مفہوم وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس میں جو ذلت ورسوائی ہے اس سے وہ آگاہ تھا اس لیے اس مرد مومن نے کہا "یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ. مَا لَکُمْ مِنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ. وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ" جس دن پیٹھ پھیر کر (قیامت کے دن) تم بھاگو گے (اس دن) کوئی تم کو عذاب خداوندی سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس شخص کو خدا گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے"۔

ایک حکیمانہ نکتہ

پھر اس مومن نے جس کو اللہ نے حکمت و عقل سے نوازا تھا ایک نیا اور بہت حکیمانہ نکتہ پیدا کیا اس نے انسانی فطرت کی ایک دیرینہ کمزوری اور انسانی سوسائٹی اور سماج کے ایک ایسے مرض کی نشاندہی کی جو قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نعمت کی قدر اسوقت نہیں کرتا جب اس کو حاصل ہوتی ہے، کہنے والے نے کہا ہے "قدر نعمت بعد زوال" جو چیز حاصل ہو چکی ہے اس کی تحقیر کرنا اس کی فطرت میں ہے اور جب تک وہ نعمت اس کے دسترس میں ہے اس کی عزت نہیں کرتا گویا وہ اس کو فراموش کر دیتا ہے کہ یہ بھی کوئی قابل شکر نعمت ہے۔ یہ انسانی فطرت کی ایک کمزوری بلکہ مرض ہے ماضی میں جو تھا اس کی تو وہ عزت کرتا ہے اور اس کی اہمیت محسوس کرتا ہے اور اس پر حسرت کرتا ہے اگر ہاتھ سے چھین لی جائے لیکن موجود ہے اس پر اس کا خیال نہیں جاتا کہ یہ بھی قدر کرنے کی چیز ہے جیسے دنیا

سے رخصت ہوجانے والے کے بارے میں کہا جاتا کہ ایسا آدمی نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا اس کے اوصاف شمار کیے جاتے ہیں اس کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد کی جاتی ہیں مگر جو زندہ ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک آدمی ہے ہم بھی ایک آدمی ہیں اور اگر وہی آدمی مرجائے تو پھر اس کی شان میں مرثیے اور قصائد کہے جانے لگیں مبالغہ کے ساتھ اس کی مدح کی جائے گی یہ انسانی سوسائٹی کا ایسا مرض ہے جس نے انسانی نسلوں کو اکثر معاصر شخصیات کی طرف سے بے پرواہ رکھا اور لوگ اپنے وقت کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں سے بہرہ مند نہ ہوسکے اس ناسپاس گزاری اور ناشکری کی طرف اس مرد مومن نے اس طرح نگاہ ملتفت کرائی ''وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهٖ. حَتّٰى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا'' (المومن: ۳۴) اور پہلے یوسف بھائی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے تو وہ جو لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے یہاں تک کہ وہ جب فوت ہوگئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا''۔

حضرت یوسف علیہ السلام آپ اپنی مثال تھے اور اپنی شان میں منفرد تھے ان کا ثانی کون ہوسکتا تھا، شریف باپ، دادا کے شریف بیٹے اور پوتے رحم دل انصاف پرور بادشاہ جب تک زندہ رہے لوگ ان کی عیب جوئی کرتے رہے اور ان کی طرف طرح طرح کے قصے منسوب کرتے رہے، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی تم وہی سلوک کرو جو ان سے پہلے کے پیغمبر یوسف کے ساتھ کر چکے ہو اور نتیجہ یہ ہو کہ جب یہ بھی دنیا سے اٹھا لیے جائیں تو کہنے لگو کہ موسیٰ تو خدا کا ایک بیش بہا انعام اور عطیہ تھے ان سے پہلے کوئی بھی پیغمبر ان کے جیسا اولوالعزم نہیں گزرا اور نہ آئندہ کبھی آئے گا لوگو! میں تمہیں اس طرزِ عمل سے آگاہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی غلطی نہ کرنا۔

فرعون کی وہ خصلت جو حق وصداقت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

ان الفاظ پر غور کیجیے ''لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا'' یعنی اللہ ان کے بعد ہرگز

کوئی رسول نہیں بھیجے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یوسف علیہ السلام کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب پھر کوئی پیغمبر اس دنیا میں آئے گا۔ "کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ. اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ اَتٰھُمْ. کَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا. کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ" (المومن:۳۴-۳۵) اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہو جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں خدا کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک یہ جھگڑا سخت ناپسند ہے اس طرح اللہ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ساری محرومیوں اور ناکامیوں اور حق کی نعمت سے تہی دست رہ جانے کا سبب تکبر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر دعوت دے رہا ہے، جس کی پیغمبرانہ صداقت کی گواہی وہ جادوگر دے چکے تھے جس کو موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے بلایا گیا تھا وہ جادوگر حقانیت پر ایمان لے آتے ہیں اور یہ ایمان ان کو فرعون کے گروہ سے نکال کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گروہ میں لے آتا ہے، یعنی اللہ کے داعیوں کے گروہ میں ان کو لے آتا ہے اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے زمرہ میں لے آتا ہے اور وہ جادوگر ایسے مومنین صادقین بن جاتے ہیں گویا ہمیشہ سے گہوارۂ نبوت میں پلے ہیں حالانکہ ان کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے دلوں کے پتھروں کو موم کر دیا اور ایمان کی تخم ریزی ان کے اندر کر دی، چنانچہ وہ فرعون کے گروہ سے نکل کر حق کے گروہ میں شامل ہو گئے اور برملا کہنے لگے "فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ. اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا" (طٰہٰ:۷۲) کرو جو فیصلہ بھی چاہو بہر حال جو بھی کرو گے وہ اس مادی زندگی میں کرو گے اور ہم ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس مرد مومن نے کئی طرح سے فرعون کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا، کیوں؟ اس لیے کہ فرعون کی یہ خصوصی علامت بلکہ کلیدی علامت تھی جس کو ہم تکبر کہہ رہے ہیں یہ بات حضرت موسیٰ کے ذکر میں کئی بار فرمائی گئی ہے ﴿وَقَالَ مُوْسٰی اِنِّی

عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ (المومن:۲۷)
''اور حضرت موسیٰ نے فرمایا میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر اس متکبر سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا''۔

حضرت موسیٰ کی دعوت اور قوم فرعون کے مومن کے وعظ میں مشترکہ بات

پھر اس مرد مومن نے کہا ''كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ. اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ'' (المومن:۳۴-۳۵) اسی طرح اللہ ہر اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہو جو لوگ کہ بغیر اس کے کہ کوئی دلیل آئی ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں''۔

لہٰذا اس پوری داستان کی کلید اور فرعون کی شخصیت کا کلید عنصر تکبر ٹھہرا یہ تکبر ہی تھا جو فرعون کی راہ میں رکاوٹ بنا اور جس نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی اس کمزوری کا پورا پورا احساس تھا اور فرعون کی قوم سے جو مرد مومن اٹھا وہ بھی اچھی طرح اس بات سے آگاہ تھا لہٰذا وہ مرکزی نقطہ یا مشترکہ بات جس میں یہ دونوں متفق تھے وہ تکبر کے مرض کی تشخیص تھی اور دونوں اس مرض پر اپنے تاسف کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ اسی بات نے فرعون اور فرعون کے حاشیہ برداروں اور وزیروں کو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر وہ ہدایت نہ پا سکا۔

دکھتی رگ کو پکڑنا

اس مکالمہ میں دنیا کی تحقیر اس کا تغیر پذیر ہونا فانی ہونا اور آخرت کی زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ رہنا پر اثر انداز میں بیان ہوا ہے: ''وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ. يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ. وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ'' (المومن:۳۸-۳۹) ''اور وہ شخص جو مومن تھا اس نے کہا بھائیو! میرے پیچھے چلو، میں تمہیں بھلائی کا راستہ دکھاؤں گا۔ بھائیو! یہ دنیا کی زندگی (چند روزہ) فائدہ

اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت وہ وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے"۔

اور فرعون کے لیے جو بات سب سے بڑا حجاب ثابت ہوئی وہ اس کی وسیع شہنشاہی تھی جس پر اس کو ناز تھا، لہذا ضرورت تھی کہ اسی احساس پر ضرب لگائی جائے چنانچہ انہوں نے کہا "یہ زندگی ایک وقت تک کے لیے نفع اٹھانے کی جگہ ہے اور صرف آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے" اس طرح انہوں نے دکھتی رگ پکڑ لی اس کے بعد اللہ کے عادلانہ قانون کو بیان کیا جس سے کوئی بچ نہیں سکتا، اور کہا "مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا. وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ" (المومن: ۴۰) "جو برے کام کرے گا اس کو بدلہ بھی ویسے ہی ملے گا اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور صاحب ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

نفع بخش اور فریبی دھوکہ باز کے درمیان تمیز کی دعوت!

پھر اس نے یہاں ایک دوسرا پہلو اجاگر کیا کہ نفع بخش اور نقصان دہ کے درمیان اور مخلص اور فریب دہندہ کے درمیان تمیز نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے اس بات کو ان الفاظ میں ادا کیا "وَيَا قَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ. تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ. وَأَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ" (المومن: ۴۱-۴۲) اور اے میری قوم! میرا کیا حال ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی آگ کی طرف بلاتے ہو تم مجھے اس لیے بلاتے ہو کہ خدا کے ساتھ کفر کروں اور اس چیز کو اس کا شریک مقرر کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور میں تم کو خدائے غالب اور بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں"۔

وہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگو! اس دعوت کے درمیان جسے میں لے کر کھڑا ہوا ہوں اور اس دعوت کے درمیان جس کو فرعون لے کر کھڑا ہے موازنہ کرلو، میں تمہیں نجات کا راستہ بتاتا ہوں اس رحم کرنے والے اور بخشنے والے اللہ کی طرف بلاتا ہوں جبکہ وہ تمہیں اپنی ذات

کی طرف بلاتا ہے اور اس راستہ کی طرف بلاتا ہے جس میں ہلاکت اور تباہی ہے پھر کہتا ہے ''لاجَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْآخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَا اِلَی اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ'' (المومن:۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا و آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں اور ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں''۔

یہاں اس شریف النفس مبلغ نے اس بات پر آگاہ کیا کہ فرعون کی دعوت ایک لایعنی اور زبردستی کی دعوت ہے وار در حقیقت جاہلیت کی جتنی دعوتیں ہیں وہ لایعنی اور بے مقصد ہیں اللہ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری اور عقل سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ل ہے علم سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ انبیاء کی دعوت سے ان کا کوئی تعلق ہی ہے زمین کی سطح پر وہ اس طرح ابھر آتی ہیں جیسے بے مصرف اور مضرت رساں رو ئیدگی کسی لگائے ہوئے پودے کے اردگرد ظاہر ہوتی ہیں اور اسے باغباں یا کسان اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے اس شریف النفس مبلغ نے اسی نقطہ کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ بلاشبہ تم لوگ ہم کو اس چیز کی طرف بلاتے ہو جس کی نہ دنیا میں کوئی آواز ہے اور نہ آخرت میں، کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے؟ کوئی ثبوت ہے؟ ہرگز نہیں یہ صرف تمہاری خواہشات اور تمہاری مصلحتیں ہیں۔

وہ آخری بات جو ہر مخلص مبلغ کہا کرتا ہے!

اخیر میں اس مرد مومن نے دلی سوز کے ساتھ ایک بات کہی جس میں اللہ پر اپنے تمام معاملات کو سپرد کرنا ظاہر ہوتا ہے اس کی اس بات میں دل کا درد بھی ہے اور ایک آخری کوشش کا اظہار بھی یہ وہ بات ہے جو ہر مخلص مبلغ کی زبان سے نکلتی ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی بات نہیں کہی جاسکتی ''فَسَتَذْكُرُوْنَ مَا اَقُوْلُ لَكُمْ. وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ'' (المومن:۴۴) ''جو بات میں تم سے کہتا ہوں تم اسے آگے چل کر یاد کرو گے اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں بے شک خداوند تعالیٰ بندوں کو دیکھنے والا ہے''۔

یہ وعظ کا ایک بہترین خاتمہ ہے اور ایک ایسی دعوت جس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہو

اس کا اتمام ہر داعی انہیں الفاظ پر کرتا ہے۔

یہ مکالمہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے بے نظیر ہے یہی وہ مکالمہ ہے جس کو اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے بلیغ اور پر حکمت اسلوب میں بیان کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے یہ اپنے ترتیب کے لحاظ سے اور اس لحاظ سے کہ ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک ذہن منتقل ہوتا ہے اس کی ابتدا اور انتہا دونوں بے مثال ہیں یہ مکالمہ اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اسے تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں مشعل راہ بنا دیں اور اگر کوئی جابر قوت ہمارا راستہ روکے تو ہم اس مکالمہ کی روشنی میں دعوت کا حق ادا کر سکتے ہیں"[1]۔

(۱) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ۹۷-۱۱۸